رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۵   جنوری ۱۹۳۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت:- پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتبی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا گیا، اب تک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے، جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے،

تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر اُن معجزات کی تفصیل ہے جو بروایت صحیحہ ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کیگئی ہے کہ انہیں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے صحیح عقائد لکھے جائیں،

پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور اُن کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے اُن کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد [illegible]، حصہ دوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]، حصہ سوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]، حصہ چہارم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]، حصہ پنجم تقطیع کلاں [illegible]،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۳۹	ماہ شوال المکرم ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۳۷ء	عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

۱۹۳۲ء سے **معارف** کا بائیسواں سال شروع ہوا، ہندوستان کی ناموافق آب و ہوا میں جہاں ہر سال سیکڑوں رسالے پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، معارف جیسے بے لطف رسالہ کا اتنے دنوں جی جانا اس کی بڑی کامیابی ہے، لوگ شعر و سخن کے چٹخارے، ادب لطیف کے آب و نمک اور بے معنی عبارت آرائی کے مزے کے خوگر ہوگئے ہیں، اس حال میں اگر کچھ ایسے قدردان بھی ہوں جو معارف کے دسترخوان کے مدد کے پھیکے کھانوں کو پسند کریں، تو یہ اس کے مہمانوں کا حسن اخلاق ہے،

دار المصنفین نے اپنی بائیس برس کی زندگی میں **سیرۃ نبوی** کی پانچ ضخیم جلدوں، اور دوسری بعض تالیفات کو چھوڑ کر جو اس کے سلسلہ سے باہر ہیں ہر علم و فن کی پچاس، اور سلسلہ سے باہر کی کتابوں کو ملاکر ستر کتابیں شائع کی ہیں، یہ فلسفہ، ادب، تاریخ، سوانح اور دوسرے متفرق مضمونوں پر ہیں،

مولانا **شبلی** مرحوم جب شعر العجم لکھ رہے تھے تو ان کو خیال بھی نہ تھا کہ وہ اتنی مقبول ہوگی کہ ایک طرف انگلستان کا سب سے بڑا مستشرق اس سے فائدہ اٹھائے گا، اور دوسری طرف ایران و عجم کے مشتاق اس سے بہرہ مند ہونگے، شعر العجم کی دو پہلی جلدوں کے فارسی ترجمے پہلے نکل چکے تھے، اب کابل کی مجلس ادبی کی طرف سے اس کی تیسری جلد کا فارسی ترجمہ شائع ہوا ہے، اس کے فارسی مترجم سرور خاں گویا خود

فارسی ادبیات کے ذوق شناس ہیں، اس لئے اس کا ترجمہ بھی بہت اچھا ہوا ہے، امید ہے کہ "اس قندِ ہندی سے ایران و کابل کے طوطیانِ سخن "شکرشکنی" کا لطف اٹھائیں گے ،
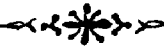
اب افغانستان بھی تالیف و تصنیف کے نئے طرز سے آشنا ہو رہا ہے، اس سلسلہ کی سب سے تازہ مثال حکیم سنائی ہے، جس کو خلیل اللہ خاں خلیلی نے تالیف کیا ہے، اور جس میں حکیم موصوف کے سوانح تصنیفات اور معاصرین کی تحقیق کی ہے، عمدہ ٹائپ میں اچھے کاغذ پر صفائی کے ساتھ چھپی ہے ،

دو برس پہلے ایران میں فردوسی کی جو یادگار رسم منائی گئی تھی، اس میں ہندوستان اور کابل کے بعض اہلِ علم شریک ہوئے تھے، ان میں سے کئی دوستوں کی زبانی یہ سنا کہ خاکسار کی کتاب خیام کی قدر دانی مستشرقوں اور ایران کے ادیبوں نے یکساں کی، اور فرمائش کی گئی کہ اس کا فارسی ترجمہ جلد شائع کیا جائے اس کے لئے تقاضا تو ایک سال سے تھا، مگر دوبارہ نظرثانی اور ترمیم و اضافہ کے خیال سے ابھی تک تعمیل نہیں کی گئی، گذشتہ رمضان کی فرصت اس "بادہ خوار" کے سوانح پر نظرثانی کے نذر ہوئی جس نے سرخوش ہوکر کہا تھا،

ماہ رمضاں برفت و شوال آمد ہنگامِ نشاط و عیش و قوال آمد

تصحیح اور اضافہ کے بعد اب یہ نسخہ کابل بھیجا جا رہا ہے، امید ہے کہ جلد اس کا ترجمہ طبع ہو کر نیشاپور تک پہنچ جائے جس کو صاحبِ سوانح اپنے قافلۂ عمر کا گذرگاہ سمجھتا تھا ،

اب ہندوستان میں بھی خوبصورت ٹائپ میں فارسی کتابوں کی چھپائی کا کام ترقی کر رہا ہے، کئی سال ہوئے کہ سخنورانِ ایران دلی کے جامعہ پریس میں چھپی تھی، اب بمبئی (بھنڈی بازار) میں ابنائے شرف الدین

نے عربی و فارسی کے ٹائپ کا جو مطبع قائم کیا ہے، اس میں مولانا جامی کی سلامان وابسال نہایت صاف اور خوشخط

خدہ کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت فی جلد عہ قیمت مجلد مطلا بیعہ،

سلطان محمد تغلق کے بعد مصر کے بھائیوں کو سب سے پہلی دفعہ اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں کا خیال آیا ہے، مصر کے نوجوان مسلمانوں کی انجمن (جمعیۃ الشبان المسلمین) کی طرف سے ہندوستان کے تعلیمی و مذہبی حالات کی تحقیق کے لئے ایک وفد اس مہینہ یہاں آیا ہے، یہ وفد ایک صدر اور چند ممبروں پر مشتمل ہے، صدر حضرت علامہ ابراہیم جبالی، اور ممبر شیخ عبد الوہاب نجار اور شیخ محمد عدوی وغیرہ ہیں جمعیت کے رئیس ڈاکٹر عبد الحمید سعید کا خط آیا ہے کہ ان بزرگوں کو ہندوستان کے علمی و تعلیمی و مذہبی حالات کے مطالعہ کا موقع دیا جائے اور اتحاد اسلامی کی اس فرصت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک روسی پروفیسر ڈاکٹر ذکی ولیدی نے روسی زبان میں اس موضوع پر کہ مشرقی اور مغربی فضلاء مل کر کس طرح اسلامی علوم کی تحقیقات کو ترقی دے سکتے ہیں ایک مضمون لکھا ہے، بھوپال سے ایک دوست نے اس کا اقتباس اصل روسی اور انگریزی کے ترجمہ کے ساتھ بھیجا ہے جس کو آپ آیندہ تلخیص میں پڑھیں گے۔

اس مضمون میں پہلے سر سید اور مولانا شبلی کا نام ہے اور اس کے بعد ہمارے دوست ڈاکٹر حمید اللہ (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) کا ذکر ہے جس کے ان مقالوں پر جو فرانسیسی میں انہوں نے لکھے تھے، بہت تعریف کے ساتھ یہ اظہار خیال کیا ہے کہ مذہب کے ساتھ اس کی تحقیق کا معیار بہت اونچا ہے، ہم اپنے دوست کو ان کی اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں، اور ان مسلمان یورپ زدہ علمی ڈاکٹروں کے لئے نمونہ پیش کرتے ہیں، جو اپنی کامیابی کا ذریعہ علمائے یورپ کی تحقیقات کی اندھی تقلید کو سمجھتے ہیں۔

مقالات

تذکرۂ طاہر

یعنے

سوانحِ خود نوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خاں طاہر مرحوم،

"نواب سید محمد علی حسن خاں مرحوم کی وفات سے جو صدمہ علم و فن کو پہنچا ہے، وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں، مرحوم نے اپنے والد ماجد کی جو مفصل سوانح عمری مآثر صدیقی کے نام سے لکھی ہے، اس کا اخیر حصہ اون کی اولاد اور اولاد کی اولاد کے حال میں لکھا تھا، اس حصہ کے الحاق کی یہ خود نوشت سوانحعمری شائع کیجارہی ہے،

اس میں بہت سے واقعات ایسے ہیں، جو ذاتی حیثیت رکھتے ہیں، مگر اس بنا پر کہ واقعاتِ ماضی کا قلم بند ہو کر محفوظ ہو جانا تاریخ کی ایک خدمت ہے، اسلئے ان کو اپنی جگہ پر قائم رکھا جاتا ہے،"

چونکہ والاجاہ مرحوم کے سلسلۂ اولاد میں یہ عاصی پر معاصی، راقم الحروف بھی داخل ہے، اس لحاظ سے کچھ نہ کچھ اپنے حالِ پرملال کے روزنامۂ سیاہ کا دفتر بھی کھولنا ہے، مگر حیران ہوں کہ لکھوں تو کیا لکھوں، اور بیان کروں تو کیا بیان کروں،

نہ شگوفہ ام نہ برگم نہ درخت سایہ دارم ہمہ حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا

حقیقت حال تو یہ ہے کہ جب میں اپنی عدم صلاحیت، تہیدستی علم و عمل، بے بضاعتی نقد و نظر، ہیچ
ذیسیہ کاری، خود رفتگی و خود فراموشی پر غور کرتا ہوں، اور ساتھ ہی اگر جب اپنے انتساب ظاہری و نسبی پر نظر ڈالتا
ہوں، جو جلیل القدر اسلاف کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر منتہی ہوتا ہے، تو میرے رنج و انفعال کی کوئی حد
باقی نہیں رہتی، اور اس خیال سے کہ خدائے عزوجل کا یہ ارشاد لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح
کہیں مجھ پر بروز جزا صادق نہ آئے، میرا دل لرز جاتا ہے، اور وحشت دل سے مضطرب ہو کر بے اختیار
پکار اٹھتا ہوں،

چو پرسش گنہم روز حشر خواہد بود تمسکات گناہان خلق پارہ کنند

اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے، بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ
جو علم انسان کو اپنے نفس کا ہوتا ہے وہ یقین ہے، اور جو علم غیر کو ہوتا ہے وہ ایک ظن خیر یا ظن شر سے
زیادہ نہیں ہوتا، ولا یزکی علی اللہ احدا ھو اعلم من اتقی، یہ ایک ایسی حقیقت واضحہ ہے جس میں
ذرا شک و شبہہ کی گنجائش نہیں، بایں ہمہ میں نے اعزہ و احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر حتی الوسع
بلا کم و کاست عرض حال کرنے کی کوشش کی ہے، اور اپنے دل کو یوں تسلی دے کر سمجھا لیا ہے کہ اگر
میرے اس افسانہ لاطائل اور داستان حسرت و حرمان سے میرے اعزہ و احباب اور ناظرین کو بجز انقباض
خاطر اور تکدر طبع کچھ حاصل نہو گا، تو کم سے کم سبق عبرت و بصیرت و استغفار و انابت تو حاصل ہوگا، ع

من نہ کردم شما حذر بکنید

اگر چمنستان فضل و کمال اور بہارستان علم و ہنر کی گلگشت سے دل کو سرور و فرحت اور وجد و حال
پیدا نہ ہوگا، تو بے کمالی، اور بے ہنری کی برگ ریزی و پژمردگی اور گلشن فضل و کمال کی بربادی و ویرانی
ملاحظہ کرنے سے بازیچۂ روزگار کی نیرنگسازیوں کا اور دنیائے ناپائدار کی بے ثباتیوں کا سماں تو آنکھوں کے
سامنے پھر جائے گا،

بر رشتہ گرہ می فگنم گر نہ کشایم، بیکار نیم گر روش کار ندانم،

ولادت، واقعہ یہ ہے کہ اس کوچہ گرد عزتکدہ ہستی ناآشنائے علم و عمل ناشناس اوضاع زمان سرگشتہ وادی عصیان و طغیان الموسوم بہ علی المکنی بہ ابی نصر المتخلص بہ سلیم و طاہر نے چہارم ربیع الثانی ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۶ء روز پنجشنبہ وقت نیم شب خواب عدم سے اس ظلمت کدۂ شہود اور دار قنا میں بمقام بھوپال آنکھ کھولی اور اپنے آپ کو ایک عجیب حال میں پایا، سب کچھ دیکھا، اور کچھ نہ دیکھا، سب کچھ سنا، اور کچھ نہ سنا ع

ہمہ خندان بدند و من گریان،

تا نظر بر چمن وضع جہاں وا کردم ستمے بود کہ بر دیدۂ بینا کردم،
نہ چمن بوے بقا داشت نہ گل رنگ وفا حیرت آلودہ بہر سوئے نظر ہا کردم

والا جاہ مرحوم اس نمود بے بود سراپا ننگ و عار کی نسبت محبت پدری کے جوش مسرت میں اپنے فرحات قلبی اور دلی امیدوں کو کتاب اتحاف النبلاء المتقین میں ان الفاظ کیساتھ ظاہر فرماتے ہیں

"سعادت آثار ئی لطف طبیعت ذکا سے مناسب وحرکات لطیفہ ورقت قلب و بشاشت چہرہ ہمراہ دارد، حق تعالی را امید وارم کہ از برکات اسمی با جمیع از محدثین و فقہا کہ باین نام نامور اند، بمراتب علیا، از علم و عمل در دنیا و دین فائز گردد، چہ دعاہاست کہ برائے او و برائے برادر کلان او در حرمین محترمین حرسہا اللہ تعالی نہ کردہ ام و قبول و اجابت را راجی بودہ ام،

یارب این اخترم قمر گردد، بلکہ خورشید باختر گردد،
متحلی بہر حمیدہ شود، صاحب خصلت گزیدہ شود،
نور سنت منور ش دارد ظلمت بدعتش نیازارد،
یک سر موے بر تنش نبود کہ شریعت مزینش نبود،

باد عمرِ بخشش دراز در طاعت کز وجود بہ سود تو ہر ساعت،
اختر طالعم بہ شام امید مایۂ انبساط چون مہ عید

ہر چند کہ میں اپنی ذات میں بجز شامتِ اعمال و زلّاتِ اقدام باللہ العظیم کوئی ایک صفت ان صفاتِ مذکورہ میں سے اور کوئی ایک وجہ وجوہِ مزیت و فضیلت میں سے نہیں پاتا، اِنَّ النَّفسَ لَامَّارَۃٌ بِالسُّوءِ، لیکن حضرت والد محترم مرحوم مغفور کی تمنائے قلبی و دعا ہائے صبحگاہی کا اتنا اثر دنیا میں ضرور پاتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالی نے علوم کتاب و سنت اور فنونِ دانش و حکمت کا ذوق آشنا بنایا ہے، اور ارباب علم و معرفت اور اہلِ کمال کی محبت میرے دل میں ڈالکر مجکو ان کی خدمت و اتباع کا شوق بخشا ہے، اور دولت و ثروتِ دنیوی کا بھی کچھ حصہ عطا فرما کر ہنوز بجز اپنی بارگاہِ لم یزلی کے مجھ کو کسی دنیادار کے دولت کدۂ جاہ و حشمت کا آستاں بوس نہیں بنایا، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً،

ما عجز و شنیم و حریفان زبون طلب اے خون ما بہ گردنِ طبعِ غیور ما،

ساتھ ہی اسکے کسی قدر رضائے نفس اور آزادیِ طبع مرحمت فرما کر ابنائے زمان کی خوشامد و احسان کے بارِ گران سے سبکدوش اور محفوظ و مصؤن رکھا،

روزگارے است کہ از غایت بیداد و درد نیست ممکن کہ کسے با سرو ساماں باشد،
چشمِ نیکی زکہ داریم بہ عہدے کہ درد گر کسے بد نہ کند غایتِ احساں باشد

خدائے ارحم الراحمین کے فضل و رحمت سے امیدوار ہوں کہ جس طرح اس نے حضرت والد مرحوم کی دعا ہائے مخلصانہ کو کچھ نہ کچھ شرفِ قبولیت عطا فرما کر مجکو دنیا میں اپنے انعام و اکرام سے بالکل محروم رکھنا پسند نہیں کیا، اسی طرح وہ ان دعاؤں کو میرے دمِ واپسیں جب کہ کل تعلقاتِ مادی اور اعمالِ دنیوی منقطع ہو جاتے ہیں، سرمایۂ نجاتِ آخرت کرے، وباللہ التوفیق والیہ المرجع والمآب،

گر گرفتہ عام شد رفت زہر ہالہ غذا ورنہ بہ گل حکم شدہ کہ چہا دیدنی است

ولادت کے ساتویں روز معمول اہلِ اسلام کے مطابق میرا عقیقہ ہوا، نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشین نے بروز ولادت پانچ عدد مہر طلائی، اور بروز عقیقہ شریکِ تقریبِ مذکور ہو کر ایک صد مہر طلائی والا جاہ مرحوم کو مرحمت فرمائی،

والد مرحوم نے اپنی کتاب ابقار المنن میں جن واقعات کا اظہار میرے بیانِ ولادت کے ذیل میں کیا ہے، اگرچہ ان کے نقل کرنے میں میرا دل تامل کرتا ہے کیونکہ ان میں بظاہر ایک قسم کے استحسانِ نفس کا شائبہ لازم آتا ہے، بایں ہمہ چونکہ میں اپنی ذات میں واقعۃً ایک بات بھی ایسی نہیں پاتا، جس پر مجھکو استحسان کا وہم و گمان بھی ہو سکے، اس لئے میں حضرت والد محترم کے ان کلماتِ محبت آیات کو محض ان کے خلوص شفقت کی ایک دیرینہ یادگار، اور اپنے حق میں ایک طرح کی دعائے خیر تصور کر کے بر سبیل الشئی بالشئی یذکر، یہاں نقل کرتا ہوں وہ لکھتے ہیں:-

"میری اولاد میں فرزند صغیر باعتبار دنیا کے سب سے زیادہ خوش نصیب ہے، جس دن سے وہ پیدا ہوا، مجھ پر ابوابِ فتوح مفتوح ہونے لگے، اور ہر طرف سے اسباب جاہ و ثروت نے ہجوم کیا، سرکار عالیہ بھی اسی کو دوست رکھتی ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو اس آیت کا مصداق کرے، وآتیناہ فی الدنیا حسنۃ وانہ فی الآخرۃ لمن الصالحین"

میں کہتا ہوں کہ اگر فی الواقع ایسا ہوا تو صاف ظاہر ہے، کہ یہ ایک حسنِ اتفاق ہے، اس میں میری پیدائش، اور میری ذات کو مطلق کوئی دخل نہیں، اس وقت مجھ کو عہدِ رسالت کا ایک واقعہ یاد آیا حضور سرورِ کائنات (فداہ ابی و امی) کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؑ نے جس روز وفات پائی، اسی روز اتفاق سے سورج گرہن واقع ہوا، بعض لوگوں نے گمان شروع کیا کہ آپ کے فرزندِ دلبند

کے حادثۂ وفات کا ملاء اعلیٰ پر بھی اثر پڑا، یہ سورج گرہن اسی کا نتیجہ ہے، یہ خبر جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچی، تو آپ نے صحابہ کو مخاطب فرماکر ارشاد فرمایا، کہ تم لوگ آگاہ ہوجاؤ، کہ کسوف و خسوف کو کسی کی مرگ و زیست سے کوئی تعلق نہیں، یہ دونوں کسوف و خسوف تو آیۃ من آیات اللہ ہیں،

اللہ اکبر جب فرزند رسولِ خدا کی ذاتِ قدسی صفات کو نظامِ کائنات اور ظہورِ واقعاتِ فطرت میں کوئی دخل نہ ہو، تو ہم جیسے سراپا نامہ سیاہ لوگوں کا وجود کس شمار و قطار میں ہے،

بہر تقدیر جیسا کہ عام قاعدہ ہے، روزِ ولادت سے بدو شعور تک میرا زمانۂ طفولیت کنارِ شفقتِ مادری میں بسر ہوا، مگر اس طرح کہ تمام دنیا کے حالات سے بے خبر فریب خوردہ چشم و نظر نگار خانۂ ہستی کے تماشائے جمال میں حیران و مضطر نہ اپنے آغاز کا علم نہ انجام کی خبر،

طفلی و دامان مادر خوش بہشتے بودہ است تا بپائے خود روان گشتیم و سرگردان شدیم

کاش اس بہشت کی نعمتوں اور دلفریب لذتوں کی قدر و قیمت ہی کا اسوقت کچھ احساس و ادراک ہوتا، مگر ایسے نصیب کہاں تھے، وہ تو ایک خوابِ نوشیں تھا جو چشم زدن میں صبح ہوتے ہی ختم ہوگیا، آنکھ کھلی تو آفتاب سر پر تھا، اور دھوپ کی تپش و تمازت اور اس کی گرم گرم لپٹوں سے دل و دماغ آتشکدۂ آذر بنا ہوا تھا، جب اوس کی یاد آجاتی ہے، تو دل پر ایک عجیب حسرت انگیز و اضطراب آمیز کیفیت طاری ہوجاتی ہے، اور دل پہلو کے اندر ہی اندر تڑپ کر رہجاتا ہے، ع

می خندم و می گریم چون طفل بخواب اندر

عالمِ بے خبری طرفہ بہارے بود است حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم،

مکتب نشینی، اس کے بعد گہوارۂ طفولیت سے قدم باہر نکالنے کا وقت آیا، پانچویں شعبان ۱۳۰۷ھ کو جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی، تو طریقۂ قدیم کے مطابق رئیسۂ عالیہ خلد مکان نواب شاہجہان بیگم صاحبہ نور اللہ مرقدہا کے شوکت محل پر تقریب مکتب نشینی کی محفل منعقد ہوئی، میرے نانا منشی جمال الدین

خان بہادر مرحوم مدار المہام ریاست اور مولنا مولوی عبد القیوم صاحب مرحوم جد مولینا محمد اسحاق صاحب مہاجر دہلوی کے داماد تھے، اور اعیان و علمائے پائے تخت شریک محفل تھے،

میری تعلیم ابتدا سے نصاب مروجہ ہند کے مطابق نہیں ہوئی، اولاً حافظ پیر محمد صاحب مرحوم سے قرآن مجید ناظرہ پڑھا، پھر اپنے نانا مدار المہام صاحب بہادر مرحوم سے ترجمۂ قرآن کریم کے چند سبق پڑھے فارسی کی ابتدائی کتابیں مولوی خلیل الرحمن صاحب مرحوم سے (جو بھوپال میں متلّی کیا کرتے تھے) پڑھیں، اسی اثناء میں مولینا مولوی محمد احسن صاحب مرحوم بلگرامی مولف کتاب ارژنگ فرہنگ و کارنامۂ فرہنگ و اسرار احسن وغیرہ کا غلغلۂ شہرت حضرت والد مرحوم کے سمع مبارک تک پہنچا، فی الحقیقت مولوی صاحب ممدوح فن تعلیم کے موجد اور استاذ کل اور نظم و نثر فارسی کے ماہر کامل تھے، اور شاعر گر کے لقب سے مشہور تھے، یہ ان کی عالمگیر شہرت ہی کی تاثیر تھی، کہ حضرت والد مرحوم نے ان کو حیدرآباد دکن سے خاص میری تعلیم کے لئے طلب کیا، اور جب ان کی محیر العقول بے نظیر قدرت فن تعلیم میں ظاہر ہوئی، تو رئیسہ عالیہ نے بھی ان کو اپنے تلمذ کا شرف بخشا، اور ان کے ادب و احترام اور قدر افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، ہندوستان میں ان کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع تھا، بہار و بنگال سے لیکر حیدرآباد دکن تک ان کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے، حکیم محمد اسحاق حاذق موہانی مرحوم جن کا فارسی نعتیہ دیوان مدینۂ نعت کے نام سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے، اور محبوب شیر صاحب صولت مرحوم عظیم آبادی جن کا فارسی کلام دیوان صولت کے نام سے طبع ہو کر مشتہر ہو چکا ہے، ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے،

میں نے کتب فارسی کی تکمیل مولانا ممدوح ہی سے کی، گلستان بوستان سکندر نامہ اُن سے بالاستیعاب پڑھا، قصائد عرفی سہ نثر ظہوری شبنم شاداب، رسائل طغرا، قصائد خاقانی رسالہ عبد الواسع ہانسوی کا متفرق طور پر ان سے درس لیا، کوئی کتاب ایک جزو دو جزو پڑھی، اور کوئی کتاب محض اپنے زور مطالعہ اور کتب لغت و مصطلحات کی مدد سے ان کو پڑھکر سنائی، بقیہ تمام درسی اور

کتابیں ہوں گی، جن کو اوّل سے آخر تک میں نے ایک بار نہ پڑھا ہو، بلکہ بعض کا ذو دو چار چار بار مطالعہ کیا، اسی دوران تعلیم میں مولنا کے فیض صحبت سے خود بخود میری طبیعت میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا، ابتداے عمر سے مجھ کو فارسی زبان کے ساتھ (جو اپنی عذوبت و لطافت میں مشہور خاص و عام ہے) تشنگی رہی، مجھکو خوب یاد ہے، کہ مین نے بیس پچیس برس کی عمر تک کبھی کوئی نظم یا نثر سوائے فارسی کے اردو میں نہیں لکھی، البتہ تذکرۂ شعراے اردو کے جمع و ترتیب کے وقت جو بزم سخن کے نام سے موسوم ہے، میں نے چند اشعار بضرورت اردو میں لکھے تھے،

صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں میزان الصرف منشعب، پنج گنج، زبدہ، ضریری، نحو میر، ہدایت النحو، شرح مأتہ عامل، کافیہ، شرح جامی دو چار ورق، مولانا سلامت اللہ صاحب مرحوم جیراجپوری اور مولینا مولوی الٰہی بخش صاحب مرحوم مؤلف تحفۂ شاہجہانی سے پڑھیں،

صدر العلمار مولانا مولوی سید ذوالفقار احمد صاحب مرحوم، مولانا مولوی حافظ عبد العزیز صاحب مرحوم بھوپالی، مولانا مولوی عبد الرشید صاحب مرحوم شوبانی کشمیری، مولینا مولوی عبد الباری صاحب مرحوم سہسوانی، مولینا مولوی بدیع الزمان صاحب مرحوم لکھنوی سے مختصرات ادب و تاریخ اور بعض کتب حدیث اور قصائد عربیہ کا اکتساب کیا، اور بعض دواوین کتب سنت و تصوف و رقاق اور مؤلفات والا جاہ مرحوم کو خود حضرت والد محترم سے سبقاً سبقاً پڑھا، مثلاً بلوغ المرام، مشکوٰۃ المصابیح، بخاری شریف کا کچھ حصہ، غنیۃ الطالبین، بغیۃ الرائد، ریاض المرتاض، حظیرۃ القدس، درر البہیہ وغیرہ، حکیم مولوی علی حسین صاحب مرحوم بنگالی سے منطق کے چند ابتدائی رسائل پڑھے، مولینا مولوی حکیم محمد اسحاق صاحب مرحوم لکھنوی (جو ممتاز الدولہ ابو تراب میر عبد الحی خاں صاحب مرحوم و مغفور کے عم بزرگ تھے،) اور حکیم معز الدین خاں مرحوم اور حکیم عبد العلی صاحب مرحوم لکھنوی سے بعض کتب طبیہ کا اکتساب کیا، حکیم معز الدین خاں مرحوم ریاست بھوپال میں افسر الاطبا تھے، اور حکیم عبد العلی صاحب مرحوم لکھنوی جو مشہور اذنا مولینا عبد الحی لکھنوی کے

سے تھے، وہ بھی ریاست بھوپال میں افسر الاطباء کے معزز منصب پر فائز رہے تھے، انگریزی زبان کی بھی چند ابتدائی کتابیں یعنی ریڈر وغیرہ حضرت والد محترم کی حکم سے بادل ناخواستہ مختلف اوقات میں ماسٹر منشی حسین خان مرحوم اور ماسٹر فیاض الدین صاحب سے پڑھیں، اور بعض کتابیں انگریزی زبان کی محض تفننً والاجاہ مرحوم کی وفات کے بعد بھی بطور خود ماسٹر عبد الرحمٰن صاحب بی اے علیگ اور ماسٹر بہاری لال صاحب سے پڑھیں، مگر دلبستگی انگریزی تعلیم کے ساتھ کسی طرح نہ ہوسکی، چند ماہ کے بعد یہ شغلہ چھوٹ گیا، دل بر داشتگی کا بڑا سبب عام طور پر ملکی بد مذاقی اور عدم احتیاج تھی، اس کے علاوہ اس زمانہ میں کوئی سوسائٹی بھی بھوپال میں ایسی موجود نہ تھی، جس کے سبب سے تعلیم انگریزی سے دلچسپی اور اسکی طرف کشش پیدا ہوتی،

اسی دوران تعلیم میں فنون سپہ گری اور شہسواری کی تعلیم بھی جاری رہی، غلام محبوب خانصاحب مرحوم سے (جو کارخانجات ریاست کے مہتمم تھے،) شہسواری کی، اور سید امیر علی صاحب مرحوم سے بانک بنوٹ اور فنون سپہ گری کی تعلیم پائی، حضرت والد مرحوم اپنی کتاب تاج المکلل میں اسی امر کی طرف توجہ کرکے صفحہ ۳۰۰ میں لکھتے ہیں،

"وقرأ مختصرات العلوم بالفارسیۃ والعربیۃ الی شرح الکافیۃ للجامی واخذ عن جماعۃ من اعیان بلدۃ وغیرھم الواردین بھا یقرء فی ھذہ الایام کتاب جامع الصغیر للسیوطی وتحصیل سائر الحدیث لہ ید طولیٰ فی الفروسیۃ ورکوب الخیل وھمتہ فی تحسین الزی وتجمیل الھیئۃ وتنظیف الدار والمجالس وایثار شان الامارۃ"

مگر سچ یہ ہے کہ ایک فن بھی درجۂ تکمیل تک نہیں پہونچا، اور جو کچھ سیکھا، اور جتنا سیکھا، اس کا بڑا حصہ عالم تغافل اور بے نیازی کے نذر ہوگیا، یہ وقت تھا کہ کبھی مرغزار علوم کی گلگشت کا ولولہ دل میں

اٹھتا تھا، اور کبھی فنون سپہ گری کے میدان میں جولانی دکھانے کی خواہش پیدا ہوتی تھی، کبھی دل ایک علم و فن کی طرف مائل ہوتا تھا، اور پھر کچھ دنوں کے بعد کسی دوسرے علم و فن کی طرف رجحان خاطر بڑھ جاتا تھا،

صرفت زمانا فی فنون عدیدۃ وافرغت جھدی والجنون فنون

ولما تجلی الامر انکشف الغطا تبین لی ان الفنون جنون

گہ خوشہ چین زلفم و گہ دانہ دزد خال چوں مور قحط دیدہ بہ خرمن فتادہ ام

اسباب نامساعد کا تعلیم میں حائج ہونا

قطع نظر اس کے سوء اتفاق سے اس زمانہ میں کچھ اسباب ناموافق اس قسم کے میرے گرد و پیش جمع ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے حضرت والد محترم کو میری تعلیم کی جانب سے ایک گونہ مایوسی پیدا ہو گئی تھی، اولاً تو میں پیدائشی نحیف الجثہ واقع ہوا ہوں، اسکے علاوہ زمانہ طفولیت سے میری صحت کبھی اچھی نہیں رہی، درد سر و نوازل وغیرہ کی شکایت کا کچھ نہ کچھ سلسلہ بچپن سے برابر قائم رہا، اگر دو چار مہینے اچھا بھی رہتا تھا، تو آٹھ دس مہینے بیمار پڑا رہا کرتا تھا ع

زہے بخت مریض غم عیادت کو جو آتے تھے یہ سر رنجور بالش تھا، یہ تن بیمار بستر تھا

اس حالت کا اقتضاء تو یہ تھا، کہ مجھکو ایک حرف بھی نہ آتا، مگر ساتھ ہی اس کے خوش قسمتی سے کچھ اسباب مساعد بھی ایسے موجود تھے جن کی وجہ سے میری تعلیم میں کسی قدر سہولت پیدا ہو گئی تھی، مجھکو سب سے زیادہ فائدہ میری والدۂ ماجدہ کی علمی قابلیت اور ان کی پاکبازی اور دینداری سے پہنچا، اور حضرت والد محترم کے فیض تربیت و صحبت نے مجھکو ورطۂ جہالت اور ہاویۂ ضلالت سے نکلنے میں بہت بڑی مدد دی اور مولٰنا مولوی محمد احسن صاحب بلگرامی جیسے فرد کامل اور شفیق استاذ کے بے نظیر طریقۂ تعلیم نے مجھ پر اکتساب علم کا راستہ بہت کچھ آسان کر دیا،

(باقی)

شاہجہاں کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب رفیق دار المصنفین

شاہجہاں کی نادرۂ کار تعمیری یادگاریں اس کے ذوق کی نفاست اور لطافت کی بین دلیل ہیں، اسکی تمام تکوینی قوتیں فنونِ لطیفہ کی اسی شاخ پر صرف ہوئیں، اگر ہم بابر کی ذہنی نقش آرائیاں اسکی تزک بابری میں، ہمایوں کی تخیل آرائیاں اس کے شعرو شاعری میں، اکبر کی علمی فیاضیاں اس کے دربار کی ہنر پرور فضا میں اور جہانگیر کی رنگینیاں اسکی تزکِ جہانگیری میں پاتے ہیں، تو شاہجہاں کے ذہن کی پرکاریاں، اس کے تختِ طاؤس، قلعہ معلّی اور روضۂ تاج کے نقش و نگار سے عیاں ہیں، اسلئے یہ امر موجب تعجب نہیں کہ اس نے اپنے باپ یا اپنے لڑکوں دارا اور اورنگ زیب کی طرح کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی، اس کے دماغ کی گل افشانی کاغذ کے صفحات کے بجائے دیوانِ خاص اور دیوانِ عام کی دیواروں پر ہوئی، اس کا حسنِ ذوق علم و ادب کے بجائے جامع مسجد دہلی کی تعمیری ندرت و نفاست میں ظاہر ہوا، اس نے محبت کا ترانہ شعر و شاعری میں نہیں بلکہ تاج میں منظوم کیا،

اسکو بابر، ہمایوں اور جہانگیر کی طرح علمی انہماک نہ تھا، اس لئے ان کی طرح کوئی علمی تصنیف نہیں چھوڑی، لیکن پھر بھی اس کے ذوقِ علمی کا صفحہ دلچسپیوں سے خالی نہیں، اس کے دربار کی علمی فضا، پھر دارا شکوہ، جہان آرا، مراد اور اورنگ زیب کی اعلیٰ تعلیم و تربیت اسکے ذوقِ سلیم کی شہادت ہے،

وہ جب چار برس، چار مہینے اور چار روز کا ہوا تو خاندانی روایات کے مطابق پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا، قاسم بیگ تبریزی، حکیم دوائی گیلانی، شیخ ابوالخیر (برادر علامی ابوالفضل) اور وجیہ الدین گجراتی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے، ان باکمال استادوں کی زیر نگرانی شہزادہ خرم نے علوم و فنون کی تکمیل کی خطاطی میں اسکو بڑی مہارت تھی، محمد صالح کنبو لاہوری شاہجہاں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں لکھتا ہے:-

"بے بر بنیاد کہ بتفصیل تحصیل فصول ابواب دانش نمودہ در جمیع فنون فضائل و دقائق نکتہ فہمی باعلی درجات کمال رسانید، و در عرض اندک مایہ مدتے بے آنکہ کار بطول کشد، ہیولائے خط نیز صورت درست پذیرفتہ تختہ مشق از ریختہ قلم مشکین رقم چوں صفحۂ رخسار نوخطان بحسن خط زینت گرفت[۱]"

ان استادوں میں حکیم دوائی گیلانی کی سعی و محنت زیادہ بار آور تھی، چنانچہ شاہجہاں کہا کرتا تھا

"فی الحقیقت حکیم دوائی آموزگار ماست، و حق تعلیم او برما از استادان دیگر بیش است[۲]"

تاتار خاں جسکو ترکی لغت کی واقفیت میں اعلیٰ کمال حاصل تھا، شہزادہ کی ترکی زبان کی تعلیم کے لئے مامور تھا[۳] یوں تو اس نے شروع ہی سے اکبر کی سب سے پہلی بیوی خدیجۃ الزمانی رقیہ سلطان بیگم بنت ہندال مرزا کی زیر نگرانی پرورش پائی[۴] جو خالص ترکی زبان بولا کرتی تھی، مگر شاہجہاں کو ترکی بولنے کی کبھی مشق نہیں ہوئی، جہانگیر کہا کرتا تھا، کہ اگر کوئی شخص مجھ سے پوچھے کہ خرم میں کیا عیب ہے تو میں کہوں کہ وہ ترکی زبان نہیں جانتا ہے[۵]، وہ ہندوستانی زبان سے بھی واقف تھا،

شاہجہاں نے کوئی تصنیف اور نہ رقعات کا مجموعہ چھوڑا، اسلئے اسکی علمی لیاقت کا اندازہ کرنا مشکل ہے لیکن شاہجہاں نامہ میں اس کا ایک رقعہ منقول ہے، جو اس نے تخت نشینی کے بعد دست خاص[۶] میں

---

[۱] عمل صالح الموسوم بہ شاہجہاں نامہ از محمد صالح کنبو، جلد اول ص۳۱، [۲] ایضاً ص۳۲، [۳] ایضاً ص۳۲، [۴] بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری جلد اول ص۳۱، [۵] تزک جہانگیری، [۶] بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری جلد اول ص۱۱۳،

سے لکھ کر آصف خان یمین الدولہ کے پاس بھیجا، رقعہ حسب ذیل ہے:-

"دانائے رموز سلطنت عظمیٰ، واقف اسرار خلافت کبریٰ، سرخیل یکرنگان وفادار، سلالۂ یکجہتان حق گذار، کارفرمائے سیف وقلم، مدبر امور عالم، زبدۂ خوانین عالیشان قدوۂ امرائے بلند مکان عضد الخلافت یمین الدولہ، عموی بجان برابر آصف خاں، در امان حضرت ملک منان بودہ بدانند، کہ در چہارم گھڑی روز مبارک دوشنبہ بست وہفتم بہمن ماہ موافق ہشتم جمادی الثانی سنہ ہزار وسی وہفت ہجری بمبارکی وفیروزی در دار الخلافت اکبرآباد جلوس میمنت مانوس بر تخت سلطنت وسریر خلافت واقع شدہ، وبدستوری کہ معروض داشتہ بودند، لقب راشہاب الدین قرار دادیم، چنانچہ نام مبارک مارا بعنوان شہاب الدین صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی در خطبہ کہ دریں روز بلند آوازہ گردانیدند، ولہج نمودند، وسکہ بہمیں نام مبارک زدہ شد،

للہ الحمد کہ آن نقش کہ خاطر میخواست

آمد آخر زپس پردۂ تقدیر برون

امیدواریم کہ اللہ تعالیٰ بادشاہ کل ہندوستان راکہ بحض کرم خود بما عنایت نمودہ بربادشاہ شادشما کہ شریک غالب ایں دولت ابد، مبارک گرداند، وروز بروز فتوحات تازہ ونصرت ہائے بے اندازہ نصیب ماشود وشماہم بعمر طبیعی رسیدہ از دولت ما دولت ہائے عظیم یابید، خدمت پرستخان آخر روز جمعہ رسید وعرضہ داشت شمارا گذرانید و بعرض رسانید، کہ مقرر نمودہ آمد، کہ روز پنجشنبہ بیست ویکم ماہ بہمن از آنجا روانہ شوید، وروز جمعہ

---

[1] شاہجہاں نامہ از محمد صالح کنبو ص۲۹۲، وبادشاہ نامہ جلد اول از عبد الحمید لاہوری ص۸۱، شاہجہاں کے بعض اور رقعات بھی نظر سے گذرے، لیکن علمی حیثیت سے وہ بلند نہیں ہیں،

چہاردہم ماہ اسفندارمذ بملازمت ما مشرف گردید ایں معنی چوں دلالت بر آں می نمود کہ زمان دریافت ملازمت نزدیک رسیدہ خوشحال شدیم، قرار داد ایں معنی کہ پادشاہزادہ کامگار برخوردار را ہمراہ بیاورید، و خواجہ ابوالحسن را در لاہور بگذارید متضمن افتادست، چہ کہ در روز مبارک جلوس میمنت مانوس پوشیدہ بودیم برائے آں عضد الخلافہ فرستادیم ہر چند کہ ہر چہ بآں علو عنایت فرمائیم زیادہ ازاں گنجائش دارد، اما بالفعل منصب ہشت ہزاری ذات وہشت ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عنایت نمودیم، و سوائے آں بندر لاہری را بطریق انعام مرحمت فرمودیم، ایں عنایت ہائے ما بر شما مبارک باشد"

اس عبارت میں جہانگیر کی تزک کی رنگینی اور روانی اور نہ عالمگیر کے رقعات کی سلاست اور برجستگی ہے لیکن پھر بھی اس کا کاتب کوئی معمولی استعداد کا آدمی نہیں معلوم ہوتا،

ایک اور فرمان سے اس کی علمی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے، ایک بار کا ذکر ہے کہ شاہجہانی سفراء عراق گئے، تو خلیفۂ سلطان کے وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ میں قدم علم اور نفی علم واجب تعالیٰ کے مسئلہ میں شیخ ابونصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے؟ شاہجہانی سفرا ہندوستان اور سلطنت تیموریہ کے فضل و کمال کے وقار کو قائم رکھنا ضروری سمجھتے تھے، اسلئے انھوں نے شاہجہان کو اطلاع کیا، شاہجہان نے اپنے وزیر نواب سعد اللہ خاں کو حکم دیا کہ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کو لکھو کہ اس کے متعلق دس پندرہ دن میں ایک رسالہ لکھکر پیش کریں، کہ عراق کو بھیجا جائے، چنانچہ سعد اللہ خاں نے ایک فرمان صادر کیا، جس میں لکھا، کہ

"بکرتمکن مریداں حکم شد کہ بآں فضائل و کمالات دستگاہ سطرے چند بنگارد، و بر آں آرد کہ ان افادت و افاضت مرتبت راہ در میں مسائل مختصر جامع مفیدے کہ مستجمع کلمات

نکات حکما و تاویلات علما، و وجہ تکفیر اسلامیین و اقوال ملیین، و مباحثات و مناظرات شکوک و شبہات و ازالات و اخراجات و اسولہ واجوبہ و غایت تدقیقات و نہایت تحقیقات و اصل کلام در ہر باب و اساس سخن در ہر جواب و آن چہ دران نظر یافتہ باشند و برہان بران قائم شدہ باشد، و احاطہ مسائل متعلقہ بمطلب علم از حصولی و حضوری بود و علم و عین عالم و عین معلوم است، یا غیر، و تعلق آن بجزئیات بوجہ کلی است یا بوجہ جزئی، و تحریر آنکہ کلیہ و جزئیہ معلوم تابع مدرک و یا تابع مدرک است و نسبۃ الواجب جزئی ست یا نہ، و بیان آنکہ ادراک تعقلی است، نہ احساسی، .....الخ"

ایک صاحب نظر کا خیال ہے کہ یہ جملے شاہجہاں کے بتائے ہوئے تھے، چنانچہ عبارت ہذا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہین، کہ "شاہجہاں کی علمی قابلیت کا یہ نمونہ ہے، کہ اس نے اس مسئلہ میں جن امور پر رسالہ لکھوانا چاہا ہے، اسکو چند جملوں میں ادا کر دیا" آگے چل کر پھر لکھتے ہیں، کہ "سعد اللہ خان کی علمی استعداد تو مشہور ہی ہے، لیکن شاہجہاں کی علمی فضیلت بھی اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ کچھ کم نہ تھی، ظاہر ہے کہ جو شخص کسی علم و فن سے واقف نہ ہو وہ کیا اسکو سمجھ سکتا ہے"[1]

شاہجہان کی علمی لیاقت کا حال ان حکیمانہ اور عالمانہ باتون سے بھی معلوم ہوتا ہے، جو وہ اپنے درباریون سے کہا کرتا تھا، ایک بار اہل دربار نے کہا کہ ایک صوبہ کا دیوان اپنی ریاست کے اظہار اور جزرسی کے لئے لوگوں کے حق میں سختیان کرتا ہے، اسکے جواب میں شاہجہان نے جو نکتہ آفرین باتین کین، وہ ایک ہمعصر مورخ کے الفاظ میں سننے کے لائق ہیں،

"وبست و نہم ماہ کہ دانشوران و سخن سنجان پایۂ تخت ہمایون بخت در انجمن حضور پر نور بر طبق دستور معہود سعادت بار دریافتہ شرف قرار داشتند، و از ہر جا سخن سر شدہ از ہر

[1] دیکھو معارف نمبر ۴ جلد ۱۰،

گفت و گو در میان بود اتفاقاً بتقریب ذکر روش سلوک یکے از متصدیان شغل دیوانی صوبجات مذکور شد کہ آن و شعار معاملہ بغایت عرصۂ کار بر مردم تنگ کردہ دہمات سخت گرفتہ، آنحضرت فرمودند کہ ایں معنی موافق آئین کارگذاری نیست، چہ سخت گرفتن کارہا و تنگ کردن ساحت امور باعث آن می شود کہ سستی و فتور در اساس پیشرفت کارہا افتد و عرصۂ ملک برفتنہ و فتنہ گران فراخ گردد، چنانچہ در عہد ولایت حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ با وجودآنکہ حضرت خلیفۂ حق و امام مطلق بودہ بر وفق قول حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ کار فرمائے برحق و باحق بودند، اصلا کار موافق مدعائے آنحضرت پیش نرفت، چہ آنحضرت در ہیچ امرے از امور دنیا و دین دقیقہ واری تجویز مساہلہ نفرمودہ یک لمحہ مسامحہ روا نمی داشتند، و اہل دنیا کہ نقطہ مقابل دین و طرف آخرت بل فی نفسہا باطل مطلق است، طالبان ...بشتافتند و تحریک سلسلۂ فساد نمودہ فتنہا برانگیختند،،[1]

اسی اثنا میں سید جلال بخاری نے شاہجہاں کے ایک ارشاد عالی کا حوالہ دیا کہ دنیا دو پاؤں پر قائم ہے، ایک حق دوسرا باطل لیکن اس نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ حق پر قائم ہو، اس پر شاہجہاں نے جو تقریر کی، وہ بہت ہی بصیرت افروز ہے، عمل صالح میں ہے کہ

حضرت بادشاہ حقائق آگاہ کہ طبع اقدس دقیقہ رس آنحضرت بکار فرمائی حدت ناخن دریافت از ہیچ نکتہ بے تفتیش نمی گذرد، فرمودند کہ دریں مقام جائے ایستادگی خرد است ازیں کلام فیض نظام چناں لازم می آید کہ از وقت آنحضرت گرفتہ تا مبدء فطرت ابو البشر علیہ السلام احیاناً پائے باطل نیز درمیان بودہ باشد، وحاشا کہ آنحضرت را ازاں کلام ایں معنی منظور بود، دریں وقت چندے از فیض یابان حضور پر نور آن را بتاویلات دور دو

---

[1] عمل صالح جلد دوم، ص ۲۳۳،

در اظهار نمودند، چنانچه هیچ کدام دلنشین و خاطر ایشان نیامد و در آخر کار خود فرمودند که

که این کلام را برین وجه تاویل باید نمود، که در عهد برکت آئین حضرت خادم النبیین صلی الله علیه وسلم

بر حق محض بوده پیش رفتن امور در ان حال بنا بر آن بوده که بمیامن وجود مسعود آن

مؤید بتائید آسمانی اهل آن زمان راستی و درستی و حق پژوهی و حقیقت طلبی دیگر داشتند،

و دلهای همگنان در آن محل با وجود صفوت جبلی و صفای فطرت از پرتو صیقل مواعظ و نصائح

آنحضرت جلا و صفائی کلی پذیرفته خلاف حق و صدق بران قرار نمی گرفت بلکه بطلان و ناصواب

دران راه نمی یافت، لهذا تنسیق امور بر وفق نفس الامر میسر می شد و حق مطلق کما ینبغی از

پیش می رفت، و برین قیاس در زمان حضرت خلفای راشدین که بمقتضای قرب عهد

رسالت معاینه مانند ساعت بعد از غروب آفتاب که بتاثیر پرتو آن دمی چند اثر فروغ

باقیست و رفته رفته بظلمت می گراید، بواطن اهل آن زمان نیز هنوز از یمن تاثیر نیر اعظم

اوج نبوت نورانی بوده زنگ غفلت بر آن دست نیافته بود، و چون بتدریج احوال

زمانیان دگرگون شده، یکبارگی بعد مطلق از عهد آنحضرت در مابین اتفاق افتاد و زنگار

ظلمت بر قلوب ابنای روزگار استیلا گرفت، چنانچه کار بجای رسید که ظلمت پیشگان

ظلمت سرشت اطفای نور وجود خلیفه برحق اعنی حضرت ذو النورین نمودند، در خلال

این حال خلل در میان استقامت حق و حقیقت راه یافته اقامت دنیا بر پای حق دست

نداد، و ازین رو حضرت امیر را این معنی که مطلوب آنحضرت افتاده بود میسر نشد و قرار

داد خاطر عاطر آن سرور حق پرور صورت نبست چون این توجیه وجیه بسبب تدقیق

آنحضرت رو نمود همگنان از برکت غور و خوض آن خسرو عقیدت اندیش دقیقه یاب

بکنه این دقیقه رسیدند و باتفاق کلمه اقرار نمودند که این کلام را بهتر ازین تاویلی

نمی توان کرد۔"

ایک اور علمی مجلس میں شاہجہاں کی نکتہ آفرینیاں ملاحظہ ہوں:۔

"چہارم آذر کہ محفل ارم آئین، بوجود دانشوران ہر کشور محفوف بود و ہر یک بقدر مبلغ علم خود در سائر ابواب ہر فن سخنی می گفت، و بادشاہ حکیم مشرب حکمت پژوہ کہ پیوستہ درپے تحقیق و تفتیش لوامع حکم و جوامع کلم اند در ہر باب مدخل نمودہ، از ہر در گفتگو می فرمودند، تا سر رشتہ سخن باحوال ملوک حکما، و اوضاع حکما ملوک کشید، دریں اثنا یمین الدولہ کہ ارسطوے عہد و آصف سلیمان زمان است مبالغۂ ستایش و ثنائے سکندر بدیں مبلغ رسانید، کہ دریں مدت متمادی ہیچ فردی از افراد ذوی العقول بر قول و فعل آن بادشاہ راست گفتار درست کردار گرفت نمودہ، بل مبادی راہ دخل نپیمودہ حضرت خلافت مرتبت فرمودند، کہ چوں نبوت سکندر فیلقوس رومی بدرجۂ ثبوت نہ رسیدہ و بنا بر قول محققین ائمۂ تاریخ اسکندر ذوی القرنین دیگر ست مارا بدستور بی ادب در سخن بر گفتار و کردار اوست نخست آنکہ بجواب رسول دارا در باب طلب بیضہاے طلا کہ پدرش فیلقوس ہر سالہ برسم خراج می داد چنیں گفت، ع

شد آں مرغ کو خایۂ زریں نہاد،

چنانچہ در تواریخ معتبرہ و کتب اخبار و سیر مذکور است و در افواہ و السنہ بر سبیل تواتر مشہور و ایں سخن نسبت بہ پدر کمال سوء ادب دارد، و چہ باکیان جانوریست بغایت فرومایہ و مع ہذا بیضہ نہادن مستلزم انوثیت، دوم ترک طریقۂ حزم و احتیاط نمودن و در لباس رسالت بمجلس فرشاہ رفتن، و ایں شیوہ از طریقۂ خردمنداں دور است،

---

[۵۱] عمل صالح جلد دوم ص ۲۲۴،

چہ دانا از ارتکاب امرے کہ پشیمانی بار آورده چاره پذیر نباشد ہرگز نمی نماید، حاضران مجلس

بشکرانۂ اتفاق پوشیدن خلعت وجود در عہد سعادت مہد این بادشاه زبان بسپاس

جہان آفرین کشوده آنگاه فراخور فرصت دستگاه سخن ستایش این سخنان حکمت آمیز در سلک

دعاے از دیاد دین و دولت بجا آوردند"[1]

شاہجہاں اپنے گوناگوں مشاغل کے باوجود روزانہ کتابوں کا مطالعہ جاری رکھتا تھا، جب تمام

کاموں سے فارغ ہو کر رات کو سونے جاتا، تو اس کے مقربانِ خاص پردہ کے پیچھے سے کتابیں پڑھتے

تھے، جو زیادہ تر انبیا، اولیا، و سلاطین کی سوانحِ عمریاں اور تاریخیں ہوتیں، وہ ظفر نامہ اور واقعات

بابری کو بہت پسند کرتا تھا،[2]

اس کا خاندان خود علم و ادب کا گہوارہ تھا،[3] اس کے دربار میں علمی وقار و شوکت دیرینہ روایات

کیساتھ قائم رہی، وہ اہلِ علم و فضل کو کن نظروں سے دیکھا کرتا تھا، یہ ذیل کے پند و نصائح سے معلوم

ہوگا، جو اس نے بیاض خاص میں لکھ رکھی تھیں،

"رنجاندن مردم بد، نرنجیدن بعدم حصول مقصد، نرنجانیدن مردم خوب مزاج

و خواستن بکمالِ احتیاج صحبت داشتن با اہل معاد و جستجو کردن قابلان باستعداد، بازنداشتن

پیش خود بردم جہان، دادن بارباب استحقاق بقدر توفیق پیش از سوال، اکرم داشتن

اہلِ فضل، معروف نمودن مزاج بعدل میل نکردن باقوال غیر عقائد، بے تجسس نمودن

از احوالِ متوکلان بے مکان غنیمت دانستن وجود یگانگان کہ بیگانہ از خلق باشند، پیش داشتن

جمیکہ مصالح امور دنیا و عقبیٰ بودند"

---

[1] عمل صالح حصہ اول، ص ۵۱۵، ۵۱۶، [2] بادشاہ نامہ جلد اول ص ۱۵۳، [3] شاہجہاں کی اولاد کی علم نوازی کا

حال ہم تیموری شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق کے سلسلے میں لکھیں گے،

یہ نکات علمی اور عملی حیثیت سے کسقدر بصیرت افروز ہیں، عالمگیر نے ان کو شاہجہاں کی بیاض سے نقل کر کے اپنے فرزند عالیجاہ شاہزادہ معظم کو از روے نصیحت لکھ بھیجا تھا[1]

شعراء | شاہی دربار میں شعراء و فضلاء کی ایک کثیر تعداد تھی، جو شاہجہاں کے جود و سخا سے فیضیاب ہوا کرتی تھی، لطف اللہ مہندس[2] نے جو داراشکوہ کے مقربانِ خاص میں تھا، شاہجہانی شعراء کے نام مندرجہ ذیل اشعار میں نظم کئے ہیں،

وحید دہر امانی بن مہابت خان	وے بخان زمان است شہرۂ دوران
دگر یگانہ ظفر خان تخلص احسن	ربودہ گوے سخن از سخنوراں در فن
دگر وحید زمن آشنا عنایت خان	بود بجر سخن آشنا عنایت خان
دگر وحید زمن شادمان غم پرور	بیان شادی و غم در کلام او مضمر
دگر سخنور کشمیر محسن فانی است	بقاے نام وے از دولت سخندانی است
مہ سپہر سیادت یگانہ میر عماد	کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد
لبیب عصر محمد حسین آشوب است	سخنورے کہ سخنہاش جملہ مرغوب است
دگر وحید زمان ست طالباے کلیم	کہ شعر او ید بیضا است نزد طبع سلیم
دگر فرید جہاں قدسی محمد خان	بعہد شاہجہاں گو ربود از اقران
الٰہی ہمدانی است در سخن استاد	سخنورے است کہ داد سخنوری می داد
لبیب از منہ آلی نخواند ہیچ کتاب	ز فیض حق شدہ مفتوح بر رخش صد باب

[1] وقائع عالمگیری مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی، [2] لطف اللہ مہندس کے مزید حالات کے لئے دیکھو مضمون تاج محل، اور لال قلعہ کے معمار، از علامہ سید سلیمان صاحب ندوی معارف فروری و مارچ و اپریل ۱۹۳۳ء،

دگر وحید زمن باقیا ترانہ اوا خوش است ہچو غزلہائے عاشقانہ اوا

فصیح از منہ فتحا کہ چوں غزل می گفت چو عندلیب غزلخواں درو گہری سفت[۱]

اس چمنستان شعراء کا گل سرسبد ابو طالب کلیم تھا، کلیم کاشان کا رہنے والا تھا، جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا، لیکن ۱۰۲۸ھ میں وطن واپس چلا گیا، پھر ہندوستان آیا، جہانگیر کے دربار میں ملک الشعراء طالب آملی کے مقابلہ میں اسکو فروغ نہ ہوا، لیکن شاہجہاں کے عہد میں کلیم کا کلام شعلۂ طور بن کر چمکا، شاہجہاں کے دربار سے ملک الشعراء کا خطاب ملا، ۱۰۴۴ھ میں جب شاہجہاں نے ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے تخت طاؤس تیار کرایا، اور آگرہ میں جشن نوروز کے دن اس پر جلوس کی رسم ادا کی، تو کلیم نے ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا،

خجستہ مقدم نوروز غرۂ شوال نشاندہ اند چہ گلہائے عیش بر سر سال

شاہجہاں کو یہ قصیدہ اس قدر پسند آیا، کہ کلیم کو اس کے صلہ میں روپے کے برابر تلوایا، جو ۵۵۰۰ روپئے وزن میں آئے،[۱] اور اسکو عطا کئے[۲] ۱۰۴۶ھ میں جشن وزن شمسی کے موقع پر شاہی خزانہ سے کلیم کو کچھ اشعار کے صلہ میں ایک ہزار روپیہ ملے[۳] ۱۰۴۹ھ میں کلیم شاہجہاں کے ساتھ کشمیر گیا، اس جگہ کی دلآویزیوں اور رنگینیوں کو دیکھ کر وہاں کا فریفتہ ہوگیا، بادشاہ سے وہاں قیام کی اجازت چاہی جو منظور ہوئی، یہیں بیٹھ کر فتوحات شاہی منظوم کرتا تھا، جس کے لئے کلیم کو سالانہ وظیفہ ملتا تھا، ۱۰۵۵ھ میں شاہجہاں پھر کشمیر گیا، تو کلیم نے تہنیت کا قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس کے انعام میں خلعت اور دوسو اشرفیاں پائیں، شاہجہاں جب واپس ہونے لگا، تو کلیم نے پھر ایک قصیدہ کہا، اور دو

---

[۱] دیکھو مضمون ہذا و فہرست کتب خانۂ شاہ اودھ از ڈاکٹر اسپرنگر ص ۱۱۶، [۲] بادشاہ نامہ حصہ دوم ص ۸۳ نیز مآثر الکرام دفتر ثانی، از غلام علی آزاد بلگرامی ص ۸۷، مطبع مفید عام آگرہ و شعر العجم حصہ سوم از مولینا شبلی ص ۱۰۰، [۳] بادشاہ نامہ جلد اول ص ۱۳۴

اشرفیاں بھی انعام میں ملیں[1]،

کلیم کا مد مقابل شاعر حاجی محمد جان **قدسی** تھا، مشہد کا رہنے والا تھا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں تعلیم پاکر ہندوستان آیا، خواجہ عبد اللہ خان بن خواجہ ہارون کی مدح میں جو ہفت ہزاری منصب کا شاہجہانی امیر تھا، ایک قصیدہ کہا، عبد اللہ خاں سفر میں جارہا تھا، اسی حالت میں قدسی نے قصیدہ پڑھا، عبد اللہ خان اس قصیدہ سے اسقدر متاثر اور محظوظ ہوا، کہ اپنی مسند سے اٹھ گیا، اور اسکو اپنی جگہ پر بٹھایا، پھر باہر نکل کر اپنا خیمہ اس کے تمام متعلقات اور لشکر کے تمام جانور انعام میں اسکے حوالہ کردیے[2]

۱۰۴۲ھ میں شاہجہان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا،

اے قلم بر خود ببال از شادی وبکشا زباں در ثنائے قبلۂ دیں ثانیِ صاحبقراں[3]

اس صلہ میں شاہجہان نے قدسی کے منہ کو سات دفعہ جواہرات سے بھرا[4]، اور اسکو دربار سے منسلک کرلیا، جہاں اسکو روزانہ وظیفہ ملا کرتا تھا، آگے چل کر ملک الشعراء ہوا، ۱۰۴۵ھ میں اس نے جشن نوروز کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا، جو شاہجہان نے بہت پسند کیا، اس کے انعام میں اسکو روپیے میں تلوایا، جو طالب کلیم کے وزن کی طرح ۵۵۰۰ ہوئے[5]، ۱۰۴۹ھ میں قدسی کو کچھ اشعار کے صلہ میں سو اشرفیاں مرحمت ہوئیں، جہاں آرا بیگم کی صحت یابی کے موقع پر قدسی نے ایک قصیدہ کہا، تو شاہجہان نے دو ہزار روپیے عطا کیے[6]،

---

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۲۹۴، نیز شعر العجم حصہ سوم و مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۔ [2] مرآۃ الخیال ص ۱۳۷

[3] عمل صالح حصہ دوم ص ۵۰۰ پر پورا قصیدہ منقول ہے، [4] مرآۃ الخیال ص ۱۳۷، [5] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ۲۴۲، [6] عمل صالح حصہ دوم ص ۴۱۲، شیر خان مرآۃ الخیال میں لکھتا ہے کہ حاجی محمد جان قصیدۂ رنگین در مدح صاحبقران ثانی گفتہ بعرض رسانید پادشاہ اقسام جواہر قیمتی طلبیدہ فرمود تا ہفت بار دہانش از آن پر کردند، معلوم نہیں کونسے موقع پر یہ قصیدہ کہا گیا تھا

قدسی کا انتقال ۱۰۵۶ھ میں ہوا، طالب کلیم نے ایک مرثیہ لکھا، جس کے ایک ترکیب بند سے تاریخ نکلتی تھی، ع

دور از ان بلبل قدسی چمنم زندان شد
۱۰۵۶

احسن، مرزا احسن اللہ نام اور احسن تخلص تھا، خواجہ ابو الحسن تربتی کا لڑکا تھا، خواجہ ابو الحسن خراسان سے اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آیا، شاہزادہ دانیال اور دکن کا وزیر مقرر ہوا، جہانگیر کے زمانہ میں وزارت کے عہدۂ اعلیٰ پر مامور رہا، شاہجہاں کے زمانہ میں شش ہزاری و شش ہزار سوار کا منصب اور کشمیر کا علاقہ عطا ہوا[۱]، باپ کے مرنے کے بعد احسن اللہ عنایت شاہانہ سے مستفیض ہوا، کشمیر میں باپ کا جانشین ہوا، ظفر خاں خطاب ملا، ظفر خاں نہایت فیاض اور قدردان علم و فن تھا، خود ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا، مرزا صائب کا شاگرد تھا، مگر اس کے کلام پر استادانہ نکتہ چینیاں کرتا تھا، مرزا صائب اسکی سخندانی کا بہت مداح تھا[۲]، وہ صاحب دیوان بھی تھا[۳]،

آشنا، مرزا محمد طاہر نام، عنایت خاں شاہی خطاب، اور آشنا تخلص تھا، ظفر خاں کا لڑکا تھا، شاعری کا ذوق باپ سے وراثت میں پایا تھا شاہجہاں کا ندیم خاص تھا[۴]، اسکے عہد کی تیس سالہ تاریخ بھی لکھی[۵]، شاہجہان کی طرف سے اسکو ہزار و پانصدی کا منصب عطا ہوا تھا[۶]،

باقیائی، شاہجہانی دربار کا ایک مقبول شاعر تھا، ۱۰۶۲ھ میں جشن نوروز کی تہنیت میں ایک قصیدہ لکھا جس کے صلہ میں شاہجہاں نے اسکو روپیہ میں تلوایا، جو ۵ ہزار کے برابر ہوا[۷]،

---

[۱] مآثر الامراء حصہ اول ص ۲۳۷، [۲] شعر العجم حصہ سوم، [۳] مآثر الکرام ص ۹۵، [۴] ایلیٹ جلد ہشتم ص ۷۳، [۵] ر، [۶] مآثر الامراء جلد ۲ ص ۷۶۲

[۷] عمل صالح میں باقیائی کے بارے میں ہے، ، سخنورے طبع روان داردو در تصنیف و تالیف نغمات بروش موسیقی یونانی و فرس بے نہایت ماہر است و تصانیف خود را کہ بروفق ریختۂ مرزا میر خسرو، و نغمۂ ہوش ربا ہندیہ آہنگ بستہ لنا نوبت مرغوب و مطبوع مسامع و طبائع افتادہ، حصہ دوم ص ۲۳۰،

لطف اللہ کے گنے ہوئے شعرا ء میں امانی ابن مہابت خاں، شادماں، فانی، قضا، آشوب، الہٰی
تی، امی، تمثا کے حالات میری نظر سے مختلف تذکروں میں نہیں گذرے،
ان کے علاوہ بہت سے اور شعراء بارگاہ شاہجہانی سے منسلک تھے، ان میں سب سے پہلے مرزا
ب پر نظر پڑتی ہے، جس کے بارے میں مولینا شبلی کا خیال ہے، کہ "ایران میں شاعری رودکی سے شروع
ئی، اور مرزا صائب پر ختم ہو گئی" میرزا صائب کا مولد تبریز تھا تعلیم و تربیت اصفہان میں حاصل کی جہانگیر کے
عہد میں ہندوستان آیا، خواجہ ابوالحسن تربتی کی فیاضیوں سے سیراب ہوا، شاہجہان جب تخت پر بیٹھا، تو
تاریخی قطعہ لکھ کر بارہ ہزار روپیے صلے میں حاصل کئے،
شاہجہاں کی طرف سے مرزا صائب کو ہزاری منصب اور مستعد خاں کا خطاب بھی ملا تھا، میرزا صائب
علق زیادہ تر خواجہ ظفر خاں احسن کے ساتھ رہا، جس کی مدح میں اس نے متعدد قصائد لکھے، میرزا کو اکی
اہی پر ناز تھا ۱۰۴۲ھ میں صائب مشہد مقدس کی زیارت کو جانا چاہتا تھا، تو شاہجہاں نے زادِ سفر کے لئے
نچ ہزار روپیے عنایت کئے[1]
شیدا، ایک بہت ہی ذہین رسا شاعر تھا، بدیہہ گوئی میں کمال رکھتا تھا، حاجی محمد خاں قدسی
کے ایک قصیدہ پر قصیدہ لکھ کر اعتراض کیا، جو بہت مقبول ہوا، طالب آملی اور میر الہٰی کی ہجو کہی، ہجو گوئی
میں بڑی مہارت رکھتا تھا، پہلے عبد الرحیم خانخاناں کی زر پاشیوں سے سیراب ہوتا رہا، پھر شہزادہ
شہریار کے آستانہ کا جبیں سا ہوا، آخر میں شاہجہاں کے دربار میں باریابی حاصل کی، ایک بار شاہجہاں
کے حضور میں ایک مطلع پڑھا،

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے حسن را پرور دگارے عشق را پیغمبرے

[1] مرزا صائب کے حالات اور شاعری کی تفصیل کے لئے دیکھو شعر العجم حصہ سوم، اور مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۹۹-۱۰۰

اس شعر کو سُن کر شاہجہان بہت ہی غضب ناک ہوا، حکم دیا، کہ اس کو فوراً شہر بدر کر دیا جائے لیکن شیدانے فوراً معذرت میں ایک قطعہ لکھا، اور اپنی برأت کیلئے جامی کا مندرجہ ذیل شعر استشہاد میں پیش کیا،

از مراعی دو بار قلقل مے، پیش جامی بہ از چہار قل است،

شاہجہان کا غصہ فرو ہو گیا[1]

اسی قسم کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے، چندر بھان برہمن جو دارا شکوہ کا میر منشی تھا، فاضلانہ اور صوفیانہ اشعار اچھے کہتا تھا، شاہزادہ دارا شکوہ کے مزاج میں اسکو بہت دخل تھا، ایک بار شاہزادہ موصوف نے بارگاہ شاہی میں برہمن کے ایک شعر کی تعریف کی، اور شاہجہان سے بھی سننے کی درخواست کی، برہمن طلب کیا گیا، تو اس نے شعر عرض کیا کہ

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار، بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم،

شاہجہان کو یہ بیت سن کر غصہ آیا، مگر سعد اللہ خاں وزیر اعظم نے عرض کیا، کہ گیتی پناہ، حضرت شیخ سعدی چار سو برس پہلے اس کے جواب میں فرما گئے ہیں کہ

خرِ عیسیٰ اگر بہ مکہ رود، چوں بیاید ہنوز خر باشد،

شاہجہان ہنس پڑا[2]

میر الٰہی و میر یحییٰ کاشی بھی شاہجہانی دربار سے تعلق رکھتے تھے، میر الٰہی اصفہان سے آکر شاہی دربار میں ملازم ہوئے، ۱۰۶۳ھ میں انتقال ہوا، تو غنی کشمیری نے یہ تاریخ کہی، ع:-

بردا لٰہی ز جہان گوے سخن،

۱۰۵۸ھ میں جب دارالخلافہ شاہجہان آباد کی تعمیر ساٹھ لاکھ روپیہ کے خرچ سے تکمیل ہوئی، تو میر یحییٰ

---

[1] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۸۳، و مرآۃ الخیال ص ۱۰۴-۱۰۵، [2] مخزن الغرائب قلمی نسخہ دار المصنفین اعظم گڈھ [3] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۸۵،

نے یہ تاریخ کہی ع

شد شاہجہان آباد از شاہ جہاں آباد،
۱۰۵۸ھ

شاہجہاں نے ایک ہزار روپیہ انعام میں دیا، اور ایک موقع پر شاہجہاں نے اسکو سو اشرفیاں بطور انعام عنایت کی تھیں[1]

میر رضی بن میر ابو تراب **دانش** رضوی مشہدی کو شاہجہانی دربار میں باریابی حاصل تھی ۱۰۶۵ھ میں شاہجہاں کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جسکا مطلع یہ تھا،

بخواں بلند کہ تفسیرِ آیہ کرم است خطے کہ از کفِ دستِ مبارکش پیداست

شاہجہاں نے اس پر دو ہزار روپے عنایت کئے[2]

مسیح حکیم رکنا کاشی، ایک "عیسیٰ نفس" شاعر تھا، جو اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آیا، جہانگیر کے دربار سے بھی منسلک رہا، شاہجہاں کی تخت نشینی کے موقع پر یہ تاریخ کہی،

بادشاہ زمانہ شاہجہاں خرم و شاد و کامراں باشد
بہر سال جلوس او گفتم، در جہاں بادتا جہاں باشد

شاہجہاں نے اس صلہ میں دو ہزار روپے عطا کئے ۱۰۴۱ھ میں مشہد مقدس کی زیارت کو گیا، تو رخصت کرتے وقت شاہجہاں نے خلعت اور پانچ ہزار روپے دیئے[3]

دو اور شاعر قابل ذکر ہیں،

میرزا حسن **رفیع** قزوین کا رہنے والا تھا ۱۰۴۵ھ میں ہندوستان آیا، شاہجہاں کے دربار میں باریابی ہوئی، تو خلعت اور تین ہزار روپے ملے، اور شاہی ملازموں میں داخل کر لیا

---

[1] مآثر الامراء جلد سوم ص ۴۶۹، [2] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۲۰۹، [3] مآثر الکرام ص ۱۸۳ دفتر ثانی، [4] ، ص ۲۰،

ـنـ؁ میں جشن وزن کے موقع پر ایک قصیدۂ تہنیت کہا تو ہزار روپیہ انعام ملا[۱]

میر صیدی طہرانی، اصفہان سے ہندوستان آیا، اور شاہی دربار میں ملازم ہو کر شاہجہان
ـاشیوں سے سیراب ہوا، ـ؁ میں ایک قصیدۂ تہنیت کہا، جس کا مطلع یہ تھا،

زہے جہان خدا را سپہر عدل و کرم
بزیر سایۂ قدر تو نیست اعظم،

ـں نے اس کے صلہ میں ہزار روپئے دیئے[۲]،

عبد الحمید لاہوری نے شاہجہانی دربار کے ایک اور شاعر سعیدا سے گیلانی المخاطب
ـرل خان کا ذکر کیا ہے، وہ اس کی شاعری کا بہت مداح ہے[۳]، سعیدا نے شاہجہانی جلوس
ـخ اس مصرع سے نکالی،

جلوس شاہجہاں دادہ زیب ملت و دین

شاہجہاں کی زرپاشیوں اور علم نوازیوں کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے،
ـلدولہ نے تربہت کے دو برہمنوں کو دربار میں پیش کر کے عرض کیا، کہ یہ دونوں دس
ـی بیتیں جو دس شاعروں نے تازہ کہی ہوں، اور کسی نے نہ سنی ہوں ایک بار سنکر
ـیتے ہیں، اور اسی وزن اور مضمون میں دس شعر فی البدیہہ کہہ دیتے ہیں، امتحان ہوا تو
ـبت ہوا، شاہجہاں نے دونوں کو خلعت اور ہزار ہزار روپئے انعام میں دیئے[۴]،

---

[۱] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۰۰،
[۲] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۱۱،
[۳] ـاسکے کلام کے نمونے بادشاہ نامہ جلد اول ص ۳۵۰ پر ملاحظہ ہوں،
[۴] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۲۶۹،

مسلمان اور جبر و مقابلہ

از

مولوی محمد یوسف صاحب عمری رفیق دار المصنفین

جبر و مقابلہ علم ریاضی کی ایک شاخ ہے جسمیں علامتون کے ذریعہ سے مقدارون سے بحث کیجاتی ہے، یہ علامتیں عام طور سے حروف تہجی ہوتی ہیں، اور ان کی قیمت ایک مثال میں اول سے آخر تک ایک ہی رہتی ہے،

جبر کے لغوی معنی ٹوٹی ہوئی ہڈی کے باندھنے کے ہیں، اور لفظ مقابلہ مفاعلہ کے باب سے ہے، جس کے معنی ایک دوسری کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں، لیکن ان دونون لفظون کے اصطلاحی معنی یہ ہیں، کہ معادلات کے ایک جملہ میں ناقص کی تکمیل کرکے وہی مقدار دوسرے جملہ میں بڑھا دیجائے اور ایک جنس کی ناقص مقدار کو زائد مقدار میں سے گھٹا یا جائے، چنانچہ نجم الدین خان انہی اصطلاحی معنون کو یوں بیان کرتے ہین،

طرفے کہ در واست حرف الا	تکمیل کن و مثل آن را،
بر طرف دگر فزودن کن اے جبر	در مصطلح است نام این جبر
ہنگام معادلہ تو بشناس،	افتد اگر این کہ بعض اجناس
با وصف تجانس از سویت،	در ہر طرف اند بے مزیت،
باید کہ ز ہر دو سو برانی،	نامش تو معتابلہ بخوانی،

مثلاً ۵ ب۲ - ۶ ب + ۲ = ۴ ب۲ + ۷

اس مثال کے پہلے جملہ میں ۶ ب ناقص ہے، اسلئے اسکی تکمیل کرکے یہی مقدار اس کے دوسرے جملہ میں بڑھا دیجائیگی، اسی کا نام جبر ہے، چنانچہ مذکورہ شکل حسب ذیل شکل مین تبدیل ہوجائیگی،

۵ ب۲ + ۲ = ۴ ب۲ + ۶ ب + ۷

اب اس میں ۵ ب۲، ۴ ب۲ اور ۲، ۷ ایک جنس کی مقدارین ہین، اسلئے ۴ ب۲ کو ۵ ب۲ میں سے اور ۲ کو ۷ میں سے گھٹا دیا جائے گا، اسی کا نام مقابلہ ہے، تو مذکورہ صورت حسب ذیل صورت میں تبدیل ہوجائے گی،

ب۲ = ۶ ب + ۵

شروع میں اس علم کا نام "الجبر والمقابلہ" تھا، لیکن رفتہ رفتہ دوسرا لفظ متروک ہوگیا، اور اب یوروپین زبانون مین "الجبر والمقابلہ" کی بجائے صرف الجبرا (Algebra) بولا جاتا ہے،

اس فن کا موجد کون ہے؟ قطعی طور پر یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ اس علم کو کس نے ایجاد کیا؟ البتہ اتنا ضرور ہے، کہ ولادت مسیح سے ایکہزار سات سو سال پہلے ہی اسکی ابتدا ہوچکی تھی، گو اس پر فن کا اطلاق نہیں ہوسکتا، مگر اسکی بنیاد اسی زمانہ میں پڑ چکی تھی[1]،

یونانی و ہندی تصنیفات، اسلام سے پہلے یونانیوں میں دو شخصون نے اس پر مستقل کتابین لکھین، ایک ابرخس ہے، جو ۱۶۰ ق م میں نہایت مشہور ریاضی دان گنا جاتا ہے، اس کی کتاب کا ترجمہ ابوالوفا محمد بن محمد حاسب المتوفی ۳۸۳ھ نے کیا، اور اس کی جا بجا اصلاح کی، نیز اس نے اس کی شرح بھی لکھی تھی، اور دعووں کو براہین و ہندسہ سے ثابت کیا تھا[2]،

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد اول ص ۶۱۶، کالم ۱، [2] فہرست ابن الندیم ص ۳۶۶،

ابرخس کے بعد ذیوفنطس الموجود فی ۲۵۰ء نے اس علم پر ایک مشہور کتاب لکھی اصل کتاب جو ایک مقدمہ اور بارہ رسالوں پر مشتمل تھی، آج ناپید ہے، مگر اس کے ابتدائی چھ رسالوں کا لاطینی ترجمہ موجود ہے، جس کو ۱۵۷۵ء میں اکسیلنڈر (XYLANDER) نے بیسل (BASEL) سے شائع کیا ہے [۱]،

اس کتاب کا عربی ترجمہ سب سے پہلے قسطا بن لوقا بعلبکی نے کیا تھا، جو معتقد باللہ (۲۷۹ھ/۸۹۲ء تا ۲۸۹ھ/۹۰۲ء) کے زمانہ میں تھا [۲]، بعد میں ابوالوفا المتوفی ۳۸۸ھ نے اس کی اصلاح کی، اور اوس کی شرح لکھی تھی [۳]،

ہندوستان میں سب سے پہلے آریہ بھٹ نے چھٹی صدی عیسوی میں آریہ بھٹیم کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کا تیسرا باب علم حساب پر ہے [۴]، بیرونی نے براہم سدھانتا کے ابواب کا تذکرہ کیا ہے جسکا ایک باب جبر و مقابلہ پر ہے [۵]،

اسی طرح اسلام کے بعد ۱۱۵۰ء میں مشہور ہندوستانی ریاضی دان حکیم بھاسکراچاریہ نے خاص جبر و مقابلہ پر ایک مستقل کتاب بیج گنت کے نام سے لکھی جس کا ترجمہ فارسی میں عطاء اللہ رشیدی ابن نادر العصر احمد نے ۱۰۴۴ھ میں شاہجہان کی تخت نشینی کے آٹھویں سال کیا تھا، فارسی ترجمہ کے قلمی نسخے کتب خانہ، برٹش میوزیم لندن اور کتب خانہ میونخ میں ہیں [۶]، اس کا ایک اور نسخہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں بھی ہے جو میری نظر سے گذرا ہے،

اب یہ سوال کہ آیا ہندوؤں نے اس علم کو یونانیوں سے حاصل کیا، یا یونانیوں نے ہندوؤں

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا، جلد اول صفحہ ۶۱۰ کالم ۱، [۲] عیون الانباء فی طبقات الاطباء جزو اول ص ۲۴۴، [۳] فہرست ابن الندیم ص ۲۸۳، [۴] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد اول ص ۶۱۱ کالم ۱، [۵] کتاب الہند ص ۷۷، [۶] فہرست مخطوطۃ فارسی کتبخانہ برٹش میوزیم لندن ص ۴۵۴، و کتبخانہ میونخ ص ۱۳۶،

سے لیا، ابھی تک محل نظر ہے، اس میں شک نہیں کہ ایک زمانہ سے ہندوستان اور یونان کے درمیان تجارتی آمد و رفت کا سلسلہ قائم تھا، اور یہ طبعی بات ہے کہ تجارتی چیزوں کے تبادلہ کے ساتھ خیالات کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا ہے، اس لئے بہت ممکن ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا ہو،

لیکن اگر یونانیوں اور ہندؤوں کی کتابوں کا موازنہ کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندؤں نے اس علم کو یونانیوں سے بھی آگے بڑھا دیا تھا، ہندو ریاضی دانوں نے دو درجی مساوات کے دو جذر کو تسلیم کر لیا تھا، غیر معین مساواتوں کے حل کرنے کا عام قاعدہ بھی انھوں نے دریافت کر لیا تھا، یونانی ان سے ناواقف تھے، [۱]

مسلمانوں کا جبر و مقابلہ، جب مسلمانوں کا زمانہ آیا، تو ان کو وراثت اور تجارت وغیرہ کے مسائل حل کرنے کے لئے اس فن کے حاصل کرنیکی ضرورت پڑی، مسلمانوں میں سب سے پہلی کتاب جو اس فن پر لکھی گئی، [۲] وہ خلیفہ مامون کے درباری منجم محمد بن موسیٰ خوارزمی کی "المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ" ہے، جس کو فریڈرک روزن نے ۱۸۳۱ء میں انگریزی ترجمہ اور مقدمہ کے ساتھ لندن سے چھاپ کر شائع کیا ہے،

اصل کتاب سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا ماخذ کیا ہے، ؟ یوں تو منصور باللہ کے زمانہ ہی سے علم حساب کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہونا شروع ہو گیا تھا، مگر صریحی طور پر یہ نہیں معلوم کہ خوارزمی کے پہلے خاص جبر و مقابلہ کی کسی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا تھا یا نہیں،

اب تک اس علم کی جتنی کتابوں کا پتہ لگا ہے، وہ سب کی سب خوارزمی کے بعد عربی میں ترجمہ ہوئی

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا ص ۶۱۰، کالم ۲۔ [۲] کشف الظنون جلد اول ص ۲۰۹، و مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵۳۰،

ہیں، ذیوفنطس کی کتاب کا ترجمہ قسطا بن لوقا بعلبکی نے کیا، جو خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانہ میں تھا[۱]، براہم سدھانتا کا ترجمہ البیرونی نے کیا جس کا زمانہ پانچویں صدی ہجری کے نصف اول کا ہے[۲]،

بہت ممکن ہے کہ خوارزمی کے پہلے اس فن کی کسی کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ہو، اور یہ بھی معلوم نہ ہو، یا اس نے دربار کے یونانی اور ہندی علما سے استفادہ کیا ہو، پھر یہ کتاب لکھی ہو،

بہرحال خوارزمی کی یہ کتاب اسقدر مقبول ہوئی، کہ برسوں تک مشرق و مغرب کے مدارس میں درس کے طور پر پڑھائی جانے لگی، بعد کے آنے والوں نے اس کو اپنا ماخذ بنایا، اور اس کی شرح و شرح لکھی، بارھویں صدی عیسوی میں رابرٹ آف چسٹر نے لاطینی میں اس کا ترجمہ کیا تھا[۳]، اور ایک زمانہ تک مدارس یورپ کے نصاب میں داخل رہی، اور اہل یورپ نے اسی پر اپنے آیندہ جبر و مقابلہ کی بنیاد کھڑی کی ہے،

مضامین کتاب۔ اس کتاب کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے بہتر معلوم ہوتا ہے، کہ اسکے مضامین پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے،

شروع میں ایک مختصر دیباچہ ہے، جس میں یہ بیان کیا ہے، کہ مامون کے اشارے سے اس نے یہ کتاب لکھی، تاکہ لوگوں کو وراثت، تجارت، بٹوارے اور دیگر معاملات کے حل کرنے میں آسانی ہو،

پھر یہ بتایا ہے کہ جبر و مقابلہ کی بنیاد تین چیزوں پر ہے، جذور، اموال، اعداد، جذور جمع ہے جذر کی، جذر کے لغوی معنی جڑ کے ہیں، جس کو ہم انگریزی میں (ROOT) کہتے ہیں، اور اس کی تعریف یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو اپنی نفسہ مضروب ہو، اور اموال مال کی جمع ہے، اور اس کو انگریزی میں (SQUARE) کہتے ہیں، اب دارالترجمہ عثمانیہ نے مال کی بجائے لفظ مربع استعمال کیا ہے، یعنی جذر کو جذر میں ضرب دینے سے جو حاصل ہو، اس کو مال یا مربع کہتے ہیں،

---

[۱] عیون الانباء فی طبقات الاطباء جزء اول صفحہ ۲۴۴، [۲] کتاب الہند ص ۷۹، [۳] تاریخ ریاضیات از اسمتھ،

انھی تینوں کے معادلات سے چھ شکلیں پیدا ہوتی ہیں، جو حسب ذیل ہیں،

۱- مال جو جذور کے معادل ہو، جیسے ۱ب۲ = ۵ ب

۲- مال جو عدد " " " " ب۲ = ۹

۳- جذور جو عدد " " " " ب = ۳

۴- مال اور جذور جو عدد کے معادل ہوں " ب۲ + ۱۰ب = ۳۹

۵- مال اور عدد جو جذور " " " " ب۲ + ۲۱ = ۱۰ب

۶- جذور اور عدد جو مال " " " " ۳ب + ۴ = ب۲

اگلی تین شکلوں کو مفردات کہا جاتا ہے، اسلئے کہ معادلات کا ہر جملہ مفرد ہے، اور پچھلی تین شکلوں کو مقترنات میں شامل کیا جاتا ہے، کیونکہ معادلات کا ایک جملہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے،

خوارزمی نے مذکورہ بالا چھ شکلوں کے حل کرنے کے کلیہ قواعد بتائے ہیں اور ہندسی اشکال سے اپنے دعوے کی صحت پر دلیلیں دی ہیں، پھر ضرب، جمع، تفریق اور تقسیم کی تشریح شامل کیا تھ کی ہے اور مشق کے طور پر مختلف سوالات دیکر ان کے جوابات کی تشریح کر دی ہے،

اس کے بعد معاملات کا ایک چھوٹا سا باب باندھا ہے، پھر مساحت کا ایک باب ہے جس میں مثلث متساوی الاضلاع، دائرہ، قوس، مکعب، مخروط مثلث، مخروط مربع، مخروط مدوّر، مربعات قائمۃ الزوایا متساویۃ الاضلاع، مربعات مختلفۃ الاضلاع قائمۃ الزوایا، مربعات معینہ مختلفۃ الزوایا مربعات مشبہ بالمعینہ مربعات مختلفۃ الاضلاع والزوایا، مثلثات قائمہ مثلثات حادہ، مثلثات منفرجہ اور عمود مخروط وغیرہ کی مساحت کے وہی قاعدے بتائے ہیں، جو آج عام طور سے مستعمل ہیں،

اس کے بعد کتاب الوصایا ہے، جس میں وصیت کی کثرت سے مختلف مثالیں دی ہیں اور

ان کے حل کرنے کے طریقے شرح و بسط کیسا تھ بیان کئے ہیں،

اخیر میں مسائل وراثت کے تعلق سے دور کے مسائل ہیں، اور انہی پر کتاب ختم ہو جاتی ہو

یہ متوسط تقطیع کے ایک سو بائیس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے، اس پر ایک نظر ڈالنے سے اسکی حسب ذیل خصوصیات نظر آئیں گی،

۱۔ عبارت آسان اور طرز بیان سلیس او سہل ہے، اور مسائل کو اس قدر صاف اور واضح بیان کیا ہے، کہ ان کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں واقع ہوتی، بخلاف برہم گپت کے کہ اس میں مسائل واضح طور پر نہیں بیان کئے گئے ہیں، اسلئے اسکے سمجھنے میں کافی دقت ہوتی ہو،

۲۔ تمام اصطلاحیں عربی کی اختیار کی ہیں، غیر زبان کی ایک اصطلاح بھی اس میں نہیں پائی جاتی،

مضامین کے لحاظ سے گو خوارزمی جمع، ضرب، تفریق تقسیم، مساوات مفرد مساوات درجۂ دوم سے آگے نہیں بڑھا ہے، مگر اس کے بتائے ہوئے کل قواعد، ہندو ریاضی دانوں کے بتائے ہو قواعد سے مختلف ہیں، اس کے علاوہ خوارزمی کے قواعد بہت آسان، جلد سمجھ میں آنے والے اور واضح ہیں، ہندو ریاضی دانوں کے قواعد میں یہ بات نہیں، ان کے قواعد خوارزمی کے قواعد کے مقابلہ میں پیچیدہ اور مشکل ہیں،

اس لئے یہ قیاس میں آتا ہے کہ جہانتک حل مسائل کے قواعد کا تعلق ہے، وہ تمام تر خوارزمی کے دماغ کی پیداوار ہیں،

یونانیوں کے اصول بھی کچھ زیادہ کارآمد نہ تھے، اسلئے عربوں نے خود اپنی طرف سے حل مسائل کے اصول بنائے، فاضل عیسائی عالم جرجی زیدان کا یہ کہنا بجا ہے کہ

"اہل عرب جبر و مقابلہ میں بھی سبقت لے گئے، ان لوگوں نے دو کتابیں یونانی سے اپنے

فن کی عربی میں ترجمہ کی تھیں، لیکن جب اس میں ان لوگوں نے زیادہ غور و فکر کیا تو معلوم ہوا کہ جو اصول ان کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں، وہ اعتبار کے قابل نہیں، اسلئے خود ان لوگوں نے جبر و مقابلہ کے اصول بنائے[1]"

فریڈرک روزن یونان و ہندوستان کے جبر و مقابلہ کے ساتھ خوارزمی کے جبر و مقابلہ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"وہ علم جو محمد بن موسیٰ نے اس ہماری پیش نظر کتاب میں بیان کیا ہے، وہ مساوات درجہ دوم اور ان چند مسائل سے جو (AFFECTED SQUARE) سے تعلق رکھتے ہیں، آگے نہیں بڑھا ہے، ان تمام مسائل کے حل کرنے میں وہ انہی اصول کی پیروی کرتا ہے جو ذیوفنطس نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں[2] یا ہند دریاضی دانوں نے (گو وہ عیسائی ہی کیوں نہ ہوں) بیان کئے ہیں[3]"

یہ ممکن نہیں ہے کہ اس نے ذیوفنطس کی کتاب سے یہ اصول لئے، کیونکہ چوتھی صدی ہجری کے نصف تک عربوں کو اس کتاب کا کچھ علم نہیں تھا، یہانتک کہ ابوالوفا بوزجانی نے اس کو عربی میں نقل کیا[4]، یہ بہت ممکن ہے کہ عربوں نے جبر و مقابلہ کا ابتدائی فن ہندوؤں سے لیا ہو جنھوں نے عربوں کو کسور اعشاریہ اور دیگر حساب و نجوم کے ضروری معلومات و نکات بتائے تھے،

---

[1] علوم عرب مصنفہ جرجی زیدان مترجمہ حافظ اسلم صفحہ ۲۲، [2] ذیوفنطس مسئلہ ۳۲ و ۳۳ [3] لیلاوتی ص ۲۹، بیج گنت مترجمہ مسٹر کولبروک ص ۳۴۴،

[4] Casiri Bibl. Arab. Esc. vol. 1-433 Colebrooke's Dissertation P. lxxii

فن کے لحاظ سے گو خوارزمی ہندو ریاضی دانوں کی منت کا زیر بار رہی کیونکہ نہ ہوتا ہم اصول و مسائل کی تشریح و توضیح میں وہ بالکل آزاد نظر آتا ہے، کم از کم اوس نے اپنے اصول کی تشریح میں جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ ایک حد تک ہندو ریاضی دانوں کے طریقوں سے بالکل مختلف ہے، بھاسکرا، اور برہم گپتا صرف بنیادی اصول بتا دیتے ہیں، اور ان کی صحت پر کوئی دلیل نہیں دیتے، اور ان اصول کا تعلق طلبہ کے فہم و ادراک کی بجائے ان کے حافظہ سے ہوتا ہے،

خوارزمی اپنے اصول کو ایک سادہ نثر میں بیان کرتا ہے، پھر ہندسی اشکال سے ان اصول کی صحت کے دلائل دیتا ہے، ہندو ریاضی دان نسبتہً بہت کم مثالیں دیتے ہیں اور بھاری بھر کم الفاظ سے صرف ضروری اصول بیان کر دیتے ہیں، لیکن عرب ان کے برخلاف مثالیں کثرت سے دیتے ہیں، اور طرز بیان ایسا سہل اور سلیس اختیار کرتے ہیں، کہ اس سے مسائل آسانی سے نمایاں ہو جاتے ہیں،

ہندو ریاضی دان مسائل کے حل کرنے میں صرف نتیجہ اور بیچ کے ضروری طریقوں (Steps) کو بیان کرتے ہیں، لیکن ایک عرب ہر مسئلہ کی تشریح کا طریقہ پورے طور پر بیان کرتا ہے، اس کی نظر ہمیشہ معادلات کے دونوں طرف رہتی ہے، گویا وہ ترازو کی ڈنڈی کے دونوں طرف کو دیکھ رہا ہے، وہ بتاتا ہے کہ معادلات کے ایک طرف کچھ رد و بدل کرنے سے کس طرح دوسری طرف بھی رد و بدل واقع ہوتا ہے[۱]

خوارزمی کے بعد سند بن علی یہودی، ابو کامل شجاع بن اسلم اور ابو یوسف المصیصی وغیرہ نے اس فن پر مستقل کتابیں لکھیں[۲]، جن میں ابو کامل کی کتاب ترتیب اور طرز بیان کے لحاظ سے بہت بہتر تھی،

۱؎ مقدمہ انگریزی کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ صفحہ ۔ ۲؎ فہرست ابن الندیم ص ۲۸۲ و ۳۹۲،

بعض نے مثلاً عبداللہ بن حسن صیدنانی، سنان بن فتح، اور ابوالوفا نے خوارزمی کی کتاب کی، اور اصطخری المتوفی ۳۰۰ھ اور علی بن احمد العمرانی المتوفی ۳۴۴ھ نے ابو کامل کی کتاب کی شرح لکھی[۱] مگر ابوالوفا کے علاوہ کسی نے خوارزمی کی کتاب کے مضامین سے آگے قدم نہیں بڑھایا، ابوالوفا نے مساوات درجہ چہارم کو ہندسی اشکال کے ذریعہ حل کیا[۲]

ابھی تک کسی نے کعبی مساوات کے حل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، البتہ ماہانی المتوفی ۲۶۰ھ نے کعبی مساوات کی تین مخصوص شکلوں[۳] کو حل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن غور و فکر کے بعد بھی وہ جب حل نہ کر سکا، تو اس نے یہ یقین کر لیا، کہ ان کا حل ناممکن ہے،

اس کے بعد ابو جعفر الخازن پیدا ہوا، اور اس نے ان تین مخصوص شکلوں کو قطوع مخروطیہ کے ذریعہ حل کیا[۴]

ابوالجود محمد بن لیث جو ابوریحان بیرونی المتوفی ۴۴۰ھ کا معاصر تھا، اور ابوعلی بن ہیثم، (المتوفی بین ۴۲۶ھ و ۴۳۰ھ) نے کعبی مساوات کی دیگر چند شکلوں کو حل کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے کسی میں کامیابی حاصل کی اور کسی میں غلطی کی جس کی بعد میں خیام نے اصلاح کی[۵]

پانچویں صدی ہجری میں خیام پیدا ہوا، اور وہ ابتدا ہی سے اس فن پر غور و فکر کرنے لگا، اور کافی غور و خوض کے بعد مساوات مفرد، مساوات درجہ دوم، اور کعبی مساوات کی پچیس شکلیں نکالیں، اور ان تمام کو ہندسہ کے ذریعہ حل کیا، اور رسالۃ فی براہین الجبر والمقابلہ کے نام سے ایک

---

[۱] فہرست ابن الندیم ص ۲۷۰ و ۳۹۲ و ۳۹۴۔ [۲] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد اول ص ۶۱۱ کالم ۱، [۳] وہ تین مخصوص شکلیں یہ ہیں، (۱) کعب اور مال جو عدد کے معادل ہوں، (۲) کعب اور عدد جو مال کے معادل ہوں، (۳) مال اور عدد جو کعب کے معادل ہوں [۴] براہین الجبر والمقابلہ لخیام ص ۲، [۵] ایضاً ۴۴ و ۴۳،

چھوٹا سا رسالہ لکھا جکو ایف ویپکے (F. WEOPCKE) نے فرنچ ترجمہ اور مقدمہ کے ساتھ باریک ٹائپ کے باون صفحوں میں پیرس سے ۱۸۵۱ء میں شائع کیا ہی،

خیام کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہی، کہ خوارزمی وغیرہ کی کتابیں اس کو نہیں ملیں، متاخرین میں ماہانی، ابوجعفر الخازن، ابوالجود محمد بن لیث، ابوعلی بن ہیثم، اور ابوسہل قوہی وغیرہ کے نام گنتا ہے،

اس رسالہ کے صفحہ صفحہ سے ہویدا ہے، کہ اس نے کافی جانفشانی اور محنت و کوشش سے یہ رسالہ لکھا ہے، پچیس شکلوں میں سے چھ شکلیں تو اوپر گذر چکی ہیں، باقی انیس شکلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں،

۱- کعب جو اموال کے معادل ہو، جیسے $ب^3 = ۴ب^2$،

۲- کعب جو جذور " " " " $ب^3 = ۱۶ب$،

۳- کعب جو عدد " " " " $ب^3 = ۶۴$

۴- کعب اور مال جو جذور کے معادل ہوں " $ب^3 + ب^2 = ۲۰ب$

۵- کعب اور جذور جو اموال " " " " $ب^3 + ۴ب = ۵ب^2$،

۶- جذور اور اموال جو کعب " " " " $ب^2 + ۱۲ب = ب^3$،

۷- کعب اور جذور جو عدد " " " " $ب^3 + ۵ب = ۸۴$،

۸- کعب اور عدد جو جذور " " " " $ب^3 + ۱۶ = ۲۰ب$

۹- کعب اور مال جو عدد " " " " $ب^3 + ۲ب^2 = ۹۶$

۱۰- کعب اور عدد جو اموال " " " " $ب^3 + ۳۲ = ۶ب^2$

۱۱- عدد اور اموال جو کعب " " " " $۳۲ + ۲ب^2 = ب^3$،

۱۲- عدد اور جذور جو کعب کے معادل ہوں جیسے، $۲۴ + ۱۰ب = ب^{۳}$

۱۳- کعب اور مال اور جذور جو عدد کے معادل ہوں جیسے، $ب^{۳} + ب^{۲} + ۲ب = ۱۰۸$،

۱۴- کعب اور مال اور عدد جو جذور " " " " ، $ب^{۳} + ۳ب^{۲} + ۸ = ۳۰ب$،

۱۵- کعب اور جذور اور عدد جو مال " " " " ، $ب^{۳} + ۱۲ب + ۱۶ = ۸ب^{۲}$،

۱۶- کعب جو جذور اور مال اور عدد " " " " ، $ب^{۳} = ۶ب + ۲ب^{۲} + ۸$

۱۷- کعب اور مال جو جذور اور عدد " " " " ، $ب^{۳} + ۲ب^{۲} = ۱۹ب + ۳۲$

۱۸- کعب اور جذور جو مال اور عدد " " " " ، $ب^{۳} + ۱۰ب = ۶ب^{۲} + ۸$

۱۹- کعب اور عدد جو جذور اور مال " " " " ، $ب^{۳} + ۲۰ = ۵ب + ۴ب^{۲}$

ان انیس شکلوں میں سے پہلی تین شکلیں خیام کے پہلے ہی جبر و مقابلہ کے ذریعہ حل کر دی گئی تھیں، خیام کا کارنامہ یہ ہے، کہ اس نے ان پر ہندسی اشکال سے دلیلیں قائم کیں،

تیسری شکل کے متعلق خیام نے لکھا ہے، کہ کعب کا جذر صرف استقرار اور تتبع سے معلوم ہو سکتا ہے، ورنہ اس کے معلوم کرنے کا کوئی کلی قاعدہ نہیں ہے[1]، اسی طرح مربع کے جذر کے متعلق بھی اس نے یہی خیال ظاہر کیا ہے، لیکن ان دونوں کے جذر کے معلوم کرنے کا ایک کلیہ قاعدہ موجود ہے، اور یہ خیام سے پہلے کے لوگوں کو معلوم تھا، مسلمانوں میں ابوالوفاء المتوفی ۳۸۸ھ نے مکعب کے جذر کو معلوم کرنے کا قاعدہ دریافت کر لیا تھا[2]، مشہور ہندی ریاضی دان حکیم بھاسکر انے بھی لیلاوتی میں ان کے قاعدے ذکر کئے ہیں[3]،

نویں، دسویں اور گیارہویں شکل کو ابو جعفر الخازن نے قطوع مخروطیہ کے ذریعہ حل کر دیا تھا، خیام نے ان کے علاوہ باقی اشکال کو جبر و مقابلہ کے ذریعہ نہیں بلکہ ہندسے سے حل کر دیا،

---

[1] براہین الجبر والمقابلہ ص۷، [2] تاریخ الحکماء قفطی ص۱۹۱، [3] لیلاوتی، ص۱۳ و ۱۹،

اس کے بعد مشرق میں کوئی صاحب دماغ ایسا نہیں پیدا ہوا، جو جبر و مقابلہ کے ذریعہ کعبی مساوات کو حل کرتا، شپیو فرو (Scipio del Ferro) المتوفی ۱۵۲۶ء نے جبر و مقابلہ کے ذریعہ کعبی مساوات کے حل کرنے کی کوشش کی، بیان کیا جاتا ہے، کہ اس نے اپنے شاگرد انٹونیو میری فلاریڈا اس کو اسکے حل کرنے کا قاعدہ بتا دیا تھا، آخر سنہ ۱۵۳۰ء میں ٹکولس نے اس کے حل کرنے کا قاعدہ دریافت کیا، اور اطالیہ بھر میں اسکو شائع کرایا[۱]،

اندلس۔ یہ تو مشرق کی حالت تھی، اب بغداد سے کوسوں دور مغرب میں قرطبہ پر نظر ڈالئے، تو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی خلفاے بنی امیہ قرطبہ کو علوم وفنون کا گہوارہ بنا رہے تھے،

خلیفہ الحکم ثانی جو ۳۵۰ھ میں تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا، علم کا بہت بڑا قدرداں تھا، اس نے اپنے باپ کے زمانہ ہی سے مشرقی ممالک کی بیش بہا اور نادر کتابیں منگوانی شروع کیں، اور اپنی وفات تک اتنا بڑا ذخیرۂ کتب فراہم کر لیا، کہ خلفاے عباسیہ کے اس علمی سرمایہ کی ہمسری کرنے لگا جس کو انھوں نے مدت مدید میں جمع کیا تھا،

الحکم کے اس انتہائی شغف علمی نے لوگوں میں قدما کی تصانیف پڑھنے پڑھانے کی پرجوش تحریک پیدا کر دی، اس کے علمی شغف کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ جب اوس نے ۳۶۶ھ میں انتقال کیا، تو اس کے کتب خانہ میں چار لاکھ جلدیں کتابوں کی موجود تھیں،

الحکم نے علماء کی قدردانی اور ہمت افزائی میں اتنی ہی یا اس سے زیادہ بلند حوصلگی دکھائی جتنی مامون نے بغداد میں دکھائی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ چند دنوں میں اندلس میں بڑے بڑے علماء پیدا ہو گئے جنھوں نے ہر فن میں بیش بہا اور قیمتی تصنیفات یادگار چھوڑیں،

اندلس کا سب سے بڑا ماہر ریاضی مسلمہ بن احمد ابو القاسم المعروف بالمجریطی ہے، جسکو قفطی نے

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد اول صفحہ ۶۱۱ کالم ۲،

امام الریاضیین کے لقب سے یاد کیا ہے، یہ علم الافلاک اور حرکات نجوم کا بہت بڑا ماہر تھا، اس نے علم الحساب میں ایک کتاب بھی لکھی تھی، اور محمد بن موسیٰ خوارزمی کی زیچ کے ساتھ اسکو بہت شغف تھا، اسی نے اسکی فارسی تاریخ کو عربی تاریخ میں بدل دیا تھا، مجریطی نے ۳۹۸ھ میں وفات پائی[1]

اس کے بعد جابر بن افلح پیدا ہوا جس نے خاصکر فن جبر و مقابلہ میں عظیم الشان شہرت پائی، یہانتک کہ یورپ میں ایک زمانہ تک جبر و مقابلہ کا موجد اسی کو سمجھا جاتا تھا، اور فن کا نام اس کے نام سے منسوب خیال کیا جاتا تھا[2]،

پھر آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں ابوعبداللہ محمد بن عمر بن محمد المعروف بابن بدر پیدا ہوا، اور اس نے ۷۴۳ھ میں اس فن پر ایک مختصر رسالہ لکھا جسکو یوسف شانچش پیریز (Jose, Sanchez Perez) نے ۱۹۱۶ء میں اپنی ترجمہ اور مقدمہ کیساتھ میڈرڈ سے شائع کیا ہے،

اس کتاب کا اصلی نام "کتاب فیہ اختصار الجبر والمقابلہ" ہے، اس میں ابن بدر نے وہی مطالب بیان کئے ہیں، جو محمد بن موسیٰ خوارزمی نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ تمام مسائل پر جبر و مقابلہ کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے، اور اصول کی صحت پر ہندسہ سے دلیلیں نہیں دی ہیں، مساحت کا باب بھی حذف کر دیا ہے،

ابن خلدون المتوفی ۸۰۸ھ کے ایک جملہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ اسکے زمانہ تک اندلس میں جبر و مقابلہ کی صرف چھ شکلیں رائج تھیں، کیونکہ اس نے لکھا ہے، کہ

"ہم کو معلوم ہوا ہے کہ مشرق کے بعض ائمۂ ریاضی نے معاملات کو چھ شکلوں سے آگے بڑھا اور بیس تک پہنچا دیا ہے، اور تمام کے حل کرنے کے قواعد دریافت کرکے ہندسہ سے ان پر دلیلیں دی ہیں[3]"

[1] اخبار الحکماء للقفطی صفحہ ۲۱۴، [2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد اول صفحہ ۶۱۶ کالم ۱، [3] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۴۵۳،

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خیام کا رسالہ اس کی نظر سے نہیں گذرا تھا، متاخرین کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام کے بعد غالباً کوئی عالی دماغ ایسا نہیں پیدا ہوا، جو اس فن کو اور ترقی دیتا، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ فلسفہ، کلام، منطق، ہیئت اور اقلیدس نے تمام مسلمانوں کے دماغوں کو اپنی طرف مبذول کر لیا تھا، یہ فنون مسلمانوں کو اتنے دلچسپ نظر آئے کہ ہر ایک شخص انہی فنون میں تصنیف و تالیف کرنے لگا، ورنہ یہ علم بھی ان کے ہاتھوں دیگر علوم کی طرح اوجِ کمال پر پہنچ جاتا،

نسخہ گوئے چوگان

موجودۂ

کتبخانہ حبیب گنج،

از جناب عبد الغفور صاحب بی اے، آنرز لندن، ایم اے، ایم ایس سی علیگ

فنِ خوشنویسی مسلمانوں میں تعلیم کا ضروری جزو خیال کیا جاتا تھا، جس طرح مصری رسم الخط ہیروغلافی اور چینی رسم الخط فنِ مصوری سے ملتے جلتے تھے، اور بسا اوقات ان کو تصویروں کے حاشیہ یا جزئیات کی زیب و زینت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، اسی طریق پر نسخ اور خط نستعلیق بھی ایرانی مصوروں کے لئے ایک لازمی جزو ثابت ہوتے تھے، مکتبوں میں بھی بچوں کو شروع سے ہی خوشنویسی کی مشق کرائی جاتی تھی، اور اوائل عمر سے ہی انکو خطاطی کے شہ پاروں سے روشناس کرایا جاتا تھا، تاکہ ان میں ادبی اور فنونِ لطیفہ کا صحیح مذاق پیدا ہو، گلستان میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے، کہ اس نے اپنے بیٹے کو مکتب میں بھیجا، تو ایک لوحِ سیمیں جسپر ایک مصرعہ فارسی خوشخط لکھا ہوا تھا، اس کے ہمراہ بھیجی،

پادشاہے پسر بمکتب داد، لوحِ سیمیش در کنار نہاد،

بر سرِ لوحِ او نوشتہ بزر جورِ استاد بہ زمہرِ پدر،

اسلامی حکمراں نہ صرف فنِ خطاطی کے قدرداں تھے، بلکہ خود بھی اس فنِ شریفہ کی مشق کرتے تھے، غلام خاندان کے سلطان ناصر الدین اور اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ تو بدست خود قرآن کریم کی کتابت کرتے تھے، بابر کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ مولینا حبیب الرحمن خانصاحب نے سنایا،

موصوف کو فنِ خوشنویسی سے بے حد شغف اور تاریخ خطاطان سے بہت دلچسپی ہے، ان کے ہاں نوادر
فنِ خطاطی کے متعدد شہ پارے موجود ہیں، بلکہ وہ خود اس کے بہترین نقادہیں،

بابر تزک بابری میں ۹۳۵ھ کے حالات میں لکھتا ہے کہ شاہی لشکر سکندر پور بہار میں پڑا تھا کہ نماز تراویح کے بعد گھنگھور گھٹا اٹھی، اور طوفان باد و باراں سے بہت سی قناتیں اکھڑ کر زمین پر گرگئیں، لکھتا ہے کہ میں اس وقت وصلیوں پر مشق کر رہا تھا، اور کچھ کتابیں ارد گرد منتشر پڑی ہوئی تھیں، اتنے میں خیمہ گرگیا، اگرچہ بفضلِ ایزدی میں تو سلامت رہا، مگر وصلیان اور کتابیں بھیگ گئیں، کتب بینی کا عشق ملاحظہ ہو، کہ اسی وقت ان سب آب زدہ کتابوں کو اونی کپڑے میں رکھا اور اس پر قالین ڈال دیا اور ساری رات جاگ کر کاٹی، شمعیں اور آگ جلا کر کتابوں اور وصلیوں کو سکھلایا، تب اطمینان ہوا،

مغل بادشاہ مشہور خطاطین کی کتابوں اور کتبوں کو بہت شوق سے خریدتے تھے، اور بسا اوقات ان کو دستِ خاص سے شاہی کتب خانے میں داخل کرتے تھے، پروفیسر شیرانی صاحب کے پاس جو نسخہ گلستاں کا یاقوت کے نسخے سے منقول ہے، اس پر جہانگیر کی اپنی تحریر ہے، شاہجہان تو اس فن کا خاص قدردان تھا، میر عماد کے قتل کے بعد جب اس کا عزیز شاگرد عبد الرشید دیلمی ہندوستان پہنچا تو اس نے بڑی عزت افزائی سے دربار میں رکھا، میر عماد الحسینی کے کتبوں کی تو شاہجہان نے اتنی قدر کی کہ شاید ہی کسی اور نے کی ہو، اور جو شخص بھی اس نادر العصر استاد کی کوئی چیز پیشکش میں دیتا تھا تو کم از کم ایک صدی منصب پاتا تھا،

بادشاہ کے علاوہ امرا، و وزرا خود قدرداں بھی تھے اور بعض اچھے خوشنویس بھی کتب خانۂ حبیب گنج کے نوادر میں سے ایک عربی مناجات بھی ہے، جو ابو الحسن آصف خاں برادر نور جہاں اور شاہجہان کے خسر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، خط نستعلیق میں ہے، اور خاصہ اچھا ہے، مولینا غلام احمد مصنف تذکرۂ خوشنویساں نے میر فتح اللہ شیرازی، عبد الرحیم خانخاناں، ٹوڈرمل، زین خاں کوکہ

اور شاہزادوں میں سے خسرو، پرویز، خرم اور داراشکوہ کو طبقۂ خوشنویسان میں شمار کیا ہے،

ملا میر علی سرآمد خطاطان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مثنوی گوے وچوگان، فن خطاطی اور مصوری کے لحاظ سے کتبخانہ حبیب گنج کی بہترین کتاب ہے گوے وچوگان ملا عارفی ہراتی کی سب سے مشہور تصنیف ہے، مصنف نے اس کتاب کو سلطان جہانیان محمد بن مرزا بایسنقر کے نام معنون کیا ہے، جو پہلے تو حاکم عراق رہا، پھر فارس پر قابض ہوگیا، اگرچہ کتاب کا مضمون تصوف ہے، مگر تمام تشبیہات اور استعارے گوے وچوگان کے کھیل سے لئے گئے ہیں، جسکو آج کل پولو کہتے ہیں، جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہزادہ خود گوے وچوگان کا بہت شوقین تھا، عارفی نے اشعار میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے، خود سلطان کے والد مرزا بایسنقر کی نسبت بابر تزک میں لکھتا ہے کہ وہ نستعلیق خوب لکھتا تھا، اور فن مصوری میں بھی طاق تھا، شاعر مثنوی کے ضمن میں لکھتا ہے، کہ میں نے اسکو دو ہفتے میں لکھا تھا، اور گوی خوش اس کا تاریخی نام ہوا، جس سے ۸۴۲ھ تاریخ نکلتی ہے، اسی سلسلے میں لکھتا ہے کہ اسوقت میری عمر پچاس سال کی تھی، اور بادشاہ نے ایک گھوڑا اور ایک ہزار دینار انعام میں دیئے، ملا عارفی سلمان ثانی کے نام سے مشہور تھے، جامی علیہ الرحمہ نے ان کا ذکر اپنی کتاب بہارستان میں کیا ہے، شہر ہرات میں ۸۵۳ھ میں وفات پائی،

گوے وچوگان ۱۹۳۱ء میں لندن سے گرین شیلڈ نے شائع کی ہے،

حبیب گنج کے نسخے کے کاتب ملا میر علی ہیں، یہ سادات ہرات میں سے تھے، اور خط نستعلیق کے مشہور مشاق مولانا سلطان علی مشہدی کے شاگرد تھے، فن خطاطی کیساتھ عربی فارسی وشاعری میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے، کچھ عرصہ بخارا میں بھی قیام کیا، بہت مدت تک عبد اللہ خان اوزبک ہمعصر اکبر اعظم کے دربار میں رہے، کہا جاتا ہے کہ مومن خان پسر عبد اللہ خان کے استاد تھے، مولانا غلام محمد ہفت قلمی اپنے تذکرۂ خوشنویساں میں لکھتے ہیں، کہ جو کتاب و مرقع لکھتے تھے، اسکی تاریخ کتابت خود

کہتے تھے، اور اپنے ہاتھ سے کہتے تھے، ایک مرقع (جو جہانگیر بادشاہ نے نہایت شوق سے مرتب کیا تھا) کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ معلوم ہوتا تھا، کہ ایک باغ ہے عالم بہار میں، اس پر میر علی کے ہاتھ کی سند بھی درج تھی، ملا میر علی کی تصنیفات میں قواعد خطوط سبعہ منظوم، رسم الخط او رخط و سواد ہیں، وفات غالباً ۹۵۱ھ میں ہوئی[1]، شاہجہان میر علی الکاتب کا بڑا مداح تھا، او رعینہ جیسے جہانگیر نے تزک میں تحریر لکھا ہے، کہ میں ایک کاتب کا قلم دوسرے سے تمیز کر لیتا ہون، شاہجہان کی قدر شناس نگاہ بھی فی الفور ملا میر علی کے خط کو جانچ لیتی تھی، شش رسالہ سعدی کے اس نسخہ پر جو بانکی پور میں ہے، شاہجہان نے بدست خاص لکھا ہے کہ یہ نسخہ درحقیقت ملا میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، مگر کسی نے کاٹ کر اس کے بیٹے کا نام لکھدیا ہے، کتب خانہ حبیب گنج میں اس ماہر فن خطاط کی تین یادگاریں ہیں، ایک تو مثنوی گوئے وچوگان دوسرے ایک کتبہ جسکی پشت پر جہانگیر کے دربار کے مصور منصور نادر الزمانی کے ہاتھ کا گل سوسن بنا ہوا ہے، تیسرے ایک اور کتبہ ہے،

گوئے چوگان کیا بلحاظ کتابت اور کیا بلحاظ مصوری اور گلکاری ایک نادر الوجود اور عظیم الشان نسخہ ہے، یہ کتاب دو شاہی خزانوں میں رہ چکی ہے، عالمگیر کے سنہ جلوس کے اکتیسویں سال بابت مال غنیمت فتح گولکنڈہ شاہان مغلیہ کے خزانے میں منتقل ہوئی، لوح کتاب سے پہلے کے ورق میں مفصلۂ ذیل عبارت لکھی ہے، "کتاب گوئے وچوگان در ایام کمال استاد الکتاب ملا میر علی بابت فتح گولکنڈہ در سال سی ویکم جلوس اقبال تحویل سہیل نمودہ شد، عدد اوراق سی وسہ وقیمت دو ہزار روپیہ چہار صد و نود و دو واشعار"

میر علی الکاتب کے قلم سے خاتمہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے، "کتبہ علی الحسینی الکاتب سنی اوائل شہر ربیع الاول سنہ ست وعشرین وتسعمائہ،

---

[1] تذکرۂ ذکر احباب،

چونکہ تذکرہ و تذکرۂ احباب کی روسے میر علی نے سنہ ۹۵۱ھ میں بعمر ہفتاد سال وفات پائی اسلئے اس نسخہ کی کتابت کے وقت ان کی عمر ۵۹ سال ہوگی، اسی لئے اس کو ان کے کمالِ فن کا ایک نمونہ کہا گیا ہے، کتاب پر ایک مہر قابل خان خانہ زاد عالمگیر کی، ایک عہد شاہ عالم کی اور ایک نواب ضیاء الدین خاں کی ہے، ان کے علاوہ متعدد مواہیر مختلف زمانوں کی ہیں، اور عرض دیدہ ہیں، جس سے یہ مراد ہے کہ یہ کتاب شاہی جائزہ میں اتنی مرتبہ لائی گئی، لوح کتاب سے پہلے کے اوراق کے مطالعہ سے ایک دلچسپ بات یہ مترشح ہوتی ہے، کہ فنِ خطاطی کے شہ پاروں کی قدر و قیمت عہدِ عالمگیری میں کس طرح گھٹتی بڑھتی رہی ہے یہی بے نظیر نسخہ جو فتح گولکنڈہ کے وقت دو ہزار روپیہ کی قیمت کا تھا سنہ ۱۱۹۶ھ میں ۲۱۰ روپیہ کا رہ گیا، سنہ ۱۲۶۴ھ میں قیمت بڑھکر ۲۵۰ روپیہ ہوگئی، اور آجکل تو اسکی قیمت یقیناً بہت زیادہ ہوگی، زمانہ کے الٹ پھیر سے یہ نسخہ ایک مشہور و معروف ریاست کے کتب خانہ میں جا پہنچا، جہاں کے حکمراں نے اس کو ایک خیرخواہ ریاست کو عطا کر دیا، اور اس سے مولوی صاحب نے خرید کر کتب خانہ حبیب گنج میں داخل کیا،

یہ نسخہ نہ صرف فنِ خطاطی کا بہترین نمونہ ہے، بلکہ مصوری کے لحاظ سے بھی کچھ کم اہم نہیں ہے، کل کتاب اک گلستاں ہے، جس پر موسمِ بہار آیا ہوا ہے، قلم جلی، کاغذ زر افشاں عنوان لاجوردی طلائی مینا کار ہر ورق کا حاشیہ رنگ اور انداز میں دوسرے حاشیہ سے مختلف اور تزئین و آرائش میں بڑھ چڑھکر ہے، عبارت عنوان باب کہیں سپید یعنی موتی کے سفیدے سے لکھی ہوئی اور کہیں شنجرفی، ہر باب کے خاتمہ پر ترنج مینا کار طلائی، درمیان کے صفحوں پر بھی اکثر جگہ بہت نفیس اور مختلف الوان مینا کاری کی گئی ہے،

سب سے دلچسپ چیز دو تصویریں ہیں، ایک تو مکہ معظمہ کی، دوسری مدینہ منورہ کی، ان کے علاوہ دو رنگین باغوں کے نقشے ہیں، ان میں سے تین تو اپنی قسم کے نادر الوجود نمونے ہیں، حرمین شریفین کے

اتنے عتیق اور خوبصورت نقشے بہت کم دیکھنے میں آئے ہونگے، نقشے کے ہر جزو کو بے حد احتیاط اور نفاست سے بنایا گیا ہو، باغوں میں سے ایک نقشہ اپنی قسم کا نرالا ہی ہے، اس میں چار درخت پھلوں سے لدے ہوئے دکھائے گئے ہیں، منصور نادرالزمانی کے گل سوسن کی طرح یہ درختان بابرگ وبار بھی ایرانی مصوری کا ایک خاص پہلو ظاہر کرتے ہیں، جس پر آج تک بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے، چوتھی تصویر الحاقی اور بعد کی لگائی ہوئی معلوم ہوتی ہے،

سنہ کتابت کے لحاظ سے بھی گوے وچوگان کا یہ نسخہ اہمیت رکھتا ہے، یہ نسخہ ۹۲۶ھ یعنی مصنف کی وفات کے ۲، سال بعد لکھا گیا ہے، عجائب خانہ لندن کے نسخے پر کوئی سنہ کتابت درج نہیں ہے، اور غالباً وہ اس کے بعد کا ہوگا، اسلئے قدامت کے لحاظ سے بھی یہ نسخہ عتیقیات میں شامل کرنے کے قابل ہے،

ملا میر علی کا ایک اور کتبہ بھی کتب خانے کی زینت ہے، جس پر چار ترکی مصرعے تحریر کئے گئے ہیں، وصلی زریں طلا کار مینا کار گل کاری، تین حاشیے، اور ان میں سے ہر ایک مینا کار گلکار اور طلائی حاشیہ سوئم چند اشعار فارسی خفی قلم میں اسکی پشت پر ایک تصویر گل سوسن کی ہے، جسپر عمل بندۂ درگاہ نادر العصری منصور نقاش جہانگیر شاہی لکھا ہوا ہے، منصور دربار جہانگیر کا مشہور و معروف مصور تھا، اور آجکل بالعموم اسکے قلم سے جانوروں اور پرندونکی تصویریں ملتی ہیں، مگر یہ فخر اس کتب خانے کو ہی حاصل ہوا، کہ منصور کی قلم کے پھول پہلی دفعہ دنیائے نقاشی کے سامنے پیش کئے گئے، مسٹر مہتہ آئی سی ایس جنکو ہندوستانی مصوری سے شغف ہے، اور وہ اس پر کئی بیسوطاکتابیں بھی لکھ چکے ہیں، مصوری کے اعلیٰ نمونوں کی تلاش میں جیب گنج گئے تھے، اور منصور کے اس شہ پارہ پر انھوں نے فن مصوری کے رسالے روپم کلکتہ میں ایک مضمون بھی لکھا تھا، اس تصویر میں گل سوسن کو تین حالتوں میں دکھایا گیا ہے، ایک کلی، دوسرا نیم باز، تیسرا پورا کھلا ہوا پھول مع پتیوں کے، یہ تصویر کچھ جہانگیر کے دربار ہی کے لئے

باتھی، جس شوق اور دلچسپی سے جہانگیر اپنی تزک میں پھولوں کا ذکر کرتا ہے، اس سے یہی انداز
یا جا سکتا ہے، کہ اسکے منظور نظر مصور نے گلہائے رنگین کی مصوری سے دربار کو ضرور ایک تختہ باغ
دیا ہوگا، مگر زمانہ کی غارتگریوں کی وجہ سے صرف یہی تصویر اس صناع کے کمال کی یادگار رہگئی
ہے، مصور نے جاندار اشیا، کا تخیل اس تصویر میں بھی نہیں چھوڑا، دو تیتریاں نہایت لطافت سے بنائی
ہیں، ایک نیلی اور دوسری ملگجی، پھولوں کی مصوری کا رواج اسوقت ایران میں بھی تھا، بلو
کتاب مسلمان پینٹنگ میں ایک گل نرگس شفیع عباسی کی قلم سے ہے، تیتریاں اس میں بھی موجود ہیں،

مضمون بالا میں گوئے و چوگان اور کتبے کی جزئیات اور تفصیلات اگرچہ ذاتی مشاہدہ کی بنا
ہیں، مگر اس میں بہت سا حصہ مولوی صاحب کی خود تیار کردہ فہرست کتب خانہ سے لیا گیا ہے،
رست کے عنوانات ان کے خود ایجاد کردہ ہیں، اور اب تک میرے محدود تجربے میں تو کسی مشرقی
تب خانے کی ایسی فہرست نہیں گذری، جسکی روح اتنی مشرقی ہو، اور جس کے عنوانات منتخب کرنے
ں اسلامی علوم و فنون لطیفہ کا اسقدر لحاظ رکھا گیا ہو، مولوی صاحب موصوف نے جو کچھ بھی کتاب کے
رطاس، خطاطی، جلد، سنہ، کتابت کی بابت لکھدیا ہے، وہ اس پر آخری اور حتمی رائے ہے، مین نے
پنے مختصر قیام حبیب گنج مین ان کی ذات بابرکات سے بہت کچھ سیکھا ہے،

مختصر تاریخ ھند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، انکا لب ولہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں
رتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض وعناد پیدا ہو جاتا ہے، مولینا ابو ظفر صاحب
ردی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے، کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات
سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ بلا تفریق مذہب
لت معلوم ہو جائیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت ۱۲ عہ ر

کتاب تقویم الابدان

از

جناب مولوی عبد اللہ صاحب چغتائی

ستمبر ۱۹۳۶ء کے معارف میں جناب سید سلیمان صاحب ندوی نے ایک مضمون بعنوان "سفر گجرات کی چند یادگاریں" حوالۂ قلم کیا ہے، جس سے بہت سے امور پر مفید معلومات کا اضافہ ہوا ہے، جہاں انکلیشور کا ذکر کیا ہے، وہاں لکھتے ہیں:

"عربی کتابوں میں سے سب سے نادر چیز یہاں قدیم طب کی ایک کتاب تقویم الادویہ ہے، اس کا سال کتابت ۵۰۸ھ ہے، نسخہ بخط عربی شیرۂ خرما سے لکھا ہوا ہے، اور اب تک اچھی حالت میں ہے"

منجملہ اور کتابوں کے یہ کتاب بھی مجھے دسمبر ۱۹۳۳ء میں اپنے مخلص دوست سید سراج الدین ناگا میاں کے ہمراہ ان کے عزیز جناب سید حیدر علی انعامدار صاحب کے ہاں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس وقت اس سے کچھ یادداشتیں میں نقل کر لی تھیں، میرے خیال میں قبلہ سید سلیمان صاحب نے اسے بادی النظر میں کوئی اہمیت نہیں دی[1]، یہ کتاب مصنف اور نفس کتاب کی حیثیت سے بہت اہم معلوم ہوتی ہے، عبارت ذیل اس کے سرورق پر عمدہ خط نسخ میں درج ہے:-

"کتاب تقویم الابدان واسباب کل مرض وعلامته ورتبه یحیی بن عیسی جزلة رحمة الله تعالی لجمیع المؤمنین وصاحبه وکاتبه الفقیر

[1] معارف:- یہ بدگمانی آپ کو کیسے ہوئی،

الی رحمۃ اللہ تعالی وغفر ذنبہ الملتمسك باذیال فضلہ واحسانہ

حمید بن عمر بن عبد الجبار الورزقینی کتبہ لنفسہ فی سنۃ ثمان

وثمانین وخمس مائۃ "

اس مختصر عبارت سے ہمیں اس کتاب کا نام تقویم الابدان الخ، اسکے مصنف کا نام یحیی بن عیسی ابن جزلہ اور کاتب کے نام اور تاریخ کتابت کی اطلاع ملتی ہے، جب ہم اس تالیف اور اسکے مصنف کی دوسری کتب تاریخ حکماء میں تلاش کرتے ہیں، تو سب سے پہلے ہماری نظر حال ہی کی شائع شدہ تتمہ صوان الحکمۃ از پروفیسر محمد شفیع پر پڑتی ہے، اگرچہ اس کے شائع ہونے سے ہماری معلومات میں بہت مفید اضافہ ہوا ہے، مگر افسوس کہ اس میں یحیی بن عیسی جزلہ اور اسکی تصنیف کا ذکر نہیں ہے، لیکن اخبار العلماء باخبار الحکماء قفطی میں ذیل کے الفاظ میں دونوں کا ذکر ملتا ہے، (مطبوعہ مصر صفحہ ۲۳۹-۲۴۰)

" (یحیی بن عیسی بن جزلہ) ابو علی الطبیب البغدادی النصرانی نے اپنے معاصرین اطباء نصاری کرخ سے علم طب کو پڑھا، اس نے علم منطق پڑھنے کا ارادہ کیا لیکن ان نصاری میں اسوقت کوئی اس درجہ کا نہ تھا، شیخ معتزلہ ابو علی ابن الولید نے اسی موقع پر ذکر کیا ہے، اور اس کی توصیف بیان کی ہے، کہ وہ علم الکلام کا عالم تھا، الفاظ منطقیہ جو منطق کے پڑھنے والوں کے لئے ضروری ہیں، ان کی معرفت سے واقف تھا، ابن الولید اسکو دعوت اسلام دیتا رہا، دلالات واضحہ کی شرح کرتا رہا، اور براہین کو بیان کرتا رہا یہانتک کہ اسنے قبول کر لیا، اور مشرف باسلام ہوا، قاضی القضاۃ قاضی ابو عبد اللہ الدامغانی اسکے اسلام کی خبر سنکر بہت خوش ہوئی اس نے طب میں ان کی خدمت کی تھی جس کی وجہ سے اس نے بہت بڑا درجہ حاصل کیا، وہ بغیر اجرت کے کام کرتا تھا، اور بغیر معاوضہ کے ادویات دیتا تھا، جب اس کے انتقال کا وقت قریب آیا، تو اس نے اپنی کتب کو مشہد امام ابو حنیفہ میں وقف کر دیا، چنانچہ ابن جزلہ کا انتقال ۴۹۳ھ میں ہوا"

اس کی مشہور تصانیف میں سے کتاب المنہاج فی الاغذیہ، کتاب الادویہ، اور کتاب تقویم الابدان

مجدول ہیں"

ان متذکرہ بالا تالیفات ابن جزلہ میں سے اخیر کتاب تقویم الابدان وہی ہے، جو اس وقت

انگلیشور میں موجود ہے،

کشف الظنون میں اسی تاریخ کا ذکر یوں ملتا ہے:-

"تقویم الابدان فی تدبیر الانسان فی الطب لابی حسن علی یحیی بن عیسی

بن جزلہ المطبب البغدادی المتوفی سنہ ۴۹۳ مجلداً، اولہ:- الحمد

للہ الذی خلق فسوی الخ صنفہ مجدولاً کالتقویم النجوم للمقتدی

بامر اللہ العباسی وجعل مواضع الاجتماع والاستقبال قسمۃ الامراض الخ"

شکر کا مقام ہے کہ ابن جزلہ اور اس کی تالیف دونوں کے حالات ہمکو تقویم الابدان میں

میسر آگئے، مگر کشف الظنون کے بیان میں اور نفطی کے نام کتاب اور تاریخ وفات میں کچھ تھوڑا سا

فرق ہے، میرا خیال ہے کہ حاجی خلیفہ کے زمانہ میں یا تو اس کو یہی اطلاع میسر آئی، یا طباعت کی غلطی

ہے، بہرحال زیادہ صحیح نسخہ انگلیشور کا ہے، جو کشف الظنون سے کئی صدی قبل اور مولف کے قریب

ایک صدی بعد کا ہے،

آخر میں ایک بات کی طرف توجہ دلانی ضروری معلوم ہوتی ہے، کہ ہندوستان بھر میں یہ حصہ

گجرات ایسا ہے، کہ جہاں ابھی تک گنج کے طور پر ایسے قدیم کتب خانے ہیں جہاں بے شمار علمی نوادر

موجود ہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے کھمبائت دھولقہ چمپانیر اور سومنات وغیرہ میں دیکھے ہیں، جن

پر مستقل مضامین لکھے جاسکتے ہیں، اور یہی حصے زیادہ تر قدیم تمدن اسلامی سے مملو ہیں،

معارف:- ابن جزلہ کا حال ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب طبقات الاطباء میں بھی لکھا ہے جس

کا ترجمہ یہ ہے:۔

ابن جزلہ کا پورا نام یحییٰ بن عیسیٰ بن علی بن جزلہ ہے، مقتدی بامر اللہ کے زمانہ میں تھا، اپنی بہت سی تصنیفات اُسنے مقتدی کے نام سے منسوب کیں، فن طب اور اسکے عمل میں مشہور تھا، ابو الحسن سعید بن ہبۃ اللہ کا شاگرد تھا، فن ادب پر بھی اس کی نظر تھی، نہایت اچھا خوشنویس تھا، میں نے اس کے قلم کی لکھی ہوئی خود اس کی اور دوسروں کی متعدد تصانیف دیکھی ہیں جو اسکے فن خطاطی کے کمال پر دلالت کرتی ہیں، مذہباً نصرانی تھا، پھر مسلمان ہوگیا، اور نصاریٰ کے رد میں ایک رسالہ لکھ کر الیا القس کے پاس بھیجا، اس کی متعدد تصانیف ہیں، کتاب تقویم الابدان، منہاج البیان فیما یستعمله الانسان، (یہ دونوں کتابیں مقتدی کے لئے لکھی تھیں،) کتاب الاشارة فی تلخیص العبارة، کتاب تقویم الابدان کی تلخیص ما یستعمل من القوانین الطبیة فی تدبیر الصحة وحفظ البدن ایک رسالہ طب کی مدح شرع سے اس کی موافقت اور ان لوگوں کے رد میں جو شرعی حیثیت سے اس پر طعن کرتے ہیں، ایک رسالہ نصاریٰ کے رد میں جسے ۶۶ھ میں الیا القس کے پاس بھیجا تھا (طبقات الاطباء جلد اول ص ۲۵۵)

"الاصلاح" ماہوار

تلخیص و تبصرہ

جمہوریۂ روس

روس میں جو تبدیلیاں حال میں ہوئی ہیں، اُن پر کارل راڈک (Karl Radek) کا ایک مضمون رسالہ ورلڈ ریویو (اکتوبر ۱۹۳۶ء) میں شائع ہوا ہے، مقالہ نگار اسوقت روس کا سب سے زیادہ ممتاز صحافی خیال کیا جاتا ہے، اور وہ اس کمیٹی کا ممبر بھی رہ چکا ہے، جس نے اسٹالن کی صدارت میں سویٹ روس کا جدید دستور مرتب کیا ہے، کارل راڈک کی ذمہ دار شخصیت کے لحاظ سے ہم اس کے مضمون کی تلخیص ذیل میں درج کرتے ہیں :۔

روس کے نئے دستور کا مسودہ جو اسوقت جمہور کے سامنے بحث و مباحثہ اور اظہار رائے کی غرض سے پیش کیا گیا ہے، دراصل ان تغیرات کا ترجمان ہے، جو سنین گذشتہ میں روس میں رونما ہوئے ہیں، مجوزہ دستور کی اہمیت کا اندازہ انہی تغیرات کو پیش نظر رکھنے سے ہو سکتا ہے،

یہ تغیرات کیا ہیں؟ پہلا تغیر یہ ہے کہ ایک زراعتی ملک صنعتی ملک بن گیا ہے، بالکل جدید بنیاد پر صنعت و حرفت کی ایک عظیم الشان عمارت کھڑی ہو گئی ہے، صرف یہی نہیں کہ کارخانوں میں مزدوروں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے، اور ان کی استعداد فنی میں بھی اضافہ ہو گیا ہے، بلکہ جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ صنعتی پیداوار زراعتی پیداوار سے بڑھ گئی ہے، اس صنعتی ترقی سے نہ صرف مزدوروں کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جا رہی ہے، بلکہ زبردست زراعتی ترقی کے وسائل بھی فراہم ہو گئے ہیں،

یہ اسی کا نتیجہ ہے، کہ حکومت کی طرف سے غلہ اور مویشیوں کی پیداوار کے لئے بڑے بڑے مرکز قائم کردیے گئے ہیں، اور کسانوں کی بڑی اکثریت نے بڑے پیمانہ پر زراعت کرنے کے فوائد کو سمجھ کر متحدہ معیشت کو عملی شکل دیدی ہے، اگر یہ بات پیشِ نظر رکھی جائے، کہ زمین اور کارخانوں کی، مالک حکومت ہے، تو ان تبدیلیوں کا حاصل یہ نکلتا ہے، کہ زراعت ایک اشترا کی صنعت بنا دی گئی ہے،

دیہاتوں میں نہایت پیچیدہ مشینوں کو رائج کرنا، بجلی اور ریڈیو کو جاری کرنا، کسانوں کی ایک بڑی تعداد کو جدید ترین آلات کے استعمال کی تعلیم دینا، جدید حالاتِ زندگی، تیز تعلیمی نظام اور اخبارات کی تعداد میں زبردست ترقی کی وجہ سے دیہاتوں میں تہذیب و تمدن کا ترقی پذیر ہونا، ان تمام باتوں نے کارخانوں کے مزدوروں، اور مشترکہ مزرعوں کے کسانوں کو متحد کرکے ایک رشتہ میں منسلک کردیا ہے،

ان اقتصادی اور اجتماعی تغیرات نے زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی تبدیلیاں پیدا کردی ہیں، چنانچہ مزدوروں اور کسانوں کے طبقہ میں ایک جدید تعلیم یافتہ جماعت پیدا ہوگئی ہے، جو لاکھوں کی تعداد میں ہے، اور انقلاب سے نہایت شدت کے ساتھ وابستہ ہے، اقتصادی عہدے مثلاً انجینیری، کاریگری، منیجری وغیرہ اور سرکاری عہدے اسی طبقہ کے افراد سے پُر ہیں، یہ جدید تعلیمیافتہ طبقہ انقلاب کی پیداوار ہے، لیکن دورِ زاریت کا قدیم تعلیم یافتہ طبقہ بھی گذشتہ اٹھارہ سال کے حالات و واقعات کو سمجھنے سے قاصر نہیں رہا، اس نے نہ صرف یہ دیکھ لیا، کہ سوویٹ حکومت کو زیر و زبر کرنے کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں، بلکہ یہ بھی دیکھ لیا، کہ موجودہ نظامِ حکومت میں روس کی مادی اور تمدنی حالت روز بروز ترقی کرتی جارہی ہے، اس نے محسوس کرلیا ہے کہ اجتماعی ترقی کے لئے سائنس حد درجہ معین ہے، اور حکومت سائنس کی ترقی میں حتی الامکان پوری کوشش کررہی ہے، چنانچہ قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت مزدوروں اور کسانوں سے

قریب تر آگئی ہے،

صنعتی ترقی کے باعث سوویٹ حکومت نے ان طبقوں کو بھی شاہراہِ ترقی پر لا کھڑا کر دیا ہے جو زاریت کے دور میں پست حالت میں پڑے ہوئے تھے، چنانچہ کوہ قاف، وسط ایشیا اور سائبیریا میں صنعت و حرفت کو بہت کچھ ترقی دی گئی ہے، مثلاً باکو میں تیل کے کارخانے اور وسط ایشیا میں آبپاشی کی ترقی اور پارچہ بافی کے بڑے بڑے کارخانے اس امر کا کافی ثبوت ہیں، کہ سوویٹ حکومت نے دورِ سابق کی پست اقوام کی تمدنی سطح کتنی بلند کر دی ہے،

جدید دستور انہی واقعات سے نتائج اخذ کرتا ہے، بولشویک لوگوں نے طبقۂ ادنیٰ کی آمریت کو ہمیشہ عوام ہی کی حکومت سے تعبیر کیا، تاہم ابتدا میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ سوسائٹی کے ان طبقوں کو عارضی طور پر جمہوری حقوق سے محروم کر دیا جائے جو انقلاب میں سب کچھ کھو بیٹھنے کی وجہ سے اشتراکیت کے قیام کی ضرور مخالفت کرتے، دوسرے یہ کہ چونکہ اشتراکیت کے لئے جد و جہد کا ابھی آغاز ہی تھا، اور نتائجِ انقلاب کے ظاہر ہونے تک شدید دشواریوں پر قابو پانا ضروری تھا، اسلئے کسانوں کی ایک معتد بہ جماعت کا تذبذب ناگزیر تھا، لہذا اشتراکیت کی تحریک کو مستقل راستہ پر لگا دینے کے لئے ضرورت تھی کہ مزدوروں کے طبقہ کو جو اشتراکی نظام کا حامی اور مددگار تھا، سوویٹ انتخابات میں کچھ خاص حقوق دیدیئے جائیں، لیکن اب نہ تو اس کی ضرورت باقی رہ گئی ہے، کہ پہلے جو طبقہ جائداد کا مالک تھا، اس کو انتخابی حقوق سے محروم کیا جائے اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ مزدور پیشہ جماعت کو مخصوص انتخابی مراعات عطا کی جائیں، شہر کے متوسط طبقہ کے لوگ مثلاً تاجر وغیرہ اور سابق زمیندار جو اب سوویٹ روس میں باقی رہ گئے ہیں، ان کی تعداد بہت کم ہے، اور وہ ایک طویل مدت سے اجرت پر کام کر رہے ہیں،

آبادی کی بڑی اکثریت مختلف مذہبی فرقوں کے پادریوں کے اثر سے نکل گئی ہے، اور مذہبی

پرانے پادریوں کا اقتدار باقی نہیں رہا، کولکس (Kulaks) کا متوسط طبقہ جو سرمایہ دار کسانوں کا طبقہ تھا، اور ایک کثیر تعداد پر مشتمل تھا ختم ہو چکا ہے، اور اسے از سرِ نو تعلیم دی گئی ہے، انقلاب کے خلاف جو اندرونی قوتیں کام کر رہی تھیں، ان کا خاتمہ کر دیا گیا ہے، لیکن اشتراکیت جس کی فتح و کامرانی آج مسلّم ہے، اپنے دشمنوں سے انتقام نہیں لے رہی ہے، حقوقِ انتخاب سب کو دیدئے گئے ہیں، اس کی وجہ سے مواقع سب کے لئے یکساں ہیں، اور وہ لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو کبھی دوسروں کو اپنا آلۂ منفعت بنائے ہوئے تھے، ان حقوق سے وہی لوگ محروم ہیں، جنکے طرزِ عمل کو عدالت نے سوسائٹی کے مفاد کے لئے مضر قرار دیا ہی،

اس میں شبہ نہیں کہ مشترکہ مزرعوں کے کسان بھی مزدور پیشہ جماعت کی طرح صنعتی ترقی کے خواہشمند ہیں، وہ سرخ فوج کو بھی زیادہ مضبوط کرنا چاہتے ہیں جس میں زیادہ تر اُنھی کے لڑکے شامل ہیں، یہ لوگ سویٹ حکومت اور اشتراکی نظام کے ایسے زبردست حامی ہیں، کہ اشتراکیت کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچے گا، اگر کسانوں کو رائے دہندگی کے بالکل وہی حقوق دیئے جائیں، جو مزدوروں کو حاصل ہیں، اس میں بھی شبہ نہیں کہ مزدوروں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت اشتراکیت کو مضبوط کرنا چاہتی ہے، کیونکہ اشتراکیت اُنکی فلاح و بہبود کا بہت زیادہ خیال کرتی ہے، اور اسکے دور میں سائنس کو ہر سال ترقی ہو رہی ہے،

تمام باشندوں کو جن کی عمریں اٹھارہ سال سے کم نہیں ہیں، رائے دہندگی کا حق دیدیا گیا ہے، اور وہ ہر چھوٹے بڑے عہدوں کے انتخاب میں رائے دیسکتے ہیں، پریس کی آزادی، تقریر و اجتماع کی آزادی، جلوس و مظاہرہ کی آزادی، ٹریڈ یونین کو اپریٹیو سائنٹفک اور اسی قسم کی دوسری سوسائٹیوں کے قائم کرنے کی آزادی، اس جمہوریت کے بنیادی عناصر ہیں، جدید دستور نے سویٹ یونین کے انتخابی عہدوں کے لئے امیدوار پیش کرنے کا حق صرف کمیونسٹ پارٹی کی انجمنوں ہی کو نہیں، بلکہ جمہور کی

تمام انجمنوں کو دیدیا ہے،

انقلاب کے ابتدائی زمانہ میں چونکہ حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے، اس لئے قوانین بھی جلد جلد شائع کئے گئے، اور تبدیل ہوتے رہے، لیکن اب جب کہ بنیادی مسائل طے ہوچکے ہیں، ضرورت ہے، کہ اس صنعتی ملک کے پیچیدہ اقتصادی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب قوانین مرتب کئے جائیں، اس دستور کی روسے مجلس قانون ساز صرف دو ایوانوں پرمشتمل ہوگی، ایک مجلس اتحاد (Council of the Union) اور دوسرے مجلس اقوام (Council of Nationalities) مجلس اتحاد میں ہرشخص کو مساوی طور پر براہ راست راے دینے کا حق حاصل ہوگا، مجلس اقوام کے ارکان مختلف قومی جمہوریتوں کے نمایندے ہوں گے، قوانین صرف انہی دونوں ایوانوں کے فیصلہ سے وضع ہوسکین گے،

"ع ز"

امریکہ میں اعلی تعلیم کا مسئلہ

امریکہ کے ماہرین تعلیم کے سامنے اس وقت یہ مسئلہ زیر بحث ہے، کہ ریاست ہاے متحدہ کا موجودہ تعلیمی نظام کہاں تک مناسب ہے، اور اعلی تعلیم کے نصاب میں اصلاح و ترمیم کی کس حد تک گنجایش ہے، اس مسئلہ میں ماہرین کی دو مخالف جماعتین قائم ہوگئی ہین، اور درجنوں کتابیں موافقت اور مخالفت میں لکھی جاچکی ہیں، ایک طرف وہ لوگ ہیں، جن کا خیال ہے، کہ امریکن یونیورسٹیوں میں فنی (VOCATIONAL) تعلیم پر اس قدر زور دیا جانے لگا ہے، کہ اب وہ مختلف پیشوں اور تجارتوں کی تعلیم گاہیں ہوکر رہ گئی ہیں، یہ لوگ چاہتے ہین کہ یونیورسٹیوں میں خالص عقلی اور علمی تعلیم دی جائے، دوسری طرف اکثریت ان لوگوں کی ہے جو موجودہ نظام تعلیم کے حامی ہیں، اس بنا پر کہ یہ نظام قوم کے لئے مفید اور کارآمد ہے،

اس دوسری جماعت میں سب سے زیادہ ممتاز شخصیت ڈاکٹر وہائٹ ہیڈ (Alfred North Whitehead) کی ہے، جو ہارورڈ یونیورسٹی کے شہرۂ آفاق اُستاذِ فلسفہ ہیں، موصوف کی رائے ہے، کہ اگر یونیورسٹیاں فنی تعلیم میں ذرا بھی تخفیف کر دیگی، تو یہ ان کے لئے حد درجہ مضرت رساں ہوگا،

اصلاح کے حامیون میں پہلا نام ڈاکٹر ہچنس (Robert Hutchins) صدر شکاگو یونیورسٹی کا ہے، ان کے نزدیک یونیورسٹی کی تعلیم میں مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کو اساس قرار دینا چاہئے یعنی تمام علوم کے بنیادی اصولوں کی تعلیم دینی چاہئے، تاکہ علم کی تمام مختلف شاخوں میں ربط و اتحاد پیدا ہو سکے، اسکے لئے ان کے خیال میں یہ ضروری ہے، کہ کالج کے نصاب میں جو مضامین خالصًا کسی پیشہ یا فن سے تعلق رکھتے ہیں، وہ نکال دیئے جائیں، کیونکہ کلی علوم کا باہمی اختلاف و تغایر تعلیمی انتشار کا سب سے بڑا سبب ہے،

اسوقت تک یونیورسٹیوں میں تعلیم تین مختلف طریقوں سے دیجاتی رہی ہے:- (۱) مذکورۂ بالا مابعد الطبیعیاتی طریقہ (۲) دینی طریقہ (۳) افادی طریقہ، جس پر امریکہ کے موجودہ تعلیمی نظام کی بنیاد ہے، ڈاکٹر موصوف کی رائے ہے، کہ آج افادی طریقہ کے بجائے جو طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، وہ صرف مابعد الطبیعیاتی طریقہ ہے، کیونکہ دینی طریقۂ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ اُس مذہب پر لوگ عام طور پر قوی اعتقاد بھی رکھتے ہوں، قرونِ وسطیٰ کی یورپین یونیورسٹیوں کی بنیاد دینی طریقہ پر تھی، آج بھی مسلمانوں اور یہودیوں کا تعلیمی نظام اسی دینی طریقہ پر قائم اور کامیاب ہے، کیونکہ ان کے طلبہ اپنے مذہبی اصولوں کے اب بھی پابند ہیں،

ڈاکٹر ہچنس کے نزدیک مستقبل کے لئے بہترین یونیورسٹی جو ہو سکتی ہے، اسکا خاکہ یہ ہے:-

۱- کالج کے موجودہ چار سالہ نصاب سے ابتدائی دو سال خارج کر دیئے جائیں، اور انہیں ہائی اسکول کے آخری دو سالوں میں شامل کر کے ایک طرح کا جونیر کالج (Junior College)

قائم کردیا جائے،

۲- اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج کا نصاب تین سال کا کر دیا جائے، پہلے مابعد الطبیعیات کی تعلیم دیجائے تاکہ تمام علوم کے بنیادی اصول ذہن نشین ہو جائیں پھر علوم عمرانیہ کی جو انسانوں کے باہمی تعلقات سے بحث کرتے ہیں، پھر اُن علوم کی جن کا تعلق انسان اور فطرت سے ہے تعلیم میں اس بات پر ہمیشہ نظر رکھی جائے، کہ ان تینوں قسم کے علوم کا تعلق ایک دوسرے کیسا تھ کیا ہو،

۳- اس نصاب سے فنی اور تجارتی تعلیم یک قلم خارج کر دیجائے، مختلف پیشوں اور تجارتوں کیلئے مخصوص تعلیم گاہیں، علٰحدہ قائم کیجائیں،

ڈاکٹر موصوف موجودہ امریکن یونیورسٹی کو ایک انسائیکلوپیڈیا سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"انسائیکلوپیڈیا میں بہت سے حقائق ہیں، لیکن اسکی وحدت صرف اس کی ابجدی ترتیب میں ہے، موجودہ یونیورسٹی کا حال بھی ایسا ہی ہے، اس میں آرٹ (Art) سے لیکر حیوانیات (Zoology) تک مختلف شعبے ہوتے ہیں، لیکن نہ تو طلبہ اور نہ خود اساتذہ یہ جانتے کہ کسی ایک شعبہ میں ایک حقیقت کا تعلق دوسری حقیقت سے کیا ہو، یا ایک شعبہ کے حقائق کا تعلق دوسرے شعبہ کے حقائق سے کیا ہوسکتا ہو" موصوف لکھتے ہیں، کہ ہماری تعلیمی نظام میں عملی فنون کا زور ہر جگہ نظر آرہا ہو، اسکا نتیجہ بھی ظاہر ہے یعنی ہلکا پن اور سطحیت" امریکہ کی ایک یونیورسٹی نے موٹر چلانے کا فن چندروز ہوئے نصاب میں داخل کر لیا ہو اخباروں میں یہ اطلاع بھی آچکی ہو کہ پبلک اسکولوں کے نصاب مین سائکل چلانے کا فن داخل ہونے والا ہے، اس کے لئے کوشش کیجارہی ہو، ڈاکٹر ہچنس کے نزدیک مستقبل کی یونیورسٹی تمامتر علمی اور عقلی یونیورسٹی ہوگی فنی اور تجارتی تعلیم اس میں نہ دیجائیگی، ان کا عقیدہ ہے کہ یونیورسٹی کا تعلق تخیل (Thought) سے ہو، اور اسمیں قدیم یا موجودہ زمانہ کی معلومات کو جمع کرنا ایک بے معنی سی بات ہو بجز اس صورت کے کہ ان معلومات سے مقدمات کا کام لیا جائے، اور اصولوں کی تشریح و تصدیق میں ان سے مدد ملے، (ل - ڈ)

جراثیم اور انکی عالمگیری کا امکان

جراثیم میں بھی افزائشِ نسل ہوتی رہتی ہے، لیکن توالد و تناسل کے طریقہ سے نہیں بلکہ اس طرح کہ وہ ٹکڑے ہو کر ایک کے دو ہو جاتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان میں فطری تبدیلی بھی واقع ہوتی رہتی ہے، ان تبدیلیوں کو منازلِ ارتقاء سے تعبیر کر سکتے ہیں، سائنٹفک تحقیقات سے اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جراثیم اپنی فطرت بدلتے رہتے ہیں، اسکی ایک واضح مثال چیچک کے جرثومہ کی ہے، ایک زمانہ میں چیچک نہایت مہلک بیماری تھی، لیکن جہاں تک انگلستان کا تعلق ہے، جس جرثومہ سے بیماری پیدا ہوتی ہے، اس کی سمیت میں اب بہت کچھ تخفیف ہو گئی ہے، اور انگلستان کی چیچک بہ نسبت پہلے کے بہت ہلکی ہو گئی ہے، شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ خود لوگوں کے اندر مرض کا مقابلہ کرنے کی قوت زیادہ پیدا ہو گئی ہے، یعنی تبدیلی انسانوں میں ہوئی ہے، نہ کہ جراثیم میں، لیکن یہ صحیح نہیں، مشرق کی چیچک اب بھی ویسی ہی شدید ہے، جیسی پہلے تھی، اور جب وہاں کا کوئی مریض بندرگاہ کے ڈاکٹروں سے بچکر انگلستان میں داخل ہو جاتا ہے تو تعدیہ کا خطرہ ویسا ہی رہتا ہے، جیسا پہلے تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کی چیچک کے جراثیم ہی میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے، لیکن اگر تبدیلی کے ذریعہ بعض جراثیم کی سمیت میں تخفیف ہو سکتی ہے، تو یہ بھی ممکن ہے کہ بعض دوسرے جراثیم کی سمیت میں اضافہ ہو جائے، ایک جرثوم کی اوسط زندگی تقریباً بیس منٹ ہوتی ہے، اسکے بعد وہ ٹکڑے ہو کر دو ہو جاتا ہے، اس حساب سے ۲۴ گھنٹوں میں بہتر پشتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور تبدیلی کیلئے بہت کچھ موقع رہتا ہے، اگر اس تبدیلی سے سمیت میں زیادتی ہو جائے، تو دنیا کے لئے خطرہ کا امکان بھی بڑھ جائیگا، ہوائی جہازوں کی وجہ سے بیماریوں کے پھیلنے کا اندیشہ بڑھتا جاتا ہے، اور خطرہ ہے کہ جو بیماریاں ابھی کسی ایک مقام میں پائی جاتی ہیں، وہ جلد دوسرے حصوں میں بھی پھیل جائیں گی، مثلاً زرد بخار جو اسوقت مغربی افریقہ کی سب سے بڑی وبا ہے، اور ملیریا سے دس گنا زیادہ خطرناک ہے، ہوائی جہازوں کے ذریعہ اپنی مدتِ تعدیہ یعنی چار یا پانچ روز کے اندر آسانی سے ایشیا پہنچ سکتا ہے، جو ابتک اس وبا سے بالکل محفوظ ہے،

"مرغ زنا" (ج - ل - و)

اخبارِ علمیہ

دماغی امراض کا نفسیاتی علاج،

عہدِ حاضر میں سائنس کی ترقی نے جو نئے علوم و فنون پیدا کر دیئے ہیں، ان میں ایک علم سائکی ایٹری (Psychiatry) کا بھی ہے یعنی دماغی امراض کا نفسیاتی علاج، اس قسم کے علاج کے لئے اب مستقل ادارے قائم ہو گئے ہیں، اور وہ اپنے طریق علاج میں کامیاب ہو رہے ہیں، نومبر ۱۹۳۶ء میں واشنگٹن اسکول آف سائکی ایٹری امریکہ کے ماہرِ فن ڈاکٹر ہیڈلے (Ernest Hadley) نے اپنے چند دلچسپ تجربات بیان کر کے بعض ایسے لوگوں کی طرف سے متنبہ کر دیا ہے، جن سے بظاہر کوئی خطرہ نہیں معلوم ہوتا، لیکن جو کسی وقت قتل کے مرتکب ثابت ہو سکتے ہیں، ڈاکٹر صاحب موصوف کا مشورہ ہے کہ جو لوگ بہت مسکین اور متحمل مزاج دکھائی دیتے ہیں، ان سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہئے، کیونکہ ممکن ہے کہ ان کے اندر دشمنی کے جذبات پوشیدہ ہوں، اور وہ کسی وقت رونما ہو کر ارتکابِ قتل کا باعث بنجائیں، چنانچہ موصوف نے ایک عورت کا حال بیان کیا، جو بظاہر نہایت فرمانبردار تھی، اور جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنی بیمار لیکن سخت گیر ماں کی خدمت میں صرف کر دیا تھا، ماں کی خدمت میں وہ اس طرح لگی رہتی تھی، کہ اٹھارہ سال سے کسی سنیما اور تھیٹر وغیرہ میں بھی تفریح کے لئے نہیں گئی تھی، پہلے کچھ دنوں وہ اتوار کو گرجا چلی جاتی تھی، مگر بعد کو وہاں کا جانا بھی موقوف کر دیا، اور دن رات ماں ہی کی خدمت میں مصروف رہنے لگی، لیکن ایک روز وہ دفعۃً بھڑک اٹھی، اور ایک کلہاڑی لے کر اپنی ماں کے سر

ایسی ماری کہ غریب وہیں ٹھنڈی ہوگئی، اسی طرح ایک دوسری عورت بھی جس کی ماں نے بچپن ہی سے اُسے گھر کی دیکھ بھال میں لگا رکھا تھا، اور وہ تمام دن خانگی امور میں معروف رہتی تھی، ایک مدت کے بعد اس جذبہ سے مغلوب ہونے لگی، کہ اُسے اپنی ماں کو قتل کر دینا چاہیے، لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے ارادہ کی تکمیل کرے، وہ ڈاکٹر کے پاس چلی گئی، اور نفسیاتی شفاخانہ میں داخل ہوگئی، ڈاکٹر ہیڈلے کی رائے ہے، کہ اس قسم کی دبی ہوئی نفرت دراصل بچپن ہی میں پیدا ہو جاتی ہے، اور اندر ہی اندر غیر شعوری طور پر پرورش پاتی رہتی ہے، ہوسکتا ہے کہ بچہ شروع ہی سے اپنی ماں یا دائیوں سے نفرت کرنے لگے، اگر کسی وجہ سے ماں بچہ کی طرف جیسی چاہیے، توجہ نہیں کرتی، تو بچہ اسے فوراً محسوس کر لیتا ہے، اور اس بے توجہی کے جواب میں دودھ یا کھانے سے انکار کر دیتا ہے، کبھی کبھی اس بیزاری کا اثر بڑے ہونے کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اور غیر متوقع اوقات میں ظاہر ہو جاتا ہے،

بڑوں کے دلوں میں اس قسم کی بیزاریاں جو قائم ہو چکی ہیں، ان کا رفع کرنا تو محال ہے، لیکن بچوں کی اصلاح کی بہت کچھ توقع ہے، خصوصاً اگر والدین یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں، کہ ان کی بیزاریوں کے حقیقی اسباب کیا ہیں، ڈاکٹر موصوف کا تجربہ ہے کہ بچوں کی اصلاح میں سختی کو دخل دینے سے نتیجہ خراب نکلتا ہے، مثلاً اگر کوئی بچہ جھوٹ بولتا ہے تو اُسے جھڑکنا نہیں چاہیے، کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اپنے والدین سے نفرت کرنے لگتا ہے، بلکہ نرمی کے ساتھ جھوٹ بولنے کی بُرائی اسے سمجھا دینی چاہیے، اگر وہ کھانا نہیں تو جھڑکنے سے اور نہ کھائے گا، بہتر یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو نہ کھانے کا سبب معلوم کیا جائے، اسی طرح ہر بات میں نرمی کیساتھ اصلاح کی کوشش کی جائے،

دنیائے جدید کی قدامت

گذشتہ موسم گرما میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں نیو میکسیکو کے قریب ایک نہایت عظیم الشان جانور

ڈھانچہ زمین کھود کر نکالا گیا ہے، گردن کے زیریں حصہ نیز دونوں پہلوؤں میں تیر کی نکیلی پھل
پیوست تھے، یہ پھل اسی قسم کے تھے، جس قسم کے زمانہ قبل تاریخ کے شکاری استعمال کرتے تھے، اور
باوجود ہزاروں برس مٹی میں دبے رہنے کے نئے پھل کی طرح تیز تھے، ماہرین اثریات نے معائنہ کے
بعد فیصلہ کیا، کہ یہ ڈھانچہ عہد تیخ کے ہاتھی کا ہے، جو موجودہ زمانہ کے ہاتھی سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا
تھا، اب سے بیس ہزار سال پہلے یہ ہاتھی شمالی نصف کرہ کے تمام برّاعظموں میں پھرا کرتے تھے، اور عہد حجری
میں یورپ کے باشندے ان کا شکار کیا کرتے تھے، چنانچہ فرانس میں بعض پہاڑی غاروں کے اندر انکی
تصویریں بھی دیواروں میں کھدی ہوئی اب تک ملتی ہیں، ان کی پیٹھ پر کوہان تھے، دانت گھومے ہوئے
تھے، اور جسم پر بڑے بڑے بال تھے، عہد تیخ کے گذرنے پر یورپ اور ایشیا کے یہ ہاتھی شمال کی طرف
چلے گئے، اور سائبریا میں قیام پذیر ہوگئے، ان میں سے بے شمار وہاں کے برفستانی دلدلوں میں
پھنس کر جم گئے، اب دس ہزار سال کے بعد بعض وقتاً فوقتاً برف کھود کھود کر نکالے جا رہے ہیں،
اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جس حال میں وہ دلدلوں میں دھنسے تھے ٹھیک اسی حال میں اب تک
محفوظ ہیں، ان کی کھال، بال، گوشت، یہاں تک کہ پیٹ میں جو غذا اس وقت تک ہضم نہیں ہوئی تھی، وہ
بھی بدستور باقی ہے، اتنا ہی نہیں، بلکہ منہ کے اندر سیوار، گھاس اور جھاڑیوں کے جو تنکے تھے، وہ بھی
اسی طرح موجود ہیں، سائبریا کے کسان ان ہاتھیوں کے جسم سے سرخ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے
کاٹ کر کتوں کو کھلاتے ہیں، زمانہ قدیم سے سائبریا کے ہاتھی دانت کی تجارت چین اور یورپ سے بہت
زیادہ ہوتی رہی ہے، شمالی روس کے دلدلوں میں سیکڑوں آدمی برف کھود کر ان ہاتھیوں کے دانت
نکالتے رہتے ہیں، لیکن چند سال قبل تک امریکہ میں ان ہاتھیوں کا سراغ نہیں ملا تھا، کئی سال سے
ان کے ڈھانچے جنوبی مغربی امریکہ میں ملنے لگے ہیں، پھر بھی ماہرین اثریات کو توقع نہ تھی کہ ہزاروں
برس پہلے انسان بھی امریکہ میں آباد تھے، لیکن نیو میکسیکو کے جدید اکتشاف نے اب یہ قطعی طور پر ثابت

کر دیا کہ امریکہ میں انسانی آبادی اسوقت بھی موجود تھی، جب یہ جنگلی ہاتھی وہاں بکثرت پائے جاتے تھے جس ہاتھی کا ڈھانچہ نیو میکسکو میں برآمد ہوا ہے اسکے زمانہ کا تخمینہ اب سے دس پندرہ ہزار سال قبل کیا جاتا ہے،

موسم اور غیر معمولی ذہانت کا باہمی تعلق۔

امریکہ کی نیشنل اکاڈیمی آف سائنس (National Academy of Sciences) کے ششماہی اجلاس میں جو نومبر ۱۹۳۶ء میں شکاگو یونیورسٹی میں منعقد ہوا تھا، ڈاکٹر ولیم پیٹرسن نے ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا، وہ یہ کہ غیر معمولی ذہانت اور موسمی کیفیت کے درمیان کوئی قوی تعلق ہے۔ موصوف نے امریکہ کے پچیس ہزار ممتاز آدمیوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے نیز پاگلوں اور مجرموں کے حالات زندگی پر بھی نظر رکھی ہے، ان کے جمع کردہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن بچوں کا حمل سال کے نصف اول میں قرار پایا تھا، ان کی دماغی قوت بہ نسبت دوسرے بچوں کے عموماً زیادہ تھی، اور انہی کی تعداد میں وہ لوگ جو غیر معمولی طور پر ذہین تھے، یا جن کا دماغی توازن درست نہ تھا، زیادہ تر ہوئے تھے، اس قاعدہ کو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اکتیس صدور پر منطبق کر کے ڈاکٹر موصوف نے دیکھا کہ ان میں سے چھبیس کے حمل سال کے ابتدائی سات مہینوں میں قرار پائے تھے، اور صرف پانچ کے بقیہ پانچ مہینوں میں ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ ذہانت اور ذکاوت کا تعلق نہ ستاروں سے ہے اور نہ دوسرے مخفی اثرات سے، بلکہ تمام تر موسم سے ہے، شمالی نصف کرہ میں سال کا نصف اول طوفانی زمانہ ہوتا ہے اور موسمی کیفیت کا اثر ان بچوں پر بہت زیادہ پڑتا ہے جن کے حمل اس زمانہ میں قرار پاتے ہیں، برخلاف اس کے جن بچوں کے حمل سال کے نصف آخر میں قرار پاتے ہیں جو نسبتہً پرسکون اور غیر طوفانی زمانہ ہوتا ہے، وہ عموماً خالص اور دماغی اور جسمانی دونوں قوتوں کے لحاظ سے اوسط درجہ کے ہوتے ہیں،

ع ۔ ز ۔

ادبیات

یادگار داغ،

از حضرت متین مچھلی شہری یادگار داغ دہلوی

کون اسیرِ دامِ محبت تیرا اے صیاد نہیں — بلبل و قمری کو کیا کہئے سرو کوئی آزاد نہیں

آنکھوں میں آنسو بھی نہیں اب آہ نہیں فریاد نہیں — محو ہوں تیری یاد میں ایسا گویا تو بھی یاد نہیں

گلشن ہو یا کنجِ قفس مرغِ چمن دل شاد نہیں — بھول ستمگر منہ نہیں کرتے خوش ظالم صیاد نہیں

خیر غلط اقرارِ محبت اچھا وعدہ نباہ کو جھوٹ — دل کا لینا بھول گئے کیا وہ بھی تم کو یاد نہیں

کیا کیا ان کو یاد نہیں ہے صرف مجھی کو بھول گئے — مجھ کو سب کچھ بھول گیا ہے انکے سوا کچھ یاد نہیں

وہ کوڑی کا مال نہیں ہے سچ جو شیشہ خالی ہو — پتھر کہئے دل وہ کیا ہے جس میں بتوں کی یاد نہیں

حاصل زیست جسے کہئے وہ تجھ پر مرمٹنا ہے — خاک ہے تیرے کوچہ میں ملی جس کی برباد نہیں

عشق و جنوں میں ہمت شرط ہے دو قصے شاہد ہیں — ہستی کچھ صحرا کی نہیں ہے کوہ کی کچھ بنیاد نہیں

یاد کیا ہو مجھکو ایسی کوئی گھڑی ہے یاد تمہیں، — بھول گیا ہوں تمکو ایسا لمحہ مجھ کو یاد نہیں،

یاس میں تم کو آس نہیں تو کیا مطلب ہے عالم کو — دل کی بستی اُجڑ گئی تو دنیا بھی آباد نہیں،

میں تو متین اللہ سے ہر دم ایک صنم کا طالب ہوں
فرماتے ہیں حضرتِ زاہد تجھکو خدا کی یاد نہیں،

پیامِ بشیر

از جناب محمد بشیر صاحب بی اے ایل ایل بی ہڈ ماسٹر شبلی جارج، ہائی اسکول

نورِ صباحِ اصل ہو، شمعِ شبِ مجاز بن ۔ کعبۂ ذوق شوق ہو، قبلۂ حسن و ناز بن،

شکوۂ ناز تا بکے، پیکرِ حسن و ناز بن ۔ برقِ نظارہ سوز ہو، چشمِ نظارہ ساز بن

ساغر و گل میں کچھ نہیں لالہ و گل میں کچھ نہیں ۔ روحِ شرابِ ناب ہو، بوے چمن طراز بن

دردِ شفا فروش ہو، داغِ جہاں فروز ہو ۔ نالۂ قلب سوز ہو، آہِ جگر گداز بن

دل کو یونہی لہو نکر، ذلتِ آرزو نکر ۔ راز کی جستجو نہ کر، پردہ کشاے راز بن

عقل کا اعتبار کیا، عشق پہ اعتماد کر ۔ یار ہو حیلہ جو اگر، تو بھی بہانہ باز بن

آہ بشیر تا بکے مطرب و نغمہ کی ہوس،

کون و مکان بھی جھوم جائیں تو وہ صدا سے ساز بن

آہنگِ تپش

از جناب پروفیسر تپش امرسن کالج، ملتان،

یہ نقشِ داغِ معصیت ہی یا تاثیرِ میخانہ ۔ مری توبہ کے ہر ٹکڑے پہ ہی تصویرِ میخانہ

کہیں واعظ بہک آیا نہ ہو مسجد کے دھوکے میں ۔ کوئی کھڑکا رہا ہے دیکھنا زنجیرِ میخانہ

ابھی ساغر بکف حوریں چلی آتی ہیں جنت سے ۔ لگا کر دیکھ زاہد سر پہ تسخیرِ میخانہ

نہ جھونکو میری مشتِ خاک کو بنیادِ کعبہ میں ۔ اسے رہنے دو یہ ہے حاصلِ تعمیرِ میخانہ

کہاں میں اور کہاں یہ بادہ پیمائی لیکن تپش ۔ سفینہ بخششوں کا بن گئی تحریرِ میخانہ

مری ہو حق تُو نے رنگِ قلقلِ مینا بدل ڈالا مرے سجدوں سے کعبہ تک بڑھی توقیرِ میخانہ

وہاں دعوے خدائی کے یہاں بندے بھی جبّہ دیکھے وہ قسمت خانقاہوں کی یہ ہے تقدیرِ میخانہ

تپش آتے ہی بزمِ وعظ میں گھبرا کے کیوں اٹھے

اترتا ہے کہیں یوں نشۂ تقریرِ مے خانہ

جامِ صہبائی

جناب عبد السمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم اے ایل ایل بی

دے! بادۂ شوق کا مجھے ساغر دے اپنی ہی تجلیات مجھ میں بھر دے!

بنکر غمِ عشق تو سما جا مجھ میں ، ! ۱ میں فانی ہوں مجھ کو جاودانی کر دے!

عصیاں سے نہ داغِ دل کبھی دھوئے تو نے اپنے ہی بلند رتبے کھوئے تو نے!

بگڑا نہ کسی کا کچھ بدی سے تیری، ۲ ہاں اپنے ہی حق میں کانٹے بوئے تو نے!

ہونے دے دل و جگر کا خوں ہونے دے افلاک کی یورشیں فزوں ہونے دے

کٹتا ہے جو سر ترا تو کٹ جائے آخر ۳ پر حق کا علم نہ سرنگوں ہونے دے

نیکی کا ہے گر ثمر تو ہے میرے لئے عصیاں کا ہے کچھ ضرر تو ہے میرے لئے

اللہ کی ذات پر ہے کیا اس کا اثر ۴ یہ عقدۂ خیر و شر تو ہے میرے لئے

ہنگامۂ شوکتِ شہی سے نہ ڈرو، بزمِ جم و شانِ قیصری سے نہ ڈرو

یوں عمر بسر ہو اس صنم خانے میں ۵ سب تم سے ڈریں پہ تم کسی سے نہ ڈرو

اے غرقِ نشاط و عیش! اے بادہ پرست! ہر کیف و سرور کا ہے انجام شکست

سرمستیِ عشق جاودانی ہے اثر ۶ ہیں بے خبرِ خمارِ مستانِ الست

گذشتہ ششماہی کے رسائل واخبارات پر گذشتہ پرچوں میں ریویو ہوتا رہا ہے، جو باقی رہ گئے تھے یا بعد میں نکلے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

رسائل، **کائنات** (ماہانہ) مرتبہ جناب شوکت تھانوی و فدا احمد صاحب عباسی تقطیع ۲۰×۳۰

حجم ۴۸ صفحات کاغذ کتابت وطباعت اوسط، قیمت سالانہ للعہ فی پرچہ ۴ر پتہ مرشد آباد پیلس لکھنؤ،

آجکل رسائل کی کمی نہیں، آئے دن رنگ برنگ کے رسائل نکلتے رہتے ہیں، لیکن سنجیدہ اور مفید مقصد رکھنے والے رسائل کی تعداد بہت کم ہے، ایسی حالت میں کائنات کا اجراء ایک مفید اضافہ ہے، عام علمی اور ادبی مقاصد کے ساتھ اس کا سب سے بڑا مقصد اس الحاد بے دینی اور بے شرمی اور بے حیائی، بلکہ بدمذاقی کا تدارک ہے جو آجکل آزادی خیال اور آرٹ کے نام کو پھیلائی جارہی ہے، اگرچہ یہ شے بالکل نظر انداز کرنے کے لائق تو نہیں ہے، لیکن کچھ بہت زیادہ قابل اعتنا بھی نہیں، کہ یہ ان کے نقیبوں کے نزدیک بھی مقصود بالذات نہیں ہے، بلکہ آج کل کے کم مایہ ادب فروشوں نے محض عوام کو اپنی متاع کاسد کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ان مقبول خیالات کو وسیلہ بنایا ہے، بہت ممکن ہے، کل ان کی جگہ کوئی دوسرا جالو مال آمیش کیا جانے لگے، تاہم کائنات کے مقاصد کے مفید ہونے میں کوئی شبہہ نہیں، ابھی اسکو عرصۂ وجود پر آئے ہوئے، صرف دو ہی مہینے ہوئے ہیں، لیکن رفتار سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ بہت جلد سنجیدہ رسائل کی صف میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرلے گا،

عارف (ماہانہ) مرتبہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب شوق، تقطیع ۲۰×۳۰ ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ نفیس، کتابت و طباعت پاکیزہ قیمت سالانہ عہ فی پرچہ:- ۲ر

پتہ۔ دفتر عارف بل روڈ لاہور،

یہ رسالہ کئی مہینوں سے لاہور سے نکل رہا ہے، ظاہری نفاست و پاکیزگی میں بہت کم رسائل اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اس کا خاص مقصد مسلمانوں کو مغربی معاشرت کے مسرفانہ مصارف سے بچانا ہے لیکن مضامین مذہبی اخلاقی ادبی ہر قسم کے ہوتے ہیں، مذہبی اور اخلاقی پہلو غالب ہے، قرآنی احکام اور احادیث نبوی کی تشریح التزام کے ساتھ ہوتی ہے، بزرگان سلف کے مختصر حالات بھی اکثر ہوتے ہیں، لیکن مضامین کا معیار ابھی اور بلند کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ظاہر اور باطن میں مناسبت پیدا ہو جائے،

کہکشاں، مرتبہ سید کاظم صاحب دہلوی ادیب عالم تقطیع ۲۰×۳۰ ضخامت ۴۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ عہ، رو سالے ہے، پتہ:- دفتر کہکشاں گلی شاہ تارا، دہلی،

کہکشاں دہلی سے نکلتا ہے، اگرچہ صورۃً کم رو ہے لیکن معناً ادب و افسانے کا دلچسپ مجموعہ ہے، شروع میں اشخاص، طبقات اور جماعتوں کے نام منظوم پیامات ہوتے ہیں، "بعرگل و ریحان" کے ماتحت مختلف مسائل پر اظہار خیال ہوتا ہے، پھر خریداروں کے سوالات اور اس کے جوابات درج ہوتے ہیں، اڈیٹوریل میں اسلامی ممالک کی خبریں ہوتی ہیں، غرض یہ رسالہ مختلف قسم کے معلومات کا دلچسپ مجموعہ ہے،

دُرِّ یتیم (ماہانہ) مرتبہ محمد رشید خانصاحب تقطیع ۲۰×۳۰ ضخامت ۴۴ صفحات کاغذ کتابت و طباعت نہایت معمولی، قیمت عہر، پتہ:- دفتر انجمن یتیم خانہ، اڈہ ہوکو در جالندھر،

یہ رسالہ جالندھر کے اسلامی یتیم خانہ کی جانب نکلتا ہے، مضامین عموماً مذہبی اور اخلاقی ہوتے ہین، کبھی کبھی سبق آموز تاریخی واقعات اور اخلاقی افسانے بھی نظر آتے ہیں، اسکی آمدنی یتیم خانہ پر صرف ہوتی ہے، اسلئے اسکی خریداری ہم خرما و ہم ثواب ہی،

اخبارات | **ناخدا** (ہفتہ وار) مرتبہ مولوی خلیل احمد صاحب فاضل دینیات، تقطیع ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۸ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت مرقوم نہیں ہے، پتہ :- مولوی گنج لکھنو

یہ اخبار عرصہ سے لکھنو سے نکل رہا ہی ہمارے پاس حال میں ریویو کے لئے آیا ہے، ہفتہ وار اخبارات میں سے خاصہ اخبار ہے، ہفتہ بھر کی سیاسی خبروں کا خلاصہ دیتا ہے، قابل توجہ واقعات پر تبصرہ ہوتا ہے، کبھی کبھی بعض مفید مضامین بھی ہوتے ہیں،

الہلال (ہفتہ میں دو مرتبہ) مرتبہ مولوی سید یحییٰ حسن صاحب ندوی و عبدالرحمٰن صاحب عثمانی، تقطیع ۲۰×۲۶/۲ ضخامت ۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ للعہ ششماہی عاز فی پرچہ - رپتہ مراد پور بانکی پور پٹنہ،

الہلال حال ہی میں پٹنہ سے طلوع ہوا ہے، عام اخباری زبان میں اس کا مقصد مذہب و ملت اور ملک و قوم کی خدمت ہی، ابھی اس کے چند ہی نمبر نکلے ہین، ان سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اگر یہ موسمی نہ ہوا، تو بہار کے اخبارات میں اچھی جگہ حاصل کرلے گا، لیکن رنگ بالکل موسمی معلوم ہوتا ہے،

مجاہد (ہفتہ میں دوبار) مرتبہ شاہد احمد زماں صاحب تقطیع ۲۰×۲۶/۲ ضخامت متعین نہیں معلوم ہوتی، کم سے کم چار صفحات ہوتے ہیں، سالانہ قیمت مرقوم نہیں، مقامی ارہے، پتہ گلی نمبر ۳۰، مکان نمبر ۲۳۱، رنگون،

ہندوستانی کے مرکز سے دور رنگون میں ہندوستانی زبان کا خاصہ مذاق ہے، اور یہاں سے متعدد اچھے اخبارات و رسائل نکلتے ہیں، حال میں مجاہد صف آرا ہوا ہے، ظاہری اور معنوی

معنوی بحاظ سے قدر افزائی کا مستحق ہے اخباری خبروں کے علاوہ کبھی کبھی مفید مضامین بھی نظر آتے ہیں، امید ہے کہ مجاہد بریلی میں مسلمانوں کی مفید خدمت انجام دیگا،

علیگ (ہفتہ وار) مرتبہ مولینا سعید انصاری و ضیاء احمد صاحب انصاری (علیگ) تقطیع $\frac{22 \times 18}{4}$ ضخامت ۸ صفحات کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت سالانہ مقامی عہر بیرونجات کے لئے عہر، پتہ:- دفتر علیگ، علی گڑھ،

علیگ برادری کے لئے ایک ایسے سنجیدہ اخبار کی ضرورت تھی، جو ایک طرف انمیں رشتۂ اتحاد و اتفاق کا وسیلہ ہو، اور دوسری طرف ارباب مسلم یونیورسٹی کے کانوں تک اپنی آواز پہنچا سکے، اور ان کو موجودہ ضروریات کے مطابق صحیح مشورہ دیسکے، علیگ کے افتتاحیہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ مسلمانوں کی اس واحد درسگاہ کو اسکی قدیم روایات اور پرانے ڈھرے سے بلند اور مسلمانوں کے موجودہ مقتضیات کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے، اگرچہ یہ اخبار بلحاظ ضخامت کمتر ہے لیکن بقیمت بہتر ہے، امید ہو کہ مولینا سعید انصاری کے ہاتھوں علیگ برادری اور مسلم یونیورسٹی دونوں کی مفید خدمت انجام دے گا،

مومن گزٹ (ہفتہ وار) مرتبہ مولوی ابو عزیز زکریا صاحب بھاگلپوری، تقطیع $\frac{22 \times 29}{4}$ ضخامت ۱۶ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت سالانہ سے ششماہی، عہر، پتہ:- مشن روڈ، کانپور،

مومن گزٹ آل انڈیا مومن کانفرنس کا آرگن ہے، اس کے مقاصد اس کے انتساب سے ظاہر ہیں، ان مقاصد کے ساتھ وہ اپنے ناظرین کے لئے ضروری سیاسی خبروں کا خلاصہ اور عام معلومات اور دلچسپی کے لئے مفید مذہبی اور تاریخی مضامین بھی پیش کرتا ہے،

(ھ)

مطبوعاتِ جدیدہ

خاتمِ سلیمانی، مولفہ جناب مولینا شاہ غلام حسنین صاحب ندوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۵۲۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت دو روپیہ، علاوہ محصولڈاک پتہ خانقاہ سلیمانیہ، پھلواری شریف، پٹنہ،

دورِ گذشتہ کے علماء میں مولینا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بڑی جامع الحیثیات اور اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے منفرد شان رکھتی تھی، ان کی ساری زندگی ارشاد و ہدایت اور ملک و ملت کی خدمت میں گذری، اس لئے ان کی سوانح عمری کی بڑی ضرورت تھی، اس فرض کو ان کے لائق فرزند مولینا شاہ غلام حسنین صاحب ندوی نے پورا کیا، اور خاتم سلیمانی کے نام سے ان کی مبسوط سوانح عمری مرتب کی، جو چار حصوں پر منقسم ہے، پہلے حصہ میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذاتی حالات، عادات و خصائل اشغالِ زندگی، اور ملکی و مذہبی خدمات کا ذکر ہے، اگرچہ آپ کا اصل کام ارشاد و ہدایت تھا، لیکن آپ کے ہمہ گیر جذبۂ خدمت کی وجہ سے ہندوستان کی کوئی اسلامی تحریک ایسی نہ تھی جس میں آپکا دستِ اعانت شامل نہ رہا ہو، علی گڈھ کالج، ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم لیگ، ندوۃ العلماء، مسلم یونیورسٹی، طبی کانفرنس، خدامِ کعبہ، موتمر الاسلام، خدام الحرمین، بزم صوفیہ، انجمن حمایت اسلام لاہور، غرض اُس وقت سے لیکر آپ کی وفات تک، کوئی اسلامی تحریک اور کوئی ادارہ ایسا نہ تھا، جو آپ کے فیض سے محروم رہا ہو، اور یہ فیض ہندوستان کے تمام حصوں میں یکساں جاری تھا، دوسرے حصہ میں مختلف انجمنوں اور جماعتوں کے ان تعزیتی جلسوں کی روئداد اور اخباروں کے تعزیتی نوٹ ہیں جو آپ کی وفات پر لکھے گئے، تیسرے حصہ میں اشخاص کے تعزیتی خطوط

کی تقلیں ہیں، چوتھے حصہ میں آپ کے ملفوظات یعنی وہ مختلف تاریخی واقعات، مذہبی عقائد وخیالات صوفیانہ لطائف و نکات اور دوسرے مختلف النوع معلومات ہیں جو آپ کی زبان سے نکلے، اس کتاب سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جامع حیثیات اور مقبول شخصیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے، کہ آپ کس طرح مختلف بلکہ متضاد جماعتوں میں یکساں مقبول تھے، امید ہے، کہ آپ کی مقبولیت کی طرح آپ کے سوانح حیات کو بھی قبولِ عام حاصل ہوگا،

سبل السلام مولفہ جناب مولینا محب النبی مصطفےٰ احسن صاحب علوی ایم اے تقطیع چھوٹی،

ضخامت ۱۰۹ صفحات کاغذ کتابت وطباعت معمولی، پتہ:- خیالی گنج لکھنؤ،

کاکوری کے خانوادۂ تصوف کے ایک بزرگ نے حضرت علی مرتضیٰ کی ایک مبسوط سوانحعمری لکھی ہے جس کا پہلا حصہ احسن الانتخاب کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا، اس کتاب میں حضرت علیؓ کے مناقب بیان کرنے اور ان کی محبت میں اتنے غلو سے کام لیا گیا ہے، کہ کتاب مذکور مناقب علیؓ کے بجائے مثالب صحابہ بن گئی ہے حتی کہ حضرات شیخین بھی تفضیلیت کی زد سے نہیں بچ سکے، اور امیر معاویہؓ پر تو کوئی تبرا باقی نہیں ہے، چونکہ یہ کتاب ایک مدعی تسنن کے قلم سے نکلی تھی، اس لئے مولینا مصطفیٰ حسن صاحب نے اسکے گمراہ کن عقائد و خیالات کی تردید میں فصل الخطاب لکھی، اس کے جواب میں رفع الحجاب لکھی گئی، اب مولانا مصطفےٰ احسن صاحب نے اس کے جواب میں سبل السلام لکھی ہے، اس سلسلہ کی کتابوں میں سبل السلام کے علاوہ اور کوئی کتاب ہماری نظر سے نہیں گذری ہے، لیکن احسن الانتخاب کی شہرت حد تواتر تک پہونچ چکی ہے، پھر سبل السلام میں اس کے جو اقتباسات دیے گئے ہیں، نیز اس کی تنقید اور جوابات سے معلوم ہوتا ہے، کہ احسن الانتخاب اور رفع الحجاب کا معیار اور تحقیقی پایہ نہایت پست ہے، اصول نقد کو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے، روایت و درایت کا مطلق کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اپنے منشا و مقصد کے مطابق جو رطب و یابس مل گیا ہے، اسے بلا تامل قبول کر لیا گیا ہے، بعض نہایت ادنیٰ درجہ کی کتابوں سے

کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، ان اصولی نقائص کے علاوہ جا بجا تدلیس تلبیس، غلط منقولات اور الحاق و اضافوں سے بھی کام لیا گیا ہے، سبل السلام میں ان تمام نقائص کی پردہ دری کی گئی ہے، اور غلط یا کم از کم گمراہ کن بیانات کو صحیح روشنی میں پیش کیا گیا ہے، جن لوگوں نے اس سلسلہ کی کوئی کتاب دیکھی ہے، ان کے لئے سبل السلام دیکھنا ضروری ہے،

مختصر تاریخ ادب اردو، مولفہ سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم اے لکچرار اردو الہ آباد یونیورسٹی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ سپید، کتابت و طباعت روشن قیمت عہ غالباً مصنف سے اوپر کے پتہ سے ملیگی،

ہندوستانی زبان کی تاریخ اور اس کے ادب کی تنقید پر اب بہت کتابیں ہو گئی ہیں، اور نئی تحقیقاتوں اور نئے اکتشافات سے بہت سے نئے معلومات کا اضافہ ہو گیا ہے جو پرانی کتابوں میں نہیں مل سکتے لیکن اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ یا مطوّل ہیں یا کسی خاص پہلو سے متعلق ہیں، "مختصر تاریخ" میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اختصار اور جامعیت کے ساتھ ان سب کا خلاصہ کر لیا گیا ہے اور دور حاضر کے متعدد ممتاز شعراء اور ادیبوں کے حالات اور ان کے ادب کے نمونے بڑھائے گئے ہیں، جو دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتے، انتخاب میں بڑی فیاضی اور فراخدلی، اور تنقید میں بڑی رواداری اور وسیع المشربی سے کام لیا گیا ہے، لوگوں کی دلآزاری کا خصوصیت کیساتھ زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے، یہ کتاب کالج کے طلبہ کے لئے خاص طور سے زیادہ مفید ہے، اس سے اجمالی طور سے ہندوستانی زبان کی پوری تاریخ ذہن میں آجاتی ہے،

تمدنِ عتیق، مولفہ جناب ابو ظفر عبد الواحد صاحب ایم اے، و محمد عطاء الرحمن صاحب بی اے، اساتذہ شعبہ کلیہ سٹی کالج حیدرآباد دکن تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۴ صفحات کاغذ کتابت و طباعت نہایت عمدہ، قیمت مذکور نہیں ہے، غیر مصور عا پتہ منیجر بک ڈپو سٹی کالج حیدرآباد دکن،

ہماری زبان میں عہدِ عتیق کی تاریخ پر بہت کم کتابیں ہیں، تمدنِ عتیق میں لائق مؤلفین نے آغازِ آفرینش سے لیکر بعثت نبوی تک کے مختصر حالات جمع کردیئے ہیں، ابتدائی ابواب میں تخلیقِ عالم کی سرگذشت ہے، کہ کس طرح زمین بنی، اور پھر بتدریج اس پر کیسے زندگی، اور پھر انسانی زندگی کا ظہور ہوا، پھر قدیم وجدید، عہد حجری کے انسانوں کے حالات، ان میں تخیلات وعقائد کی ابتدا، اور تحریک آغاز ہے، پھر تمدن کے ابتدائی دوروں میں ہندوستان سامرستان اور مصر کے حالات، اور یہاں کے باشندوں کے مذہبی اور ادبی رجحانات، ان کے علوم وفنون طبقاتی نظام کاروباری زندگی، قوانین اور اقتدارِ شاہی کی تاریخ ہے، پھر مصر قدیم کی تاریخ، اور قدیم آشوری کلدانی اور عبرانی حکومتوں کے عروج وزوال سیاسی انقلابات اور جنگ وجدال کی سرگذشت ہے، گو یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت مختصر ہے تاہم اس کے پڑھنے سے سرسری اور اجمالی حالات ذہن میں آجاتے ہیں، زبان کہیں کہیں کھٹکتی ہے،

البرہان التحقیق الاظہر فی فضائل الصدّیق والعمر	مولفہ جناب غلام یٰسین خاں صاحب قائم خانی جمعدار رسالہ آصفیا ہی، تقطیع بڑی ضخامت

۴۰ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت معلوم نہیں، پتہ محلہ کھو کھرواڑی اندرون بلدہ حیدرآباد دکن،

مؤلف نے اس رسالہ میں اہلِ سنت کی حدیث کی کتابوں سے شیخین کی فضیلت میں اہل بیت کرام کی روایات اور شیعوں کی معتبر کتابوں اور ان کے ائمہ اور اکابر کے اقوال سے صحابۂ کرام اور حضرات شیخین کے فضائل جمع کئے ہیں، ہر روایت کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے ترجمہ کی زبان پرانی ہے، البتہ والعمر کی عربی ترکیب نئی ہے،

(م)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۶ — فروری سنہ ۱۹۲۳ء

معارف

دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبع معارف

اعظم گڑھ

جلد ۳۹ | ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۳۷ء | عدد ۲

مضامین

شذرات

دکن کا جشنِ سیمین

یہ رسالہ جب آپ کے ہاتھون میں پہنچے گا تو اعلیٰ حضرت سلطان العلوم حضور پرنور فرمانروائے کشورِ دکن دام اقبالہ خلد اللہ ملکہ کا جشنِ سیمیں ممالکِ محروسہ اور بیرونِ ممالک میں شروع ہو چکا ہوگا، اعلیحضرت کے دورِ حکومت کو فرمانروایانِ آصفیہ کے درمیان وہی امتیاز ہو جو خلیفہ مامون الرشید کے عہد کو خلفاے عباسیہ کے درمیان، علوم و فنون کی اشاعت، تعلیم کی ترقی، عمارات کی تعمیر، دفاتر کی تنظیم، نظم ونسق کی درستی، رعایا کی خیر خواہی اور ان کی بھلائی کی مفید تجویزیں عہدِ عثمانی کے خاص برکات ہیں،

یہ بھی عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ عین اُس وقت جب حضور کے بست و پنج سالہ عہدِ حکومت کا جشن منایا جانے والا تھا دولت آصفیہ کا پرچم ایک نئے ملک پر جو تقریباً اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، پھر لہرانے لگا، یہ مصالحانہ فتح اعلیٰ حضرت کے ناخنِ تدبیر اور وزراے آصفیہ کے حسنِ سعی سے حاصل ہوئی ہے، لیکن اس سلطنت کے سیاسی حدود سے وسیع تر اُس کے علمی و تعلیمی حدود ہیں، جو ہمالیہ کی چوٹیون سے لیکر بحرِ شور کے کنارون تک پھیلے ہیں،

اس جشنِ سیمیں کے ابرِ گہربار کے چند سیمین چھینٹے دار المصنفین کے دامن تک بھی پہنچے ہین، اعلیٰ حضرت نے پانچ برس کے لئے دار المصنفین کی دو سو ماہوار کی مزید امداد منظور فرمائی ہے، اور گذشتہ دو برس چند مہینوں کی رقم چھ ہزار چھ سو پچاس روپیے محکمۂ امورِ مذہبی کے ذریعہ سے دار المصنفین کو عطا کر دی گئی ہے، دار المصنفین ہرچند دکن سے دور ہے

مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کی سیرابی دکن ہی کے چشمۂ حیات سے ہے،

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہاناں را
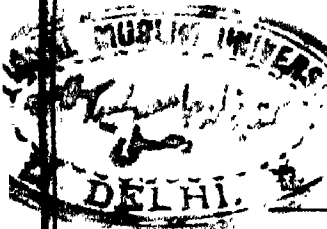
نظام الملک آصفجاہ عثمان علی خاں را

گذشتہ ۱۶-۱۷-۱۸ جنوری ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ کی نمائشگاہ میں ہندوستانی اکاڈیمی کی ادبی کانفرنس کے جلسے ہوئے حسب دستور پہلا اجلاس اردو و ہندی کا مشترک تھا، جس میں صدارتی خطبے پڑھے گئے، اور باقی دنوں میں اردو اور ہندی کے الگ الگ جلسے ہوئے جن میں مضمون پڑھ کر سنائے گئے، اردو حصہ میں سید سجاد حیدر صاحب نے ہندوستان کیلئے رومن خط کی تجویز پیش کی، اور پروفیسر مہیش پرشاد نے مرزا غالب کے سہرے پر، مجنون گورکھپوری نے کلام آسی پر، مولوی احمد مکرم صاحب اعظمی نے اردو اور ہندی بھائی چارہ پر، مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی نے مرزا جہانگیر کے مقبرہ پر، مرزا محمد عسکری صاحب نے فسانۂ آزاد پر، ڈاکٹر آغا مہدی حسن (آگرہ یونیورسٹی) نے ہندوستان میں تاریخ نویسی پر، اور مولوی عبد الماجد صاحب دریابادی نے اکبر الہ آبادی کی معاشرتی شاعری پر محققانہ اور دلچسپ مضمون پڑھ کر سنائے، عثمانیہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، آگرہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی کے نمائندے شریک تھے،

ہندی اور اردو کے آسان لکھے اور بولے جانے پر سر تیج بہادر سپرو، اور صدر اردو کانفرنس اور بہت سے مقررین نے زور دیا، لیکن ہر ایک تقریر کا توڑ اس پر تھا کہ جبتک ہندو مسلمانوں کے دل نہیں ملین گے، زبان ایک نہیں ہو سکتی، لیکن سوال یہ ہے کہ دل کیونکر ملین؟ پالٹیکس میں انکی علحدگی تو کھلی ہوئی ہے لیکن انتہا یہ ہو کہ جس ادبی کانفرنس کے ذریعہ ہم ان کو ایک کرنا چاہتے ہیں اس میں بھی دونوں مل کر نہیں بیٹھے، اردو اور ہندی کے بہت سے ادیب یہاں جمع تھے، مگر دونوں دو خیموں میں تھے، ایک نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اور ایک دوسرے کی سننا اور سمجھنا تو بعد کی چیز ہے، کیا یہ حد درجہ افسوسناک نہیں!

پچھلے پرچہ میں شعر العجم جلد سوم کے فارسی ترجمہ کی جو خبر دی گئی تھی اس سلسلہ میں یہ مزید تفصیل معلوم ہوئی ہے کہ جلد اول و دوم و سوم و پنجم کا فارسی ترجمہ کابل میں، اور جلد چہارم کا مع رسالہ کتبخانہ اسکندریہ کے ایران میں ہوا ہے، اس طرح کتاب کی پوری جلدوں کے ترجمے کابل و ایران نے مل کر پورے کر دیئے ہیں،

اردو کی یہ خوش قسمتی کیا کم ہے کہ اس زبان کی تصانیف کے فارسی اور ترکی میں ترجمے ہوں، اس سلسلہ کی نئی کڑی شمس العلما آزاد مرحوم کی کتاب سخندانِ فارس کا فارسی ترجمہ ہے، یہ ترجمہ ملک الشعرائے افغانستان قاری عبداللہ خان کے قلم کا رہینِ منت ہے،

یہ کتنے افسوس کی بات تھی کہ تاریخ ابن خلدون جیسی اہم کتاب کا کوئی صحیح اور مکمل اڈیشن شائع نہیں ہوا تھا، جو مطبوعہ نسخہ ہاتھوں میں ہے وہ جابجا سے ناقص اور سقیم ہے، اس سلسلہ میں معارف میں بھی ایک تحریر چھپی تھی، اب یہ خبر مسرت کیساتھ معلوم ہوئی ہے کہ آجکل اس کے ایک نئے صحیح اور مکمل نسخہ کی تیاری عمل میں آرہی ہے، مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ سے جو اس نے سلطانِ مغرب کو ہدیہ دیا تھا، اور جو کتبخانہ قرویہ واقع فاس (مراکش) میں موجود تھا اور قسطنطنیہ کے مصحح نسخہ سے جو دارالکتب مصریہ میں تھا، اور احمد تیمور پاشا مرحوم اور احمد زکی پاشا مرحوم کے نسخوں سے مقابلہ کرکے نیا نسخہ تیار کیا گیا ہے، چنانچہ موجودہ مطبوعہ تیسری جلد کے صـ۲۲ سے ۶۰ صفحے ناقص پائے گئے جو اضافہ کئے گئے، اطمینان کی مزید بات یہ ہے کہ امیر شکیب ارسلان نے اس پر حواشی اور تعلیقات لکھے ہیں، اور نئے اسلوب سے متعدد فہرستیں اس میں شامل کی گئی ہیں،

یہ نسخہ چودہ جلدوں میں مکمل ہوگا، اور ایک ایک جلد کرکے شائع ہوگا، ہر جلد میں قریب پانچسو صفحے ہونگے اور ہر جلد کی قیمت چار روپیے ہوگی، اور ہندوستان میں مکتبہ عربیہ اور نیمنٹ ہوٹ بلڈنگ کرافٹ مارکٹ بمبئی سے ملے گی،

مقالات

خطبۂ صدارت

ہندوستانی اکیڈمی اردو کانفرنس لکھنؤ

منعقدہ ۱۶، ۱۷ جنوری سنہ ۱۹۳۷ء

لکھنؤ سے نسبت۔ شرفاء علم وادب! کرمفرمائی کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی اس علمی وادبی مجلس میں ایک حقیر کو پائین سے اٹھا کر صدر میں بٹھایا، آپ کی اس ذرہ نوازی کی قدر اور بڑھ جاتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مجھے اس اعزاز کی دولت اس سرزمین میں بخشی گئی ہے، جو ہمیشہ سے علم وادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں کا مرکز ہے، خاکسار کو گو لکھنؤ سے وطن کی نسبت حاصل نہیں، لیکن گذشتہ چھتیس برس سے مجھے اس سے جو علمی وتعلیمی تعلق رہا ہے، وہ وطن ہی کے مانند ہے، اسی کی گود میں میرے ہوش وتمیز کی آنکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں میری تعلیم وتربیت ہوئی، اور اسی کی آب وہوا میں میرا علمی وادبی نشو ونما ہوا، اسلئے اس سرزمین کا ہر گوشہ، میرے لئے مانوس اور اس چمن زار کی ہر کیاری میرے لئے نظر افروز ہے،

مفارقت کے داغ۔ خوشی اور غم توام ہیں، اس خوشی کے موقع پر ان چند دوستوں کی یاد آتی ہے، جو اس سال ہم کو اپنی دائمی مفارقت کا داغ دے گئے، اور جو خود اس بزم ادب کے رکن رکین اور باعثِ تزئین تھے، منشی پریم چند کا ماتم اسوقت تک رہے گا، جب تک ہماری زبان میں ان کی کہانیوں کا ایک ورق بھی باقی ہے، وہ ہمارے ملک کے دیہاتیوں کے دل اور زبان تھے، دیہات کے

دکھ درد کو انکا دل جو محسوس کرتا تھا، وہ ان کے قلم کی زبان سے ادا ہوتا تھا، سادہ فقرے، بے تکلف بیان، لیکن درد اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی کہانی، اونکا قلم ہمارے پرانے کیرکٹر اور قومی آن بان کا سچا قدردان تھا،

اصغر مرحوم کی یاد دل سے کوئی کیونکر بھلائے، گو اُن کے جسمِ خاکی کا وطن گونڈا تھا، مگر اونکی شاعرانہ مقبولیت کا وطن اعظم گڈہ تھا، اسی ویرانہ سے ان کی شہرت کی بو نکل کر ملک کے چمن زاروں تک پہنچی یہیں انکا پہلا دیوان مرتب ہوا، وہیں ان کے شاعرانہ امتیازات کے جوہر کھولے گئے، اور وہیں سے انکا نشاطِ روح مطبوع ہوکر نشاطِ عالم کا باعث ہوا، وہ ہماری زبان کے اُن شعراء میں سے تھے جنھوں نے ہندوستانی زبان کی موجودہ شاعری کا رُخ پلٹا ہے، اور ایک نئے دورِ سخن کا آغاز کیا ہے،

ان جوانوں کے ساتھ بوڑھے نیّر کے فضل وکمال سے ہماری محرومی بھی اس سال کا افسوسناک حادثہ ہے، وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے، اور خود بھی شاعر اور شاعر سے بڑھکر محقق فن تھے، ہماری زبان میں فرہنگِ آصفیہ کے بعد دوسرا مکمل لغت نور اللغات انہی کے آزمودہ کار ہاتھوں نے ترتیب دیا، سب سے آخر میں لکھنؤ کے مایۂ ناز ادیب شاعر و مصنف نواب حسام الملک سید محمد علی حسن خان طاہر کا ماتم کرنا ہے، جن کے قلم اور زبان نے کم از کم پچاس برس تک شعر و سخن اور علم و ادب کا ہنگامہ برپا رکھا،

لکھنؤ کے خدمات

آج ہم جس تاریخی شہر میں جمع ہیں، وہ گو ہماری پوری ملک کی پوری راجدھانی کبھی نہیں بنا، لیکن یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ وہ ہمارے علوم و فنون اور شعر و ادب کا مدتوں پایۂ تخت رہا ہے، اور اب بھی ہے، شاہ پیر محمد صاحب جنکا ٹیلہ اور ٹیلہ پر والی مسجد مشہور ہے، وہ یہاں کے سب سے پہلے عالم ہیں، عالمگیر کے عہد میں سہالی سے فرنگی محل کو علم و فن کا وہ خاندان منتقل ہوا جو صدیوں تک ہمارے علوم و فنون کا محافظ اور شیراز ہند پورب کا دار العلم رہا، اور اس نئے زمانہ میں مسلمان

کی نئی عربی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی یہیں نبیاد پڑی یہاں کا خاندان اجتہاد پورے ملک کے طول و عرض پر تنہا حکمراں ہے،

دلّی کے باغ میں جب خزاں آئی، تو یہاں بہار کا دور آیا، اس اُجڑے باغ کے کتنے مرغ خوش لحن تھے جنھوں نے اڑ اڑ کر اس چمن کی شاخوں پر بسیرا لیا، ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلّی میں حاصل کی، لیکن تہذیب اور سلیقہ یہیں لکھنؤ میں سیکھا،

اودھ کی راجدھانی جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئی، تو اوسکو اور چار چاند لگ گئے، میر تقی میر انشاء اللہ خان انشاء، جرأت اور مصحفی وغیرہ نے ادھر کا رُخ کیا، میر انیس کا خاندان دلّی سے پہلے ہی آچکا تھا، ان بزرگوں کے دم قدم سے بادشاہوں کے دربار، امراء کی ڈیوڑھیاں اور اہل علم کی محفلیں شعر و سخن کے نغموں سے پُرشور بن گئیں، ناسخ و آتش، وزیر و صبا، اور ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں نے شعر و ادب کے جواہر ریزوں کے ڈھیر لگا دیئے،

شعر و سخن کے چرچوں اور شاعروں کے تفریحی جھگڑوں کو چھوڑ کر نفس زبان کی ترقی محاورات کی نزاکت الفاظ کی تراش خراش اور اصول و قواعد کے وضع و تالیف کا جو اہم کام گذشتہ دو صدیوں میں یہاں انجام پایا، اوسی کا اثر ہے، کہ اس نے بولی سے بڑھکر زبان کا درجہ پایا، ملک سخن کے دو اخیر فرمانروا انیس و دبیر نے شاعری نہیں کی، بلکہ اپنے نام سے زبان و ادب کے سکّے ڈھال ڈھال کر اہل ملک میں تقسیم کرتے رہے،

ناسخ نے زبان کی نزاکت و لطافت میں وہ کام کیا، جو ہر ایک ہوشیار جوہری جواہرات کے نوک و پلک نکال کر جلا دینے میں کرتا ہے، اون کے شاگرد والا جاہ میر اوسط علی رشک نے صحیح و غلط ثقیل و سبک لفظوں کو اس طرح پرکھکر الگ کر دیا، کہ انکی پسند فصاحت کا معیار بن گئی، سیکڑوں الفاظ

جو گو بول چال میں رائج تھے، مگر شعر و انشار کی بارگاہ میں ان کو بار حاصل نہ تھا، ان کو خود اپنے شعروں میں نظم کر کے پچھلوں کے لئے سند پیدا کی لکھنو میں غالبًا یہی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے ۱۲۵۶ھ میں اردو لغت ترتیب دیا، جس کا نام نفس اللغۃ ہے، سید انشاء اللہ خاں کے دریائے لطافت کا دھارا بھی یہیں بہا، شیخ امداد علی بحر المتوفی ۱۳۰۰ھ کی نسبت بھی مشہور ہے، کہ انھوں نے کوئی لغت لکھا تھا، مگر اس کا سراغ نہیں ملتا،

حکیم ضامن علی جلال جن کے دیدار کا شرف مجھے بھی حاصل ہے، ان شعراء میں ہیں جنھوں نے زبان کو نہ صرف شاعری بلکہ وضع اصول اور تحقیقات کے لحاظ سے بھی مالامال کیا ہے، سرمایۂ زبان اردو، مفید الشعراء، تنقیح اللغات گلشن فیض، قواعد المنتخب وغیرہ انکی وہ کتابیں ہیں جو اردو زبان کا سرمایہ ہیں، منشی امیر احمد امیر مینائی کے شاعرانہ خدمات سے قطع نظر، امیر اللغات کے مصنف کی حیثیت سے ہماری زبان پر ان کا بہت بڑا احسان ہے، افسوس ہے کہ اردو کے اس عظیم الشان لغت کے دو حصے الف ممدودہ اور الف مقصورہ تک چھپ سکے، ان کے جلیل القدر شاگرد نواب فصاحت جنگ جلیل سے مجھے معلوم ہوا ہے، کہ رامپور میں اس لغت کا پورا مسودہ موجود ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ہماری زبان کی بڑی بدقسمتی ہوگی کہ ترقی کے اس روز بازار میں بھی مشتاقوں کی آنکھیں اس عروس فن کی دید سے محروم رہیں،

لکھنؤ نے شعر و سخن کے ذریعہ سے اس زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ ہماری علمی محفلوں کی بار بار کی دہرائی ہوئی کہانیاں ہیں، اور جو شہرت کی بنا پر زبان زد خاص و عام ہیں،

مجھے اس شاہراہ سے ہٹ کر لکھنؤ کی وہ خدمتیں گنانی ہیں، جنکو اس دور کے قدرداں بھول گئے ہیں، یا ہماری زبان کی تاریخ سے یہ اوراق گر کر کھو گئے ہیں،

عہد جدید کی آبادی لکھنؤ کے افق میں، | ہمارے ملک میں سات سمندر پار سے آکر جب اہل یورپ نے

اپنے نئے علوم و فنون کی نمائش کی ہے، تو یہ لکھنؤ کا وہ وقت تھا جب وہ عیش و مسرت کی شراب سے بدمست تھا، اسوقت کس کو ہوش تھا کہ وہ دیساور کی نئی چیزوں کی قدر کرے، اور بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کمائی اور اپنے گھر کی اندوختہ دولت ہی پر ان کو بڑا غرور تھا، باہر سے خرید کر کچھ اور قیمتی سامانوں کا اضافہ کرے تاہم اس میخانہ میں کچھ اہل ہوش بھی تھے، انھوں نے نئے اور پرانے کا جائزہ لیا، اور جو چیز ان کے ہاں نہ تھی، وہ فرنگستان کی دوکانوں سے خرید کر لائے،

یہ سب کو معلوم ہے، کہ خاص حالات نے سرکار اودھ اور سرکار کمپنی کو متحد کر دیا تھا، اس کا اثر یہ تھا کہ انگریزی کا رزیڈنٹ اور ان کا عملہ لکھنؤ میں اور سرکار اودھ کا وکیل کلکتہ میں، اور کبھی کبھی لندن میں رہتا تھا، اس میل جول سے دو عظیم الشان مشرقی اور مغربی تمدنوں کا سب سے پہلے یہیں پیوند لگا، اس زمانہ کے رزیڈنٹ اور انگریز حکام اردو اور فارسی میں پوری مہارت رکھتے تھے، نواب سعادت علی خان کے دربار میں بیلی صاحب رزیڈنٹ اور انشار اللہ خاں کی ادبی نوک جھونک کی حکایتیں آب حیات کے ذریعہ مشہور عام ہیں،

سرکار اودھ کی طرف سے وکالت اور انشار کے منصب پر جو لوگ سرفراز ہوتے تھے، وہ عموماً اہل علم کے طبقہ سے ہوتے تھے، انگریزوں کے میل جول سے وہ بھی انگریزی علوم و فنون سے آشنا ہو جاتے تھے، اور بعض بعض تو کسی نہ کسی جدید علم میں مہارت پیدا کر لیتے تھے، خان علامہ تفضل حسین خاں انھی لوگوں میں سے تھے، وہ گور ہنے والے سیالکوٹ کے تھے، اور ریاضیات و متوسطات کی تعلیم دلی میں پائی، لیکن انتہائی تعلیم لکھنؤ میں مُلّا حسن فرنگی محلی سے حاصل کی، پہلے نواب سعادت علی خان کے اتالیق مقرر ہوئے، پھر نواب آصف الدولہ نے انکو اپنا وکیل بنا کر کلکتہ بھیجا، اس اثنار میں انھوں نے انگریزی اور لاطینی زبانیں سیکھیں، اور جدید ریاضیات و ہیئت کو حاصل کیا، نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں درس و تدریس اور تالیف و تصنیف کا مشغلہ جاری کیا، اور جدید علم ہیئت اور جبر و مقابلہ میں

کئی کتابیں تصنیف کیں، ۱۲۱۵ھ میں وفات پائی،

نواب محمد علی خاں کے زمانہ میں منشی الملک فخرالدولہ دبیرالملک ہشیار جنگ رتن سنگھ زخمی نے علوم و فنون کی نئی بساط بچھائی، گو انکے بزرگوں کا وطن بریلی تھا، مگر ان کے فضل و کمال کی بہار لکھنؤ میں ظاہر ہوئی، بادشاہ کے میر منشی تھے، قدیم علوم کیساتھ جدید ہیئت و ریاضیات میں بھی ماہر تھے، انگریزی بھی سیکھی تھی، حدائق النجوم انکی مشہور تصنیف ہے، ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۸ء میں تالیف پائی، نئے علم کے لئے نئی اصطلاحوں کا وضع کرنا انکا خاص کارنامہ ہے، لکھتے ہیں،

"باید دانست کہ چوں ایراد الفاظ یونانی و برطانیقی (انگریزی) بعینہ در کتاب فارسی و عربی کردہ دغیر مانوس است، و کتب عرب یکسر بمذہب بطلیموس کہ فیما نحن فیہ اگرچہ بعضے مطابق بآنست لیکن بسیارے مخالف از آن و برخے مچہ و کہ نشانے ازاں در تصانیف قدما پیدا نیست، ناچار بوضع بعضے از اصطلاحات جدیدہ، یا تصرفے در تعریفات و جز آن چنانکہ عادت مترجماں قدیم ہنگام نقل علوم از یونانی بعربی بودہ است من ہم اقتضاے ایشان کردہ میگویم، ص ۹"

ان ہی لوگوں میں ایک اور قابل ذکر ہستی رای منولال فلسفی کی ہے، وطن سندیلہ تھا، فلسفہ و حکمت کے علوم میں دسترس رکھتے تھے، نواب آصف الدولہ کے دربار میں نوکر تھے، دوسری تصنیفات کے ساتھ علم حساب و جغرافیہ و ہیئت اور حکمت انگریزی میں رسائل یادگار چھوڑے، ۱۲۴۸ھ میں وفات پائی،

سرکار اودھ کی طرف سے جو علماء وقتاً فوقتاً لندن بھیجے گئے، ان میں سے دو نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مولوی محمد اسمٰعیل لندنی اور مولوی محمد حسین لندنی، ان دونوں نے یورپ کے جدید علوم و فنون سے اہل ملک کو آشنا کیا، مولوی محمد اسمٰعیل لندنی مرادآباد کے رہنے والے تھے، نواب نصیر الدین حیدر کی طرف سے سفیر لندن مقرر ہوئے تھے، منطق کی بعض پرانی کتابوں پر انکے حاشیے ہیں، ۱۲۶۰ھ میں وفات پائی،

مولوی محمد حسین کا ایک عربی رسالہ ندوہ کے کتب خانہ میں ہے، جس میں یورپ کے نئے علوم و فنون
جارج سیل کے ترجمۂ قرآن اور یورپ کے بعض اختراعات کا تذکرہ ہے،

نواب نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ان دو کے علاوہ دو اور صاحب قابل تذکرہ ہیں، مولوی
عبد الرب اور مولوی کمال الدین حیدر، لکھنؤ میں جو یورپین علما رہتے تھے، ان سے برابر کی، ان کی ملاقاتیں
رہتی تھیں، اسی کا نتیجہ وہ رصد خانہ ہے، جو ۱۲۴۷ھ میں شاہ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں جنرل مکلاوڈ
کی کوٹھی میں بننا شروع ہوا، اور محمد علی شاہ کے زمانہ میں تیار ہوا، اس رصد خانہ میں کرنل ولکاکس
وغیرہ انگریز علما کے علاوہ مولوی عبد الرب صاحب، مولوی کمال الدین حیدر صاحب اور مولوی
اسمٰعیل صاحب مرادآبادی شریک تھے، اور اب یہ وہ مقام ہے جس میں امپیریل بنک کی عمارت قائم ہے،

اب تک ملک میں جدید علوم و فنون کی اشاعت کی تاریخ میں لکھنؤ کا نام نہیں لیا جاتا، حالانکہ
شاہانِ اودھ کے زمانہ میں لکھنؤ میں بھی ایک دار الترجمہ قائم تھا، نئے علوم و فنون کی کتابیں یہاں ترجمہ ہو کر
مطبع سلطانی سے شائع ہوتی تھیں، اس محکمہ کی طرف سے ۱۹ رسالے چھپ کر شائع ہوئے تھے، جن
میں سے دس رسالوں کے نام نہیں معلوم ہیں، اور جن کی تفصیل میں نے معارف ۱۹۱۷ء میں کی ہے،
یہ ہیئت، کیمیا، مناظر، اور طبیعیات اور اس کے اقسام قوت مقناطیسی، علم الماء، علم الہوا اور علم الحرارۃ وغیرہ
سائنس کے مختلف علوم پر ہیں، لارڈ بروہم (Braugham) کی کتاب Al reatisea
The objects Advantages and pleasures of Science کا اردو ترجمہ مقاصد العلوم کے
نام سے محمد علی شاہ کے زمانہ میں چھپا، اور بھوپال کے دفتر صیغۂ تاریخ میں میری نظر سے گذرا ہے،

لکھنؤ کی اس علمی و تعلیمی مجلس کا نام اسکول بک سوسائٹی تھا، اور اسکی ایک جنرل کمیٹی تھی، جو کتابوں
کے ترجمہ و اشاعت کا کام کرتی تھی، اور رصد خانہ سلطانی کا انگریز مہتمم ان ترجموں کی دیکھ بھال کرتا تھا،
ایک انگریز نے اردو میں فن زراعت پر کتاب لکھی تھی،

ضرورت ہے کہ لکھنؤ کی اس اسکول بک سوسائٹی کے مطبوعات کا پتہ چلایا جائے، اور آئندہ دلی سوسائٹی، اور فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جائے، اسی عہد کی ایک کتاب اردو حساب میں لوگارتھم ہے جس کا ایک نسخہ ہمارے پاس ہے،

لکھنؤ کے ادبیات | لکھنؤ نے اسکے بعد زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، افسوس ہے کہ انکی کوئی مفصل تاریخ موجود نہیں، بادشاہوں کے زمانہ میں داستان گوئی کا ایک مستقل فن تھا، اور بڑے بڑے نے بانداز اور زبان آور بادشاہوں، اور امیروں کے شبستانوں میں بیٹھکر اپنی دلچسپ داستانوں سے بادشاہوں اور امیروں کے دل بہلایا کرتے تھے، حکیم ضامن علی جلال کے والد بزرگوار حکیم اصغر علی اس فن کے ماہر تھے، اخیر زمانہ میں اس فن پر کتابیں بھی لکھی جانے لگیں، اسوقت کہانیوں کے کردگار، دیو، پریاں، اور جادوگر اور طلسم ساز ہوتے تھے، داستانِ امیر حمزہ، نوشیروان نامہ، طلسم ہوش رُبا، ایرج نامہ وغیرہ مختلف ناموں سے ہزاروں صفحات میں خیالی ادب اور زورِ بیان کا ایک طلسم کھڑا کیا گیا، اس کتابی طلسم کا افتتاح ہمارے ملک کا کوئی دوسرا شہر پیش نہیں کر سکتا، ان کتابوں کے مصنف جنکو خدا جانے کس مصلحت سے مترجم کا درجہ دیا جاتا ہے، میر محمد حسین جاہ، منشی احمد حسین قمر، شیخ تصدق حسین اور طوطارام شایان وغیرہ ہیں، یہ نظم ونثر کے ہزاروں صفحات حق یہ ہے، کہ ہماری پرانی زبان کا بہترین نمونہ ہے نثر میں سرور کا فسانۂ عجائب، اور نظم میں نواب مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم وغیرہ کی مثنویاں وہ جواہرپارے ہیں، جن سے کبھی ادب اردو کی الماریاں سجائی جاتی تھیں،

امانت کا اندر سبھا توں تک اہلِ شوق کا تماشہ گاہ رہا ہے، اور اب یہ بات پوری تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے، کہ یہ صرف شاعرانہ فسانہ نہ تھا، بلکہ واقعی لکھنؤ میں اندر کا یہ اکھاڑا لگتا تھا، اور اسکا تماشہ پردوں کیساتھ کھیل کر دکھایا جاتا تھا، اور اس طرح اردو میں ان جدید تماشوں اور ناٹکوں کی تمدنی بدعت بھی یہیں پیدا ہوئی،

مین نے ہندوستانی ادب کی اس صنف کی یہ تمہیدی تاریخ اسلئے بیان کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ قدیم وجدید سے ملکر ہماری زبان میں ناولوں کی پیدایش کے لئے لکھنؤ ہی کی زمین کیوں موزوں ہوئی اور شرر و سرشار، مرزا رسوا، سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ اور جوالا پرشاد برق کی تخلیق کا باعث ہوئی، شرر نے قومی تاریخ اور اصلاح معاشرت کے بعض موضوعات کو اور سرشار نے لکھنؤ کے آخری تمدن کے رسم و رواج اور طور وطریق کو، اور مرزا رسوا نے لکھنؤ کے ایک خاص حلقہ کے خصوصیات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ انیسویں صدی کا اخیر عہد انہی کے دم قدم سے پر رونق تھا، لکھنؤ کے اس ادبی دور میں سرشار کی سیر کہسار، اور فسانہ آزاد، شرر کی فردوس بریں، اور مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا اور سجاد حسین کی حاجی بغلول ادب اردو کی بہترین کتابین ہین،

مطابع۔ آجکل ادبیات کے سلسلہ تاریخ کی ایک کڑی مطابع بھی ہیں، لکھنؤ میں مطبع سلطانی کے علاوہ مطبع محمدیہ (۱۲۵۵ھ بعہد محمد علی شاہ) محمد یعقوب، مطبع علوی علی بخش خان (۱۲۶۳ھ) مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خان (۱۲۷۱ھ) کانپور (۱۲۶۳ھ) مطبع محمدی حاجی محمد حسین لکھنوی (۱۲۶۲ھ) مطبع جعفریہ حکیم مرزا جعفر خان (۱۲۶۵ھ) مطبع امینی محمد عباس، مطبع صدیقی عنایت اللہ وغیرہ بہت سے مطبع تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مطبع، مطبع سلطانی، سلطان المطابع کے قانوناً زیر نگرانی تھے، اور اسکے مہتمم کپتان مقبول الدولہ احسان الملک مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر قبول ثابت جنگ کا نام باقاعدہ لکھا جاتا تھا، یہ نام اس عہد کی مطبوعہ کتابوں پر اکثر لکھا ہوا ملتا ہے،

مطبع مصطفائی اپنی صحت اور صفائی میں معیار کے بلند درجہ پر تھا، علماء اور طلبہ اسکی چھپی ہوئی کتابوں کے قدرداں تھے، اور اب بھی اسکی چھپی ہوئی کتابیں اہل شوق میں اشرفیوں کے مول خریدی جاتی ہیں، سب آخر لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب اسی برس کے قریب پہنچ گئی ہے، اس سے میری مراد نولکشور کا مشہور نولکشور پریس ہے، یہ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا تھا

بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے، کہ مشرقی علوم و فنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں انکا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کرسکتا، ہماری زبان کی تمام ادبی اور علمی کتابیں اس مطبع سے چھپ کر نکلیں، شعرا کے دواوین، مثنویاں، قصائد، مرثیے، قصے، افسانے، داستانیں اور درس کی عام کتابیں سب اسی کی کوششوں کی ممنون ہیں، تاہم غلط نویسی اور غفلت جو کثرت کا نتیجہ ہے اسکی شہرت کے چہرہ کا بدنما داغ ہے،

شعرائے قدیم میر، سودا، ناسخ، آتش، جرأت، مصحفی، انشا، رند و وزیر، صبا، انیس، دبیر، میر، مومن، اسیر، امیر وغیرہ کے دیوان اور کلاموں کے مجموعے، اسی مطبع سے نکل کر دنیا کا اجالا ہوئے، اور ملک کے گوشہ گوشہ میں زبان کی اشاعت کا سبب بنے،

مطبع تیغ بہادر بھی صدی کے وسط میں ادب کی اشاعت کا اچھا ذریعہ رہا،

اخبارات، | زبان کی اشاعت کا تیسرا ذریعہ اخبارات ہیں، ہمارا یہ شہر اس سلسلہ میں بھی پیچھے نہیں رہا، نہیں معلوم کہ یہاں کا پہلا اردو اخبار کون ہے، تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس صوبہ میں اردو کا پہلا روزانہ اخبار اودھ اخبار یہیں سے نکلا اور جو آجتک نکل رہا ہے، اسکے آغاز کی تاریخ ۱۸۵۸ء ہے، اور یہ بے مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس اخبار نے اس ملک کے مشہور ادیبوں کے پیدا کرنے اور ان کو پروان چڑھانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے، سرشار اور شرر دونوں اسی اخبار کے ذریعہ شہرت کے اسٹیج پر آئے،

اردو کا سب سے پہلا کامیاب مذاقیہ اخبار اودھ پنچ بھی اسی شہر کے افق پر نمودار ہوا، سید سجاد حسین جنکی ملاقات کی عزت مجھے حاصل ہے، اسکے اڈیٹر تھے، یہ وہ اخبار ہے جسکے صفحات میں منشی احمد علی کسمنڈوی، منشی احمد علی شوق، میر اکبر حسین، نواب سید محمد آزاد وغیرہ ہماری زبان کے وہ پرانے ادیب جو نئے طرز و طریق سے آگاہ تھے روشناس ہوئے،

سنجیدہ اخباروں میں مشیر قیصر (مرتبہ مولوی غلام محمد خان تپش ۱۸۸۳ء) اور آئینہ اور آزاد ہفتہ وار اخبار بھی گذشتہ صدی کے ادیبوں کی پیداوار میں معین ہوئے، آزاد آخر میں اودھ پنچ کا ضمیمہ ہوگیا تھا، یہ میری

طالب علمی کا زمانہ تھا، سجاد حسین مرحوم بیکار ہو چکے تھے، اسوقت اس آزاد کی چند ماہ تک کی اڈیٹری کا فرض چند دوستوں کیساتھ مل کر میں نے بھی ادا کیا تھا،

اردو کا سب سے پہلا آزاد سیاسی اخبار ہندوستانی نے بھی اسی شہر میں جنم لیا، گنگا پرشاد ورما اسکے اڈیٹر تھے، یہ اپنے زمانہ میں کانگریس کے خیالات کا بہترین وکیل تھا، مولینا شبلی مرحوم جو خود بھی کانگریسی خیال کے تھے، اسکو بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ اخبار یہ ہے، !

آج تو مسلمانوں میں بہت سے آزاد سیاسی اخبار ہیں لیکن زمیندار کے بعد ۱۹۱۰ء میں اس ملک میں سب سے پہلا آزاد مسلمان سیاسی اخبار مسلم گزٹ بھی یہیں پیدا ہوا، جسکے اڈیٹر مرحوم وحید الدین سلیم اور اسکے مشیر خاص اور مضمون نگار مولانا شبلی تھے،

رسالے۔ رسائل کے لحاظ سے بھی یہ شہر پیچھے نہیں رہا، میرے موجودہ معلومات کے لحاظ سے یہاں کا سب سے پہلا ادبی رسالہ محشر تھا، جو مولوی عبد الحلیم شرر کا پہلا ادبی کارنامہ تھا، یہ ۱۸۸۲ء میں نکل کر دو سال کے بعد بند ہوگیا تھا، ۱۸۸۶ء میں شرر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ دلگداز نکالا جو اپنے زمانہ میں جدید طرز تحریر کا بہترین معیار تھا، یہی وہ رسالہ ہے جس نے ملک میں اردو کے بیشمار ادیب اور نثار پیدا کئے، نثر نویسی کا سلیقہ سب سے پہلے شرر ہی کی تحریروں سے ہمارے نوجوانوں میں پیدا ہوا،

لکھنؤ کا ایک اور ادبی رسالہ ذکر کے قابل ہے، منشی نثار حسین کا پیام یار، یہ گلدستہ ایک زمانہ میں شوق کے ہاتھوں سے لیا اور عزت کی آنکھوں سے پڑھا جاتا تھا، اس میں اس عہد کے بڑے بڑے شعرا، امیر، داغ، جلیل، تسلیم وغیرہ اور انکے باکمال شاگردوں کی غزلیں چھپتی تھیں، یہ انیسوین کے اواسط میں حسن و عشق کا تنہا پیامبر تھا، جسکی باتوں کو سنکر خدا جانے کتنوں کو عروس سخن کا شیدائی بننا پڑا، اور صحیح زبان کے سیکھنے اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا،

اس عہد کا ایک اور ادبی رسالہ مرقع عالم ہے، جو حکیم محمد علی خان کی اڈیٹری میں ہردوئی سے نکلتا تھا، اس کو دلگداز کا حریف سمجھنا چاہئے، حکیم صاحب ناول نویسی میں بھی اپنے وقت میں شہرت رکھتے تھے، اور اون کے قلم میں وقت کا سماں اور سینری دکھانے کا خاص ملکہ تھا،

(باقی)

شاہجہان کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب رفیق دار المصنفین

(۲)

فضلاء مندرجۂ ذیل فضلاء دربار شاہی سے منسلک تھے،

علامی سعد اللہ خان، شاہجہانی عہد میں علامی سعد اللہ خان کو اپنی علمی فضیلت اور سیاسی تدبر میں وہی درجہ حاصل تھا، جو علامی ابو الفضل کو دربار اکبری میں تھا، سعد اللہ خان کے تبحر علمی کے تمام معاصر مورخین معترف ہیں، عبد الحمید لاہوری سعد اللہ کا تعارف اس طرح کراتا ہے:-

"چوں گرامی توجہ کشور خدیو گیتی خدا باعتنا و فضلائے نامدار و ارتباط فصحا بلاغت دثار مصروف است و بمسامع مقدس کہ ہموارہ شاہراہ بشارت بار رسید، کہ ملا سعد اللہ کہ موطن و منشاء او دار السلطنۃ لاہور است بحلیہ فضائل و کمالات عقلی و نقلی و حفظ قرآن مجید و حسن تقریر و لطف تحریر متحلی است، در ذہن وقاد و فکر نقاد و کثرت معلومات و بسطت مدرکات مشارکُ و مساہم ندارد، بموسوی خان صدر حکم شد کہ آن حاوی فضائل را بسعادت بساط بوس مستسعد گرداند، خان مذکور، روز یک شنبہ ہفدہم ایں ماہ (رمضان) اورا بایں دولت عظمیٰ فائز گردانید، پادشاہ دوربیں ثواب گزیں از خطوط پیشانی او استعداد کار گزاری و کارданی دریافتہ، در سلک زمرۂ بندگان منسلک گردانیدند"[۱]

[۱] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۲۲۰

یہی بات عمل صالح جلد دوم میں اس طرح مذکور ہے:-

"..... در رمضان سنہ یکہزار و پنجاہ بصدارت و سفارش زبدہ سلسلہ حضرت خیرالبشر موسوی خان صدر کل بدریافت شرف حضور ماذون گشتہ، در مجلس اوّل از پرتو کمال قدرشناسی و مرتبہ دانی حضرت خلافت مرتبت استعدادش صورت نمو پذیرفت، و ببرکت تمیز اشرف و فطرت دقیقہ رس آنحضرت مقدار کمال آن بلند اقبال پدیدار گشتہ۔ دقت طبع وجودت فہم و کثرت فراست وحدس صائب و استنباط دقائق، و دریافت حقایق و تفصیل تحصیل ابواب دانش آن جامع فضائل وہبی و کسبی خاطرنشان اہل علم گشت، چون ہگی ہمت بادشاہ ہنر پرور دانش نواز در ترویج شرع مبین و امداد و تقویت اکابر دین و اشراف و تعظیم علما و صلحا، و تربیت طلبۂ علم و حسن اہتمام در پیش آوردن طائفہ مذکور معروف است ببرکت ہمزبانی خاص آنحضرت کہ ہم صحبت آب زندگانی است حیات جاودانی یافتہ، بروز رزانہ مناسب و خلعت و اسپ سرفراز گردیدہ در زمرۂ بندگان منسلک گشت، .... رفتہ رفتہ کار ران جامع الکمالات از عنایت خاص آنحضرت بجاے کشید، کہ در سال دوم بمنصب جلیل القدر سہ ہزاری دو ہزار سوار و خدمت خانسامانی سربلند گشتہ، در انجمن ہمدم و دمساز و در خلوت محرم و ہمراز گشت، و در سال چہارم از فیض تربیت سحاب آن ابر گوہر بار سپہر قدرشناسی نہال اقبالش طولی مثال بالیدہ زینت افزائے بوستان، وزارت کل ہندوستان گشت، و در سال ہفتم بعنایت منصب ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار از انجملہ پنجہزار دو اسپہ سہ اسپہ دادہ کہ در دوام انعام و خطاب علامی و فہامی دقایق مراتب کمالات از ارتفاع درجات آسانی در گذرانید[1]"

افضل خان شکر اللہ نام، افضل خان خطاب تھا، شیراز کا رہنے والا تھا، ابراہیم ہمدانی اور میرتقی

[1] عمل صالح جلد دوم ص ۳۳۶،

محمد سے تعلیم حاصل کر کے جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان آیا اور شاہی ملازمت میں داخل ہوا جب جہانگیر نے شہزادہ خرم کو اودے پور کی مہم پر بھیجا، تو ساتھ گیا یہاں اس نے قابل قدر خدمت انجام دی، جہانگیر نے افضل خان کا خطاب دیا، شاہجہان جب سریر آرا ہوا، تو وہ اپنی لیاقت و قابلیت کے سبب وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر مامور ہوا، ہفت ہزاری و چار ہزار سوار کے منصب پر فائز تھا،[۵]

ملا محمد فاضل بدخشان کے رہنے والے تھے، کابل، توران، اور شیراز سے علم معقول و منقول حاصل کر کے ہندوستان آئے، تفسیر اور اصول کی تعلیم ملا جمال لاہوری سے حاصل کی، اپنی لیاقت کے سبب عدالت اردوئے کیہان پر فائز تھے،

ملا یوسف لاہوری تفسیر اور منقولات کے ماہر تھے،

عبدالسلام دیوی، معقول منقول، فقہ اور اصول فقہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے، شاہی فوج کیساتھ منسلک تھے،

قاضی محمد زاہد کابلی، کابل میں شاہی قضائت پر مامور تھے، یہ وہی ہیں جنکی تالیف میر زاہد رسالہ معقولات میں درس نظامی کی اونچی کتاب سمجھی جاتی ہے،

قاضی محمد اسلم ہرات میں پیدا ہوئے، بخارا میں علوم دینیہ حاصل کیا، جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آئے، ان کی دینداری و پرہیزگاری سے متاثر ہو کر جہانگیر نے شاہی لشکر کا قاضی بنایا، شاہجہان نے ان کو امام خاص بنایا،

قاضی محمد سعید کرہرودی، کچھ دنوں تک دارالخلافہ داغ رہے، پھر عرض مکرر کی خدمت انجام دی، آخر میں بیوتات نوازش کے دیوان تھے، ہزاری منصب پر فائز تھے،

ملا میرک شیخ ہروی، ہرات سے ہندوستان آئے، پھر مکہ معظمہ گئے، وہاں حدیث کی تعلیم حاصل

---

[۵] بادشاہ نامہ جلد اول ص ۲۳۹،

کی ہندوستان آئے، تو شاہجہان نے داراشکوہ اور مراد بخش کی تعلیم کے لئے مقرر کیا،

ملا عبد اللطیف سلطانپوری، تقریر و تحریر اور علمی تحقیق و تدقیق میں یگانۂ روزگار تھے، داراشکوہ کی تعلیم کے لئے مقرر تھے، آنکھوں کی بصارت جاتی رہی، تو شاہجہان نے چند مکانات ان کو بطور انعام دیے اور اجازت دی کہ وطن جاکر علوم دینیہ کا درس دیں،

میر محمد ہاشم معقولات، منقولات، طب اور ریاضی کے عالم تھے، شاہجہان نے انکی لیاقت کو دیکھکر تمام ملک کی صدارت و طبابت کی خدمت پر مامور کیا، پھر اورنگزیب کی تعلیم انہی کے سپرد کی گئی، تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھکر شاہجہان کے نام سے معنون کیا،

شیخ محمد مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے، وہاں سے تعلیم حاصل کرکے ہندوستان آئے، پرہیزگاری نیک کرداری اور دوسرے فضائل سے متصف تھے، شاہجہان نے انہیں دارالسلطنت کا میر عدل مقرر کیا[1]

ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، مآثر الکرام میں انکا ذکر ان الفاظ میں ہے:-

"علامۂ زمان افتخار زمانیان است، الحق در جمیع فنون درسی مثل او از زمین ہند برنخاست آثار دانش باین کیفیت وکمیت وحسن قبول بر صفحۂ روزگار نداشت، مولد و منشا او سیالکوٹ از توابع لاہور است، ...... چون نوبت دارائے ہندوستان بہ صاحب قرآن شاہجہان انار اللہ برہانہ، رسید، و طائفۂ علما و شعرا را رواجے دیگر پدید آمد، ملا درین عہد بارہا خود را بہ درگاہ خلافت رسانید، بر گاہ و ار حضوری گردید، بہ رعایت نقود تا معدود مخصوص می گشت و دو بار بہ زر سنجیدہ شد، و مبالغ ہم سنگ ہم گرفت وچند قریہ بہ رسم سیورغال انعام شد ملا بہ حضور خاطر و فراغ بال در وطن مالوف اقامت داشت، و تخم علم و فضل در سرزمین

---

[1] مذکورۂ بالا علماء کے حالات کے لئے دیکھو بادشاہنامہ جلد اول از عبد الحمید لاہوری ص ۳۴۶ - ۳۳۹ [2] مزید تائید کیلئے دیکھو بادشاہ نامہ جلد اول ص۳۴۶،

سینہ ہا وسفینہ ہا می کاشت ، تصانیف او در بلاد عرب و عجم سائر و دائر داشت[1]"

شیخ عبدالحق دہلوی ، ان کا ذکر خیر عبدالحمید لاہوری ان الفاظ میں کرتا ہے :

"مجمع فضائل صوری و معنویت ..... او در فنون دانش یکصد و کسری از تصانیف مختصرہ و مطولہ دارد ، با آن کہ عقود زندگیش بتسعین پیوستہ است از سلامت قوی با نواع طاعات و ریاضات و تعلیم و تالیف و تصحیح بسان ایام شباب می پرداز و از اعقاب او ہفت تن تحصیل علوم رسمیہ نمودہ بافادہ مشغول اند ......"[2]

مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شیخ صاحب کا لگاؤ شاہجہانی دربار سے کیا تھا ،

ملا فرید دہلوی ، یمین الدولہ آصف خان کے حسنِ اہتمام سے ملا فرید دہلوی نے اور منجموں کی مدد سے ایک زیچ تیار کی جسکا نام زیچ شاہجہانی رکھا ، شاہجہان کے سامنے جب یہ زیچ پیش کی گئی ، تو اس نے عام استصواب کی خاطر ہندوستانی زبان میں ترجمہ کے لئے حکم دیا ،[3]

میر محمد صالح مشکیں قلم ، میر عبداللہ زریں رقم کا لڑکا تھا ، ایک کتاب مناقب مرتضوی لکھ کر شاہجہان کو گذرانی ، شاہجہان نے چند اوراق دیکھے ، تو بہت پسند کی ، پانچ ہزار روپیہ اور ایک ہاتھی انعام میں دیا ،[4]

ہندو اہل علم **چندربھان** برہمن ، یہ عہد شاہجہانی کا سب سے بڑا ہندو ادیب تھا ، پنجابی برہمن تھا ، لاہور میں پیدا ہوا ، ملا عبدالکریم سے تعلیم حاصل کی ، آگے چل کر فارسی زبان کا باکمال شاعر ہوا ، برہمن تخلص کرتا تھا ، اس کا فارسی دیوان ابتک کتب خانوں میں موجود ہے ، فارسی ادب میں بڑی دستگاہ حاصل کی تھی ، اس لئے دربار شاہی کے سلکِ ملازمین میں داخل ہو کر وقایع نویس یعنی شاہی تاریخ و روزنامچہ

---

[1] تصانیف کی فہرست کے لئے دیکھو مآثر الکرام دفتر اول ، ص ۲۰۰ ، [2] بادشاہنامہ جلد اول ص ۳۴۲ ، [3] عمل صالح جلد اول ص ۳۶۲ ، [4] خافی خان جلد اول ص ۶۰۵ ،

کا چیف اڈیٹر مقرر ہوا، اس عہدۂ جلیلہ کے باعث وہ روزانہ دربار شاہی میں حاضر ہو کر ہر روز کے مرتبہ واقعات وحالات سناتا تھا ۱۰۵۱ء میں اوس نے چہار چمن برہمن لکھ کر نوروز کے موقع پر سرہند میں دربار شاہجہانی سے گذرانی آخر میں دارا شکوہ کا میر منشی ہوا،[ا]

شاہجہاں، اکبر و جہانگیر کی طرح ہند و اہل کمال کی برابر سرپرستی کرتا رہا، ۱۰۶۱ء میں ایک ہندی شاعر نے اس کے نام پر ایک کبت لکھی، تو اسکو دو ہزار روپیے اور ایک ہاتھی مرحمت کیا،[ب] ہندی شاعری میں سندر اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اسکی تصنیف "سندر سرنگار" اور "سنگھاسن بتیسی" برج بھاشا میں مشہور ہے، ہندی کے مشہور شعراء چنتا منی اور راجہ شمبھو ناتھ سنگھ بھی اسکے دربار سے منسلک رہے، چنتا منی ہتا یعنی ترکیب نظم کا استاد تھا، راجہ شمبھو ناتھ نے شاہجہاں کی فرمائش سے کوندر اکلپ تا لکھی، اس کتاب میں شاہجہاں، دارا شکوہ اور جہاں آرا بیگم کی مدحیہ نظمیں ہیں،[ج]

ان ارباب علم کے علاوہ شاہجہاں کے عہد میں مندرجۂ ذیل علماء و شعراء بھی تھے، جن کا ذکر قزوینی کی شاہجہان نامہ میں ہے،

(۱) سید بخاری گجراتی، (۲) سید جلال الدین، (۳) شیخ میر لاہوری، (۴) خواجہ خوند محمود، (۵) شیخ بہلول قادری، (۶) مرزا ضیاء الدین، (۷) مولنا محب علی، (۸) شیخ نذیری (۹) ملا شکراللہ شیرازی (۱۰) میر ابوالقاسم ایرانی،[د]

[ا] دیکھو معارف جلد ۲ نمبر ۲ مضمون ہندوں کی علمی و تعلیمی ترقی، از علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ، نیز مخزن الغرائب از سندیلوی، [ب] خافی خاں جلد اول ص ۷۰۰، [ج] کی ہسٹری آف ہندی لٹریچر، [د] یہ نام نریندر ناتھ کی کتاب "پروموشن آف محمدن لرننگ" سے لئے گئے ہیں، قزوینی کی شاہجہان نامہ میری نظر سے نہیں گذری، اس لئے ان علماء و شعراء کے حالات اور ان کی شاہی دربار سے لگاؤ پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہوں،

مورخین، شاہانِ مغلیہ کو تاریخ سے خاص ذوق رہا ہے، اسلئے ہر حکمراں کے عہدِ حکومت میں تاریخ نویسی کا خاص محکمہ رہا، شاہجہاں نے اس ذوق کی تکمیل کے لئے متعدد اہلِ قلم کی خدمات حاصل کیں، چنانچہ اس کی فرمایش سے جو تاریخیں مرتب ہوئیں وہ مندرجۂ ذیل ہیں،

۱- بادشاہ نامہ از محمد امین قزوینی،

۲- بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری،

۳- بادشاہ نامہ از محمد وارث،

۴- شاہجہاں نامہ از مرزا جلال الدین طباطبائی،

محمد امین قزوینی، محمد امین ابن ابوالحسین قزوینی ایران سے آکر پانچویں سن جلوس میں شاہجہانی دربار میں منشی کے عہدہ پر مامور ہوا، شاہجہاں اپنے دربار کے موجودہ تاریخ نویسوں کی کارکردگی سے خوش نہیں تھا، وہ ایک لائق اہلِ قلم کی تلاش میں تھا، اتفاق سے قزوینی نے بندیلہ کی جنگ کے حالات لکھکر پیش کئے، شاہجہاں اسکی لیاقت سے خوش ہوا، ۱۰۴۵ھ یعنی آٹھویں سن جلوس میں قزوینی سے فرمایش کی کہ وہ اسکی پیدایش سے موجودہ عہد تک کی ایک مفصل تاریخ لکھے، قزوینی نے ابتدائی دس سال کے احوال قلمبند کئے، دوسرے دس سال کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر نہ لکھ سکا، عملِ صالح[1] میں ہے

"مرزا امینا در اصطلاحاتِ زبان فارسی مہارت تمام دارد و قاعدہ فنِ انشا را بقانون می شناسد، شاہدِ نخش از لباسِ تکلف مبرا است و صاحبِ طبع و ذہنِ مستقیم ذکر رسا سابق خدمت نگارش بادشاہ نامہ بدو متعلق بود، و بعد ازان بخدمت جمع و قائع می پرداخت، مردے خوش ظاہر و خوش محاورہ بود"

عبد الحمید لاہوری، عبد الحمید کا مولد اور مسکن لاہور تھا، علامی ابو الفضل کا شاگرد تھا، اسلئے

---

[1] ایلیٹ جلد ۷ ص ۱، برٹش میوزیم کیٹلاگ ص ۲۵۹.

اسی کے طرز انشاء میں لکھنے کی مہارت رکھتا تھا، لیکن زمانہ کی نامساعدت سے ٹھٹھہ میں آکر عزلت نشین ہو گیا تھا، اسکے ادب و انشاء کی خبر شاہجہاں کو ملی، تو اس نے اسکو دربار میں طلب کیا، شاہجہاں چاہتا تھا کہ ابوالفضل کی اکبر نامہ کے طرز پر اسکی حکومت کی بھی تاریخ لکھی جائے، چنانچہ عبد الحمید کو اسی خواہش کو محوظ رکھتے ہوئے تاریخ نویسی کے لئے مامور کیا، عبد الحمید خود لکھتا ہو:۔

"بتوسید بعضی از ملتزمان بساط تقرب بعرض اشرف اقدس رسید، کہ عبد الحمید لاہوری المولد والمنشا کہ دل رمیدہ را از اختلاط این وآن وخاطر شوریدہ را از ارتباط فلاں وبہماں وا پرداختہ، در معمورہ پٹنہ بزاویہ تنہائی، وبیغولہ بے نوائی درساختہ است روش سخن پردازی وطرز انشاء طرازی شیخ ابوالفضل نیک فراگرفتہ، اگر نگارش معالی ومکارم ایں دولت والا وگذارش محامد ومآثر ایں سلطنت دست بالا، بدو بازگذاشتہ آید ہر آئینہ ایں تالیف منیف وایں تصنیف شریف بنہجے کہ در خاطر دوربیں صواب گزیں مرکوز است نگاشتہ بود"[۱]

یہ تاریخ شاہجہاں کی بیس سال کی حکومت پر مشتمل ہو، عمل صالح کا مصنف لکھتا ہو کہ شاہجہاں اسکی خدمت سے اسقدر خوش تھا کہ اس نے دو مرتبہ اسکو روپیے میں تلوا کر انعام عطا کیا[۲]

محمد وارث، آخر میں کبر سنی اور ضعف کے سبب عبد الحمید اس فرض کو انجام نہیں دیسکتا تھا، اس کے شاگرد محمد وارث کے ذمہ یہ خدمت سپرد کی گئی، جس نے بقیہ دس سال کی تاریخ کو مکمل کیا، وارث لکھتا تھا اور علامی فہامی سعد اللہ خان دیکھتے تھے، پھر علاء الملک طونی المخاطب فاضل خان

---

[۱] ایلیٹ ٹھٹھہ کے بجائے پٹنہ لکھتا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخہ میں بھی پٹنہ لکھا ہو، لیکن اورنٹیل لائبریری پٹنہ کے فاضل کٹیلاگ کرنے صاف طور سے بتایا ہو کہ پٹنہ نہیں ہو بلکہ ٹھٹھہ ہے، پٹنہ کتابت اور پڑھنے کی غلطی ہو، ملاحظہ ہو، کٹیلاگ جلد ۷ ص ۶۔ [۲] بادشاہنامہ جلد اول ص ۱۔ [۳] عمل صالح۔

جو شاہجہانی عہد میں خانساماں کے عہدہ پر ممتاز تھا اور اورنگ زیب کے زمانہ میں ..... یہ نظر ثانی کیا کرتا تھا، آخر کا کچھ حصہ اس نے خود لکھا[۱]،

مرزا جلالہ طباطبائی، اصفہان سے ہندوستان ۱۰۴۶ھ میں آیا، شاہجہان کے درباری مورخین میں داخل ہوا، پانچ برس کی تاریخ لکھنے پایا تھا، کہ دشمنوں نے اسکے خلاف سازش کی اور وہ اس خدمت سے محروم کر دیا گیا، شش فتح کانگڑہ اسی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے، اس میں شاہجہاں کی شاندار فتح کا حال لکھا ہے، اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی تحریر میں چھ قسم کا طرز اختیار کیا ہے[۲]،

درسگاہیں ان درسگاہوں کو جو اکبر و جہانگیر اور ان کے امراء نے قائم کیں، شاہجہان نے نہ صرف ان کو بجنسہ رہنے دیا، بلکہ انھیں فروغ دینے کی کوشش کی، ان کے علاوہ جامع مسجد دہلی کے ہمسایہ اس نے ایک مدرسہ دار البقار نامی قائم کیا، جس میں طلبہ معقول و منقول کی تعلیم حاصل کرتے تھے[۳]

[۱] ایلیٹ جلد ۷، صفحہ ۱۲۳، [۲] اس عہد کی اور بھی مشہور تاریخیں ہیں، مثلاً محمد صالح کی عمل صالح دو جلد اور محمد صادق خان کی شاہجہان نامہ مگر ان مورخوں کا بظاہر کوئی تعلق شاہی دربار سے نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس مضمون میں ان کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا، [۳] آثار الصنادید از سید احمد خاں باب تیسرا صفحہ ۱۲،

رقعاتِ عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں، اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور ان سے علم و ادب، سیاست، اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ضخامت ۲۹۰ صفحات، طباعت، کتابت، کاغذ بالخصوص ٹائٹل، نہایت دلفریب، قیمت: ۔ ۳ روپے

"منیجر"

رامچندر جی کی کہانی

از

جناب سلطان احمد صاحب بدایونی

اس مضمون کا مقصد اردو داں اصحاب کو مسٹر ملا دی وین کٹا رتنام بی اے سابق وائس پرنسپل گورنمنٹ ٹرینگ کالج راج مندری (دکن) کی ایک تصنیف سے متعارف کرنا ہے جس کا نام "رام مصر کا فرعون" ہے،

کتاب کے نام سے ظاہر ہے، کہ مصنف کا موضوع بحث ہندوستان کی وہ مشہور ہستی ہے جسکو والمیک اور تلسی داس نے حیات دوام بخش دی ہے، راماین اور مہابھارت ہند کے ادب قدیم کے دو زبردست شاہکار ہیں، بہت سے دماغ ان کے مطالعے سے لطف اندوز ہو چکے ہیں، مگر وہ نقاد جو تاریخی تحقیق کے مقصد سے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ہمیشہ مایوس رہتے ہیں نہ تو اب تک ان کا زمانۂ تصنیف معین کیا جاسکا ہے، نہ یہ کہا جاسکتا ہے، کہ ان کے بیانات میں کہاں تک اصلیت موجود ہے، اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے، کہ دونوں کتابیں بعد آنے والوں کی تحریف سے محفوظ نہیں رہی ہیں،

مسٹر وین کٹا رتنام نے ان کی تاریخی حیثیت سے بحث کی ہے، اور غیر معمولی جسارت سے کام لیا ہے، رامچندر جی اور کرشن جی کی ذات اب انسانیت سے بالاتر سمجھی جاتی ہے، لاکھوں انسانوں کے قلوب اُن کو معبود یا معبود کا پرتو خیال کرتے ہیں، ایسی صورت میں اگر ان کو قدوسیت اور الوہیت

کے سریر علوی سے اتار کر اس دنیا کے بادشاہون میں جگہ دی جائے، تو یہ خود ایک مجرمانہ جرأت
ہوگی، مگر وین کلا رتنام کی تصنیف تو اسی پر بس نہیں کرتی، بلکہ ان محبوب ہستیون اوران کے تمام
متعقین کو جن کی مدح وثنا کرتے ہمارے شعراء اور بھگتون کو صدیاں گذر گئی ہیں، ہم سے چھین کر
مصر کو سونپے دیتی ہے، لیکن مورخ کا قلم جذبات کا احترام کیوں کرے،

کتاب زیر بحث راماین کے افسانے کو ایک مصری فرعون کا قصہ بتاتی ہے، یہ نسبت حیرت خیز
معلوم ہوتی ہے کہاں مصر اور کہاں ہندوستان کا یہ فصیل بند رمنہ، پھر تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے
دیکھا جائے تو یہ بعد مکانی اور بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اس نسبت کو سُن کر پہلے تو لبوں پہ وہ تبسم
پیدا ہوتا ہے، جو کسی مجذوب یا دیوانہ کی باتوں پر آیا کرتا ہے، لیکن مطالعہ کے بعد استہزاء استعجاب سے
بدل جاتا ہے،

مصری تعلق اسقدر حیرت انگیز نظر آنے کا سبب یہ ہے کہ ہم ابتداء سے ہندی تمدن کو ایک پردہ
نشین عورت سمجھتے آئے ہیں، جس کا آنچل بھی کسی نامحرم نے نہیں دیکھا تھا، مدرسوں کی ابتدائی جماعتون
سے آخر تک بار بار یہ سبق دیا گیا ہے کہ شمال نے ہمالہ پہاڑ اور باقی تین طرف سمندر نے عہد قدیم میں
اس خطۂ جنت نشان کو پڑوس کے تمام ملکوں سے بالکل الگ تھلگ رکھا، لیکن حال کے محققین جو نظریے
پیش کر رہے ہیں، ان کا تقاضا ہے، کہ جلد سے جلد اس عقیدۂ باطل سے توبہ کر لیجائے، چنانچہ مسٹر دین
کلا رتنام کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کرنے سے پہلے مناسب ہوگا، کہ ہند اور مغرب کے ہمسایہ ملکوں کے
میل جول کا کچھ اندازہ کر لیا جائے، تاکہ مصری عقائد اور روایات کا ہندوستان میں پایا جانا ہمیں حیرت
میں نہ ڈالے،

ہندوستان کے پرانے رہنے والے وہ قبیلے تھے، جن سے جنوبی ہند اب تک بھرا ہوا ہے،
یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں سے آکر یہاں آباد ہوئے، لیکن یہ واقعہ ہے

وہ کافی متمدن تھے، اور ہمسایہ قوموں سے ربط ضبط رکھتے تھے، ہندوستان کے مغرب میں تہذیب کے دو بڑے گہوارے تھے، نیل کی وادی مصر میں اور دجلہ کی وادی عراق میں مسیح علیہ السلام سے چار ہزار سال پہلے ان دریاؤں کے کناروں پر انسان متمدن زندگی بسر کر رہا تھا، بہت سے فنون وہ حاصل کر چکا تھا، اور اسکی حیرت انگیز یادگاریں آجتک باقی ہیں، لیکن ہندوستان میں دریاے سندھ کی وادی میں ڈراور قوموں کی تہذیب بھی ان سے پیچھے نہ تھی، اور یہ غالباً اس مسلسل تعلق کا نتیجہ تھا، جو ہندی ڈراوروں کو ہمسایہ قوموں کے ساتھ ہمیشہ رہا،

سندھ کی وادی میں جو مہریں زمین سے برآمد ہوئی ہیں، ان کے نقش ونگار علماے آثار کے نزدیک قدیم سمیری طرز سے مشابہ ہیں، جو عراق اور بابل کی قدیم ترین متمدن قوم تھے، سندھ سے ذرا پرے ہٹ کر سیستان میں مٹی کے برتن سمیری برتنوں سے ملتے ہوئے پائے گئے ہیں[1] ڈراور قوم میں مُردے دفن کرنے کی رسوم وہی تھیں جو جزیرہ کریٹ یا شہر ٹرائے اور بابل میں رائج تھیں، دکن میں چنگل پٹ، مدورا، اور سلیم کے اضلاع میں جو مٹی کے تابوت نکلے ہیں، وہ شکل میں ان تابوتوں سے مشابہ ہیں، جو برہمن آباد اور موہنجودارو (واقع سندھ) یا گہارہ (واقع عراق) اور دوسرے بابلی شہروں میں پائے گئے ہیں[2]،

اِن کے علاوہ بابل کے کلدانی دور میں ہند اور بابل کے درمیان تجارتی تعلقات کا ثبوت بعض الفاظ سے ملتا ہے، جو ہند سے بابل پہنچے تھے، مثلاً "من" کا لفظ ایک وزن یا مقدار کے معنی میں بابل میں بھی مستعمل تھا، اسی طرح سِندھو ایک کپڑے کو کہتے ہیں، جو غالباً سندھ میں بنتا ہوگا[3]،

ہندی اور بابلی میل جول نے دریاے سندھ کی وادی کو تہذیب کا وہ مولد بنا دیا تھا، جس کو ہندوستان میں بجا طور پر اوّلیت کا شرف دیا جا سکتا ہے، ڈاکٹر ہنڈار کرنے گذشتہ انڈین کلچرل

[1] مشرق قدیم مصنفہ ہوگرٹ، [2] ہند قدیم، بنرجی، [3] ویدی ہند رگوزن، صفحہ ۳۰۵،

کانفرنس کا خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہوئے کہا تھا کہ "دریاے سندھ کی وادی ایک غیر آریہ تہذیب کا گہوارہ تھی، آریہ قوم نے اس تمدن سے جو کچھ سیکھا اس کا صحیح اندازہ اب تک نہیں کیا گیا ہے، یہ حقیقت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ آخر زمانے کے ہندو مذہب کو رگ وید کے قدیم مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں، برخلاف اس کے بعد کا ہندو مذہب اُس غیر آریہ مذہب سے بہت کچھ ہمرنگ ہے، جو سندھ کی وادی میں پہلے سے موجود تھا"

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے ڈراور قومیں جہاز رانی سے واقف تھیں، اور جب آریہ بدیسیوں نے اُن کو دھکیل کر جنوبی ہند میں اتار دیا تب تو ان کے بیرونی تعلقات اور بھی زیادہ وسیع ہو گئے، توریت میں مذکور ہے کہ ملکۂ سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو تحائف نذر کئے، اُن میں بہت سی خوشبو کی چیزیں، سونا اور بیش قیمت جواہر تھے، ان تحائف کے جو نام عبرانی توریت میں تحریر ہیں، وہ عبرانی الاصل نہیں، بلکہ جدید تحقیق کے مطابق ڈراوری الفاظ ہیں[1]

اسی کیسا تھ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ابتداے تاریخ سے عربی قومیں تجارت اور جہازرانی میں ممتاز رہی ہیں، ان میں سب سے زیادہ نامور فنیشین یا فنیقی تھے، جو مسیح سے تقریباً ڈیڑھ دو ہزار سال پہلے عروج حاصل کر چکے تھے،

فنیقیوں اور عربوں کی سیاحت اور تجارت آریہ اور سامی قوموں کے میل جول کا بہت بڑا ذریعہ تھی، بہت سے ہندی الفاظ عرب تاجروں کی وساطت سے نقلِ وطن کرکے عرب میں آباد ہو گئے زنجبیل کافور، اور مشک وہ تین ہندوستانی الفاظ ہیں، جو عرب کی ٹکسالی زبان میں شامل ہو کر اتنے عربی نما ہو گئے تھے، کہ قرآن کریم میں بھی موجود ہیں[2]، فن ملاحی کی بہت سی اصطلاحات جو عربی جہازرانوں میں رائج تھیں، ہندی الفاظ سے ماخوذ بتائی جاتی ہیں[3]

---

[1] ویدی ہند، ریگوزن، ص۳۰۳، [2] عرب اور ہند کے تعلقات سید سلیمان ندوی، ص۶۳، [3] ۔۔

جدید نظریات کی روشنی میں دیکھا جائے، تو ہند اور مغربی ایشیا کے درمیان سب سے بڑا واسطہ اتحاد خود آریہ قوم تھی، اب تک آریہ قوم کا ابتدائی وطن ہندوکش کے پرے کسی نامعلوم خطہ کو بتایا جاتا تھا، لیکن ایک عرصہ سے یہ نظریہ زیر بحث آرہا ہے، مسٹر بال گنگا دھر تلک کا خیال تھا، کہ آریہ وطن بحر شمالی کے ساحل پر کسی جگہ واقع تھا، مسٹر جے جی سپرنٹنڈنٹ آثار قدیمہ کاشمیر نے بعض جرمن مستشرقین کے اشارات سے امداد پاکر اس نظریہ کو پیش کیا، کہ آریہ قوم کا مولد بابل یعنی بحر اسود کے سواحل کو سمجھنا چاہئے، گذشتہ سال ڈاکٹر پیران ناتھ (بنارس یونیورسٹی) نے ایک سلسلۂ مضامین اسی مبحث پر سپرد قلم فرمایا تھا، اور دکھایا تھا، کہ ایشیائے کوچک میں جہاں سامی النسل قومیں آباد تھیں، وہیں پہلو بہ پہلو آریہ قومیں بنتی بگڑتی رہیں، کلدانی آشوری، کنعانی وغیرہ اگر سامی النسل تھیں تو حطی، مطانی، میدی وغیرہ آریہ، مصر ڈاکٹر صاحب کے بقول سامی اور آریہ دونوں قوموں کا جولانگاہ رہا، رگ وید میں ڈاکٹر صاحب کو بابل کی تاریخ کے اتنے حوالے ملتے ہیں، کہ وہ اس کتاب کو ہندی نہیں بلکہ سمیری کہنا زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں، اُن کے نزدیک ہندوستان میں آریہ ایشیائے کوچک سے آئے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے، کہ ان میں بہت سے نوآباد کار مصر سے تشریف لائے ہوں[1]

اس سے بہت پہلے ڈاکٹر ہیول نے بھی یہ خیال ظاہر کیا تھا، کہ ہندوستان کے اندر بعض آریہ آبادیاں ایشیائے کوچک سے آنے والوں نے بسائی تھیں، وہ کہتا ہے کہ گمان غالب یہ ہے کہ پنجاب میں جو آریہ آباد ہوئے، ان میں بہت سے سمندر کی راہ سے خلیج فارس اور دریائے سندھ کے کنارے کنارے آئے، دو ہزار قبل مسیح کے بعد مطانی آریوں نے (ایشیائے کوچک میں) ایک طاقتور سلطنت قائم کرلی تھی، ...... جب یہ سلطنت آشوریوں اور حطیوں کے ہاتھ سے برباد ہوئی تو مطانیوں کے لئے

---

[1] ماڈرن ریویو کلکتہ؟ انڈیا ویکلی، جولائی اگست ستمبر ۱۹۳۵ء؛ ہسٹری آف آرین رول، ہیول ص ۱۵

راہ فرار بس یہی تھی کہ براہ دریا خلیج فارس تک اور وہاں سے ہندوستان تک پہونچیں؛ [1]

عجب نہیں کہ دکن میں آریہ قوم کا پہلا قدم سمندر ہی کے راستے سے پہنچا ہو، بے اصل قصص سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو دکن میں آریوں کا پہلا فاتحانہ داخلہ چندر گپت موریہ کے عہد میں ہوا، موریہ سلطنت اسوقت تمام شمالی ہندوستان پر پھیل چکی تھی، چنانچہ گجرات کی جانب سے آریہ سلطنت دکن کی طرف بڑھی، اور کانکن کا علاقہ جو مغربی ساحل کے برابر واقع ہے، سب سے پہلے فتح ہوا، حالانکہ جغرافی اعتبار سے یہ وہ حصہ تھا جو موریہ دارالسلطنت سے بعید تر ہونے کے علاوہ پہاڑوں اور دریاؤں کے سبب گجرات سے بالکل منقطع تھا، قدرتی طور پر موریہ سلطنت کو دکن کی طرف پھیلنے کے لئے جو راستہ اختیار کرنا چاہئے تھا، وہ مگدہ یا جنوبی بہار کے متصل علاقوں یعنی تلنگانہ اور گونڈوانہ سے گذر کر آگے بڑھتا، یہ الجھن اس نظریہ کی روشنی میں صاف ہو جاتی ہے کہ مغربی ساحل پر آریہ قوم کی آبادی آریہ سلطنت کے پہونچنے سے پہلے موجود تھی، اور اس خطہ کی جائے وقوع اس امر کی شاہد معلوم ہوتی ہے، کہ اس کے آریہ باشندے سمندر کے راستے سے آکر وہاں آباد ہوئے تھے،

دکن کی ساری سرزمین میں یہی کانکن کا علاقہ جو مرہٹوں کا آبائی وطن ہے، آریہ تمدن اور آریہ نسل سے آباد ہے، جنوبی ہند کی تمام زبانوں میں صرف مرہٹی زبان کو آریہ خاندان میں شمار کیا جاتا ہے، اور بقیہ تمام دراوری زبانیں بتائی جاتی ہیں، اس کے علاوہ تمام دکن میں دراوری تہذیب کا اثر غالب نظر آتا ہے، اور ان میں صرف مرہٹہ مرقوم مستثنیٰ ہے، بہ الفاظ دیگر اس کا یہ مطلب ہے کہ صرف کانکن ہی وہ حصہ تھا، جہاں آریہ آباد ہوئے تھے، بقیہ دکن پر انکا تصرف فاتحانہ حیثیت سے قائم ہوا،

مختصر یہ ہے کہ ان اکتشافات کی روشنی میں جو آریہ قوم کا ابتدائی وطن ایشیائے کوچک

---

[1] ہسٹری آف آرین رول، ہیول صفحہ ۱

میں قائم کرتے ہیں، آریہ اور سامی تہذیب کا میل جول اور عقائد و روایات کا لین دین قرین قیاس ہوجاتا ہے، ان دونوں قوموں کی روایات کا مطالعہ اس نظر سے کیا جائے تو محنت بار آور ثابت ہونے کی امید ہے، کیونکہ یہ ابتدائی ربط بعد کو بھی تازہ ہوتا رہا، وادی سندھ اور پنجاب کے علاقے تو بالخصوص مغرب کے ہمسایہ ممالک سے ہمیشہ پیوستہ رہے، اور غالباً اس تعلق کو برقرار رکھنے میں سب سے زیادہ آشوریوں نے امداد کی،

آشوری سب سے پہلی قوم تھی، جس نے ایک وسیع سلطنت کی بنا ڈال کر مختلف ممالک اور مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے ساتھ ملنے جلنے کا موقع دیا، نویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں آشوری سلاطین کے لشکر میڈیا اور پارس پر حملہ کرتے تھے، شمالی شام سے گذر کر جنوبی شام تک پہنچ گئے تھے، دمشق اور فنیقیوں کی سلطنت ان کی باجگذار تھی، تکلات فلازار ثانی کے تخت نشین ہونے پر (۷۴۵ ق م) ایک نئی روح پیدا ہوگئی،

نئے نئے ممالک فتح ہوئے، مصر تک زیر نگین آگیا، مشرق میں آشوری سلطنت کے ڈانڈے اندلس سے مل گئے، اور یونان بھی مفتوحہ ممالک میں شمار ہونے لگا،[۱]

اُس دور میں کہ وسائلِ آمد و رفت مفقود تھے، بیرونی صوبوں پر مرکزی حکومت کا اقتدار ماتحت والیانِ ملک کی وفاداری پر منحصر تھا، چنانچہ ماتحت صوبوں اور مرکزی حکومت کے درمیان رابطۂ اتحاد مضبوط رکھنے اور تمدن و معاشرت کے اختلافات مٹانے کے لئے آشوریوں نے غالباً فراعنۂ مصر کی تقلید میں یہ دستور قائم کر لیا تھا، کہ مفتوحہ علاقہ کے سربرآوردہ لوگوں کو آشوریہ میں اور آشوریہ کے باشندوں کو نو تسخیر ممالک میں آباد کر دیتے تھے،[۲] اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ آشوری تہذیب ہمسایہ تہذیبوں میں گھل مل گئی ہوگی، چنانچہ یکجائی رسم الخط جو بابل اور آشوریہ میں

۱؎ تاریخ عہد قدیم، رالنسن ص۲۳-۲۰، ۲؎ نیو لارنڈ ہسٹری ص۵۱۹،

شروع ہوا تھا، تمام مغربی ایشیا میں عام ہو گیا، فراعنہ مصر کے صوبہ دار شام سے جو مراسلے لکھتے تھے، وہ اسی رسم الخط میں ہوتے تھے،

آشوریوں کے بعد جب ایران پر میدیوں کی طاقتور سلطنت قائم ہوئی، ان میں کیخسرو سب سے زیادہ مشہور ہوا، جس نے نینوا کو فتح کر کے سلطنت کے حدود ایشیائے کوچک تک پھیلا دئے، میدیوں ہی کے عہد میں بابل کی قدیم سلطنت نے دوبارہ عروج حاصل کیا، یہاں تک کہ اس کی حد شام و فلسطین تک پہنچ گئی، بابلی سلطان نے مصر کے فرعون نیکوۃ نامی کو خود اسی کے ملک میں پہنچ کر شکست دی، بنوکد نصر یا بخت نصر اس خاندان کا سب سے زیادہ مشہور سلطان تھا، (تاریخ انتقال ۵۶۲) اس کے عہد میں شام، فلسطین، فنیقیا اور مصر فتح ہو گئے تھے،

اُدھر میدیوں کے چند روزہ عروج کو پارسیوں نے ختم کر دیا، داراے اوّل کے عہد میں پارسی سلطنت مغربی ایشیا کی سرتاج حکومت تھی، اس کی قبر پر جو کتبہ موجود ہے، اُس میں سلطنت کے صوبوں کے نام درج ہیں، جن میں ایک طرف مصر اور یروشلم شامل ہیں، تو دوسری طرف پنجاب[1]، اسوقت دارا تمام دنیا کا بادشاہ معلوم ہوتا تھا، اور اس کے فرستادے شاہی احکام لئے ہوئے سندھ سے دریائے ڈینیل تک اور مصر سے لیکر وسط ایشیا تک سفر کرتے نظر آتے تھے[2]،

پارسیوں کے ہی عہد میں ایران اور یونان کے باہم خونریزی کا وہ طویل سلسلہ شروع ہوا، جس کا آخری نتیجہ سکندر کی فتوحات تھیں، مقدونیہ سے نکل کر سکندر نے ایشیائے کوچک، مصر، عراق، ایران، افغانستان، ترکستان اور پنجاب غرض کل مغربی ایشیا کو ایک سلطنت میں شیرازہ بند کر دیا، مگر یہ اتحاد عارضی ثابت ہوا، تاہم سکندر کے بعد ہندوستان کی سرحد پر باختر کی یونانی حکومت قائم ہو گئی، جس نے پھر ایک بار پنجاب پر قبضہ کر کے غالباً متھرا تک اپنے حدود وسیع کر دیئے، اُدھر وادیٔ سندھ میں

---

[1] ریگوزن صفحہ ۱، [2] تاریخ عالم، ایچ جی ویلز، صفحہ ۳،

دارائے اعظم کے صوبہ دار جواب خود مختار حاکم تھے، اب بھی کہیں کہیں حکومت کر رہے تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور گجرات کا حاکم رُدْرمن تھا جس کا کتبہ گرنار (واقع ریاست جوناگڈھ) کی مشہور چٹان پر موجود ہے،

غرض ولادت مسیح تک کوئی عہد ایسا نظر نہیں آتا، کہ ہندوستان کو مغربی ہمسایوں سے واسطہ نہ رہا ہو، اگر ایک طرف وادی فرات کی قومیں سواحل نیل کے لوگوں سے ملتی رہتی تھیں، تو دوسری طرف بابل آشوریہ، میدیا اور پارس کی سلطنتیں کبھی ہندوستان کی سرحد اور کبھی اندرون ملک تک پھیلی رہیں، ان حالات میں قدرتی بات تھی، کہ بہت سی مصری اور بابلی روایات ہندوستان آگئی ہوں، آج یقین کے ساتھ یہ بتانا تو مشکل ہے، کہ اس مسلسل تعلق کے سبب کون کون سے علوم و فنون عقائد و مراسم مغرب سے آکر ہمارے تمدن میں جذب ہوگئے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس طویل ربط کے باوجود بھارت دیس کی تہذیب اچھوتی نہ رہ سکتی تھی،

مصر اور بابل کے سامی تمدن کا ہندی تمدن سے اگر مقابلہ کیا جائے، تو بہت سے مشترک عقائد اور مراسم سامنے آجاتے ہیں، قدیم رگ ویدی ہندو تمدن، اور متاخر ہندو تہذیب میں جو بعد اور مغایرت ہے، اس کا سبب یہی بیرونی اثرات نہ ہوں، ممکن ہے کہ ہندوستان میں آریہ قوم کا ورود دو مختلف زمانوں میں اور دو مختلف مرکزوں سے ہوا، یا قدیم آریہ تہذیب کو دراوڑی میل جول نے کچھ سے کچھ کر دیا، تناسخ، ذات پات کی تفریق، برہمنوں کی غیر معمولی برتری، گائے کی پرستش، بتوں کی پوجا، مندروں کی تعمیر، ستی کا رواج، پردے کا دستور، ختنہ اور چوٹی وہ چیزیں ہیں، جن سے رگ ویدی معاشرت خالی معلوم ہوتی ہے، اور جو متاخر ہندو سماج کے لوازم ہیں، قیاس چاہتا ہے کہ یہ رسوم اور عقائد بابل، آشوریہ یا مصر سے ہم تک پہنچے ہوں گے، کیونکہ یہ ہمسایہ تمدن ہندو معاشرت سے اُسی قدر قریب نظر آتے ہیں، جتنا کہ رگ ویدی عہد بعید معلوم ہوتا ہے،

آشوری کلدانی زندگی کی ایک مختصر سی تصویر ملاحظہ ہو، جو سین وس کی کتاب تاریخ ملل قدیمہ

سے ماخوذ ہے، اور جو ہند و رسوم کا عکس نظر آتی ہے،

تہان کے امرا ر باز و بند گلو بند اور گوشوارے استعمال کرتے تھے، اُن کے بال بڑے بڑے اور گھونگر والے ہوتے تھے، عام لوگ ننگے پاؤں رہتے، بادشاہ اور امرا کئی کئی بیویاں کرتے تھے، اور اُن کو گھر دن میں قیدیوں کی طرح رکھتے تھے، دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیاں پتھر یا سونے چاندی کی بنا کر قیمتی لباس پہناتے، اور عمدہ مکانوں میں بہت حفاظت کیساتھ رکھتے، تیوہار کے دن اُن کو باہر نکالتے، اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ گشت دے کر پھر رکھدیتے، دیوتاؤں کی پُوجا میں بخور جلاتے اور جانور قربان کرتے تھے، وہ خیال کرتے تھے، کہ تارے خداوندوں کے بھید ظاہر کر دیتے ہیں، لہذا اُن کی حرکت کا کھوج لگاتے، اور اُن سے آیندہ واقعات معلوم کرتے، اُنکے کاہن پہلے سے ہوا یا نی طوفان، سخت گرمی، اور اچھی بُری پیداوار کی خبر دیدیتے تھے، بلکہ انیوں کا خیال تھا، کہ بچے کی پیدایش کے وقت تارے کے موقعے اور محل کو دیکھکر اُس بچہ کے آیندہ واقعات زندگی معلوم ہوسکتے ہیں، اور ہر آدمی کے لئے ایک خاص ستارہ ہوتا ہے، جس کے اثر میں اسکی زندگی بسر ہوتی ہے، تمام حوادث خصوصًا امراض کو شیاطین سے منسوب کرتے تھے، اس کے لئے بہت سے عمل کرتے تھے، سحر و طلسم کے بہت سے منتر اُن کے ہاں رائج تھے، اُن کا خیال تھا، کہ بعض الفاظ میں ایک خاص اثر ہے، جس سے شیطان بھاگ جاتے ہیں،

مذکورۂ بالا بیان کے تمام اجزا ر آج بھی ہند و معاشرت میں جھلکتے نظر آتے ہیں، اس عام یکرنگی کے علاوہ ہندو دیو مالا کے بہت سے نام اور بہت سے قصے مغربی ایشیا کی روایات اور اصنام سے کچھ اسقدر مشابہ ہیں، کہ ان ممالک کا باہمی تعلق پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے، چنانچہ ان مشترک قصص اور ناموں کے علاوہ جنکو رگ وید سے انتخاب کرکے ڈاکٹر پران ناتھ نے پیش کیا ہے، ہند و ادب میں اور بھی مثالیں نظر آتی ہیں، مثلاً ایشور یا ایشر کا لفظ اور جسم و صورت سے بالاتر الوہیت کا وہ مفہوم جس پر یہ لفظ دلالت

کرتا ہے، دونوں عجب نہیں کہ آشوری قوم کا عطیہ ہوں، آشوری مذہب بہت سے دیوتاؤں کے علاوہ سب سے بالاتر ایک خدا کو سمجھتے تھے، اور ان کے تخیل میں یہ کوئی مبہم اور موہوم وجود نہ تھا، بلکہ ایک شخص ذات تھی، جس کا نام "ایس شر" تھا[1]، ریگوزن کے بقول رگ وید میں ایشور کا لقب بطور ایک اہم صفت کے آریوں کے سب سے بڑے دیوتا دیائیش کے ساتھ ملحق تھا، اور اسی مصنف کا خیال ہے کہ یہی لفظ ایران میں اہرمزد کی شکل میں تبدیل ہوگیا، جسکو زرتشت نے خدائے قدوس کے لئے استعمال کیا، بعد میں اس کا اطلاق خوفناک اور مضرت رساں شیاطین پر ہونے لگا[2]، جو لوگ ویدوں کے منتروں سے تاریخی واقعات نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے نزدیک آشور دیوزاد نہ تھے، بلکہ ہندوستان کے ڈراوری باشندوں کا کوئی قبیلہ تھا، دشمن کو برے ناموں اور برے اوصاف سے یاد کرنا ہر قوم کا رواج رہا ہے، اسی جذبہ کی پیروی میں آریوں نے آشوروں کو شیاطین بنادیا، تبایا جاتا ہے کہ چھوٹا ناگپور میں آج بھی ایک ڈراوری قبیلہ آشوری کہلاتا ہے[3]،

لیکن اس تفسیر کے بعد بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ رگ وید میں سب سے بڑے خدا کے لئے اس لفظ کا استعمال کیوں ہوا، اور دوسرے یہ کہ آج کے روزمرہ میں ایشور سے مراد خدائے قدوس کیوں ہونے لگا،

اتھروید میں جو اس مقدس سلسلے کی سب سے آخری کڑی ہے، یہ لفظ پھر اعلیٰ اور اسفل دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے[4]، اس کے یہ معنی ہوئے کہ ابتداءً اس لفظ کا اطلاق ایک عالی اور برتر خدا پر ہوتا تھا اور آخر زمانہ میں شیاطین کے لئے استعمال ہونے لگا، مفہوم کا یہ انقلاب صرف اس مفروضہ کے تحت، قابل فہم ہوسکتا ہے کہ آریہ اور آشوری قومیں کبھی علاقہ ہمسائگی رکھتی تھیں، چنانچہ آریہ بھی آشوری

---

[1] نیو لارنڈ ہسٹری ص ۵۵۵، [2] ویدی ہند ص ۱۳۰، [3] تاریخ ہند قدیم برجی ص ۲۰-۲۱، [4] اتھروید مصنفہ گرفتھ کتاب ۱۰ منتر ۵ اور کتاب ۱۸ منتر ۱۔ شیاطین کے لئے زیادہ کثرت کیساتھ مستعمل ہے کتاب ۱ منتر ۳ و منتر ۹ وغیرہ

خدا کا نام استعمال کرنے لگے، لیکن جب آشوری سلاطین کی جوع الارض نے ہمسایوں کو جابر حاکم اور ظالم فرمانروا بنا دیا، اور آریوں کو اُن سے تنگ آکر نقل وطن کرنا پڑا، تو آریہ زبان میں آشور کا لفظ خبیث اور خوفناک قوتوں کا مترادف بھی بن گیا، اور اسی طرح یہ ذومعنویت ظہور میں آئی، چنانچہ ہیول کہتا ہے کہ ویدوں میں اسُروں اور دیوتاؤں کی جنگ کا ذکر غالبًا اس مخاصمت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو آفتاب پرست آریوں اور سامی النسل آشوریوں میں جاری رہی[۱]،

نسل انسانی کا ایک فرد سے شروع ہونا بھی ہندو دیومالا اور سامی روایات کی مشترک روایت ہے، ہندو دینیات میں دنیا کا پہلا آدمی منو ہے، یہ ایک لفظ ہے جس کے خاندان سے انگریزی (man) فارسی مَن، جرمن (Mensch) مصری منا، اردو مانس سندھی مازو ماتھ وغیرہ پیدا ہوئے سنسکرت لغت میں ہندو دیومالا کے بقول نسل انسانی سات بار ہلاک ہو چکی ہے، اور ہر بار ایک منو پیدا ہوا ہے، جس سے نسل دوبارہ شروع ہوتی ہے، آخری منو ساتواں مورث انسانی تھا، اور اس کا باپ کردس وتھ دیوتا تھا، منو کا ایک بھائی بھی تھا، جس کا نام یم تھا، یم کو بھی بعض نے غلطی سے پہلا انسان کہا ہے لیکن رگوزن کے بقول یہ عزت منو ہی کا حق ہے، کیونکہ رگ وغیرہ کے تمام منترجن میں یم کا ذکر آتا ہے، اسکو پہلا مرنے والا انسان بتاتے ہیں، نہ کہ پہلا پیدا ہونے والا[۲] اسی خصوصیت کے باعث مردوں کی دنیا کا بادشاہ یم ہی کو مانا گیا ہے، یم کی بیوی یمی ہیں، اور منو کی بیوی ایدا، یم اور یمی توام بھائی بہن ہیں، منو کی بیوی ایدا اس طرح پیدا ہوئی ہیں کہ منو تنہائی سے گھبرا کر بہت سی دعائیں مانگتے ہیں، اور یہ دعائیں ایدا کی شکل اختیار کرکے ان کے سامنے آجاتی ہیں،

اس روایت میں سامی عقائد صاف نظر آتے ہیں، آدم علیہ السلام کے پہلو سے حوّا پیدا ہوتی ہیں، منو کی دعائیں ایدا بن جاتی ہیں، آدم اور منو تو باہم مترادف ہیں ہی، ایدا کا الف جو

---

[۱] آرین رول ص۲۰۔ [۲] رگوزن ص۱۰۲

تانیث کی علامت ہو سکتی ہے، اگر ساقط کر دیا جائے تو اید رہ جاتا ہے، اور اماں حوا کے انجیلی نام ایوؔ (EVE) سے اس قدر قریب ہو جاتا ہے، کہ دونوں ایک ہی لفظ معلوم ہوتے ہیں، دوسری قدر مشترک یہ ہے کہ سامی روایت میں بھی پہلا پیدا ہونے والا، پہلا مرنے والا انسان نہ تھا، آدم پہلے پیدا ہوئے، تو ہابیل سب سے پہلے مرے، جیسا کہ توریت کے باب پیدائش میں مذکور ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ یہاں یم اور منو بھائی بھائی ہیں، اور وہاں آدم اور ہابیل باپ بیٹے، آدم علیہ السلام کی اولاد میں بھائی بہن کے ازدواجی تعلقات بھی یم اور یمی کی شادی سے تائید پاتے ہیں،

ہندی روایت کے بہت سے اجزا غیر مربوط ہیں، مثلاً یم اور منو دونوں وِیے وَسُ وتھ خدا کے بیٹے ہونے کے باوجود، ابو البشر ہونے کی عزت صرف منو ہی کا حق کیوں سمجھی گئی، دوسرے یمی کو بھی خدائی فرزندیت کا شرف حاصل ہے، کیونکہ یم اور یمی توام ہیں، لیکن ہندی شعرائنے اس قصہ کو اور بھی زیادہ غیر مربوط نوح علیہ السلام کا واقعہ شامل کر کے بنا دیا، انھوں نے نوح کو بھی منو ہی کا نام دیا، مگر ناموں کے خلط ملط ہونے سے اس بحث پر کچھ اثر نہیں پڑتا، کہ ابتداے آفرینش سے سامی روایات آریہ قوم تک پہنچتی رہیں، چنانچہ نوح علیہ السلام کا واقعہ جو رگ وید کے علاوہ متعدد قدیم کتابوں میں مذکور ہے، اور جس کو تمام محققین سامی قوموں کا عطیہ تسلیم کرتے ہیں، اس امر کی سب سے بڑی شہادت ہے، اور اسکی تکرار بے محل نہ ہوگی،

سنسکرت کی قدیم ترین روایت کہتی ہے، کہ صبح کے وقت وہ منو کے پاس بدن دھونے کے لئے پانی لائے، وہ دھو رہا تھا کہ ایک مچھلی ہاتھ میں آگئی، مچھلی نے منو سے کہا کہ مجھے پال لے، میں تجھے ایک طوفان سے بچا لوں گی، جو آنے والا ہے، چنانچہ منو نے مچھلی کو پال لیا، مگر اس کا جسم اتنا بڑھتا گیا کہ گھڑے سے نکال کر تالاب اور تالاب سے نکال کر دریا یا سمندر میں چھوڑ دینا پڑا، جس سال مچھلی نے بتایا تھا طوفان آیا، مچھلی ہدایت کر چکی تھی کہ کشتی پہلے سے تیار کر لینا، چنانچہ منو نے کشتی بنا رکھی تھی،

جب طوفان آیا تو منو جی تمام جاندارون کا ایک ایک جوڑا لے کر اس میں بیٹھ گئے، اب وہ مچھلی نمودار ہوئی، اور کہنے لگی کہ کشتی کو میرے سینگ سے باندھ دے، ایسا ہی کیا گیا، آخر کشتی شمال کی طرف دُور ایک پہاڑ پر جا کر ٹھہری[1]،

بُت پرستی، مندرون کی تعمیر، برہمن کا تفوق، یہ سب وہ چیزیں ہیں، جن سے رگ ویدی تمدّن کو بہت کم لگاؤ تھا، مگر بابل اور اسیریا دونوں جگہ یہ دستور موجود تھے، آشوریہ میں تو برہمن جماعت اتنی با اثر تھی کہ آشوری سلاطین کو قدیم دار السلطنت جہاں پروہتوں کا زور تھا، چھوڑ کر نینوا کو منتقل ہونا پڑا، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ رگ ویدی عہد میں نہ بُت تھے نہ مندر، اور ریگوزن کا خیال ہے، کہ آریہ قوم نے یہ چیزیں باہر سے حاصل کیں[2]، لیکن بیرونی اثرات صرف بابل اور اشوریہ سے منتقل ہو سکتے تھے کیونکہ ہندوستان کا قریب ترہمسایہ زرتشتی تمدّن معابد اور اصنام سے ہمیشہ بے نیاز رہا[3]،

اسی سلسلہ میں ہندوستان کے قدیم رسم الخط کو بھی آریہ اور سامی داد وستد کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے، رسم الخط کو مغربی ایشیا اور ہندوستان کے درمیان قوی ترین واسطۂ اتحاد تصور کرنا چاہئے، ہندوستان کے قدیم ترین کتبے برہمی اور خوراشتی رسم الخط میں پائے جاتے ہیں، اور یہ دونوں ابتداً سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ کی طرف لکھے جاتے تھے، جو سامی تحریر کی مستقل خصوصیت ہے، آخر زمانہ میں برہمی خط کی روش تو بدل گئی، لیکن خوراشتی رسم الخط کی یہ شان آخر تک قائم رہی، محققین کے نزدیک یہ دونوں رسم الخط فنیقی اور آرامی تحریر سے ماخوذ ہیں[4]، یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ رسم الخط کے ساتھ خدا معلوم کتنی رسوم اور روایات ہندوستان وارد ہوئی ہوں گی، ہندوستان میں تحریری آثار تین سو قبل مسیح سے پہلے کے موجود نہیں، اسی عہد سے کچھ قبل یہ رسم الخط اور اس کی ذیلی روایات ہندوستان منتقل ہوئی ہوں گی،

---

[1] ویدی ہند ص ۲۳۶، [2] ص ۱۳۳، [3] نیولانڈ مسٹری ص ۲۲۳، [4] ہند قدیم مصنفہ ریپسن

بابل اور آشوریہ سے گذر کر فینقی اور مصری روایات کو بھی ہندوستان پہنچنے کے مواقع کثرت سے حاصل تھے، ہندوستان اور مصر کے درمیان مواصلت کے سلسلے بحری راستہ سے قائم تھے، اسکے علاوہ مصر اور بابل کے باہم مبادلہ مسلسل ہوتا رہا، اور مصری عقائد اور روایات کا براہ بابل ہندوستان پہنچنا بھی ممکن تھا، چنانچہ مصری تہذیب کے بہت سے عناصر بھی ہندوستان میں جھلکتے نظر آتے تھے، مثال کے طور پر انسان کے جسم میں خدا کا ظاہر ہونا، جیسا کہ رامچندر جی اور کرشن جی کی نسبت عقیدہ وہی مصری تخیل معلوم ہوتا ہے، مصری فراعنہ خود کو "آمن رع" دیوتا کا اوتار کہتے تھے، اسی خیال کا اعادہ مغربی ممالک میں حضرت مسیحؑ کی الوہیت میں ہوا، قدیم مصری خداوندوں میں آسیرس کو مخصوص اہمیت حاصل تھی، مسٹر ویلز لکھتے ہیں، "آسیرس کے متعلق عقیدہ تھا کہ وہ بار بار مرتا اور بار بار زندہ ہوتا تھا، وہ صرف تخم ریزی اور نباتات ہی کا دیوتا نہ تھا، بلکہ تصور کو ذرا وسعت دیجئے، تو بقاے دوام کا مظہر تھا، اس کا نشان ایک جوڑے پروں والا کیڑا تھا، جو اپنے انڈے دفن کر دیتا ہے، مگر اس کے اس عمل کا مقصود جو بہ ظاہر ایک مہلک فعل ہے، یہ ہوتا ہے کہ زندگی دوبارہ وجود میں آئے، چمکتا ہوا آفتاب بھی آسیرس کا نشان تھا، کیونکہ وہ غروب ہی اسی لئے ہوتا ہے کہ پھر بر آمد ہو، آخر زمانہ میں اس دیوتا کا نام اِسے پس تھا، آسیرس سے وابستہ ایک دیوی آسٹر نامی تھی، جس کا دوسرا نام ہوتریا گائے کی دیوی تھا، ہلال اور چمکتا ہوا تارا اس کا نشان تھا، ہوتر کی تصویر ایک ہلال پہ کھڑی ہوئی اور ایک شیر خوار بچہ گود میں لئے ہوئے ہے، یہ بچہ ہورس یا صبح کا دیوتا ہے، ان تین خداؤں کے نیچے اور بہت سے عجیب قسم کے دیوتا تھے"

اس اقتباس میں چاند سورج اور گائے بیل کی زوجیت کا وہ تخیل موجود ہے، جس کی مثالیں کثرت کیساتھ ہندو قصص میں پائی جاتی ہیں، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ دیوتاؤں کی شادیاں کروانے اور ان سے اولاد کا سلسلہ قائم کرانے میں یونانی قوم بھی ان سے پیچھے نہیں رہی، ہر البتہ وہ خداوندی

تثلیث جو مصر اور بابل میں پائی جاتی تھی، وشنو شیو اور برہما کے مثلث اتحاد سے ہمرنگ معلوم ہوتی ہے، چنانچہ مسٹر ونکیٹا رتنام مصری آسرس کو ہندی شیو کا پیشرو بتاتے ہیں،

لیکن سب سے زیادہ نمایاں اشتراک گائے کی تقدیس اور حرمت ہے، جو موجودہ زمانہ میں بجز ہندوستان کے اور کہیں باقی نہیں، بنی اسرائیل کا گوسالہ پوجنا، اور بابل کے قدیم آثار میں پروار گائیں ملنا، جنکو بیماری پیدا کرنے والے شیاطین کا دخل روکنے کے دروازوں پر نصب کیا جاتا تھا، ظاہر کرتا ہے کہ گاؤ پرستی مصر اور بابل کے مذہب کا اہم جز و رہی تھی، اور بہت ممکن ہے، کہ ہندوستان نے یہ سبق وہیں سے سیکھا ہو، گائے کے علاوہ گھڑیال، بگلہ، اور بندر بھی مصر کے مقدس جانور تھے، نیل کا وہی احترام کیا جاتا تھا، جو گنگا، کو ہمارے دیس میں حاصل ہے۔ بخور اور ناقوس پوجا کے وقت استعمال ہوتے تھے، اور ایک برہمن طبقہ ہندوستان کی طرح وہاں بھی موجود تھا، رالنسن کہتا ہے:-

"ایک جماعت دوسری جماعت سے اس قدر نمایاں طور پر جدا تھی، اور موروثی پیشہ اختیار کرنے کا رواج اس درجہ عام تھا، کہ مصری معاشرت کا نظام ہندوستان کی سماج سے بہت زیادہ ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے"

اور سنویس بتاتا ہے کہ

"کاہنوں کے لئے معبد ہی میں مکان بنے ہوتے تھے، اُن کا کام تھا، کہ عبادت اور ریاضت میں عمر بسر کریں، ہر ایک کو رات دن میں دو مرتبہ غسل کرنا ضروری تھا، بدن کے تمام بال حتی کہ ابرو تک روزانہ ترشواتے تھے، بکری، سور مچھلی اور لوبیا کھانے سے پرہیز کرتے تھے"

مابعد ہندی برہمنیت میں ان مصری کاہنوں کا رنگ جھلکتا معلوم ہوتا ہے، اسی سلسلے میں تناسخ کے عقیدے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، یہ عقیدہ آج ہندو دھرم کا بنیادی اصول ہے مگر

اس کا مولد مصر کو بتایا جاتا ہے[۱]، اسی کیساتھ یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ویدوں میں ہر جگہ حیات مابعد کے سلسلے میں یہ عقیدہ صاف نظر آتا ہے کہ انسان کی رُوح مرنے کے بعد ایک دوسرے عالم کو منتقل ہو جاتی ہو، جہاں موت کا دیوتا یم حکمراں ہے، اور جہاں کا قیام ابدی ہے، بلکہ بعض منتروں میں اس عالم مابعد کا نقشہ راحت و سرور سے اس قدر لبریز دکھایا گیا ہے، کہ رگوزن اسکو اسلامی جنت کا مکمل نمونہ کہتا ہے، ممکن ہے کہ ہندوستان تک اس عقیدے کی رسائی یونانی وساطت سے ہوئی ہو، یونان ہی وہ ملک تھا جہاں فیثاغورث اور اس کے متبعین نے اس کو فلسفہ کا جزو بنا دیا، اور اس شدت کے ساتھ اس کے قائل ہوے کہ گوشت کھانا ترک کر دیا، کیونکہ جن جانوروں کو مارا جاتا تھا، ان میں انسانی روح ہونے کا احتمال ہوتا تھا، کہا جاتا ہے کہ سکندر کے آنے سے پہلے ہی ہندوستان اس عقیدے سے آشنا ہو چکا تھا، اور اس کے ساتھیوں کو اس امر پر تعجب ہوا تھا[۲]، بہرکیف مصر یونان اور ہندوستان میں ایک ایسے عقیدے کا وجود جس کی طرف مادّی ماحول اور ذاتی تجربہ کی بنا پر ذہن منتقل ہونا ممکن ہے، ان ممالک کے ربط قدیم پر ایک حجت ہے[۳]

مصر اور ہندوستان کے تعلق پر سب سے زیادہ روشنی ڈاکٹر پران ناتھ کے اس سلسلۂ مضامین سے پڑتی ہے جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، ڈاکٹر صاحب کے نزدیک آریہ قوم کا ابتدائی وطن (Aegean Sea) کا ساحل تھا، یہاں سے بڑھ کر وہ ایشیاے کوچک اور مصر میں آباد ہوئے، انھی ممالک میں سامی النسل قومیں رہتی تھیں، چنانچہ آریہ اور سامی دست و گریباں ہونے لگے، یہ بین الاقوامی

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، تناسخ، [۲] مضمون بر اسلام و نیکٹار تنام ص ۲۰، [۳] تناسخ کے اعتقاد سے وید خالی ہیں، اپنشد اور بعد کی کتابوں میں ملتا ہے، (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، مضمون ہندوستان)، ممکن ہو قدیم ہندی قوموں سے آریہ فاتحوں نے حاصل کیا ہو، اور قدیم آریہ قوموں سے مصر وغیرہ تک پہنچا ہو (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مضمون سنسکرت زبان)

جنگ مصر سے شروع ہو کر تمام مغربی ایشیا میں عام ہوگئی، اسی جنگ کے سلسلے میں مصری آریہ لڑائی بھڑاتے بابل تک پہنچے، جو غالباً عرصہ تک ان کے قبضہ میں رہا، ڈاکٹر صاحب کے بقول بابل کی قسمت فیصل کرنے والی جنگ بہ مقام تعل واقع ہوئی جس میں آریہ آدن نے سامی انندیت کو شکست دی، اور جس کا مفصل بیان رگ وید میں موجود ہے، دجلہ کی وادی سے آریہ قوم نے ہندوستان کا رُخ کیا، اور سندھ اور پنجاب میں آکر آباد ہوگئے، چنانچہ ڈاکٹر پران ناتھ نے بہت سے مصری اور بابلی نام رگ وید میں مذکور پائے ہیں، بابلی اُور رگ وید میں موجود ہے، اسی ثن اور سپتر کے مشہور شہر وید میں ایش پرام اور شیپر کے نام سے وارد ہوئے ہیں، بابل کے بادشاہ سارگن اور اُش وید میں بجنسہ منقول ہیں، اسی طرح مصری بادشاہوں کے نام وید میں پائے جاتے ہیں، مثلاً مینس، مِندو، اخی تے تان، انار سیدہ وغیرہ ڈاکٹر صاحب کے بقول رگ وید کا ایک خُمس مصری واقعات اور اشخاص سے متعلق ہے،

اس طویل تمہید کا خلاصہ یہ ہے، کہ تاریخی شواہد سے ایک طرف تو ہندوستان اور سامی ایشیا کا تجارتی اور سیاسی تعلق ثابت ہے، اور دوسری طرف ہندوستانی تہذیب اور مغربی ہمسایوں میں قدم قدم پر مماثلت نظر آتی ہے، اگر جدید مورخین کی یہ تحقیق کہ آریہ قوم کا اصلی وطن مغربی ایشیا کے قریب تھا، ناقابلِ قبول کہی جائے تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا، کہ آریہ اور سامی قوموں میں ہمیشہ سے عقائد اور روایات کا مبادلہ ہوتا رہا، چنانچہ اب یہ نظریہ کہ رامائن کا افسانہ ایک مصری فرعون سے متعلق ہے، اتنا خلاف قیاس نہیں رہنا چاہئے، جتنا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے،

تذکرۂ طاہر

یعنے

سوانحِ خود نوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خان طاہر مرحوم،

(۲)

نکاحِ اولیٰ، جب میری عمر پندرہ سال کی ہوئی، تو حضرت والد مرحوم نے ماہ ربیع الاول ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں میرا نکاح میر حیدر علی صاحب مرحوم ساکن موضع بیتی سادات پرگنۂ ہنسوہ ضلع فتحپور کی صاحبزادی عترت النساء بیگم کیساتھ بعوض مہر پانچہزار روپیہ سکۂ رائج الوقت کر دیا، میرا اور برادر گرامی مرحوم کا عقد ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں ہوا، شیخ عصر حضرت مولینا مولوی شاہ عبد السلام صاحب قدس سرہٗ نے خطبۂ نکاح پڑھا، بعد فراغِ نکاح جب بارات فتحپور ہنسوہ سے بھوپال پہنچی تو فوجِ ریاست نے جلوس اور ماہی و مراتب کیساتھ مقام جہانگیر آباد تک استقبال کیا، اسوقت تک بھوپال میں ریلوے لائن کا اجرا نہیں ہوا تھا، رئیسۂ عالیہ خلد مکان کے جانب سے وہ تمام مراتبِ اعزاز عمل میں آئے، جن کا ذکر برادر معظم کے تذکرۂ واقعات میں گذر چکا ہے، عالیجناب ہمشیرۂ معظمہ محترمہ نواب ولیعہد صاحبہ یعنی نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ خلد آشیاں نے بھی محفلِ تہنیت منعقد کرکے ضیافت و زر و زیور و پوشاک گراں بہا سے عزت افزائی کی، رئیسۂ عالیہ خلد مکاں نے میری اہلیۂ موصوفہ کو اعزاز دلھن کا خطاب عطا فرمایا، اور مجکو بعوض عطائے مکان تیس ہزار روپیہ بذریعۂ خط مورخہ دوازدہم شعبان ۱۲۹۸ھ اور مہر خطاب خانی مرحمت فرما کر عزت بالائے عزت عطا فرمائی

شعراے پایۂ تخت نے قصائد و قطعات تاریخ و تہنیت لکھکر حضرت والد محترم کے حضور میں پیش کئے، یہ سب قصائد و قطعات تذکرۂ بزم سخن مؤلفہ راقم الحروف میں طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں،

عطاے اعزاز | قبل از نکاح رئیسۂ عالیہ نے پانزدہم ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۷۶ء کو جب دہلی میں عظیم الشان دربار قیصری منعقد ہوا تھا، برادر معظم اور راقم الحروف کو اپنا بیج آف آنر بنا کر خاص اعزاز عطا کیا تھا،

عطاے تمغہ | ۱۲۹۹ھ میں جب رئیسۂ عالیہ دار السلطنت کلکتہ میں ورود فرما ہوئیں، اور ہز اکسلنسی لارڈ رپن صاحب بہادر سابق وائسراے ہند کی ملاقات کے لئے ڈلیسر گل لاج تشریف لے گئیں، اسوقت راقم الحروف بھی ہمراہ تھا، رئیسۂ عالیہ نے ازراہ مزید شفقت عطاے تمغۂ طلائی سے (جس پر اسم گرامی شاہجہاں کا حرف شین منقوش تھا) سرفراز فرمایا،

تمام ملک محروسۂ بھوپال میں تقرر ارد لی و سلامی | ۱۳۰۰ھ میں رئیسۂ عالیہ نے ریاست سے نقیب و سواران فوج کی اردلی میری سواری کے ہمراہ بذریعۂ خط مرقومۂ بست و دوم جمادی الاول ۱۳۰۰ھ مقرر کی، اور تمام ملک محروسۂ ریاست میں غرۂ جمادی الثانی ۱۳۰۰ھ سے تاحین حیات فوج کی سلامی کا حکم صادر فرمایا،

عطاے خطاب و تقرر القاب و آداب | ۱۳۰۱ھ میں جشن تاج محل کے موقع پر خطاب فرزند سعید صفی الدولہ حسام الملک سے مخاطب فرمایا، اور مہر خطاب اپنے دست مبارک سے عطا فرمائی، اور خلعت و فیل و اسپ و چنور و ہودج نقرہ و پالکی وغیرہ سے مخلع اور مفتخر فرمایا، خطوط و فرامین سرکاری میں راقم الحروف کا حسب ذیل القاب و آداب قرار دیا، قرۂ باصرۂ سعادت غرۂ ناصیۂ سعادت فرزند سعید میر محمد علی حسن خان صاحب حفظہ اللہ و سلم و بعد دعوات زیادت عمر و درجات و انشراح خاطر اقبال مآثر، قوما

من درین رتبہ از کجا لیکن، مور پیہ در دۂ سلیمان است،

دیگر مراتب اعزاز، | صاحبانِ ذیشان پولٹیکل ایجنٹ بہادر و صاحبانِ عالیشان ایجنٹ نواب گورنر جنرل بہادر و ہزاکسلینسز ویسرایانِ ہند کے رونق افروزی بھوپال کے وقت مجکو مراسم استقبال و مزاج پرسی و مشائعت و شرکت دربار اور تواضع عطر و پان سے عزت بخشی جاتی تھی، اور سرکاری دربار اور سرکاری تقریبوں کے موقع پر اخوان ریاست میں میری نشست کا نمبر پانچوان رکھا گیا تھا

عطائے جاگیر، | اوّلاً مجکو رئیسۂ عالیہ نے ازراہ شفقت ۱۲۸۹؁ھ میں تا مین حیات مبلغ بارہ ہزار روپیہ سالانہ کی سند جاگیر مورخہ ۲۰ صفر ۱۲۸۹؁ھ مطابق ۱۲۷۹؁ فصلی عطا فرمائی تھی،

تجدید سند جاگیر بطور وثیقہ کامل، | اس کے بعد ۱۳۰۵؁ھ میں رئیسۂ عالیہ نے اپنے قدیم شفقت مادرانہ و مراحم شاہانہ سے سند جاگیر کی تجدید فرمائی، اور بجائے حین حیات کے چہارم ربیع الثانی ۱۳۰۱؁ھ ہجری مطابق ۱۲۹۰؁ فصلی سے مبلغ بارہ ہزار سالانہ کی سند جاگیر نسلاً بعد نسل بطناً بعد بطن ابداً مؤبداً مرحمت فرماکر شرف و اختصاص خاص بخشا، اور بذریعۂ خط مورخہ ہفدہم ربیع الثانی ۱۳۰۷؁ھ ہدایت فرمائی کہ اس سند کو بطور وثیقۂ کامل نزدیک اپنے رکھو،

تقرر مشاہرہ و عطائے پوشاک، | حضرت والد محترم اپنی جاگیر سے ہم لوگوں کو مصارف سالانہ کے لئے ایک رقم معینہ دیا کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد رئیسہ عالیہ نے اپنی مادرانہ شفقت سے مبلغ تین سو روپیہ ماہوار میرے اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار میری اہلیہ کے مقرر فرمائے، اور مبلغ ساٹھ روپیہ میری اولاد کی تنخواہ روز ولادت سے مقرر فرمائی، اور سالانہ بارہ جوڑے پوشاک کے میرے لئے اور چھ چھ جوڑے پوشاک کے میری اہلیہ اور اولاد کیلئے اپنی ڈیوڑھی خاص سے عطا ہونیکا حکم صادر فرمایا،

روانگی فوج | ۱۳۰۵؁ھ میں حضرت والد محترم نے ریاست کے اندرونی سیاسی تغیرات اور زمانہ کے روز افزون انقلابات کو پیش نظر رکھکر اور مباش امین از بازی روزگار کے عمل پیرا ہوکر ازراہ دور اندیشی

یہ ارادہ کیا، کہ شہر قنوج میں جو قدیم آبائی وطن ہے، بطور یادگار سلف اور مصالح آیندہ کے لحاظ سے ایک مکان ہم لوگوں کی سکونت کے لئے تعمیر کیا جائے، اور ساتھ ہی اسکے انکی دین پرستی اور معارف نوازی اسکی مقتضی ہوئی کہ جس طرح وہ مجھکو دنیوی مال و متاع سے آسودہ حال دیکھتے ہیں، اسی طرح وہ معارف باطنی کی دولت لازوال سے بھی میرے جیب و دامن کو مالا مال دیکھیں، اسلئے انھوں نے مجکو سفر قنوج کا ایما کیا، اور تعمیر مکان کو میری پسند و مرضی پر محمول کیا، اور سرخیل صوفیاے عصر شیخ وقت حضرت مولینا شاہ فضل رحمٰن صاحب مرادابادی قدس سرہٗ العزیز کے شرف حضوری اور برکات انفاس سے مستفید ہونے کی طرف توجہ دلائی، چنانچہ بیستوین ماہ جمادی الاول ۱۳۰۵ھ کو دوشنبہ کے دن بھوپال سے روانہ ہوکر چہارشنبہ کے روز میں قنوج پہنچا، اور اپنے جدّ بزرگوار حضرت سید علامہ مولانا اولاد حسن صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت مجدد عصر مولینا سید احمد صاحب بریلوی شہید قدس سرہٗ کے مزار پر انوار کی زیارت و فاتحہ سے مشرف ہوا، نماز ظہر کے وقت باوجود غایت معذرت بعض مریدان و معتقدان خاص جد مرحوم کے اصرار سے مجبور ہوکر جد مرحوم کی مسجد قدیم میں مجکو امامت کرنی پڑی، فراغ نماز کے بعد حضرت جلال ثالث رحمۃ اللہ علیہ و حضرت بالا پیرؒ اور حضرت حاجی شریف زندنیؒ کی زیارت مزارات و فاتحہ خوانی سے مشرف ہوا،

روانگی گنج مرادآباد، پھر وہاں سے چوتھی جمادی الثانی کو گنج مرادآباد روانہ ہوا، جمعہ کے دن مغرب کے وقت وہاں پہنچکر حضرت مرشدنا و مولانا مولوی فضل رحمٰن صاحبؒ کی خدمت اقدس میں باریاب ہوا، حضرت طہارت گاہ سے برآمد ہوکر حجرہ کی صحنچی میں وضو کر رہے تھے، مجھ کو دیکھکر فرمایا کہ حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر کے پاس تنہا اور پیدل جایا کرتے تھے، اور حضرت عمر اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس

میں بہت دور سے پیادہ پا آیا کرتے تھے، اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ میں وضو کرتا ہوں تم دیکھتے جاؤ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح وضو کیا کرتے تھے، غرض جب وضو اور نماز سے حضرت فارغ ہوئے تو ایک حاضر الوقت صاحب سے میری نسبت فرمایا، کہ یہ امیر آدمی ہیں، ان کو احمد میاں کے گھر میں ٹھیراؤ، تھوڑی دیر میں جناب احمد میاں صاحب خود آکر مجکو اپنے مکان پر لے گئے، رات بھر وہاں قیام رہا، صبح کو نماز فجر کے بعد پھر مجکو حضرت کے دیدار فائض الانوار سے مستفیض ہونے کا موقع ملا، اور میں نے ان کے دست شریعت وطریقت پناہ پر طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی، قریباً نصف ساعت سے زائد حضرت مراقب رہ کر مجکو اپنی توجہ اور ہمت باطنی سے مستفید فرماتے رہے، اس کے بعد سر اٹھا کر اپنی زبان فیض ترجمان سے بیتابانہ عشق کے لہجے میں فرمانے لگے، اپنے پیا پر تن من واروں جو داروں سو تھوڑا رے، اسوقت برق وروح کے اتصال اور جذبات اور تجلیات کے باہمی امتزاج کی میرے دل پر جو ایک پرسرور والہانہ وجدانی کیفیت طاری تھی، اسکو لفظوں میں ادا کرنا میرے لئے قطعاً ناممکن ہے ؎

لطیفہا کہ بہ لفظ و بیان نمی گنجد ۔۔۔ تو چوں فرشتہ زغیب آمدی و واگفتی

بہرحال اس کے بعد حضرت بہت سے اشعار فارسی اور اردو اور ہندی کے ایک دلکش انداز اور پرتاثیر لہجہ کیساتھ ساتھ پڑھتے رہے، اُن میں سے صرف یہ دو شعر مجکو یاد رہ گئے، ؎

پروانہ نیستم کہ بہ یکدم عدم شوم ۔۔۔ شمعم کہ جان گدازم و دم بر نیاورم

در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدارا ۔۔۔ بر صفحۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

اخیر صحبت میں جب میں نے رخصت ہونے کا قصد ظاہر کیا، تو حضرت نے فرمایا کہ تم اپنے والد سے کہدینا، کہ ہم تمھارے لئے دعا کیا کرتے ہیں، خدا تمکو اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے، اتباع سنت بہت مشکل ہے، پھر میں حضرت کے پاس سے اٹھکر چلا آیا، تھوڑی دیر کے بعد حضرت حجرہ سے صحن مسجد میں آکر بیٹھ گئے، اور نسائی شریف کا درس جناب احمد میاں صاحب مرحوم کو پڑھانے لگے

میں بھی وہاں جا بیٹھا، دوران سبق میں حضرت نے مجھ سے پوچھا کہ اسمٰعیل کے معنی جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ آپ ارشاد فرمائیں، حضرت نے کہا کہ اسمٰعیل کے معنی ہیں خدا کا فرمانبردار، جب درس سے فراغت ہوئی، تو آپ نے صحن مسجد میں ٹہلنا شروع کیا، اور میرے قریب تشریف لاکر اور مسکراکر آہستہ سے ازراہِ شفقت میری پشت پر مُکّا مارا، اور حُجرہ میں تشریف لے گئے، کچھ دیر کے بعد جناب احمد میاں صاحب کی ہمراہ میں پھر حضرت کے حجرہ میں پہنچا، اور توفیقِ الٰہی کے موافق نذر دکھائی، آپ نے زرِ نذرانہ کو خوشی کیساتھ اپنے دامن میں لے لیا، اور وہیں کھڑے کھڑے میرے سامنے تمام زرِ نذرانہ ضرورتمندوں اور محتاجوں کو تقسیم کردیا، اور ایک حبہ باقی نہیں چھوڑا، پھر میری طرف متوجہ ہوکر فرمایا، کہ تم کو یہاں آنے سے کیا فائدہ ہوا؟ اپنا نقصان مفت میں کیا، چونکہ میں اسی وقت لکھنؤ روانہ ہونیکے لئے تیار تھا، اور سواری کچھ دور کھڑی ہوئی تھی، میں نے مراجعتِ وطن کی اجازت چاہی حضرت نے خدا حافظ کہکر اور یہ شعر پڑھکر مجکو رخصت کیا، ؎

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست   تو نہ پنداری کہ تنہا می روی

اس سفر میں تین روز تک میرا قیام لکھنؤ میں رہا، پھر وہاں سے موضع بیتی سادات پرگنہ ہنسوہ ضلع فتحپور اور جبلپور ہوتا ہوا چہارّ دہم جمادی الثانی ۱۳۰۰؁ھ کو بھوپال پہنچا، اور تمام حالات و واقعات حضرت والد محترم سے بیان کئے، اور شہر قنوج کی سکونت کے متعلق میں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، یہ شہر اگرچہ قدیم زمانہ میں ہندوستان کا پایۂ تخت اور راجدھانی رہا ہے، مگر امتدادِ زمانہ اور انقلابِ روزگار سے اب وہ ایک قصبۂ تباہ حال سے زائد وقعت نہیں رکھتا، وہاں کے سکنۂ شہر میں بھی کوئی فضیلتِ علم و عمل و دولت و ثروت باقی نہیں رہی، اور حضرت والد مرحوم اور اہلِ خاندان کے ترکِ وطن اور ترکِ تعلق کے سبب سے جو آبائی تعلقات اس سے وابستہ تھے، وہ کلیۃً منقطع ہو چکے تھے، اسلئے میں نے وہاں کی اقامت پسند نہیں کی، اور صاف صاف اپنا خیال حضرت والد مرحوم پر ظاہر کردیا،

والد مرحوم ابقاء المنن کے صفحہ ۱۴۰ میں لکھتے ہیں، کہ میں نے بہ مجبوری یہ قصد کیا تھا کہ وطن قدیم بلدۂ کہنہ قنوج ہی میں طرح توطن ڈالی جائے، لیکن غرہ جمادی الثانی ۱۳۰۵ھ کو جب عزیزی میر علی حسن خان نے اسکو ملاحظہ کرکے ناپسند کیا، تو خیال اس جگہ کا چار ناچار خاطر فاتر سے دور کیا گیا، وماتشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العالمین۔

وفات زوجۂ اولیٰ راقم الحروف۔ مراجعتِ وطن کے آٹھ نو ماہ کے بعد میری اہلیہ موصوفہ نے بحالت وضع ولادت بست و یکم ربیع الاول ۱۳۰۶ھ مطابق بست و ششم نومبر ۱۸۸۸ء کو روز دوشنبہ چار ساعت صبح انتقال کیا، رحمہا اللہ تعالیٰ اسوقت سے تمام انتظام خانہ داری اور خرد سال اولاد کے غور و پرداخت کا مجکو بذات خود جزاً و کلاً متکفل ہونا پڑا، ؎

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا مجھے ۔۔۔ اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو،

میری یہ بیوی نہایت نیک مزاج کم سخن، پاکیزہ خصلت اور عفت و محبت کی مجسم تصویر تھین غفر اللہ لہا، میرے محبِ مکرم جناب مولوی جمیل احمد صاحب سہوانی سلمہ اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل قطعہ تاریخ لکھا، ؎

با نوی خواجہ زادۂ من حسرتا برد ۔۔۔ پیوستہ باد رحمتِ حق بر روانِ او،

بے اختیار ریختہ از دیدہ اشک سرخ ۔۔۔ برنا و پیر در غم مرگ جوانِ او،

جا داشت آن کہ در دل ممدوح زادۂ ام ۔۔۔ امروز حیف کنج لحد شد مکانِ او،

بے پاسبان و خادمہ یارب نماندہ است ۔۔۔ حوراں شوند خادمہ و پاسبانِ او،

بے سایہ زیر چرخ کہی نارمیدہ است ۔۔۔ کن فضلِ خود بزیر زمین سائبانِ او

ایمن کنش ز مسالت منکر و نکیر، ۔۔۔ حرفے زدن بغیر چہ د اندز بانِ او

ناخواندۂ مہمان نبود تا بر آنیش ۔۔۔ مہمان خواندہ است بشو میزبانِ او

دیگر دہم چہ شرح تو دانی وکار تو، او مہان ورحمت تو میزبان او،

نکاح ثانی راقم الحروف، حضرت والد محترم کو میری زوجۂ اولیٰ کی وفات کے بعد ہی سے میرے نکاح ثانی کی تشویش و فکر دامنگیر ہوگئی تھی، چنانچہ اونھوں نے لکھنؤ میں اسکی سلسلہ جنبانی شروع کی، چونکہ اکابر سادات شرفائے لکھنؤ کے خاندانوں میں خواجہ سید جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب مودودی مرحوم کا دودمان سیادت ممتاز شہرت رکھتا تھا، اسلئے یکم جمادی الاول ۱۳۰۶ھ مطابق جنوری ۱۸۸۹ء کو انکی دختر کلاں ماہ جبیں بیگم کے ساتھ میرا عقد ثانی بعوض پانچہزار روپیہ مہر معجل کے کردیا، اعیان لکھنؤ و اکابر بھوپال تقریب مذکور میں شریک تھے، خطبۂ نکاح حضرت شیخ الحدیث مولینا شیخ حسین صاحب عرب مرحوم متوطن حدیدہ ساکن بھوپال نے پڑھا، شجرۂ نسب حضرت صاحب مرحوم کا حسب ذیل ہی،

ماہ جبیں بیگم بنت خواجہ سید جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب بن خواجہ نظام الدین احمد عرف حضرت سید نقر صاحب مودودی بن سید شاہ خواجہ حسین بن خواجہ سید براہیم بن خواجہ غیاث الدین بن خواجہ سید محمد شریف بن سید ابراہیم معروف بخواجہ کمال بن خواجہ سید محمد صالح بن خواجہ سلطان محمد بن خواجہ احمد بن خواجہ افزیں بن خواجہ محمد یحیی بن خواجہ ابی احمد بن سید قطب الدین بن سید رکن الدین بن سید ابی احمد بن سید سلطان الاسلام خواجہ قطب الدین مودودی بن سید ابویوسف ناصر الدین چشتی بن سید خواجہ محمد بن سید خواجہ سمعان بن سید خواجہ محمد بن سید عبد اللہ بن سید ابن الحسن بن امام جواد بن امام محمد تقی، بن امام موسیٰ رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق، بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن حضرت امام حسین بن حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

لکھنؤ سے جب بارات روانہ ہوکر بھوپال پہنچی، تو فوج ریاست نے جلوس و ماہی مراتب کے ساتھ بھوپال کے اسٹیشن تک استقبال کیا، میں نے اپنے مکان مسکونہ نور محل میں داخل ہونے سے قبل مسجد نور محل میں داخل ہونے سے قبل مسجد نور محل میں نماز دوگانہ تحدیثاً بنعمۃ اللہ ادا کی، شام کو سہ پہر کے وقت رئیسہ عالیہ نے نور محل میں رونق افروز ہوکر عروس کی رونمائی کی رسم ادا کی، اور میری اہلیہ موصوفہ کو

دیکھ کر بہت مسرور ہوئیں، حضرت والد محترم سے مسکرا کر فرمایا، کہ یہ آپ کی نہیں بلکہ خاص میری بہو ہے
پھر کچھ دیر قیام فرما کر وقت مغرب مراجعت فرمائے تاج محل ہوئیں، جمعہ کے روز رئیسۂ عالیہ نے تاج
محل پر ایک نہایت پرتکلف محفل ضیافت ترتیب دے کر میری اہلیۂ موصوفہ کو افتخار دُولہن کے
خطاب سے سرفرازی بخشی، اور ہم دونوں کو عطائے پوشاک زرنگار اور نذر وزیور طلائی و مرصع سے
مشرف و مفتخر فرمایا،

شعرائے پایۂ تخت حکیم اعظم حسین صاحب سندیلوی، وحافظ سید محمد سورتی صاحب منشی فدا علی صاحب
فارغ، مولوی عبد الحلی صاحب آسی مدراسی، شیخ محمد صاحب عرب حدیدی یمنی اور مولوی جمیل احمد
صاحب سہسوانی نے تہنیت میں قطعات لکھ کر حضرت والد محترم کے حضور میں پیش کئے،

بحمدہ تعالیٰ میری اہلیۂ ثانیہ نہایت صالح، نظافت پسند، غایت درجہ فیاض اور عفت وحیا کی مجسم
مرقع ہیں، سیم وزر کی اُن کے دستِ گہر پاش کے سامنے پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں، قلب خاشع
اور طبیعتِ متواضع رکھتی ہیں، اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو اور ہماری اولاد کو صراط مستقیم اور طریقۂ انیقۂ حضرت
رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قائم و ثابت قدم رکھے، وھو ولی التوفیق،

(باقی)

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، انکا لب ولہجہ دلآزی اور تعصب سے خالی نہیں
ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض وعناد پیدا ہوجاتا ہے، مولنا
ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے، کہ اس کا
طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو اور مسلمان فرما نرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں
جو کام کئے ہیں، وہ بلا تفریق مذہب وملت معلوم ہوجائیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت عہ، منیجر

مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم

"برٹش ایسٹ افریقہ کے شہر ممباسہ واقع کینیا سے ہم کو حسب ذیل خط موصول ہوا ہے، جو افادۂ عام کی غرض سے شائع کیا جاتا ہے،"

"س"

مکرمی معظمی جناب مولینا سید سلیمان ندوی صاحب دام اقبالکم،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

پچھلے سال ماہ فروری ۱۹۲۵ء کے رسالہ معارف کے شذرات میں جناب نے نوآبادیات میں اسلامی تعلیم کی کمی پر روشنی ڈالتے ہوئے مشرقی افریقہ کا ذکر بھی فرمایا تھا، اسی وقت خیال آیا، کہ جناب کی خدمتِ اقدس میں برٹش ایسٹ افریقہ کے عام مسلمانوں کی حالت کا نقشہ پیش کروں، لیکن افسوس کہ کاروبار کی الجھنون نے اس کام کی التوا میں ڈالے رکھا، آج اتفاقًا وہی رسالہ معارف نظر سے گذرا، تو دوبارہ خیال پیدا ہوا، آج اسکو عملی جامہ میں آپکی خدمت میں پیش کر رہا ہون،

محترم آپنے جو تعلیمی نقشہ اسلامی دنیا کا نوآبادیات کی بابت کھینچا ہے، وہ بالکل درست اور بجا ہے، لیکن آپ یہ سن کر خوش ہوں گے، کہ کینیا کولونی کے ہندوستانی مسلمانوں نے اس کمی کو محسوس کرکے ۱۹۲۳ء میں ایک انجمن دارالسلطنت نیروبی میں قائم کی، جس کا نام انجمن حمایت اسلام رکھا، اس کی کوششوں سے مسلمانوں کی دینی تعلیم کا انتظام ہوگیا ہے، چونکہ موجودہ تجارتی حالات کی وجہ سے انجمن کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں، جتنی ہونی چاہئے، پھر بھی اپنے مقدور کے

مطابق کافی سے زیادہ کام کر رہی ہے، اور اب تک مندرجہ ذیل کام سرانجام دے چکی ہے، انجمن کے سرپرست مولانا حاجی سید عبد اللہ شاہ صاحب اور مولینا عبد المومن صاحب مرحوم تھے، مولینا عبد المومن صاحب پچھلے سال وفات پاگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ دونوں حضرات مشرقی افریقہ میں عالم جید تھے اور محض مختلف عقائد رکھنے والے مسلمانوں میں ہی نہیں، بلکہ غیر مسلموں میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے،

۱۔ مرزائی اعتقادات کی مکمل بیخ کنی کر چکی ہے، کیونکہ یہاں یہ وبا اور فتنہ پھیل چلا تھا،

۲۔ کینیا کولونی، یوگنڈا، اور ٹانگانیکا کے بڑے بڑے شہروں میں انجمن کی شاخیں قائم ہیں، جو اپنے اپنے شہر میں مسلمانوں کی مذہبی اور تعلیمی اصلاح میں کوشاں ہیں،

۳۔ نیروبی میں افریقی مسلمانوں کے لئے اسلامی تعلیم کا انتظام اور تبلیغِ اسلام کے لئے خاص مبلغ (جو کہ افریقی لوگوں میں سے ہوں گے) تیار کرنے کا کام، ان کے تمام اخراجات طعام، لباس اور رہائش وغیرہ انجمن برداشت کرے گی،

۴۔ ان دنوں انجمن نے اپنا پریس منگوایا ہے، جس میں ہفتہ وار اخبار نکلے گا، جو سہ رخی انگریزی اور اردو میں ہوگا،

۵۔ اس سے قبل ہفتہ وار ٹریکٹ نیروبی سے اردو زبان میں نکلتے تھے، جو تمام شہروں میں تقسیم کئے جاتے تھے،

۶۔ انجمن نے ایک عالم مولینا محمد حسین صاحب فاضل دیوبندی کی خدمات حاصل کرلی ہیں، جن کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں، انجمن کی دعوت پر دوسرے شہروں میں دورہ، خاص نیروبی شہر میں قرآن اور حدیث شریف کا جامع مسجد میں روزانہ درس (جس میں حاضرین کی تعداد تقریباً سو ہوتی ہے) ایک دوسرے بزرگ مولینا محمد حسین صاحب، حضرت مولینا سید حسین احمد صاحب مدنی کی وساطت سے یہاں آئے ہیں،

۷۔ مسلمان بچوں کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام بھی خاص طور پر کیا گیا ہے، ان پڑھ مسلمانوں کے لئے نائٹ اسکول جاری کئے گئے ہیں،

۸۔ مولینا محمد حسین صاحب کے قبل انجمن نے مولانا لال حسین اختر صاحب کی عارضی خدمات انجمن احمدیہ اشاعت اسلام لاہور کی معرفت حاصل کی تھیں جنھوں نے اپنی فرائض کو اس طرح تن دہی سے انجام دیا، کہ ان کی کوششوں اور خداوند کریم کے فضل و کرم سے انجمن کی مالی حالت بھی درست ہو گئی، ہر انجمن بھی کافی دلچسپی لینے لگ گئی ہیں، اور مرزائیت کو انھوں نے موت کے گڑھے میں ڈال دیا جو اس کام میں و ثماں ملکہ رکھتی ہیں،

۹۔ ہر اتوار کو اسلامی لکچر ہوتا ہے جس میں ہر خیال کے مسلمان شریک ہوتے ہیں، اس سرزمین میں اگرچہ ہر عقیدہ کے مسلمان ہیں، لیکن تمام کام آپس میں اتحاد اور اتفاق سے طے پاتے ہیں، کوئی مذہبی جھگڑا نہیں، صرف مرزائی فرقہ ایک لعنت تھی، اس کا خداوند کریم نے کافی سدباب کر دیا،

۱۰۔ اب انجمن قرآن حکیم کا سواحلی زبان (یعنی افریقہ میں جو عام رائج زبان ہے) میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کرتی ہے، اور ساتھ ہی سیرۃ الرسول بھی اس زبان میں شائع کرے گی،

اخیر میں ایک افسوسناک خبر بھی گوش گذار کر دیتا ہوں، کہ انجمن مذکور کے محترم صدر سید احمد اللہ صاحب کوکن (جو بڑے بارسوخ اور متمول شخص تھے، اور چار سال سے انجمن کے صدر تھے) اس سے ایک ہفتہ قبل موٹر کار کے حادثہ میں داغ مفارقت دے گئے، اِنّا للّٰہ وانّا الیہ راجعُون، ان کی موت نے مشرقی افریقہ کو چند دنوں کے لئے ماتم کدہ بنا دیا، سید صاحب مرحوم نے چار سال تک جس تن دہی سے انجمن کی خدمت کی، اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ڈاکٹر خالد شیلڈریک جب نیروبی آکر ایک ہفتہ رہے، تو اونھوں نے صدر صاحب کی عدم موجودگی میں یہ الفاظ فرمائے، کہ میں تمام اسلامی دنیا میں پھر آیا ہوں، لیکن جس قسم کا صدر یہاں کی انجمن کو ملا ہے، اس قسم کے آدمی شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آئے۔"

آپ کا تابعدار محمد اسمٰعیل ٹھیکیدار،

ممباسہ (کینیا)

تلخیص و تبصرہ

نادر شاہ ایرانی اور اتحادِ اسلامی

نادر شاہ نے شیعہ اور سنیوں کو باہم متحد کرنے کی جو کوشش کی تھی، اس کا مختصر تذکرہ معارف اپریل ۱۹۲۳ء کے مضمون خلافت میں آج سے پندرہ سال پہلے گذر چکا ہے، اب مسلمان (کلکتہ) کے گذشتہ عید نمبر میں ایک مفصل مضمون حوالۂ قلم ہوا ہے، اس کوشش میں علامہ عبداللہ سویدی کی خدمت بھی بہت نمایاں تھی، اور موصوف نے اس پر ایک رسالہ الحجج القاطعہ تحریر فرمایا تھا جس کے بعض حصے اس مضمون میں نقل کئے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوگا، کہ کن اسباب کی بنا پر یہ کوشش ناتمام رہی، اب آج تمام مسلمانوں کے لئے یہ قابلِ غور مسئلہ ہے، کہ اب جب اسلام کے سیاسی حالات میں عظیم الشان تغیر پیدا ہو چکا ہے، اور سنیت اور شیعیت ترکی اور ایرانی سلطنتوں کے تعمیری اجزار باقی نہیں رہے، ان ہی مقررہ اصول کے طرز پر فریقین کے درمیان کیا اب صلح کی دفعات مرتب نہیں ہوسکتیں، ؟ خصوصاً اس حالت میں کہ سلطان ابن سعود نے حرمین المحترمین سے چار مصلوں کی بدعت بھی مٹا دی ہے،"

"متعدد فتوحات کے بعد جب ۱۱۴۸ھ میں نادر شاہ وادی مغاں میں داخل ہوا تو اعیانِ سلطنت نے ایران کا تاج اس کے سامنے پیش کیا، لیکن اس نے تاج کے قبول کرنے سے اسوقت تک کے لئے انکار کر دیا جب تک شیعہ اور اہلِ سنت کا اختلاف دور نہ ہو جائے، تاریخ جہاں کشا میں ہے کہ اس نے

ایرانی سرداروں سے حسب ذیل گفتگو کی :۔

نبی کریم صلعم کی وفات کے بعد آپ کے چار صحابہؓ خلافت پر مامور ہوئے، اس واقعہ کو ہندوستان روم (ترکی) ترکستان اور دوسرے ملک نے تسلیم کر لیا ہے، قدیم زمانہ میں ایران کا بھی یہی عقیدہ تھا، پھر شاہ اسمٰعیل صفوی نے ملکی اسباب کی بنا پر اسے ترک کر دیا، اگر اہل ایران چاہتے ہیں کہ میں بادشاہی قبول کروں، اور وہ خود اپنی اصلاح کے بھی خواہشمند ہیں، تو ضروری ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ اختیار کر لیں، جو ہمارے آبا و اجداد کا مسلک تھا، چونکہ امام جعفر صادق کو جو ہمارے نبی کی اولاد میں ہیں، تمام مسلمان امام تسلیم کرتے ہیں، نیز چونکہ اہل ایران انکے مسلک سے واقف ہیں، لہذا انھیں چاہئے کہ امام موصوف کے مسلک کو اپنا مذہب بنالیں"

لوگوں نے یہ شرط منظور کی، اور ایک محضر تیار کرکے اس پر اپنی مہریں ثبت کر دیں، اس کے بعد نادر شاہ نے تاج قبول کر لیا، اور اس واقعہ کی اطلاع امیر المومنین سلطان ترکی کی خدمت میں بھیجی تاکہ دولت عثمانیہ اور حکومت ایران کے اختلافات دور ہو جائیں، اور دوستانہ تعلقات پھر قائم ہو جائیں نادر شاہ نے دربار خلافت میں جو مراسلہ بھیجا، اس میں مندرجۂ ذیل امور کی درخواست بھی کی :۔

۱۔ چونکہ اہل ایران ان عقائد سے تائب ہو گئے ہیں، جو اب تک بنائے مخالفت تھے اس لئے امید ہے کہ امیر المومنین اور علمائے دولت عثمانیہ جعفری مذہب کو اسلام کا پانچواں مذہب تسلیم کریں گے،

۲۔ حرم کعبہ میں چار مصلوں کے علاوہ ایک پانچویں مصلے یعنی جعفری مُصلّے کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ ہمارے آدمی اپنے ایام کے پیچھے نماز ادا کر سکیں،

۳۔ ایرانی زائرین کو ایک ایرانی میرحج کی قافلہ سالاری میں مکہ معظمہ جانے کی اجازت دیجائے اور عثمانی عمال اس قافلے کے لئے ویسی ہی سہولتیں بہم پہنچائیں جیسی مصر اور شام وغیرہ کے قافلوں

کو پہونچائی جاتی ہیں،

۴- جنگ کے قیدیوں کو جو دونوں حکومتوں میں ہیں، آزاد سمجھا جائے، اور انہیں غلام نہ بنایا جائے،

۵- دونوں حکومتیں اپنے مستقل سفیر ایک دوسرے کے دار السلطنت میں متعین رکھیں تاکہ باہمی معاملات بہ حسن و خوبی طے ہوتے رہیں،

چونکہ باب عالی میں مذکورۂ بالا معروضات بے اثر رہے، اسلئے جب ۱۱۵۶ھ ہجری میں نادر شاہ نجف گیا، تو اُس نے سلطان سے ان مطالبات کی منظوری حاصل کرنے کی ایک بار اور کوشش کی، اس نے اپنی سلطنت کے تمام بڑے بڑے علما، اور سربرآوردہ اشخاص کو دعوت دی، کہ ایک مجلس منعقد کر کے معاہدۂ مغان کی تجدید و تصدیق کریں، چنانچہ احمد پاشا والی بغداد کو بھی لکھا گیا کہ وہ ایک ایسا عالم روانہ کرے، جو دینیات کا فاضل ہو تاکہ ثالث کی حیثیت سے فریقین کے اختلافات دور کر کے اون کو باہم ملا سکے، احمد پاشا نے اس خدمت کے لئے علامہ عبد اللہ سویدی کو منتخب کیا، جو اپنے وقت میں بغداد کے سب سے بڑے فاضل تھے،

یہ مجلس کامیاب ہوئی، معاہدۂ مغان از سر نو مستحکم کیا گیا، نادر شاہ نے مرزا محمد علی نائب وزیر کو ایران کے تمام حصوں میں مجلس کے فیصلہ کا اعلان کرنے اور خلفاے اربعہؓ کے نام تمام ایران میں جمعہ کے خطبے میں داخل کرانے کے لئے روانہ کیا، اس نے مجلس کی روئداد دربار خلافت میں قسطنطنیہ بھیجی، اور اپنے مطالبات کی منظوری کے لئے پھر استدعا کی، ترکی شیخ الاسلام اور سلطان محمود خان پہلے دو مطالبات پر راضی نہیں ہوئے، یعنی جعفری مذہب کو تسلیم کرنا، اور کعبہ میں ایک پانچواں مصلّیٰ قائم کرنا، نادر شاہ نے بھی معاملہ کی دشواری دیکھ کر زیادہ زور نہیں دیا، اور بقیہ تین مطالبات کی منظوری پر قناعت کر لی، ۱۱۵۹ھ ہجری میں بالآخر سلطنت عثمانیہ اور حکومت ایران کے درمیان ایک صلحنامہ مرتب ہو گیا،

علامہ عبد اللہ سویدی نے ایک رسالہ الحجج القاطعہ فی اتفاق الامم الاسلامیہ کے عنوان سے لکھا ہے جس میں انھوں نے بغداد سے نجف تک کے سفر اور اس مجلس کے حالات بیان کئے ہیں، اسکے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

"میں دوران سفر میں فریقین کے امکانی دلائل کے سوچنے اور مرتب کرنے نیز جو اعتراضات پیش کئے جا سکتے تھے، ان کے جوابات تیار کرنے میں تمام تر منہمک رہا، یہ انہماک اور اعتراضات کے جوابات معلوم کرنے اور شبہات کے دور کرنے کی کوشش اس وقت تک جاری رہی، جب تک میں نے اپنے ذہن میں سو سے زیادہ امکانی سوالات اور ہر سوال کے ایک، دو یا تین جواب اس شبہہ کی مناسبت سے جو اس کے متعلق پیدا ہو سکتا تھا، مرتب نہ کر لیا، ان باتوں کا اثر مجھ پر اتنا پڑا کہ میں بیمار ہو گیا"

اس کے بعد علامہ موصوف نادر شاہ کی ملاقات کا حال بیان کرتے ہین:۔

"میں نے اپنے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جیسا کہ اسکی نشست سے اندازہ ہو سکتا تھا اس کے سر پر قلنسوہ کے مثل جو اہل ایران پہنتے ہیں، ایک بلند چوکور ٹوپی تھی، اس پر ایک عمامہ تھا جو موتیون، لعل، ہیرے اور دوسرے قیمتی جواہرات سے آراستہ تھا، گلے میں موتیون اور لعل کا ایک ہار تھا، بازوؤں پر بازو بند تھے، جن پر موتی، ہیرے اور لعل ٹکے ہوئے تھے، اس کے چہرے سے بوڑھاپے کی علامتیں ظاہر تھین، سامنے کے دانت گر گئے تھے، عمر تقریباً اسی سال تھی، داڑھی میں نیل کا خضاب تھا، بھنویں مثل دو کمانوں کے تھیں آنکھیں کسی قدر بھوری لیکن خوبصورت تھیں، چہرہ بحیثیت مجموعی خوشنما تھا، جوں ہی میری نظر اس پر پڑی، میرے دل سے تمام ہول زائل ہو گیا، اور اسکی طرف سے جو خوف تھا، وہ سب جاتا رہا، وہ پہلے کی طرح مجھ سے ترکمانی زبان میں مخاطب ہوا، اور پوچھا کہ احمد خان کیسا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ بخیریت ہے، پھر اس نے پوچھا کیا تم جانتے ہو

کہ میں نے تمکو کیوں بلایا ہے، ؟ میں نے کہا نہیں" تب اُس نے کہا ہ میری مملکت میں دو گروہ ہیں یعنی ترکستان اور افغانستان کے لوگ جو ایرانیوں کو کافر کہتے ہیں، اور مذہب میں کفر میرے نزدیک ایک نفرت انگیز چیز ہے،

ایسا نہ ہونا چاہئے، کہ میری حکومت کے اندر بعض جماعتیں بعض دوسری جماعتوں کو کافر کہیں، اب میں تمھیں اپنا وکیل مقرر کرتا ہوں، اور تم سے کہتا ہوں کہ تمام زندقہ کا استیصال کردو، اور ان تینوں گروہوں کے درمیان جو معاہدہ ہو، میری طرف سے اس کے گواہ رہو، جو کچھ تم سنو اور دیکھو، اسکی اطلاع مجھے دو، نیز احمد خاں کو بھی اس سے مطلع کرو"، پھر اوس نے مجھے رخصت ہونے کی اجازت دی، اور حکم دیا کہ میرا قیام اعتماد الدولہ کے مکان پر ہو، اور بعد نماز ظہر میں ملا باشی سے ملاقات کروں، میں حضور شاہ سے بڑی خوشی اور مسرت کی حالت میں نکلا، کیونکہ نائبی کی خدمت مجھے عطا کی گئی تھی"،

"جب میں ملا باشی کی خدمت میں پہنچا تو وہ نکل کر میرے استقبال کے لئے آیا، وہ ایک چھوٹے قد کا آدمی ہے، گندمی رنگ، جلنے سے جو نشان کنپٹی پر پڑ گیا ہے، وہ سر کے درمیان تک پہنچا ہے، میں گھوڑے سے اتر پڑا، اس نے مجھے تعظیم دی، اور تخت پر بٹھایا، اور خود ایک شاگرد کی طرح میرے سامنے بیٹھا، پھر ہمارے درمیان گفتگو شروع ہوئی،" (اوس کے بعد مذہبی مباحثہ کی تفصیلات ہیں)

"شاہ کو اس بحث کی اطلاع بالکل صحیح صحیح دے دی گئی، اوس نے علماے ایران، علماے افغانستان اور علماے ماوراء النہر کو حکم دیا، کہ جمع ہو کر بدعت و زندقہ کے ختم کرنے کا فیصلہ کریں، مجھ سے کہا کہ تم میرے نمایندہ کی حیثیت سے انکو دیکھتے رہو، اور زیر بحث مسائل پر جو اقرار نامہ انکے درمیان مرتب ہو اسکے گواہ رہو؛

جلسہ کے روز مجمع بہت تھا حضرت علیؓ کے روضہ کے پیچھے ایران کے ستر علما مجتمع ہوئے ان میں مفتی اردلان کے سوا اور کوئی سنی نہ تھا، میں نے کاغذ اور قلم دوات منگوائی، اور جو لوگ ان میں سے زیادہ اہم تھے، ان کے نام لکھ لئے...........اس کے بعد افغان علما آئے، میں نے ان کے نام بھی لکھ لئے.........تھوڑی دیر کے بعد علماے ماوراء النہر آئے جنکی تعداد سات تھی...........میں نے ان کے نام بھی لکھ لئے، جب مجلس باقاعدہ طور پر بیٹھ گئی، تو ملا باشی نے بحر العلم (یہ لقب علامہ ہادی خواجہ کا تھا، جو علمائے ماوراء النہر میں سب سے زیادہ ممتاز تھے) کو مخاطب کر کے پوچھا، "کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں"؟ یعنی مجھے، انھوں نے جواب دیا، کہ "نہیں"، تب ملا باشی نے کہا: "یہ شیخ عبد اللہ آفندی ہیں، جو سنی فرقہ کے اکابر علماء میں ہیں، انھیں وزیر احمد پاشا نے شاہ کی دعوت پر بھیجا ہے تاکہ اس جلسہ میں ثالث کی حیثیت سے موجود رہیں، یہ شاہ کے وکیل ہیں، لہذا اگر ہمارے درمیان کسی بات پر اتفاق ہوگا، تو وہ ہم سب کی طرف سے اوس کے گواہ ہوں گے، اب بتایئے آپ کن باتوں کی وجہ سے ہم پر کفر کا الزام رکھتے ہیں، تاکہ ہم شیخ عبد اللہ کی موجودگی میں ان سے باز آجائیں، لیکن حقیقت یہ ہے، کہ ابو حنیفہ کے مسلک کی رو سے بھی ہم کافر نہیں ہیں، وہ اپنی کتاب جامع الاصول میں کہتے ہیں، کہ اسلام پانچ فرقوں کو تسلیم کرتا ہے، اور انھوں نے امامیہ فرقہ کے پانچویں مذہب ہونے کا اقرار کیا ہے، صاحب المواقف بھی امامیہ فرقہ کو اسلامی فرقوں میں شمار کرتے ہیں، ابو حنیفہ اپنی فقہ الاکبر میں کہتے ہیں کہ اہل قبلہ کو کافر نہ کہو اور وہ سید جس کا نام میں اسوقت بھول رہا ہوں، انھوں نے ہدایۃ الفقہ الحنفی کی شرح میں لکھا ہے، کہ یہ صحیح ہے کہ امامیہ فرقہ اسلامی فرقوں میں سے ایک ہے، لیکن جب آپ کے علماے متاخرین آئے، تو انھوں نے ہمکو کافر کہنا شروع کیا، اور اسی طرح ہمارے علمائے متاخرین آپ لوگون کو کافر کہنے لگے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ نہ آپ کافر ہیں نہ ہم، بہر حال وہ باتیں بتایئے، جو آپ کے علماے متاخرین

نے بیان کی ہیں، اور جن کی بنا پر آپ لوگوں نے ہمیں کافر کہا ہے تاکہ ہم انہیں ترک کردیں"،

ہادی خواجہ بحر العلم:- آپ کافر ہیں اسلئے کہ شیخین رض پر تبرا کہتے ہیں،

ملا باشی:- ہم شیخین پر تبرا کہنا چھوڑتے ہیں،

بحر العلم:- آپ کافر ہیں اسلئے کہ صحابہ کو گمراہ اور کافر بتاتے ہیں،

ملا باشی:- تمام صحابہ رض عادل تھے،

بحر العلم:- آپ حضرات ابو بکر رض و عمر رض پر حضرت علی رض کو فضیلت دیتے ہیں، آپ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم کے بعد خلافت حضرت علی رض کو ملنی چاہئے تھی،

ملا باشی:- رسول اللہ صلعم کے بعد سب سے بہتر ابو بکر رض تھے، ان کے بعد عمر رض، تب عثمان رض پھر علی رض بن ابی طالب، اور اُن کا منصب خلافت پر مامور ہونا اُن کی فضیلت کی ترتیب کے مطابق تھا،

بحر العلم:- جب صورت حال یہ ہے، تو آپ مسلمان ہیں، ہمارا نفع نقصان آپ کا نفع نقصان ہے،

سب لوگوں نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملائے، اور ایک دوسرے کو مبارک باد دی، تینوں گروہوں نے جلسہ کی کارروائی اور اپنے فیصلہ کی مہر سے تصدیق کرائی، ۲۴ شوال چہارشنبہ کے روز قریب مغرب جلسہ برخاست ہوا،

دوسرے روز نادر شاہ کے حکم سے یہ مجلس پھر منعقد ہوئی، اور شاہی مفتی آقا حسین نے نادر شاہ کا فرمان پڑھ کر سنایا، وہ فرمان یہ تھا:-

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے نبیوں کا بھیجنا مقرر فرمایا، وہ یکے بعد دیگرے نبیوں کو بھیجتا رہا، یہاں تک کہ سب سے آخر ہمارے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، جب آپکا انتقال ہوا، تو چونکہ آپ نبیوں اور رسولوں میں سب سے آخری تھے، اسلئے آپ کے صحابہ رض نے

آپ کی جانشینی کے لئے اپنے میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ دانشمند شخص ابو بکر صدیقؓ بن ابی قحافہ کو منتخب کیا، انھوں نے جمع ہو کر بالاتفاق حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کا فیصلہ کیا، اور سب نے مل کر اُن کی اطاعت اور وفاداری کا حلف لیا، ان میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے، انھوں نے بھی بہ رضا و رغبت اور بغیر کسی جبر یا دباؤ کے یہ حلف لیا"، اس طرح بیعت اور خلافت کی تصدیق ہوئی اور صحابہ کا اتفاق آرا اس واقعہ کا قطعی ثبوت تھا، کیونکہ اللہ تعالی نے قرآن پاک میں ان کی تعریف فرمائی ہے، کہ "بیشک اللہ مومنوں سے خوش ہوا جب کہ انھوں نے درخت کے نیچے تمھاری اطاعت کا حلف لیا" یہ صحابہ تعداد میں سات سو تھے، اور حضرت صدیقؓ کی بیعت کے وقت سب موجود تھے، نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ "میرے صحابہ مثل ستاروں کے ہیں، ان میں سے جس کسی کی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے"، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خلافت کیلئے اپنا جانشین حضرت عمرؓ بن الخطاب کو نامزد کیا، اور تمام صحابہ نے ان کے سامنے بیعت کی جس میں حضرت علیؓ بن ابی طالب بھی شامل تھے، اس طرح حضرت عمرؓ کی بیعت صحابہ کے متفق علیہ فیصلہ کے مطابق بھی تھی، اور خود خلیفہ کی ہدایت کے مطابق بھی، حضرت عمرؓ نے خلافت کا مسئلہ چھ آدمیوں کی ایک مجلس کے سپرد کر دیا، جس میں ایک حضرت علیؓ بن ابی طالب بھی تھے مجلس نے حضرت عثمانؓ بن عفان پر اتفاق کیا، جب وہ اپنے گھر میں شہید کئے گئے، اور اپنا جانشین نامزد نہ کر سکے، تو خلافت کا عہدہ معطل رہا، پھر صحابہ نے اس روز سہ پہر کو حضرت علیؓ بن ابی طالب کی خلافت پر اتفاق کیا، یہ چاروں حضرات رضہ ایک ساتھ ایک مقام پر اور ایک وقت میں تھے، لیکن ان کے درمیان کبھی کوئی لڑائی جھگڑا یا تکرار نہیں ہوئی، بر خلاف اس کے وہ ایک دوسرے کا اسقدر احترام اور مدح سرائی کرتے تھے، کہ جب حضرت علیؓ سے شیخینؓ کے متعلق سوال کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ "وہ دو راستباز اور عادل رہنما تھے، وہ حق پر زندہ رہے، اور حق پر مرے"، اسی طرح جب حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے فرمایا "کیا تم میرے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہو، جب کہ علیؓ تمھارے درمیان میں"، آپ

اہل ایران تم کو معلوم ہونا چاہئے، کہ ان حضرات کی فضیلت اور جانشینی کی ترتیب وہی تھی، جو بیان کی گئی، اب اگر تم میں سے کوئی شخص ان پر تبرا کہے گا، یا ان کی عیب جوئی کرے گا، تو اس کی دولت اُس کے بال بچے، اس کے اعزہ و اقربا، اور اس کا خون شاہ کے لئے جائز ہو جائے گا، اور ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ اُس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو گی، جب تم نے ۱۱۴۸ھ میں وادی مغاں میں میری وفاداری کا حلف لیا تھا، تو میں نے یہ شرط تم پر پہلے ہی عائد کر دی تھی، کہ تبرا یک قلم موقوف کر دیا جائے گا، چنانچہ اب میں اسکو بند کرتا ہوں، آئندہ اگر کوئی صحابہ پر تبرا کہے گا تو میں اُسے قتل کر دوں گا، اس کے بال بچوں کو قید اور اسکی جائداد کو ضبط کر لونگا، زمانہ قدیم میں مملکتِ ایران یا ان ممالک میں جو ایرانی علاقوں کے اطراف میں تھے، ان شرمناک بدزبانیوں کی قسم کی کوئی چیز نہ تھی، ان کا رواج بدذات شاہ اسمٰعیل صفوی کے عہد میں ہوا، اور اُس کے جانشین اُسی کے نقشِ قدم پر چلتے رہے، یہاں تک کہ تبرا ترقی کرتا گیا، بدعت و زندقہ ہر طرف پھیل گیا، اور رخنے وسیع ہو گئے، یہ ۹۰۶ھ ہجری میں ہوا، ان نفرت انگیز باتوں کو شائع ہوئے تین سو برس گذر چکے ہیں،........"

شاہی فرمان کے نیچے اسی کاغذ پر ایک اقرار نامہ اہل ایران کی طرف سے درج تھا، وہ یہ تھا،۔ "ہم لوگوں کو قبول ہے کہ صحابہ پر تبرا کہنا بالکل موقوف کر دیا جائے، ہم ان کی فضیلت اور ترتیبِ خلافت کو جیسا کہ اس دستاویز میں مذکور ہے تسلیم کرتے ہیں، ہم میں سے جو شخص تبرا کہے یا ان معاہدوں کے خلاف کچھ زبان سے نکالے اُس پر خدا کی لعنت، اسکے فرشتوں کی لعنت اور تمام نوعِ انسانی کی لعنت ہو، اور ہم لوگوں پر نادر شاہ کا غضب نازل ہو، اور ہماری جائداد، خون اور بال بچے اس کے لئے جائز ہو جائیں"،

ایرانیوں نے اس اقرار نامہ پر اپنی مہریں لگائیں، اس کے نیچے نجف، کربلا، حلات اور

خوارزم کے لوگوں کی طرف سے بھی ایک اقرارنامہ تھا، اس کا مضمون بھی وہی تھا جو اہلِ ایران کے اقرارنامہ کا، پھر اسکے نیچے افغانوں کی طرف سے حسب ذیل اقرارنامہ تھا:۔

"جب تک اہلِ ایران معاہدہ کے پابند رہیں گے، اور اس کی خلاف ورزی نہ کریں گے اس وقت تک وہ اسلامی فرقوں میں شمار ہوں گے، اور ان کا نفع نقصان مسلمانوں کا نفع نقصان سمجھا جائے گا"۔

ان لوگوں نے بھی اپنے اقرارنامہ پر اپنی مہریں ثبت کیں، اس کے علاوہ علماے ماوراالنہر کی طرف سے ایک اقرارنامہ تھا جس کا مضمون افغانوں کے اقرارنامہ کے مثل تھا، انھوں نے بھی اپنی مہریں لگائیں، تب میں نے دستاویز کے سرے پر اپنی یہ شہادت درج کی:۔

"میں اس معاہدہ کی تصدیق کرتا ہوں جس پر تینوں جماعتوں نے اتفاق کیا ہے، اور اس پر پابند رہنے کا وعدہ کیا ہے، نیز اس امر کی کہ انھوں نے اپنے اس اقرارنامہ کا مجھے گواہ بنایا ہے"۔

نادرشاہ نے علامہ سویدی کو بلاکر ان کا شکریہ ادا کیا، اور مجلس کی کامیابی پر نہایت مسرت ظاہر کی، دوسرے روز جمعہ کو اسکے حکم سے کوفہ کی مسجد میں خلفاے اربعہ کے نام خطبہ میں بالترتیب پڑھے گئے، اور سلطان محمود خاں عثمانی اور اس کے بعد نادرشاہ کے لئے دعا کی گئی، نماز جعفری طریقہ کے مطابق ادا ہوئی، پھر علامۂ موصوف کو بغداد واپس جانے کی اجازت ملی، اور ان کے ساتھ معاہدہ مذکورا اور اس خطبہ کی ایک نقل بھی روانہ کی گئی،

"ع ز"

امریکہ میں قتل کی گرم بازاری

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں قتل کے واقعات کا اوسط تقریباً بارہ ہزار سالانہ رہتا ہے، اور یہ آ

سے دس سال قبل کی بہ نسبت کم ہے، ڈاکٹر فریڈریک ہوفمین (Dr. Frederick Hoffman)

ماہر اعداد و شمار کے بیان کے مطابق ۱۹۲۵ء میں مردم کشی کا اوسط (۱۱/۲) فی لاکھ تھا جو ۱۹۳۵ء میں

(۸/۱۱) فی لاکھ تک اتر آیا ۱۹۲۵ء کے بعد اس جرم کا سب سے زیادہ ارتکاب ۱۹۳۳ء میں ہوا تھا جبکہ

ریاستہائے متحدہ میں (۱۲۱۲۴) آدمی قتل کئے گئے تھے یعنی (۹/۶) فی لاکھ ۱۹۲۸ء میں یہ اوسط (۸/۸)

تھا لیکن اسکے بعد کساد بازاری کے سالوں میں ترقی کرکے ۱۹۳۳ء میں (۹/۶) تک پہنچ گیا ۱۹۳۴ء

سے اس میں پھر تخفیف ہو رہی ہے لیکن اس تخفیف کے باوجود امریکہ میں قتل کے واقعات بہ نسبت دوسرے

ملکوں کے اب بھی زیادہ ہوتے ہیں، مثلاً انگلستان اور ویلز میں مردم کشی کا اوسط ۱۹۳۴ء میں

صرف (۰/۶) فی لاکھ تھا، کناڈا میں (۱/۳) اور اٹلی میں (۲) فی لاکھ، فن لینڈ میں البتہ ۱۹۳۲ء کا اوسط

(۹) فی لاکھ تھا، اور رومانیا میں (۶/۴) فی لاکھ،

اگرچہ بحیثیت مجموعی امریکہ میں قتل کے واقعات بہ نسبت پہلے کے اب کم ہو رہے ہیں، تاہم

وہاں نوجوان قاتلوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے، دسمبر ۱۹۳۶ء میں نیویارک کے قیدخانہ سنگ

سنگ (Sing Sing Prison.) میں قتل کے مجرموں کی تعداد جن کو سزائے موت کا

کم ہو چکا تھا (۲۳) تھی، ان میں سے (۹) کی عمریں اکیس سال سے کم تھیں بعض سترہ سال کے تھے، بعض اٹھارہ انیس اور بیس سال کے، ان سب نے روپیہ کی خاطر قتل کئے تھے، ان (۹) کے علاوہ بقیہ (۱۴) میں صرف دو کی عمریں اکتیس سال سے زیادہ تھیں، نیویارک کے علاوہ ریاستہائے متحدہ کے تمام دوسرے حصوں میں بھی ہزاروں نوجوان قاتل قید خانوں میں بند ہیں، ۱۹۳۶ء کے پہلے نو مہینوں میں (۲۱) سال سے کم کے جو مجرم گرفتار کئے گئے، ان کی تعداد (۵۹۹۴) تھی، ان میں (۵۲۶) قتل کے مجرم تھے، ۱۹۳۶ء کے ان ہی مہینوں میں گرفتار شدہ مجرموں کی تعداد میں (۲۱) سال سے کم عمر والوں کا تناسب (۱۷) فی صدی تھا، ۱۹۳۵ء میں اور اس کے قبل چار سال تک (۱۹) سال کے مجرموں کی تعداد ہر عمر کے مجرموں کی انفرادی تعداد سے زیادہ تھی،

امریکہ میں قتل کی وبا اسقدر عام ہے کہ وہاں کے محکمۂ تفتیشِ جرائم کا ایک افسر جارج شٹیل (George Schattle.) بیان کرتا ہے، کہ "ریاستہائے متحدہ، امریکہ میں جو جرم سب سے زیادہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے، وہ مردم کشی کا جرم ہے"، اس کے پیش کردہ اعداد و شمار کی رو سے ہر سال تقریباً بارہ ہزار واقعات قتل کے ہوتے ہیں، لیکن گرفتاریاں صرف نو ہزار ہوتی ہیں، ان نو ہزار قیدیوں میں سے سزائے موت اوسطاً صرف (۱۱۰) کو ملتی ہے، قتل کے نناوے فی صدی واقعات میں جیوری سزائے موت کا فیصلہ صادر نہیں کرتی، یا مجرم بری کر دیئے جاتے ہیں، افسر مذکور کی رائے ہے، کہ قتل کی یہ گرم بازاری پبلک اور جیوری کی بیجا ہمدردی کی وجہ سے ہے، وہ لکھتا ہے کہ قاتلوں کی گرفتاری کا معاملہ اتنا دشوار نہیں ہے، جتنا ان کے اثباتِ جرم اور سزا کا

جنگ جو کی امن پسندی اور نوبل انعام کا عطیہ

حال میں اوسلو (ناروے) کی نوبل پرائز کمیٹی نے اعلان کیا ہے، کہ ۱۹۳۵ء کا انعام امن (Peace Prize) کارل فان اوسٹیز کی (Karl von Ossietzky

اور سنہ ۱۹۳۶ء کا کارلوس ساویدرا لاماس (Carlas Saavedra Lamas) وزیر خارجہ ارجنٹائن (جنوبی امریکہ) کو عطا کیا گیا، یعنی کمیٹی مذکور کے نزدیک ان دونوں اشخاص نے دنیا میں تحریک امن کو ترقی دینے میں سب سے زیادہ سعی کی ہے، اور اس صلہ میں دنیا کے سب سے بڑے انعام نوبل پرائز کے مستحق قرار دیئے گئے ہیں، اوسٹیز کی جنگ عظیم میں چار سال تک جرمن فوج کا ایک افسر رہ چکا ہے، اپنے تجربات کی بنا پر وہ بعد میں جنگ کا مخالف ہو گیا، اور ایک اخبار نکال کر صلح و امن کی تبلیغ شد و مد کے ساتھ شروع کر دی، اس تبلیغ کے سلسلہ میں اُس نے بعض ایسے مضامین بھی شائع کئے جن میں حکومت جرمنی کے فوجی معارف پر نہایت سخت اعتراضات کئے گئے تھے، چنانچہ حکومت نے اسے گرفتار کر کے دو سال کے لئے قید کر دیا، رہائی کے بعد جب سنہ ۱۹۳۳ء میں نازی حکومت برسراقتدار آئی، تو اس نے پھر اس داعی امن کو گرفتار کر لیا، ابھی حال میں وہ اپنی مدت پوری کر کے دوبارہ قید سے چھوٹا ہے، قید کے دوران ہی میں نوبل پرائز کمیٹی نے اس کے انعام کا اعلان کیا، اس مسئلہ پر کمیٹی کے ارکان میں شدید اختلاف تھا، چنانچہ کابینۂ نارو سے کے دو ممبروں نے جو اس کمیٹی کے بھی رکن تھے، اس بنا پر کمیٹی کی رکنیت سے استعفا دیدیا کہ اوسٹیز کی کو انعام دینے کی وجہ سے غیر حکومتوں کے جذبات اور اغراض پر بُرا اثر پڑے گا، برلن کا ایک سرکاری بیان نوبل کمیٹی کے اس فیصلہ کی نسبت لکھتا ہے، کہ "یہ ایک گستاخانہ اشتعال انگیزی، اور جدید جرمنی کے لئے ایک توہین ہے" اوسٹیز کی کے متعلق بیان مذکور میں ہے کہ "وہ اپنے وطن کا غدار ہے، جس کے جرم کا فتویٰ ملک کی سب سے بڑی عدالت صادر کر چکی ہے" قرائن سے معلوم ہوتا ہے، کہ حکومت جرمنی اوسٹیز کی کو نہ تو انعام وصول کرنے کی اجازت دے گی، اور نہ ملک سے باہر جانے کی، نازی حکومت کی طرح اٹلی کی فاسستی حکومت میں بھی ان دونوں انعاموں پر سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے، روما کا اخبار لاوورو فاسستا (Lavoro Fascis Ta.) لاماس کو ایک آتش انگیز جہاں سوز

کا لقب دیتا ہے، حالانکہ گذشتہ سال ہی نازی گورنمنٹ اُسے توسیع امن کی خدمت کے صلہ میں جرمن صلیب احمر کا تمغہ عطا کیا تھا"

ایک عجیب مرض

امریکہ میں ایک شخص ہانس نلسن (Hans Nelson.) نامی ہے، جو ایک عجیب و غریب مرض کا شکار ہو گیا ہے، اب سے تیرہ برس پہلے اس کا وزن (۱۹۰) پونڈ اور قد پانچ فٹ ساڑھے دس انچ تھا، پھر کسی لامعلوم سبب سے اس کا قد اور بدن کم ہونا شروع ہوا، یہاں تک کہ گذشتہ دسمبر میں اسکا قد صرف پانچ فٹ اور وزن (۱۵۵) پونڈ رہ گیا یعنی اس کا قد تقریبًا ایک انچ ہر سال گھٹتا گیا، پچھلے سال اس نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، اونھوں نے اوسٹیو ملیشیا (Osteomalacia) کا مرض تجویز کیا، یہ مرض گردن کے چار خاص غدودوں کی خرابی سے پیدا ہو جاتا ہے، ان کو پراتھی رائڈ گلینڈز (Para thyroid Glands) کہتے ہیں، یہ چاول کے برابر ہوتے ہیں، جب انکا فعل خراب ہو جاتا ہے، تو ہڈیوں میں چونے کی مقدار کم ہونے لگتی ہے، اور وہ نرم ہو کر سکڑنے لگتی ہیں، اسی وجہ سے قد بھی کم ہونے لگتا ہے، تکان رہتا ہے، اور وزن اور قوت میں کمی آجاتی ہے، ڈاکٹروں نے نلسن کے لئے جو پرہیزی غذا تجویز کی ہے، اس سے کافی فائدہ معلوم ہوتا ہے، وہ غذا یہ ہے، پھل، ترکاریاں، دودھ، مچھلی کا تیل، چنانچہ گذشتہ دسمبر میں اس کا وزن (۱۵) پونڈ بڑھ گیا ہے، قوت بھی آگئی، اور وہ اس قابل ہو گیا کہ خود موٹر چلا سکے، اسکے معالج ڈاکٹروں کا خیال ہے، کہ اب اس کا قد کم نہ ہوگا، لیکن چونکہ اسکی عمر (۵۲) سال کی ہو چکی ہے اسلئے قد کے دوبارہ بڑھنے کی امید نہیں، یہ غدود اعصاب کی صحت کے لئے بھی نہایت ضروری ہیں، ان کی خرابی سے احساس میں براَنگیختگی بڑھجاتی ہے، اور ذرا ذرا سی بات پر مریض بے قابو ہو جاتا ہے،

"ع ز"

داغِ جگر

از جناب جگر مراد آبادی

شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

کوے جاناں کی ہوا تک سے بھی تھراتا ہوں میں
کیا کروں؟ بے اختیارانہ چلا جاتا ہوں میں

آ، کہ تجھ بن، اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

یک بہ یک گھبرا کے جتنی دور ہٹ آتا ہوں میں
اور بھی اُس شوخ کو نزدیک تر پاتا ہوں میں

جب مکان و لامکاں سب سے گذر جاتا ہوں میں
اللہ اللہ تجھ کو، خود اپنی جگہ پاتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم، میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو، مگر گذرا چلا جاتا ہوں میں

حسن کو کیا دشمنی ہے عشق کو کیا بیر ہے
اپنے ہی قدموں کی خود ہی ٹھوکریں کھاتا ہوں میں

ہائے رے مجبوریاں ترکِ محبت کے لئے
مجھ کو سمجھاتے ہیں وہ اور ان کو سمجھاتا ہوں میں

تیری محفل، تیرے جلوے، پھر تقاضا کیا ضرور
لے اٹھا جاتا ہوں ظالم لے چلا جاتا ہوں میں

تا کجا یہ پردہ داری ہائے عشق و لافِ حسن
ہاں سنبھل جائیں دو عالم ہوش میں آتا ہوں میں

میری ہمت دیکھنا، میری طبیعت دیکھنا
جو سلجھ جاتی ہے گتھی پھر سے الجھاتا ہوں میں

دیکھنا اس عشق کی یہ طرفہ کاری دیکھنا
وہ جفا کرتے ہیں مجھ پر اور شرماتا ہوں میں

دل مجسّم شعر و نغمہ وہ سراپا رنگ و بو — کیا فضائیں ہیں کہ جن میں حل ہوا جاتا ہوں میں

یاد ایسے کہ ہر ہر سانس تھا لب ریز شوق — اب تو نام آرزو بھی سن کے تھرّاتا ہوں میں

تیری اک آنکھوں کا ساغر تیری اک رُخ کی بہار — یہ میسّر ہوں تو ہر جنّت کو ٹھکراتا ہوں میں

تا کجا دردِ محبت تا کجا دردِ فراق — رحم کر مجھ پر کہ تیرا راز کھلاتا ہوں میں

میری خاطر اب وہ تمکینِ تجلّی کیوں کریں — اپنی گردِ شوق میں خود ہی چھپا جاتا ہوں میں

تو فنا آمادہ ہے تجھ کو نظر آتی ہے موت — زندگی، تابندگی، پایندگی پاتا ہوں میں

واہ رے شوقِ شہادت کوئے قاتل کی طرف — گنگناتا رقص کرتا جھومتا جاتا ہوں میں

ذرا سی تری آنکھوں کا ساغر ایک قرب سے رخ کی بہار،

ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگرؔ!
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

بیانِ حقیقت

از جناب سیّد شاہ عبد العلی صاحب تجرؔ،

حیرت کدۂ دہر میں کیا دیکھ رہا ہوں، — غارت گریِ کارِ قضا دیکھ رہا ہوں،

حیران ہوں یہ آج میں کیا دیکھ رہا ہوں، — انسان کی صورت میں خدا دیکھ رہا ہوں

کیا چیز سرِ دوشِ فنا دیکھ رہا ہوں، — اپنے لئے سامانِ بقا دیکھ رہا ہوں

اک عالمِ حیرت ہے مرا دیدۂ بینا، — ذرّوں میں خدا جانئے کیا دیکھ رہا ہوں

ملتا نہیں ڈھونڈے سے کبھی جو دیر و حرم میں — میں دل میں اُسے جلوہ نما دیکھ رہا ہوں

کیا پوچھتے ہو حیرتِ نظّارہ کا عالم — ہر شے کو ہم آغوشِ فنا دیکھ رہا ہوں

ہر چند کہ آنکھیں ہیں مری محوِ تماشا — میں کہہ نہیں سکتا ہوں کہ کیا دیکھ رہا ہوں

موسیٰ کی نگاہیں تو تھیں محدودِ تجلی، میں اور کچھ اس سے بھی سوا دیکھ رہا ہون

ساحل پہ کھڑا بحر میں لہروں کی فضا میں
تاروں کے چمکنے کی ادا دیکھ رہا ہون،

نقوشِ جذبات

از جناب حبیب صاحب اشعرؔ دہلوی،

مداوائے دردِ جگر چاہتا ہون	کوئی نشترِ کارگر چاہتا ہون،
نگاہِ حقیقت نگر چاہتا ہون	میں جلووں سے پہلے نظر چاہتا ہون
مزہ مل گیا مجھ کو ناکامیوں کا	میں اب آہ بھی بے اثر چاہتا ہون
نشیمن کی تعمیر وہ بھی چمن میں	گرے مجھ پہ بجلی اگر چاہتا ہون
قیودِ دو عالم سے آزاد ہو کر	تمھیں تم کو پیشِ نظر چاہتا ہون،
مجھے ظلمتوں میں بھی تسکینِ دل ہو	میں اب شام بھی بے سحر چاہتا ہون
سزا بھی جزا بھی فنا بھی بقا بھی	تری ذات پر منحصر چاہتا ہون

کوئی حد ہے اس جوشِ وحشت کی اشعرؔ
بیابان کی مانند گھر چاہتا ہون،

باب التقریظ والانتقاد

جہانِ آرزو

مصنفہ جناب سید انور حسین آرزو لکھنوی، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۷۰ صفحے قیمت عہ

پتہ روزنامہ حقیقت لکھنؤ،

از مولانا عبد السلام صاحب ندوی

حکیم سید ضامن علی جلال لکھنؤ کے اُن شعراء میں تھے، جنھوں نے سب سے پہلے لکھنؤ کی شاعری میں انقلاب پیدا کیا، اور خارجی مضامین یعنی خال و خط، زلف و کاکل اور محرم اور دوپٹہ کو چھوڑ کر جذبات و واردات کو اپنا سرمایۂ تغزل بنایا، اون کے تلامذہ نے بھی یہی روش اختیار کی، اور ان میں سید انور حسین آرزو نے اس روش کو استقدر ترقی دی، کہ اب اُن کا شمار دورِ جدید کے شعراء میں کیا جاتا ہے، اس جدید رنگ میں ان کا دوسرا دیوان جو جہانِ آرزو کے نام سے شائع ہوا ہے، ہمارے پیشِ نظر ہے، اور اسکے دیکھنے سے انکے کلام کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں،

۱- وہ بہت سی غزلوں میں نامانوس قافیے استعمال کرتے ہیں جن کی تعداد محدود ہوتی ہے، اور اس وجہ سے شعراء غزلوں میں ان قافیوں کو بہت کم استعمال کرتے ہیں، مثلاً

یہ دوئی کب تک جو دل کو سوزِ غم سے لاگ ہو

جل اٹھی ہیزم تو پھر ہیزم نہیں ہے آگ ہے،

کم التفات پہ بھی شوقِ دل کو سیری ہے، گھٹا درخت نہ ہو چھاؤں تو گھنیری ہے،

دم بخود بیٹھ کے خود جیسے زباں کیلی ہے، سانس کیا لوں کہ ہوا دہر کی زہریلی ہے،

ہمکو تو حسرت ہیں کبھی عزت انکو ضد کہ خفیف کرو دعائیں تم اور اُسپہ تم یہ کہتے ہیں تعریف کرو

۲- بہت سی غزلوں میں نامانوس بحریں اختیار کرتے ہیں، مثلاً

کیوں وادیِ ایمن کے پھیرے کیوں طور کو آتا جاتا ہے،

میں نے نہیں بھی کب کہا گریہ کہا نہیں کہ ہے،

سپید و سیاہ ایک ہی ہیں، تو تجھ کو نظر نظر ہی نہیں،

دے کے فریب لے کے دل کہتے ہیں حیلہ ساز ہو،

۳- اس قسم کی بحروں میں بعض غزلیں ایسی ہیں، جن کا مضمون بجائے ایک شعر کے دو شعروں میں تمام ہوتا ہے، اور آخری شعر میں قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے، مثلاً

ہے راہِ ہوس وہ طولانی، حد جس کی کوئی نہ تمامی ہے،
ہر گام خوشی کا سہی پھر بھی، آخر منزل ناکامی ہے،

اس باغ میں آکر ہم کو بھی تقدیر ملی ہے قمری کی،
بندش بازو میں اطاعت کی،
گردن میں طوقِ غلامی ہے،

میں ہوں تیرا خلوتیِ ازل مجھے کام منظرِ عام سے،
سرِ بام جلوہ ہے ضو فگن نظر آ گئے رفعتِ بام سے،

وہ پلٹ کے جلد نہ آئیں گے یہ عیاں ہے طرزِ خرام سے،
کوئی گردش ایسی بھی اے فلک جو ملا دے صبح کو شام سے،

نہ قفس نصیب نہ آشیان، ہے میانِ برزخ این و آن

ابھی پر شکستہ ہے مرغِ جان

کہ پھڑک کے نکلا ہے دام سے

ان خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ ان کی اکثر غزلیں حُسنِ تغزّل سے معرّا ہیں، اس کے ساتھ انھوں نے اس جدید کوچے میں بے تکلف قدم رکھا ہے، اور لکھنو کے دائرے سے نکلنے کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ سرے سے عاشقانہ مضامین ہی ترک کر دیئے جائیں، حکیم جلال نے بے شبہہ مبتذل اور خارجی مضامین کو جو غزل سے تعلق نہیں رکھتے ترک کر دیا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اونھوں نے حدودِ تغزل سے باہر قدم نہیں نکالا تھا، لیکن سید انور حسین آرزو کے بہت سے اشعار پڑھتے چلے جائیے، یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم غزل کے اشعار پڑھ رہے ہیں، ایک پوری غزل ملاحظہ ہو،

مانگ جو کھو کے آن بان نہ مانگ قتل ہو جا مگر امان نہ مانگ،

دیکھ پیمان شکن زبان نہ مانگ بعد کو پھیر دے کے جان نہ مانگ'

صرف اُس کی خوشی میں سب کچھ ہے ایک شے مانگ دو جہان نہ مانگ

روح پہ ور ہے کاہشِ غم دل موت ہو ہو کے بدگمان نہ مانگ

ظلم سے بھاگتے نہیں حسق گو، دار کافی ہے ریسمان نہ مانگ

دینے والے سے تو ہے کم ہمت خود اُسے مانگ لے جہان نہ مانگ

جان کر جان دی نہیں جاتی، ہو ون وضی بات کا زیان نہ مانگ

بیدلی میں دکھاؤں دل کیونکر نہیں جو شے وہ میری جان نہ مانگ

آرزو یہ طلب ہے بے معنی

ہند میں رہ کے اصفہان نہ مانگ

باوجودیکہ ان کے کلام میں اغلاق و ابہام نہیں ہوتا، شعرائے دورِ جدید کی طرح مغلق فارسی ترکیبیں بھی استعمال نہیں کرتے، تصوف و فلسفہ کے پیچیدہ مسائل بھی نظم نہیں کرتے، لیکن بایں ہمہ اس قسم کے پھیکے اور بدمزہ اشعار سے ان کا یہ دیوان بھرا ہوا ہے، البتہ کہیں کہیں معیارِ تغزل کے مطابق کچھ اشعار بھی ان کے قلم سے ٹپک پڑتے ہیں، اور انھی کو اس دیوان کا حاصل سمجھنا چاہئے، ان کی مثالیں یہ ہیں،

ساقیا چشمِ کرم کا وقت ہوگا کونسا　　　جامِ دل خالی ہے جامِ زندگی لبریز ہے

ناتوانی نے کیا گم ترے دیوانے کو　　　اب تو زنجیر ہی زنجیر نظر آتی ہے

آپ کا نقشِ قدم میرا خطِ پیشانی　　　ایک ہی ہاتھ کی تحریر نظر آتی ہے

آگیا وقتِ رہائی ترے دیوانے کا　　　سانس، ٹوٹی ہوئی زنجیر نظر آتی ہے

آرزو خواب بھی وحشی کے ہیں کیا وحشتناک
کبھی بیڑی، کبھی زنجیر نظر آتی ہے

بات تجھ میں بھی اے ادائے سکوت　　　لبِ حاضر جواب کی سی ہے،

کیفیت میری اُن کی چپ میں بھی　　　کچھ سوال و جواب کی سی ہے

ابھی تمہیدِ غمِ دل پہ یہ اُف اُف کیسی　　　جس کا ہر لفظ ہے شعلہ وہ بیاں باقی ہے

غفلت میں ہو وہ جس کیلئے جاگ رہا ہوں　　　آنکھوں سے نہیں نیند مقدر سے اُڑی ہو

اخفائے رازِ شانِ وفا، امتحانِ صبر　　　آج ایک خامشی نے بڑے حق ادا کئے

بسکہ طولِ ہجر سے افزوں ہے طولِ انتظار　　　آپ کا اقرار بھی انکار ہے میرے لئے

میرے ہی آنسوؤں سے دھو ڈالو خونِ میر　　　دامن سے کچھ نچوڑ دو کچھ لیلو آستیں سے

مطبوعات جدیدہ

داغ مؤلفہ جناب نور اللہ محمد نوری صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ سپید، کتابت وطباعت بہتر، قیمت انگریزی سکہ سے عار عثمانی سے عار، پتہ :۔ غلام دستگیر صاحب تاجر کتب چارکمان حیدر آباد دکن، اور شاخ عابد روڈ بک اسٹال جامعہ عثمانیہ

داغ کی شوخیاں موجودہ شاعری سے ہم آہنگ نہیں، اس لئے ان کے محاسنِ کلام بھی نئے طبقہ کی نگاہوں سے چھپ گئے ہیں، جناب نور اللہ محمد نوری صاحب کی یہ کوشش لائقِ ستائش ہے کہ انھوں نے داغ کی شاعری پر نہایت جامع اور مبسوط تبصرہ کرکے ان کے کلام کے تمام پہلوؤں کو اس طرح دکھایا ہے، کہ انکی شاعری کی حقیقت اور اس دور کے شعرا میں داغ کا درجہ واضح ہوجاتا ہے، مثلاً داغ کا احول ان کی شاعری کے محرکات، خاص خاص مواقع کا کلام، انکی شاعری کا مقصد، ان کا فلسفۂ زندگی، ان کی شاعری میں مقامی عنصر، موسموں کا سماں، داغ کے کلام کا تجزیہ بلحاظ اصنافِ سخن، اور بلحاظ مضامین و اسلوب بیان، ہندوستانی زبان میں داغ کا تعمیری حصہ وغیرہ تمام مباحث کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ دکھایا ہے، آخری بحث میں کسی قدر مبالغہ کا رنگ آگیا ہے، تاہم مجموعی حیثیت سے یہ کتاب داغ کی شاعری پر نہایت اچھا تبصرہ ہے، ابتدا میں داغ کے مختصر حالات اور آخر میں انکے چند مشاہیر تلامذہ کا تعارف اور ان کے کلام کا نمونہ ہے، اس کتاب میں ضمنی طور سے مصنف نے کہیں کہیں اجتماعیات کے نکتوں کی طرف اشارے کئے ہیں، ان سے مصنف کی بالغ نظری ظاہر ہوتی ہے، اگر وہ اس موضوع کی طرف توجہ کریں، تو زیادہ بہتر خدمت انجام دے سکتے ہیں،

گلِ عجائب شائع کردہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، تقطیع اوسط ضخامت ۱۹۶ صفحات

کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، غیر مجلد ۱۲ر، پتہ انجمن ترقی اردو،

انجمن ترقی اردو اس سے قبل شفیق اورنگ آبادی کا تذکرہ شائع کرچکی ہے، اب اس نے شفیق کے ایک اور ہم وطن اور معاصر شاعر اسد علی خان تمنا کا تذکرہ گلِ عجائب شائع کیا ہے، تمنا بارھویں صدی ہجری کا شاعر ہے، اس کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں، لیکن خود اس تذکرہ سے اسکے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے، اس تذکرہ میں بارھویں صدی کے اواخر کے ترپن ۵۳ دکنی شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا نمونہ ہے، ایک آدھ شمالی ہند کے شعراء کے حالات بھی ہیں، اگرچہ یہ حالات اتنے مختصر ہیں کہ بعض شعراء کا صرف نام و تخلص ہے، اور معلومات میں بھی اس سے کوئی نیا اضافہ نہیں ہوتا، تاہم ایک قدیم تذکرہ کی حیثیت سے لائق قدر ہے،

رسالہ دینیات حصہ پنجم، ششم و ہفتم مرتبہ مجلس نصاب کتب شعبہ دینیات و اخلاقیات سررشتہ تعلیمات حیدرآباد دکن تقطیع اوسط ضخامت علی الترتیب ۸۰، ۱۲۰ اور ۹۶ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۹ر، ۴ر، ۱۲ر، پانچویں اور چھٹے حصہ کے ملنے کا پتہ مولوی محمد فخر الدین ہاشم صاحب فاروقی مالک مطبع قاسمی نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن، ساتواں حصہ سید عبد القادر تاجر کتب چار مینار حیدرآباد دکن سے ملے گا،

یہ تینوں رسالے حیدرآباد کے سررشتہ تعلیم کے سلسلۂ دینیات کی کڑی ہیں، پانچویں حصہ میں اللہ توحید، رسالت کی تشریح، انبیاء، خاتم الانبیاء، اور ان کے متعلق ضروری عقائد، اللہ کی کتابوں، کلام اللہ اور اس کی خصوصیات، اور ملائکہ اور قیامت کے مختصر حالات ہیں، پھر برائیوں میں جھوٹ غیبت اور چوری، اور بھلائیوں میں توبہ، زہد اور تقوی کا بیان ہے، آخر میں آنحضرت صلعم کے مختصر حالات ہیں، چھٹے حصہ میں ارکان اسلام، اصطلاحات فقہ کی تشریح، طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور

حج کے جملہ ضروری مسائل ہیں، پھر صحت جسمانی کی ضرورت اس کے فوائد حلال و حرام چیزوں کی تشریح نشہ اور جوئے کی برائیاں اور توکل و صبر کی تشریح اور اسکی خوبیاں بیان کی گئی ہیں، آخر میں خلفائے راشدین کے مختصر حالات ہیں، ساتویں حصہ میں تسلیم و رضا عبدیت و کسب حلال کی دلنشیں تشریح ان کے فوائد ان کے حصول کی ترغیب اور قتل ناحق سود اور ریاکاری کی وضاحت اور ان کے ترک کی تعلیم ہے، آخر میں خلیفہ اکابر مہاجر و انصار صحابہ کے مختصر حالات ہیں، تینوں رسالے نہایت مفید ہیں، ان میں جملہ ضروری مذہبی معلومات کا نہایت خوبی سے استقصار کیا گیا ہے، انداز بیان دلنشین ہے،

تاریخ اسلام، مؤلفہ جناب برکت اللہ صاحب فاروقی اصلاحی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ اسلامیہ کتب خانہ نمبر ۹ و بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳

یہ مختصر تاریخ مکاتب اسلامیہ کے بچوں کی ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں سیرت پاک کے کسی قدر تفصیلی اور خلفاء اربعہ کے ضروری مختصر حالات ہیں جو بچوں کے لئے کافی ہیں،

پنڈوہ از جناب شاہ حسن الدین احمد صاحب منعمی ابو العلائی تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۳ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت :- ۸ پتہ شاہ حسن الدین احمد صاحب خانقاہ منعمی ابو العلائی گیا

پنڈوہ اور لکھنوتی بنگال کے نہایت قدیم مگر ویران شہر ہیں، اسلامی عہد کے بعض دوروں میں بھی ان کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے، یہاں متعدد اولیائے کرام کے مزارات اور دوسرے اسلامی آثار ہیں، شاہ حسن الدین احمد صاحب نے ان کی زیارت کرکے یہاں کے حالات معارف میں لکھے تھے جنھیں اب انھوں نے رسالہ کی شکل میں شائع کیا ہے، اور بعض مزارات اور آثار کے فوٹو بھی دیدیئے ہیں۔

زادِ راہ مصنفہ منشی پریم چند تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۴ صفحات کاغذ کتابت و طباعت روشن، قیمت مرقوم نہیں، پتہ :- حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی،

زادِ راہ منشی پریم چند کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے " وفا کی دیوی "، " زیور کا ڈبہ "، " آشیان برباد

"خدا کا قہر"،"قریب"،"لاٹری"،"تیور"،"لعنت"،"بڑے بھائی صاحب"،"مس پدما"،"بولی کی چھٹی"،"زادراہ"،"حقیقت"،"ڈامل کا قیدی"، ان تمام فسانوں میں منشی پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات نمایاں ہیں، کوئی افسانہ کسی مفید تعلیم و نتیجہ سے خالی نہیں،

ہتیا اور دوسرے افسانے، مصنفہ جناب مجنوں گورکھپوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ اصفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مذکور نہیں، پتہ:- حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی،

یہ جناب مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے، اس میں آٹھ افسانے ہیں "ہتیا"، "گہنا"، "حسین کا انجام"، "مراد"، "جشن عروسی"، "بڑھاپا"، "کلثوم"، "محبت کا دم واپسیں" ان میں سے کچھ طبعزاد ہیں، اور کچھ دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں، لیکن سب پڑھنے کے لائق ہیں، اور مجنوں صاحب کا المیہ رنگ تقریباً سب میں نمایاں ہے،

یادگار ماجد، مولفہ جناب سید طالب علی صاحب ایم اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۲ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت قسم عام ۸؎ قسم خاص ۱۲؎، پتہ سید طالب علی ایم اے، شاہ گنج الہ آباد،

سید ماجد علی صاحب مرحوم ایڈوکیٹ الہ آباد نے اگرچہ بحیثیت شاعر کے کوئی شہرت حاصل نہیں کی، لیکن وہ اس دور کے خوشگو شعراء میں تھے، اور انکی شاعری قدیم اور جدید رنگ کی آمیزش کا خوشرنگ مجموعہ تھی، وہ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے، غزلوں کے علاوہ منقبت میں ان کے جوہر زیادہ چمکتے تھے، ان کے لائق بھتیجے سید طالب علی صاحب ایم اے نے یادگار ماجد کے نام سے ان کی غزلوں کا مجموعہ شائع کیا ہے، ابتداء میں پنڈت منوہر لال زتشی کا تعارف ہے، اس کے بعد فاضل مرتب نے سید ماجد علی کے مختصر حالات اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے، دیوان میں بیشتر حصہ غزلوں کا ہے، آخر میں خاص خاص موضوع پر چند نظمیں ہیں، غزلوں کی ترتیب ردیف وار کے بجائے تاریخی ہے

جس سے شاعر کے کلام کی تدریجی ترقی کا پتہ چلتا ہے،

مقام محمود، از جناب آغا محمد صدیق حسن صاحب ضیا تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۸ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، **قیمت:-** ۴ر پتہ مستری غلام نبی صاحب کامل کوچہ مستریان، راولپنڈی،

یہ ایک نعتیہ مثنوی ہے، جس میں جناب ضیاؔ نے حسن و عشق کی زبان میں ظہور آدم سے لیکر ظہور قدسی تک کے مختلف مدارج واحوال دکھائے ہیں، ہر بیان نیاز عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے، و فور جذبات میں کہیں نظم کا دامن تنگ ہوگیا ہے، امید ہے کہ ارباب ذوق عقیدت کے ان پھولوں سے لطف اندوز ہوں گے،

حمید کے سوشعر، از جناب خواجہ حمید الدین صاحب حمید لکھنوی تقطیع جیبی صفحات ۳۲، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۴ر علاوہ محصول ڈاک، پتہ نیجر نامی پریس لکھنؤ،

خواجہ حمید الدین صاحب لکھنؤ کے ہونہار شعراء میں ہیں، اور اس سے پہلے ان کا دیوان پروازِ خیال منظر عام پر آچکا ہے، اب انھوں نے اپنے سو شعروں کا انتخاب شائع کیا ہے، یہ انتخاب لکھنؤ کے نامور شاعر مرزا ثاقب کے حسن انتخاب کا نتیجہ ہے جو امید ہے کہ ارباب ذوق میں مقبول ہوگا،

دل صد پارہ، از جناب محمد عباس صاحب طالب صفوی تقطیع جیبی ضخامت ۲۲ صفحات، کاغذ سپید، کتابت و طباعت اوسط، قیمت ۲ر کے ٹکٹ پر مصنف سے شمس آباد ضلع فرخ آباد سے ملیگی،

دل صد پارہ جناب محمد عباس صاحب صفوی کے سو منتخب اشعار کا مجموعہ ہے، ابتک اس قسم کے انتخابات سو شعر کے نام سے چھپتے تھے، لیکن جناب صفوی کی شاعرانہ جدت نے اسکو دل صد پارہ کے نام سے بدل دیا، جو ممکن ہے آیندہ چل جائے، صفوی صاحب کی شاعری کی کلی ابھی نو شگفتہ ہے، لیکن رنگ سے معلوم ہوتا ہے، کہ اگر اگی لیاری ہی جاری رہی، تو اسکی نگہت بہت جلد پھوٹ نکلے گی،

السیرۃ

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی مجموعہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہو مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا

اب تک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیلِ دین، تاسیسِ حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے،

تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر اُن معجزات کی تفصیل ہے جو بروایت صحیحہ ثابت ہیں اس کے بعد اُن معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں کوشش کی گئی ہے کہ انہیں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ [illegible]

پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور اُن کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کی عبادات سے اُن کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت با اختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد [illegible] حصہ دوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ سوم [illegible]

تقطیع [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ چہارم تقطیع کلاں [illegible] حصہ پنجم تقطیع خورد [illegible]

[illegible] تقطیع کلاں [illegible] (منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ)

جلد ۳۹ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۷ء | عدد ۳

مضامین

شذرات

آئینی مجلسون کے پچھلے انتخابات نے مسلمانون کے سامنے عبرتون کے دفتر کھول دیئے ہین، اب یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی کہ کونسلون کی ممبری قومی اور ملکی خدمتون کا ذریعہ ہے، جاہ و اعزاز کے حصول کا اب وہ پرانا وسیلہ نہین رہی ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اب شخصی انتخاب کی جدوجہد بالکل بے معنی ہے، جو کچھ ہے وہ اب سیاسی جماعتون کے افراد کی حیثیت سے ممکن ہے اس نئے انتخاب کے بعد بڑے سے بڑے اشخاص کی حالت یہ ہے کہ

اکیلے پھر رہے ہین یوسف بے کاروان ہوکر

لیکن ہم کو جس بات کی طرف اس وقت اشارہ کرنا ہے وہ سیاسی رجحانات کے بجائے شخصی انتخابات کی بنا پر اخراجات کی وہ عظیم الشان میزان ہے جس کو مسلمان قوم کبھی برداشت نہین کرسکتی، ہم کو بہار اور اس صوبہ کے متعدد باہمت مسلمانون کا حال معلوم ہے جو مہاجنون سے قرض لیکر، یا اپنی جائداد اور مکانون کو رہن رکھ رکھکر یہ لڑائی لڑے ہین، اب اگر وہ جیتے ہین تو بھی ہارے ہین، اور اگر ہارے ہین تو اپنے ساتھ اپنے خاندان کو بھی لے ڈوبے ہین،

ضرورت اس کی ہے کہ آئینی مجلسون کی رکنیت کو نام ونمود اور عزت وجاہ کا ذریعہ نہ سمجھا جائے اور نہ بنایا جائے بلکہ وہ ملک کے سیاسی خادمون کی جماعت سمجھی اور بنائی جائے، اور قومی حیثیت سے اس مہم کے لئے سرمایہ جمع کیا جائے اور قوم لائق ممبرون کو چنکر اپنی نمایندگی کا امیدوار قرار دے، ورنہ مسلمانون کی سیاسی تباہی کے ساتھ مالی تباہی بھی لازمی ہے،

اس الیکشن کی خاص حیثیت نے یہ بھی بتادیا کہ بعض مسلمان اہل سیاست کا صوبون مین چند مسلمان نشستون کے

اضافہ پر اصرار سراسر لاحاصل ہے، ہر اقلیت خواہ وہ کتنی ہی تھوڑی مقدار سے کم ہو کسی سمجھوتے کے بغیر بڑی اکثریت کے مقابلہ مین ناچار ہے، اس لئے چند نشستون کی کمی بیشی فیصلہ پر کوئی اثر نہین رکھتی،

مارچ کی اخیر تاریخون مین مسلمانون کی پرانی تعلیمی انجمن مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی علی گڈہ مین پنجاہ سالہ جوبلی ہے، اس تقریب سے اس کانفرنس کے ساتھ بہت سے شعبون کے الگ الگ اجلاس بھی ہونگے، امید ہے کہ مسلمانون کی معقول تعداد ان جلسون مین شرکت کریگی، خدا کرے یہ صرف جلسون اور جلوسون تک محدود ہو کر نہ رہجائے، بلکہ اس مین مسلمانون کی پچھلی پچاس برس کی تعلیمی جد وجہد پر صحیح تبصرہ ہو، اور آیندہ کے لئے کوئی مفید پروگرام تیار ہو،

انگریزی تعلیم گاہون مین یہ شکایتین عام ہو رہی ہین کہ مسلمان طالب علم عربی بہت کم لے رہے ہین، اور ان کی تعداد ہر سال گھٹ رہی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس جدید دور مین قدیم کے ساتھ نوجوانون کی محبت کم ہو جانے کی وجہ سے یہ صورت حال ہی، تو دوسری طرف اس کے برخلاف یہ نظر آ رہا ہو کہ سنسکرت پڑھنے والے ہندو طالب علمون کی تعداد مین علانیہ اضافہ ہو رہا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہر شہر مین ایسی انجمنین قائم ہون جو عربی پڑھنے والے طالب علمون کو وظیفہ دے کر ان کا دل بڑھائین، ہم کو معلوم ہوا ہے کہ الہ آباد مین اس قسم کی ایک انجمن قائم ہوئی ہو، ایسی ہی انجمنین ہر شہر مین قائم ہونی چاہئین،

یہ بھی ممکن ہو کہ صوبہ مین مسلمانون کے جو بھی چند اسکول ہین ان مین عربی لینے والے طالب علمون کے ساتھ فیس کی معافی کی رعایت کیجائے، اور عربی کے معلمون کو چاہئے کہ صرف ونحو کی تعلیم کے نئے آسان اصولون سے واقف ہو کر انھین نئے طریقون سے تعلیم دین، تاکہ وہ کم سے کم وقت مین کچھ نہ کچھ سیکھ لین،

مصر کی وزارت اوقاف نے ملک کے اہل قلم حضرات سے ایک میلاد نامہ کی فرمایش کی تھی، جس کا انتخاب مقابلہ ہو

اس مقابلہ مین سب سے بہتر رسالہ شیخ عبداللہ عفیفی کا قرار پایا ہے، اور شیخ ازہر نے حکم دیا ہے کہ پرانی طرز کے میلادنامون کے بجائے ہر جگہ اس کو پڑھا جائے، رسالہ گو نظم و نثر اور دعا و سلام پر بدستور مشتمل ہو تاہم روایتون کی صحت اور افادیت کا پہلو اس مین ملحوظ رکھا گیا ہے، محمد علی مرحوم بھی اپنے ملک مین اسی قسم کا رسالہ چاہتے تھے،

علامہ شبلی نعمانیؒ سے جن کتابون کی تعریف سنی تھی اور وہ خود بھی اُنکے مشتاق تھے ان مین سے ایک کتاب فتوح البلدان کے مشہور مصنف احمد بن یحییٰ بلاذری المتوفی ۲۷۹ھ کی تصنیف انساب الاشراف ہی ابن ندیم نے اس کا نام کتاب الاخبار والانساب لکھا ہی اس زمانہ مین اُسکے صرف ایک ہی مکمل نسخہ کا پتہ چلا ہے اور وہ قسطنطنیہ مین ہے،

فلسطین مین یہودی آبادی کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہان ایک عبرانی یونیورسٹی بھی قائم ہوئی ہی اس یونیورسٹی مین علوم مشرقیہ کا بھی ایک شعبہ ہے جس کا انگریزی نام "اسکول آف اورینٹل سٹڈیز" ہے، اس شعبہ کی طرف سے ایس، ڈی، الیف، گوئٹین (GOITEIN) نے اس کتاب کی پانچوین جلد ۱۹۳۶ء مین چھاپکر شائع کی ہو، باقی جلدین بھی طبع ہونگی، دلچسپ چیز یہ ہے، کہ مرتب نے اس کا مقدمہ عبرانی مین لکھا ہے، اس جلد مین حضرت عثمانؓ اور مروان اور مختار و مصعب بن زبیر کے حالات ہین،

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ کی عام تاریخون کے برخلاف سنہ کی ترتیب کے بجائے خاندانون کی ترتیب سے حالات لکھے گئے ہین، روایتون کی سندین دیکھنے سے افسوس ہوا کہ اس مین مدائنی وغیرہ کے ذریعہ سے واقعات نقل کئے گئے ہین، ہندوستان مین یہ جلد ۱۲ روپیے مین جیب اینڈ کمپنی تاجرین کتب اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے ملے گی،

مقالات

ذبح عظیم

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے جس اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا خدا کی طرف سے خواب میں حکم ہوا تھا، یہود کہتے ہیں کہ وہ اسحاقؑ تھے لیکن مسلمانوں کے نزدیک حضرت اسمٰعیلؑ تھے، اور اسی لئے ذبیح اللہ مسلمانوں میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا لقب مشہور ہے، اس کے لغوی معنی ہیں خدا کا ذبح کیا ہوا یا خدا کی راہ میں ذبح ہوا، اس لقب کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت ہے:-

يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ	(حضرت ابراہیمؑ نے کہا) میرے پیارے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں تیری رائے کیا ہے،
(والصّٰفّٰت ۳)	

حضرت اسمٰعیلؑ نے جواب میں کہا:-

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ.	اے میرے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے وہ کر گذر، خدا نے چاہا تو مجھے تو ثابت قدم رہنے والوں میں پائے گا،
(/)	

مقدس باپ نے اپنے بیٹے کے اس صبر و ثبات کو دیکھا تو اُن کو لے کر قربانگاہ کو روانہ ہو گئے، جو اُن کی جائے قیام سے کئی دن کی مسافت پر تھی، وہاں پہنچکر بیٹے کو لیکر اور آگے بڑھے، اور بیٹے کو

پیشانی کے بل گرا کر چھری اُن کی گردن پر رکھ دی، آواز آئی، اے ابراہیم!

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ — تونے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم اسی

نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ، (صافات-۳) — طرح نیکو کاروں کو جزائے خیر دیتے ہیں

علیان ناز ہیں کہ جگر گوشۂ خلیل، — سر زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند،

ابھی یہ منظر آنکھوں سے دور نہیں ہونے پایا تھا کہ ندا آئی،

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ — اور ہم نے اس کو (اسمٰعیل کو) ایک بڑی

(،) — قربانی دے کر چھڑایا،

اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ میں نے ایک دوسری بڑی قربانی کا فدیہ دیکر اسمٰعیل کو ان کی اس قربانی سے نجات بخشی، اب سوال یہ ہے کہ وہ بڑی قربانی کیا تھی جسکو حضرت اسمٰعیل کی اس قربانی اور فدیہ اور بدلہ قرار دیا گیا، مفسرین کی عام روایتیں یہ ہیں کہ جنت کا ایک مینڈھا لاکر حضرت ابراہیمؑ کے سامنے کر دیا گیا، کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ قربانی کیا جائے، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا، اور اس مینڈھے کو حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ قربانی کیا، مگر یہ روایتیں اسرائیلیات سے زیادہ نہیں، اور ان سب کا ماخذ توراۃ ہے، ؎

تب ابراہام نے اپنی آنکھیں اٹھائیں، اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے ہیں، تب ابراہام نے جا کر اس مینڈھے کو لیا، اور اسکو اپنے بیٹے کے بدلے میں سوختنی قربانی کے لیے چڑھایا؛ (پیدائش ۲۲-۱۳)

لیکن قرآن پاک میں اس مینڈھے کا ذکر نہیں، بلکہ اس کے بجائے ایک بڑی قربانی کہا گیا ہے، اگر یہ بڑی قربانی مینڈھے یا بکرے ہی کی صورت میں ہوتی تو قرآن اسکو ایک بڑی قربانی کیوں کہتا،

ہمارے مفسرین نے اس کے یہ جوابات دیئے ہیں،

۱- چونکہ یہ قربانی کا مینڈھا جنت سے لایا گیا تھا، اسلئے اسکو بڑی قربانی کا لقب ملا،

۲- یہ وہی مینڈھا تھا جس کو ہابیل نے قربان کیا تھا، اور جسکو خدا نے قبول فرمایا تھا، تو چونکہ خدا اسکو قبول کر چکا تھا، اسلئے اسکو بڑی قربانی فرمایا،

۳- ان روایات میں سب سے بہتر جواب حسن بصری کا ہے، فرمایا کہ اس بڑی قربانی سے مقصود وہ خاص جانور نہیں، جو حضرت ابراہیمؑ کے سامنے قربانی کے لئے پیش ہوا، بلکہ وہ مطلق قربانی ہے، جو اس کے بدلہ میں پوری ملت کے لئے قیامت تک یادگار سنت قرار پائی،

جسمانی یادگار کی حیثیت سے اس میں شک نہیں کہ ابراہیمی ملت میں عید قربان یا عید اضحیٰ کا سالانہ جشن، اور اس میں غریبوں اور مسکینوں کے کھلانے، اور دوستوں کی ضیافت اور خوشی کے اظہار کیلئے کسی جانور کی قربانی اسی واقعہ کی یادگار ہے، اسلام میں دو ہی تہوار ہیں، عید، اور بقرعید، بقرعید ملتِ ابراہیمی کا جشن ہے، یعنی اس واقعہ کی یادگار ہے، جس کی بنا پر ملتِ ابراہیمی کی تاسیس اور مکہ میں خانۂ الٰہی کی تعمیر ہوئی، اور وہ تعمیر ملتِ ابراہیم کا قبلہ قرار پائی، اور عید ملتِ محمدی کا جشن ہے، یعنی نزولِ قرآن کی یادگار، جس سے پردہ عالم میں ملتِ محمدی کا ظہور ہوا،

یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تھا، شریعت میں خواب کی دو قسمیں ہیں، ایک کا نام رویائے تمثیلی اور دوسرے کا نام رویائے حقیقی ہے، رویائے حقیقی میں اصل حقیقت بے پردہ نظر آتی ہے، اور وہی مقصود ہوتی ہے، جیسے کسی نے خواب میں دیکھا کہ فلاں شخص مرگیا ہے، اور وہ واقعی مرگیا تھا، یہ رویائے حقیقی ہے، رویائے تمثیلی یہ ہے کہ مقصود اس واقعہ سے ملتی جلتی کوئی مشابہ چیز ہو، جیسے حضرت یوسفؑ نے قحط کو سوکھی بالوں اور دبلی پتلی گایوں کی صورت میں دیکھا، امام خطابی معالم السنن میں کہتے ہیں،

وبعض الرؤیاء مثل یضرب بعض خواب تمثیل ہوتے ہیں جسکو اس

لیتاول علی الوجه الذی یجب	مثالی صورت میں اس لئے بیان کیا جاتا
ان یصرف الیه معنی التعبیر فی	ہے، کہ اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے
مثله وبعض الرؤیا لا یحتاج	جس طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر پھیری جاتی
الی ذلك بل یاتی کالمشاهد	ہے، اور بعض خواب اسکے محتاج نہیں ہوتے
(فتح الباری جلد ۱۲ ص ۳۰۲ مصر)	بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں،

اس بنا پر ہم کو غور کرنا ہے، کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو اپنے بیٹے کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا، تو یہ خواب تمثیلی تھا، یا حقیقی تھا، اس گرہ کے کھلنے سے وفدینا ہ بذبح عظیم کے معنی بھی کھل جائیں گے، درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو جو خواب دکھایا تھا، وہ تمثیلی تھا، یعنی یہ کہ وہ اپنے بیٹے کو قربانی کر رہے ہیں کے یہ معنی تھے، کہ وہ اسکو ہمیشہ کے لئے خدا کی راہ میں خانہ کعبہ کی خدمت گذاری اور دین حنیف کی تبلیغ کیلئے خدا کی راہ میں قربانی کر دیں، حضرت ابراہیمؑ نے خدا کاری کے سچے جوش میں اس خواب کو حقیقی سمجھا، اور جیسے اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کی راہ میں واقعی جسمانی طور سے قربانی کرنے، مکہ کے پاس پہنچکر بیٹے کو قربانگاہ پر چڑھا کر چاہا ہی تھا کہ اس کے گلے پر چھری پھیر دیں کہ بارگاہِ قدس سے ندا آئی، قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا، اے ابراہیم تونے اپنا خواب سچ کر دکھایا، اور اب خداوند حق نے حضرت ابراہیمؑ کو وحی سے مطلع فرمایا کہ یہ خواب حقیقی نہیں بلکہ تمثیلی تھا، اور حضرت اسمٰعیلؑ کی جسمانی قربانی نہیں، بلکہ روحانی قربانی مقصود ہے، اور یہ جانور کی جسمانی قربانی اُس روحانی قربانی کی تمثیل ہے، اب غور کیجئے تو معلوم ہوگا، کہ وہ "ذبح عظیم" جس کو دیکر حضرت اسمٰعیلؑ جسمانی قربانی سے بچ جاتے ہیں، وہ ان کی روحانی قربانی ہے،

روحانی قربانی جسمانی قربانی کے مقابلہ میں یقیناً ذبح عظیم ہے، جسمانی قربانی کی تکلیف تو ایک لمحہ کی بات ہے، مگر روحانی قربانی تو کسی امرِ حق کی خاطر ساری زندگی کی جیتے جی کی قربانی ہے، جس میں

مرکز نہیں بلکہ حج کرحق کی راہ میں ہر کلفت اور مصیبت کو انگیز کرنا اور ہر وقت موت کے لئے آمادہ رہنا ہے،

حضرت اسمعیلؑ نے اسکی خاطر ملک شام کے سبزہ زار کو چھوڑا، وہاں کے عیش و آرام کو خیرباد کہا، عزیز و اقارب کو ترک کیا، اور ایک لق و دق صحرا میں تن تنہا رہنا گوارا کیا، وہاں خدا کے نام کا ایک گھر بنایا اور اسکو آنے جانے والے مسافروں اور سوداگری کے قافلوں کے لئے مرکزی گذرگاہ ٹھہرایا، اور اس طرح دین حق کی تبلیغ اور خانہ خدا کی پاسبانی کے لئے نہ صرف اپنی زندگی تک بلکہ محمد رسول اللہ صلعم کے ظہور تک جو رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ کی ابراہیمی دعا کی قبولیت کا زمانہ تھا، اپنی پوری نسل کو ایسے صحرائے بے آب و دانہ میں گذار دینے کا حکم دیا، یہ تھی وہ عظیم الشان قربانی جو حضرت اسمعیلؑ کی جسمانی قربانی کی تمثیل میں حضرت ابراہیم کو دکھائی گئی، اور آج کے دن تک یہ روحانی قربانی ملت ابراہیمی کی حقیقت اور نسل اسماعیلی کی شریعت ہے، اور جانور کی جسمانی قربانی اس حقیقت کا مجاز ہے، اور اسلام میں جہاد اس مجاز کی حقیقت ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا، کہ وہ ذبح عظیم کا فدیہ جس کے بدلہ میں حضرت اسمعیلؑ کی جسمانی قربانی معاف کی گئی، دل کی وہ روحانی قربانی ہے، جو نسلاً بعد نسلٍ ان پر فرض ہوئی، اور اسکی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہوئی، اور اسی لئے یہ ہر سال کے جشن قربانی میں حضرت اسمعیلؑ کے جسمانی و روحانی فرزندوں پر واجب ہے،

جہاد اور شہادت جنکی فضیلتوں میں اسلام کا سارا دفتر لبریز ہے، وہ اسی ذبح عظیم کی تفسیریں ہیں، جو مسلمان اس ذبح عظیم کا منظر پیش کرتا ہے، بارگاہ قدس سے وہ بقائے دوام حیات جاوید اور بَلْ اَحْيَاءٌ کے سرخ خلعت سے سرفراز ہوتا ہے، جنت کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے ہیں، اور خداوند تعالےٰ اپنے پاس کی روزی سے اس کو سیر فرماتا ہے،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

قربانی کا اقتصادی پہلو

عید اضحیٰ جس کے معنی جشن قربانی کے ہیں حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے تاریخی واقعہ کی یادگار ہے، اس وقت کے جو سامی بادشاہ عراق شام اور مصر پر حکمراں تھے، وہ اپنے نمرودی و فرعونی کبر و نخوت میں مبتلا تھے۔ ہر جگہ آسمان کے ستاروں اور زمین کے بادشاہوں کی پوجا ہو رہی تھی، ضرورت تھی کہ ان نمرودوں اور فرعونوں کی جابر و ظالم سلطنتوں کے حدود سے آزاد کسی سرزمین میں اس پیام حق کے لئے جو حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ دنیا میں آیا تھا، کوئی مرکز قائم کیا جائے، جو ہر قسم کی دنیاوی سرسبزی و شادابی سے پاک ہو، تاکہ سلاطین کی حرص و آز کے ہاتھوں سے وہ ہمیشہ محفوظ رہے،

انتخاب کی نظر عرب کی اس شور اور بنجر زمین پر پڑی جس کا نام حجاز ہے، جو بحر احمر کے کنارے شام اور یمن کے دو زرخیز علاقوں کے بیچ میں آمد و رفت کا راستہ اور تجارت کے قافلوں کا گذرگاہ تھا، تاہم چونکہ وہ ہر قسم کی روئید گی اور سیرابی سے مبرا تھا، اسلئے اس میں کوئی مستقل آبادی نہ تھی، لیکن سوداگروں کی آمد و رفت سے وہ تبلیغ کا اہم مرکز ہو سکتا تھا، اس لئے زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی قسمت میں ازل سے جو عزت مقدر ہو چکی تھی، حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں اسکے ظہور کا وقت آیا،

حجاز دعوت حق کا مرکز قرار پایا، اور خانہ کعبہ کی تعمیر اور تطہیر کا حکم آیا، اور اس کی پاسبانی کے لئے حضرت ابراہیمؑ کو اپنی سب سے پیاری اور اکلوتی اولاد حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا منظر خواب میں دکھایا گیا، اس جسمانی قربانی کے خواب کی تعبیر روحانی قربانی تھی، حضرت ابراہیمؑ نے مروہ پہنچکر اپنے خواب کی جسمانی

بل کرنی چاہی تو ندا آئی، اے ابراہیم تم اپنے خواب کو پورا کر چکے، اور اب اس خواب کی تعبیر وہ "ذبح عظیم"
ی عظیم الشان قربانی ہے، جو اپنی جان کو راہ حق میں دیکر اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں لٹا کر ادا کر سکتے
اس رمز کی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی ہے، جو ہر حاجی پر ہر سال فرض ہے، ہر مسلمان پر جس میں استطاعت ہو
واجب ہے،

اس خواب کی حقیقی تعبیر کی تکمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو شام کے مرغزار سے
کر حجاز کے بے آب ودانہ اور شور زمین میں خانہ خدا کے پاس آباد کیا، تاکہ حق کا پیغام اور توحید کا
دعوت سلاطین زمانہ کی جابرانہ تعدی سے محفوظ رہکر آخری پیغام الٰہی کے ظہور کے لئے تیار رہے،

اس بے آب ودانہ بنجر اور شور زمین میں کسی انسانی آبادی کی بقا کسی مادی اقتصادی انتظام کے
بغیر ناممکن تھی اور ہے، اس کے لئے قدرت الٰہی نے دو انتظام کئے، حج اور قربانی، حج کو علاوہ اپنے روحانی
ض وبرکات کے اقوام عالم کی تجارتی نمائشگاہ، یا عالمگیر تجارتی میلہ ٹھہرایا، اشہر حرم کے مامون زمانہ میں
ب کے سارے گوشوں سے تاجر اور سوداگر آتے، اور مکہ کے میدان میں قیام کر کے سال بھر کی روزی
یدا کرتے،

اسی نکتہ کو سامنے رکھکر حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کے معنی سمجھئے:-

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ	اور جب ابراہیم نے کہا، اے میرے
هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَارْزُقْ اَهْلَهٗ	پروردگار اس کو امن والا شہر بنا،
مِنَ الثَّمَرَاتِ،	اور یہاں کے رہنے والوں کو کچھ پھلوں
(بقرہ - ۱۵)	میں سے روزی کر،
رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ	اے ہمارے پروردگار! میں نے
بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ	اپنی کچھ اولاد بن کھیتی کے میدان میں تیرے

رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً	عزت والے گھر کے پاس اس لئے بسائی
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِىٓ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم	ہے، کہ نماز کو قائم کریں، تو انسانوں کے
مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ،	کچھ دلوں کو ان کی طرف مائل کر، اور ان
(ابراہیم-۶)	کو کچھ پھلوں کی روزی دے تاکہ وہ ش

حج کی تجارتی گرم بازاری، اور حاجیوں کی آمد و رفت سب اسی لئے ہے تاکہ اس کے ذریعہ اس ویرانہ کی روحانی وجسمانی و مالی آبادی ہو، اسلام آیا تو لوگوں نے سمجھا کہ روحانی مقصد سے حج کے مالی مقاصد رد کر دیے گئے، مگر خدا نے تصریح کی کہ ایسا نہیں ہے، فرمایا:-

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا	تمھارے لئے یہ گناہ نہیں کہ (حج میں)
فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ، (بقرہ-۲۵)	خدا کی روزی کو تلاش کرو،

اسی لئے خدا کی روزی تلاش کرنے والے حاجیوں کے لئے راستوں کے امن کا حکم دیا گیا، فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا	اے ایمان والو! اللہ کے شعائر کی
شَعَائِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ	بے توقیری نہ کرو، اور نہ حرمت والے
وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا	(حج کے) مہینے کی، اور نہ حج کی قربانی کی
آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ	اور نہ قربانی کے جانوروں کے پٹوں کی
فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا،	اور نہ ان کی جو عزت والے گھر (کعبہ) کے
(مائدہ-۱)	قصد سے نکلے ہوں، اپنے پروردگار کے
	فضل (تجارت) اور اس کی رضامندی

اس سے معلوم ہوا کہ حج کے اغراض میں ایک اہم غرض اس کا تجارتی اور اقتصادی پہلو ہے

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے، کہ حضرت ابراہیم کو اس اعلان کا حکم ہوا تھا،

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ	اور لوگوں میں حج کو پکار دے، وہ
رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ	پیادہ اور ہر دبلی پتلی سواریوں پر ہر
مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ	دور دراز راستہ سے تیرے پاس آئینگے
لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ	تاکہ اپنے (دینی و دنیاوی) منافع کے
اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ	مقاموں پر حاضر ہوں، اور چند مقررہ
مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا	دنوں میں اللہ کا نام جانوروں پر لیں
مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ	جو ہم نے ان کو روزی کئے، تو ان جانوروں
(حج - ۴)	کے گوشت میں سے کچھ کھاؤ، اور بدحال

ان آیتوں میں خاص تصریح ہے کہ حج کے مقاصد میں سے ایک خاص مقصد یہ ہے کہ لوگ تجارتی و مالی منافع کے مقاموں پر اکٹھے ہوں، اور باہم مبادلہ اور خرید و فروخت سے اقتصادی فائدے اٹھائیں، اسی لئے متعدد مفسرون نے آیت میں منافع سے مراد تجارت لی ہے، اور کسی نے مغفرت مگر اکثروں نے ان دونوں کو شامل کیا ہے،

آیت میں اس بات کی بھی تصریح ہے، کہ قربانی سے مقصود یہ ہے کہ جانوروں کی جو نعمت انسانوں کو ملی ہے، اس کا وہ شکریہ ادا کریں، اور اس مسرت اور جشن کے موقع پر خود انکا گوشت کھائیں، اور فقیروں اور مسکینوں کو کھلائیں، کہ وہ بھی اس خوشی میں شریک ہو سکیں، قربانی کا یہ مقصد نہیں کہ نفس جانور کی خونریزی خدا کو محبوب ہے، یا اس کا گوشت اسکو پسند ہے فرمایا،

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا	اللہ کے پاس قربانی کے جانور
وَلَا دِمَاۗؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى	کا گوشت اور خون نہیں پہونچتا بلکہ تمہارے

مِنکم ۔ (حج ۔ ۵) (دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے)

اب معلوم ہوا کہ حج میں قربانی کی غرض ایک تو یہ ہے کہ اس جشن میں دعوت کا سامان ہو، دوسری غرض یہ ہے کہ بدحال فقیروں کو کھلایا جائے، اسلئے قربانی کے اتنے حصے کے علاوہ جو ذاتی صرف میں آئے بقیہ کل گوشت پوست سب فقیروں کو ہدیہ ہے،

دولت کا سرچشمہ تین چیزیں ہیں، زراعت صنعت اور مویشی کی پرورش، عربوں کے پاس زراعت نہیں، اور نہ صنعت ہی ہے، اسلئے دوسری قوموں کے تجارتی سامانوں کی دلالی کے بعد جو چیز ان کی دولت کا سرمایہ ہے، وہ جانوروں کی پرورش ہے، اور یہی ان کی سب سے بڑی دولت ہے،

بے مایہ عربوں کو بیت حرام کی پاسبانی کی اجرت اور ان کی اقتصادی امداد کا ذریعہ یا تو خیرات ہو سکتی تھی، جو حد درجہ ان کی دنائت اور پست حالی کو ہر حال میں بڑھاتی، جس طرح وہ آج کل علاف شریعت خیرات لے لے کر تمام دنیا کی نگاہوں میں عربوں کی عزت کو بٹا لگا رہے ہیں، یا کوئی دوسری صورت ہوتی، اسلام نے دوسری صورت نکالی اور وہ ان کی پرورش کے لئے تجارت، حاجیوں کا کرایہ مکان حاجیوں کی خدمت کی مزدوری، حاجیوں کی سواری کی اجرت، اور دوسرے ذریعے مقرر کئے ہیں انہی میں سے ایک قربانی بھی ہے'

پہلے زمانہ میں پانچ لاکھ حاجیوں کا تخمینہ ہوتا تھا، اور اب ایک لاکھ ہے، ہر حاجی کم از کم ایک دنبہ یا بکرا قربانی کرتا ہے، بعض اونٹ کرتے ہیں جس کی گو قیمت زیادہ ہوتی ہے، مگر اس میں شرکت بھی ہوتی ہے، بہرحال اوسطاً ایک لاکھ دنبہ رکھ لیجئے، ایک دنبہ کی قیمت اوسطاً چار روپے ہوتی ہے، تو اس طرح اہل بادیہ عرب کو ہر سال حج میں کم از کم چار لاکھ روپئے تقسیم ہوتے ہیں، اور پہلے کے حساب سے بیس لاکھ روپئے تقسیم ہوتے تھے،

غیر حاجی مسلمان ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی جو قربانی کرتے ہیں، اس کا

سو یہ بھی ہر ملک کے دیہاتی مسلمانوں کو پہنچتا ہے، ہندوستان میں گو اکثر قربانی کے جانور قصائیوں کے ذریعہ خریدے جاتے ہیں، مگر شاید مسلمانوں سے زیادہ نامسلمان مویشی کی پرورش کرتے ہیں، اور فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر یہ قصور کس کا ہے؟

جانور کا گوشت، پوست، ہڈی سب کی قیمت بازار میں ہے، اور ان سب کا نفع زکوٰۃ کی طرح مستحقین کے لئے مخصوص ہے، اگر عرب یا حجاز کی حکومت اس کا مناسب انتظام نہیں کرتی، اور اس کا نفع حاصل کرکے غریبوں کو نہیں دیتی، تو یہ قصور اسلام کا نہیں مسلمانوں کا ہے، اسکے لئے اسلام میں اصلاح کی ضرورت نہیں، مسلمانوں میں اصلاح کی ضرورت ہے،

عرب سے باہر دوسرے اسلامی ملکوں کا حال گو نہیں معلوم مگر اسکو ہندوستان پر قیاس کیا جاسکتا ہے، ہندوستان میں ۸ کروڑ مسلمانوں میں ۸ لاکھ قربانیاں ہوتی ہونگی، اور آٹھ لاکھ قربانیوں کی کھالوں کی قیمت اگر آٹھ ہی لاکھ کم وبیش رکھی جائے، تو یہ آٹھ لاکھ روپئے سالانہ عربی مدرسوں، مکتبوں، قومی اداروں اور شہر و دیہات کے غریبوں میں بانٹے جاتے ہیں، اگر ہر سال ان آٹھ لاکھ روپیوں کے جمع وخرچ کا ٹھیک انتظام نہیں کیا جاتا ہے تو یہ مسلمانوں کا قصور ہے، پھر بھی یہ معلوم ہے کہ ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے کئی مہینون کے اخراجات اس قربانی کی مَد سے پورے ہوتے ہیں

جشن قربانی کے اظہار کے لئے کوئی ایسا طریقہ جس میں جشن کا اظہار ہو، باہم دوستوں کی ساتھ دعوت اور ہدیہ کا انتظام ہو، اور پھر غریبون اور مسکینوں اور قومی ضرورتوں کا فنڈ بھی اس سے قائم ہو، فَدَیْنَاہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ کا مصداق بھی ہو، قربانی کے سوا کوئی دوسرا نہیں،

آجکل کی مہذب سلطنتوں میں ٹیکس کے دو طریقے ہین، ایک براہ راست ٹیکس جیسے انکم ٹکس، دوسرا بواسطہ ٹیکس، جس طرح ہم اس سلطنت میں ہر چیز پر ہر وقت ٹیکس ادا کر رہے ہیں، مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ براہ راست ٹیکس ہمیشہ گراں گذرتا ہے، اور بواسطہ ٹیکس کبھی معلوم بھی نہیں ہوتا یہی سبب ہے

کہ جتنے لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اوس سے زیادہ لوگ قربانی دیتے ہیں، اسلام نے ان دونوں ٹیکسوں سے کام لیا ہے، زکوٰۃ براہ راست انکم ٹیکس ہے، اور قربانی بواسطہ ٹیکس ہے اور اس کی ادائی کا راز اسی قربانی کے پُرپیچ رمز میں ہے، اگر کوئی اس دینی راز کے نفسیاتی فلسفہ کو کھول کر اسکو نقد روپیہ سے بدلنا چاہے، تو وہ دیکھے گا کہ چند ہی سال میں یہ منتر بے اثر، اور عید اضحیٰ کا فلسفہ باطل ہو جائے گا، اور وہ روز جشن نہیں بلکہ تحصیل وصول کا ناگوار دن بن جائے گا،

الغرض قربانی بہت سے نفسیاتی، روحانی، اور مادی اقتصادی فوائد پر مبنی ہے، اور اس میں جو کمی نظر آتی ہے، وہ مسلمانوں کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے ضرورت ہے، کہ مسلمان اپنی اصلاح کریں، اسلام کی اصلاح نہیں، کہ وہ ہر اصلاح سے پاک و بلند ہے،

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، اون کا لب ولہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض وعناد پیدا ہوجاتا ہے، مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب وملت معلوم ہوجائیں ضخامت ...۴ صفحے، قیمت عہ

تاریخ فقہ اسلامی

مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہاء پر مکمل و ایسا تبصرہ ہے جس کو جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے، حجم ...۴ صفحے قیمت سے، "منیجر"

رامائن پر ایک عمومی نظر

از

جناب مولوی سید سبطین احمد صاحب بی اے، بدایونی

(۳)

یورپ کے مستشرقین کی رائے میں مہابھارت کے پڑھنے سے تو یہ حقیقت صاف کھل جاتی ہے، کہ اس کی تصنیف میں بہت سے شاعروں نے حصہ لیا ہے، اور مختلف اوقات میں جدید اضافے ہوتے رہے ہیں لیکن رامائن کی نسبت خیال تھا، کہ اس کا بیشتر حصہ ایک ہی عہد اور ایک ہی قلم کا اثر ہے، اور بہت کم اجزا ایسے پائے جاتے ہیں، جن پر بعد کے ملحقات ہونے کا شبہہ ہو سکتا ہے، لیکن مسٹر ونیکٹا رتنام کا خیال ہے کہ رامائن اس الزام سے بری نہیں بلکہ ایک تو بہ تو تصنیف ہے جس میں کم سے کم چار افسانہ نویسوں کی کوشش کو دخل ہے۔

خود رامائن بتاتی ہے کہ نَرَد (ن۔ ر۔ د) پہلا شخص ہے جس نے والمیک کو یہ افسانہ سنایا، نرد کی ابتدائی روایت میں والمیک کے جادو نگار قلم نے کتنی رنگ آمیزی کی ہوگی، اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ باور کر لینا کہ ابتدائی روایت کو بغیر کسی تغیر کے نظم کر دیا گیا، قرین عقل نہیں، مسٹر ونیکٹا رتنام کہتے ہیں کہ یہ والمیک بھی نہ ہندو تھا نہ ہندوستان کا رہنے والا بلکہ کوئی بدیسی نووارد تھا جس کی وساطت سے رامائن کا افسانہ پہلی مرتبہ ہندوستان پہنچا، نرد جس سے والمیک نے نقل کیا، کسی نامعلوم مقام اور اجنبی قوم کا آدمی تھا جس نے ہندوستان کی سرزمین پر کبھی قدم بھی نہ رکھا تھا، ظاہر ہے کہ مورخ جب کسی ایسے عہد کے حالات

[1] یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ اس مضمون کا موضوع والمیک سے منسوب رامائن ہے، تلسی داس کی رامائن سے بحث نہیں۔

تحقیق کرتا ہے، جس کی تاریخ تحریری آثار کی ممنونِ احسان نہیں ہوتی، تو اس کے نظریات کا مدار صرف الفاظ اور لغات پر رہ جاتا ہے، چنانچہ نرد کی نسبت مسٹر وینکٹا رتنام کے نظریہ کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ نرد کے معنی بادل ہیں، اور بادل سے مراد ایک سُنی سُنائی اُڑتی ہوئی خبر لیجاتی ہے، ہندو دیومالا میں جو بیرونی عنصر کو اپنے قدیم نظام میں جگہ دینے کے لئے تیار تھی، نرد کو برہما جی کا بیٹا کہا گیا ہے، جس کو رام کا قصہ سنانے کے لئے برہما نے والمیک کے پاس آسمان سے بھیجا تھا، اور جو یہ خدمت انجام دینے کے بعد پھر آسمانوں کی طرف چلا گیا، ہندو دینیات کا یہ جزاگر تاریخی نگاہ میں کوئی معنی رکھتا ہے، تو بس یہی کہ نرد کوئی اجنبی تھا جس کی قومیت اور ذاتی حیثیت ہندوستان والوں کی نظر سے مخفی رہی،

والمیک کے غیر ہندی ہونے پر مصنف نے جو استدلال کیا ہے، وہ اور بھی زیادہ دلنشین معلوم ہوتا ہے، آریہ قوم کی عادت تھی کہ ہر بدیسی کو ذلیل سمجھتی تھی، اور اس کو ملکش یا شودر کہتی تھی، والمیک بھی اسی نسلی تفوق یا تعصب کا شکار رہا، چنانچہ ہندوستان کی شودر قومیں آجتک والمیک کو اپنی جماعت کا ایک ممتاز فرد سمجھتی ہیں،

مسٹر وینکٹا رتنام کا خیال ہے کہ رامائن کی وہ داستان جو والمیک نے نظم کی تھی، ہندوستانی مقامات اور ہندی اشخاص سے متعلق نہ تھی بلکہ ان افراد اور بستیوں کا ذکر کرتی تھی، جن کے نام نرد کی ابتدائی روایت سے ماخوذ تھے، اور جو راویوں اور زبانوں کی اختلاف سے اپنی اصلی صورت سے کسی قدر دور ہو گئے تھے،

والمیک کے ایک عرصہ بعد قدرتی طور پر ان تمام مقامات اور افراد کو ہندی نام تصور کیا جانے لگا، اور ایک تیسرے ناقل نے کچھ مزید تصرف کے بعد اصلی ناموں کو شمالی ہندوستان کے مقامات سے منطبق کر دیا، پھر بھی رامائن کی منظوم داستان والمیک کی تصنیف سمجھی جاتی رہی،

یہاں تک تو رامائن کا تعلق صرف شمالی ہندوستان سے تھا، اور اس میں ایک غیر ہندوستانی سلطان کی ایک کامیاب مہم مذکور تھی، مگر جنوبی ہند میں اسی سلطان کی ایک اور مہم کا افسانہ پہنچ چکا تھا، چنانچہ رامائن کی داستان میں ایک اور تہ بعد کو چڑھائی گئی، اور موجودہ رامائن وجود میں آگئی، یہ واقعہ ہے کہ

فاضل مصنف نے راماٗن کی ان ارتقائی منزلوں سے بحث کرتے وقت خطرناک اختصار سے کام لیا ہے، اور کتاب کا یہ جزء غیر سنسکرت وان اصحاب کے لئے تسلی بخش نہیں ہے،

بصورت موجودہ راماین کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ کبھی ایک بڑی سلطنت کوسل نامی دریائے سرجو کے کنارے واقع تھی، اس دریا کا موجودہ نام گھاگرا ہے، اس کا دار السلطنت اجودھیا تھا جسکو خود منو نے آباد کیا تھا، چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ایک ناقابلِ عبور خندق اسکی حفاظت کے سامان تھے، یہاں ایسے ایسے آلاتِ حرب موجود تھے، جو ایک دم سو سو آدمیوں کو ہلاک کر سکتے تھے، کئی محل اور بہت سی منزل درمنزل عمارتیں اس کی رونق تھیں، یہ تھا اجودھیا کا وہ شہر جو دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا[1]،

اس سلطنت کا حکمراں راجہ دسرتھ تھا، ایک طویل مدت تک جس کی میعاد ساٹھ ہزار سال بتائی گئی ہے، حکومت کرنے کے بعد دسرتھ نے ایک مجلس میں رعایا کو مطلع کیا کہ بڑھاپے اور کمزوری کے تقاضے سے مجبور ہو کر میں نے بڑے بیٹے رامچندر کو گدی پر بٹھا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، یہ تجویز ہر ایک کو پسند آئی لیکن کیکئی کی ضد نے مجبور کر دیا، کہ بیٹے کو چودہ سال کا بن باس دیا جائے، چنانچہ رام کو ترکِ وطن کرنا پڑا،

لکشمن اور سیتا جی رام کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں، دسرتھ کا ایک وزیر سومنتر رتھ ہانک رہا ہے، شام کے قریب یہ قافلہ دریائے تمسا کے کنارے پہنچتا ہے، دوسرے دن صبح تڑکے دریا کو عبور کرتے ہیں، یہاں تک اجودھیا کے بہت سے لوگ خیر باد کہنے کے لئے ساتھ ہیں، لیکن رام ان سے بچنا چاہتے ہیں، اور سومنتر کو حکم دیتے ہیں، کہ شمال کی طرف رتھ لیجائے، تاکہ لوگ سمجھیں کہ رام اجودھیا کو واپس جارہے ہیں، اور جنوب کی طرف لوٹ کر کسی دوسرے راستہ سے رام سے آملے[2]، اس کے بعد رام جنگل میں داخل ہو جاتے ہیں

[1] راماٗن ازگرفتہ کتاب نمبر ۱، باب نمبر ۵ اشلوک نمبر ۵، [2] راماٗن کتاب نمبر ۲ باب ۴۶،

اور کوسل کی جنوبی حد تک پہنچ جاتے ہیں، آخر دریائے گنگا کے کنارے سرنگی بیرا پور نام ایک مقام پر پہنچتے ہیں، اور وہیں اپنے دوست گوہا کی صحبت میں جو نشدون (شکاری قوم) کا بادشاہ ہے رات گذارتے ہیں،

تیسرے دن رتھ اور رتھ بان اجودھیا کو واپس بھیجدیا جاتا ہے، رام سنیاسی کا لباس پہنکر گنگا پار چلے جاتے ہیں،

چوتھے روز صبح کو اس مقام کی طرف کوچ شروع ہوجاتا ہی جو گنگا جمنا کا سنگم ہے، یہاں بھردواج رشی سے ملاقات ہوتی ہے، اور رام اپنا قصہ بیان کرتے ہیں، بھردواج ہدایت کرتا ہے کہ چترکوٹ پہاڑی پر (جو ۲۰ میل کے فاصلے پر ہے) جاکر رہیں، اس پہاڑی پر رشیوں کے صرف دھڑ نظر آتے تھے، کیونکہ رشی لوگ اپنے اپنے سر لئے ہوئے آسمان پر چلے گئے تھے،

پانچویں روز بھردواج سے رخصت ہوتے ہیں، جو ہدایت کرتا ہو کہ سنگم پر پہنچ کر جمنا کے کنارے کنارے سفر کریں، ترتھم گھاٹ پر دریا عبور کرکے رام جنوبی کنارے پر پہنچ جاتے ہیں، اور بناس پتی کے نیچے رات گذارتے ہیں،

چھٹے روز چترکوٹ پہنچ کر والمیک سے ملاقات ہوتی ہے، اور رام اپنا قصہ سناتے ہیں یہیں ایک جھونپڑا بنا کر رہنے لگتے ہیں، اسوقت اجودھیا میں راجہ دسرتھ کا انتقال ہوجاتا ہی نعش کسی روغن میں ڈال کر رکھدی جاتی ہے، اور بھرت کو بلانے کے لئے گرواج یا کیکیا پور کو جو بلکھ سے آگے ہے قاصد روانہ ہوتے ہیں، بھرت راستہ میں کہیں ٹھہرے بغیر سات دن میں اجودھیا آجاتے ہیں اور کیکئی، کوسلیا اور سومترا کو ساتھ لیکر رام کی تلاش میں نکلتے ہیں،

چترکوٹ میں قرب وجوار کے رشی رام سے راکششوں کی شکایت کرتے ہیں، جو جن استھان میں رہتے تھے، بالخصوص کھار راکشش سے جو راون کا بھائی ہے، انکو بہت زیادہ خطرہ رہتا ہے،

ساتویں روز رام ڈنڈک کے جنگل میں داخل ہوتے ہیں، جہاں بہت سے رشیوں کے علاوہ سربھنگ سے ملاقات ہوتی ہے، جو گوتم کی اولاد ہے، یہاں بھی رشی راکششوں کے شاکی ہیں، اور

رام ان کو برباد کر دینے کی قسم کھا لیتے ہیں،

آٹھویں روز اگستیا سے ملاقات ہوتی ہے، یہاں دکن میں رشی اور راکشش برسر جنگ نہیں ہیں،
اگستیا رام کو بتاتا ہے کہ اُن کے بن باس کے دس سال اسوقت تک گذر چکے، اُس کی ہدایت پر رام پنچاوتی
میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں، جسکے معنی پانچ برگد کے ہیں، اور جو گوداوری کے کنارے واقع ہے،

یہیں سے راون سیتا کو لیجاتا ہے جٹیو چیل سے رام کو یہ حال معلوم ہوتا ہے، روتے اور ماتم کرتے
ہوئے وہ رسیا مکا پہاڑ کی طرف مغرب کی سمت بڑھتے ہیں، جہاں بھالو کثرت سے ہیں یہاں سرگیو سے
ملاقات ہوتی ہے، اور سرگیو کے ساتھ کشن کندا پر پہنچتے ہیں، جو بندروں کے بادشاہ والی کا پایہ تخت ہے،
رام والی کو قتل کر کے سرگیو کو تخت پر بٹھا دیتے ہیں،

سرگیو سیتا کو تلاش کراتا ہے، ہنومان سرگیو کا وزیر اور رام کا دوست ہے، اسکو سامپتی چیل سے
سیتا کا سراغ ملتا ہے، وہ آسمان تک جست کر کے مہندر پہاڑ سے سمندر پھاند جاتا ہے، اور لنکا میں جاکر
گرتا ہے، یہاں سے لوٹ کر رام کو سیتا کا پتہ دیتا ہے،

آخر پل بنایا جاتا ہے جس کے لئے پتھر ہمالیہ پہاڑ سے آتے ہیں، اس پل کے بنانے والے سرگیو
کے محکوم بندر یعنی دکھنی لوگ ہیں، رام اس پل سے گذر کر راون کو قتل کر دیتے ہیں، اور سیتا مل جاتی ہیں،

دکن سے اجودھیا تک سفر کچھ معرکہ خیز نہیں، اور اس کا اعادہ غیر ضروری ہے، جتنا بیان کیا گیا ہے
اس سے افسانہ کے واقعات کی نوعیت معلوم ہو جاتی ہے، خلاف فطرت واقعات جو راماین میں جابجا مذکور ہیں، اگر
معرض تنقید میں لائے جائیں، تو افسانہ نگار نہیں بلکہ نقاد کی غلطی ثابت ہو گی، لیکن شاعر کے دماغ کو خیال
آرائی اور اعجوبہ آفرینی کی پوری آزادی دینے کے بعد بھی ہر ناقد ہی نہیں بلکہ ہر ناظر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ واقعات
کے باہم مربوط ہونے اور تخالف سے پاک رہنے کا مطالبہ کر سکے، دسرتھ کا ساٹھ ہزار سال حکومت کرنا، اندر جیت
کا گیارہ ہزار برس تخت نشین رہنا، جٹایو کا جو ایک چیل ہے، ساٹھ ہزار برس فرمانروائی کرنا، راون کا دونا

تسخیر کرنا، بندروں کا ہمالیہ سے تیر لانا اور آسمان تک جست لگا سکنا یا سمندر کو ایک قلانچ میں پھاند جانا یہ تمام خلاف عقل بیانات شاعرانہ تخئیل کے لئے جائز سمجھ لئے جائیں، لیکن واقعات اگر باہم متضاد نظر آئیں، تو یہ ایک ناقابل عفو جرم بن جاتا ہے، اور کتاب کو تاریخ کیا معنی افسانہ کی حیثیت سے بھی گرا دیتا ہے،

مسٹر وین کٹا رتنام کے بقول رامائن متضاد اقوال سے پُر ہے، سب سے پہلے تو قصہ کی اصلی بنیاد نرد کی روایت کو بتایا گیا ہے جس سے سُن کر والمیک نے اسکو نظم کیا، مگر دوسری جگہ دکھایا گیا ہے کہ چترکوٹ میں والمیک اور رامچندر جی کی ملاقات ہوئی رامچندر جی نے اپنا تمام حال والمیک کو سُنایا اور انھوں نے اس کو نظم کر دیا، چترکوٹ پہنچنے تک جو حادثات پیش آئے تھے، وہ تو اس ملاقات میں ذکر کئے جا سکتے تھے، لیکن بعد کے واقعات معلوم ہونے کے لئے والمیک کے پاس کونسا ذریعہ تھا، اسی تضاد کی ایک اور مثال یہ ہے کہ رام کے بن باس کا سبب بڑے اہتمام کیساتھ حرم سرا کی ایک سازش اور سوکن کا جلاپا دکھایا گیا ہے، لیکن دوسری جگہ رام کے منہ سے کہلایا جاتا ہے کہ مجھے باپ نے کھارا جیسے راکشش کو قتل کرنے کے لئے بھیجا ہے، ایک جگہ اور رام کہتے ہیں، کہ میں رشیوں کے دشمنوں کو برباد کرنے کے لئے خود اپنی مرضی سے آیا ہوں،

اس کے بعد رامائن نگار کی جغرافی معلومات سے بحث کی گئی ہے، مثلاً رام کا گومتی کو پار کرنا، جب کہ وہ گنگا کے جنوبی کنارے پر چل رہے تھے، ناممکن تھا، ڈنڈک کے جنگل کی وسعت رامائن نگار کے نزدیک گنگا سے گوداوری ہی تک نہیں، بلکہ پمپا جھیل تک جو احاطہ مدراس کے ضلع بلاری میں واقع ہے پہنچتی ہے، پھر تمام افسانے میں گنگا جمنا اور گوداوری کے علاوہ کسی بڑے دریا کا ذکر نہیں جو رام کو عبور کرنا پڑا ہو، اسی طرح پہاڑوں میں صرف ہمالہ، وندھیا اور چترکوٹ کو قابل التفات سمجھا گیا، مگر چترکوٹ جس کو گنگا جمنا کے سنگم سے پچیس میل پچھم کی طرف بتایا گیا ہے، صرف فرضی وجود ہے، کیونکہ مسٹر وینکٹا رتنام کے بقول ہندوستان کا یہ علاقہ پہاڑوں کے بوجھ سے آزاد ہے، وندھیاچل پہاڑ اگستیا کو نمسکار کرنے کے لئے زمین

پر لیٹ کر تمام اس زمین کو ایک مسطح میدان بنا دیتے ہیں، اور رامائن نگار کے بقول آج تک اگستیا کی واپسی کے انتظار میں اُسی طرح تن بر زمین اور چشم براہ ہیں، اسکے بالفاظ دیگر یہ معنی ہیں، کہ رامائن کا مصنف دکن اور شمالی ہند کو ایک مسطح اور مسلسل قطعۂ زمین تصور کرتا تھا،

اسی طرح رام کے سفر کے واقعات باہم مربوط نظر نہیں آتے، مثلاً سفر کے آٹھویں روز رام اور اگستیا کی ملاقات ہوتی ہے، مگر اگستیا رام کو یہ مژدہ سناتا ہے کہ بن باس کے دس سال ختم ہو چکے، دونوں کے شمار سے قطع نظر کر کے اگر یہ مان لیا جائے، کہ اگستیا کا قول صحیح تھا، تو مدت سفر یوں تقسیم ہو جاتی ہے، کہ دس سال شمالی ہند میں اور تین سال پنج وتی میں گذرے، بقیہ ایک سال گوداوری سے لنکا تک پہنچنے لشکر فراہم کرنے، راون سے لڑنے سیتا کو حاصل کرنے اور اجودھیا تک واپس آنے میں صرف ہو، یہ ملحوظ رکھتے ہوئے کہ تمام سفر پیادہ پا کرنا پڑا تھا، آخری ایک سال ان تمام مہمات کے لئے ناکافی نظر آتا ہے،

کتاب زیر بحث میں رام کے سفر کا ایک نقشہ بھی شامل کر دیا گیا ہے، جو دکھاتا ہے کہ کتنی مدت میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کیا گیا، اس نقشہ کی رُو سے رامچندر جی چوتھے روز چترکوٹ پہنچتے ہیں، حالانکہ سفر کا خلاصہ جو مصنف نے پہلے دیا ہے، رام کی چترکوٹ میں آمد چھٹے روز قائم کرتا ہے، اس اختلاف سے قطع نظر نقشہ میں چترکوٹ کے بعد کسی کوچ کا دن شمار نہیں کیا گیا ہے، اور خلاصہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اگستیا کی ملاقات تک روز شماری ممکن ہے، لیکن بات تو یہ ہے کہ اس افسانہ کے واقعات کو دن اور تاریخ کے حوالہ سے ترتیب دینے کی کوشش کرنا ہی فضول ہے، ورنہ ایسی ایسی مشکلات سامنے آئیں گی، کہ حل ہی نہ ہو سکیں گی، مثلاً رام چھٹے روز چترکوٹ پہنچتے ہیں اور جب کہ وہ چترکوٹ میں ہیں اجودھیا میں دسرتھ کا انتقال ہوتا ہے، قاصد بھرت کی ننہال کو روانہ کئے جاتے ہیں، بھرت سات روز میں بغیر کہیں ٹھہرے ہوئے اجودھیا پہونچ کر کیکئی کو سلا اور

سومنتر کے ساتھ رام کی تلاش میں نکلتا ہے، اور چترکوٹ میں رام سے ملاقات ہوتی ہے، لیکن مسٹر وینکٹا
رتنام کا خلاصۂ سفر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ رام ساتویں دن ڈنڈک کے جنگل میں داخل ہو گئے،
گویا چترکوٹ کے قیام کی مدت ایک ہی دن تھی، اور مذکورۂ بالا تمام واقعات اسی ایک دن میں پیش آگئے،

جیسا کہ پہلے گذر چکا مسٹر وینکٹا رتنام اس افسانے کو ہندی الاصل ہی نہیں سمجھتے، اس سلسلے میں
پہلے تو یہ دکھایا گیا ہے، کہ راماین نگار نے جتنے مقامات کا ذکر کیا ہے، ان میں چند کو چھوڑ کر کوئی بھی ایسا
نہیں کہ بلا خوف تردید ہندوستانی کہا جا سکے، اور پھر ان مستثنیات کی اصل بھی مصری جغرافیہ کی مدد سے
معلوم کیجا سکتی ہے، جیسا کہ آگے چل کر دکھایا جائے گا،

ہندوستان کے آثار الصنادید بھی کوئی چیز ایسی نہیں پیش کر سکتے جسکو رامچندر جی کی یادگار
کہا جا سکے، چترکوٹ، رام ٹیک، پنچ وتی، غرض تمام ایسے مقامات پر جن کو رام کے گذر یا قیام کا شرف
حاصل ہے، سوا ان مندروں کے کچھ بھی نہیں، جو عقیدتمندوں نے بعد کو تعمیر کر دئیے ہیں، بلکہ اکثر مقامات
کا وقوع بھی مشتبہ ہے، کیونکہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی صوبہ ایسا ہو، جہاں کے دو چار مقامات
پر رام کا گذر ہونا مدعی نہ ہو، گوداوری کے قریب بہت دور مشرق کی طرف ہٹا ہوا ایک اور مقام
پرناسالہ نامی بھی رام کا قیام گاہ بتایا جاتا ہے، پرناسالہ اور پنچ وتی یہ دونوں مقام وہ ہیں، جہان
سے کہا جاتا ہے کہ راون سیتا کو لے گیا، یہ رقیبانہ دعوی ان تمام مقامات کی فرضی حیثیت پر روشنی ڈالتا
ہے جن کو رام کے سفر و حضر سے منسوب کیا جاتا ہے، پھر راماین میں شہر اجودھیا کی عظمت، خوبصورتی
اور استحکام کا جو حال مذکور ہے، آج اس پر گواہی دینی والی ایک اینٹ بھی اس قصبہ میں نظر نہیں
آتی، اجودھیا آج ایک مرتفع میدان پر چھوٹا سا قصبہ ہے، جس کے ارد گرد یا جس کی سطح کے نیچے راماین
کے بیان کی تائید کرنے والے کوئی آثار نظر نہیں آتے، ممکن ہے کہ یہاں کچھ بدیسیوں نے آکر نوآبادی
قائم کر لی ہو، اور وہیں سے رام کی روایت ملک میں پھیلی ہو،

اس کے بعد رامائن کے زمانہ تصنیف کا سوال آتا ہے، جو مستشرقین کے نزدیک نزاعی مسئلہ ہو، مسٹر گرفتھ نے اپنے مقدمہ میں اس مسئلہ پر بحث کی ہو جس کا ماحصل یہ ہے کہ رامائن کم سے کم چودہ پندرہ سو قبل مسیح میں تصنیف کی گئی، کتاب کی قدامت پر جو دلائل دیئے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں،

۱- رامائن کے مختلف نسخوں میں کثرت سے اختلافات ملتے ہیں، جو اس امر کی دلیل ہیں، کہ مرور زمانہ سے مختلف اضافے ہوگئے،

۲- رامائن کا طرزِ عبادت اس کی قدامت کا شاہد ہے،

۳- رامائن میں کہیں بودھ مت کا ذکر نہیں ملتا، اور چونکہ بدھ جی کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح ہے، اسلئے رامائن کو قدیم تر ہونا چاہیئے،

۴- رامائن میں کہیں ستی کی رسم کا ذکر نہیں، حالانکہ یونانی مورخ جو چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستان سے روشناس ہوئے، اس رسم کو ملک کا قدیم دستور بتاتے ہیں، لہذا رامائن یونانیوں کے آنے سے کئی صدی پہلے لکھی گئی ہوگی،

۵- رامائن میں (Ceylon) کے لئے قدیم ناموں میں سے لنکا کا لفظ ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے، جو اس جزیرہ کا سب سے زیادہ پرانا نام ہے،

۶- رامائن میں کہیں بھگتی مذہب کا ذکر نہیں حالانکہ یہ مذہب بھی ولادتِ مسیح سے بہت پہلے شروع ہو چکا ہے،

۷- کشمیر کی تاریخ موسومہ راج ترنگنی میں مذکور ہے، کہ کشمیر کے راجہ دامودردویم کو کچھ برہمنوں نے بددعا دی تھی، اور اس بددعا کا اثر ختم کرنے کی تدبیر یہ بتائی جاتی تھی، کہ ایک نشست میں ساری رامائن پڑھوا کر سن لی جائے، دامودر دویم کا عہد گیرشیو کے قیاس کے مطابق چودھویں صدی قبل مسیح ہے، اور یہ رامائن کی قدامت پر زبردست حجت ہے،

۸ - رامچندر جی کا یہی افسانہ کالیداس کی تصنیف موسومہ رگھو ونس کا بھی موضوع ہے، اور کالیداس خود تسلیم کرتا ہے، کہ اس افسانہ کو اگلے شعرا بھی نظم کر چکے ہیں، گورشیو کے نزدیک یہ اشارہ والمیک ہی کی طرف ہو سکتا ہے،[1]

ان محققین کے برعکس مسٹر ساکس وغیرہ رامائن کی قدامت مشتبہ خیال کرتے ہیں اور ان کا استدلال یہ ہے، کہ یونانی مورخ اور چینی سیاح جنھوں نے چشم دید یا سماعی حالات تحریر کئے ہیں، اس کتاب کا ذکر نہیں کرتے، مثلاً فاہیان جب اجودھیا پہونچتا ہے، تو یہ امر حیرت انگیز ہے، کہ وہ اس کی قدیم عظمت اور رامچندر جی کا دارالسلطنت ہونا بیان نہیں کرتا لیکن گورشیو کی جماعت اس حجت کو قابل التفات نہیں سمجھتی اسکا جواب یہ ہے کہ چینی سیاح ہوں، یا یونانی مورخ ان سے یہ امید کرنا کہ انھوں نے سنسکرت کے ادبی سرمایہ کا جائزہ لیا ہو بے جا ہے،

مسٹر ونیکیا رتنام ان تمام مورخین کے برخلاف رامائن کا زمانہ تالیف چھٹی صدی بعد مسیح قرار دیتے ہیں، افسوس ہے کہ مسٹر ونیکیا رتنام نے لسانی تحقیق اور اسما، کی تطبیق کے ساتھ ساتھ ان متعلقہ مسائل پر سیر حاصل تبصرہ اور تنقید نہیں فرمائی، رامائن کی تصنیف کو چھٹی صدی بعد مسیح سے منسوب کرنے کیلئے جو دلائل دیئے گئے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ بیرونی اقوام مثلاً ایرانیوں اور یونانیوں کا اکثر ذکر ملتا ہے، یونانیوں کا حوالہ سب کو تسلیم ہے، مگر قدامت کے قائل فرض کر لیتے ہیں کہ سنسکرت کا لفظ "یوانا" شاید قدیم زمانے میں ہر غیر ملکی قوم کے لئے استعمال ہوتا ہو، اور بعد کو یونانیوں کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہو، دوسرے محققین کے برخلاف مسٹر ونیکیا رتنام کا یہ بھی دعوی ہے کہ رامائن میں بودھ مت کے حوالے اکثر موجود ہیں، مثلاً جب رام اور لکشمن وشوامتر رشی کے ساتھ راکششوں کو قتل کرنے جارہے ہیں، اور متھلا پہنچتے ہیں، تو گوتم کے سب سے بڑے بیٹے ستانند سے ملاقات ہوتی ہے، اور دوسری جگہ وارد ہوتا ہے، کہ جابالی

---

[1] اس تمام بحث کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ رامائن مترجمہ گرفتھ،

یک بودھی عالم سراد ھ کی رسم کے بارے میں رامچندر جی سے مناظرہ کرتا ہے، ایک اور جگہ کہا گیا ہے کہ "بودھ ایک چور کی مانند ہے، اور تاتا گت اور ملحد میں کوئی فرق نہیں"، ان اشاروں سے فاضل مصنف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ راماین کی تصنیف نہ صرف بودھ جی کے بعد ہوئی، بلکہ اس دور میں عمل میں آئی جب کہ بدھ مت کا زوال شروع ہو چکا تھا، کیونکہ بدھ مت کے دور اقبال میں اس کے بانی کو ان الفاظ سے یاد کرنا قرین مصلحت نہ ہو سکتا تھا، مصنف کا آخری استدلال اس کتاب پر مبنی ہے، جو امر کوش کے نام سے منسوب ہے، اور جس کو سنسکرت فن لغت میں وہی مرتبہ حاصل ہے، جو پینی کو صرف و نحو میں ہے، اس کتاب میں رام نامی صرف دو شخص مذکور ہیں، ایک بالا رام اور دوسرا پرس رام امر کوش کی تصنیف تقریباً نسو سال بعد مسیح ہوئی، اور ایسی جدید کتاب میں دسرتھ کے بیٹے رام کا نام نہ آنا قدامت کا دعویٰ بالکل باطل کر دیتا ہے،

مصنف کے ان دلائل کو آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا، البتہ ضروری تھا کہ مخالفین کے استدلال پر بھی جرح کی جاتی، اور بالخصوص ان متضاد بیانات پر محاکمہ کیا جاتا، جو مصنف نے دوسرے محققین کے خلاف دیئے ہیں، مثلاً یہ دعویٰ کہ راماین میں بدھ مت کے حوالے موجود ہیں، گورنیسیو کے قول کے خلاف ہے، یہاں ضروری تھا کہ سابق مبصرین کی غلط فہمی کے وجوہ بیان کئے جاتے، اور دکھایا جاتا کہ مصنف نے جن الفاظ کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے، دوسرے لوگ ان کو کن معنی پر محمول کرتے ہیں، اس بحث کا قطعی فیصلہ تو سنسکرت پر عبور رکھنے والا ہی کر سکتا ہے، لیکن انگریزی تراجم اگر صحیح ہیں، تو مذکورۂ بالا شہادتوں کے علاوہ راماین کے اندر اور بھی حوالے تلاش کئے جا سکتے ہیں، جو اس کی قدامت کے خلاف شہادت دیں گے، مثلاً ایک جگہ رام کے بیٹوں کی تعریف کرتے ہوئے شاعر اُن کو پتھر کے تراشے ہوئے اصنام سے تشبیہ دیتا ہے، اور یہ امر کسی طویل بحث کا محتاج نہیں، کہ ہندوستان کا قدیم عہد بت پرستی سے ناآشنا تھا، ہندوستان کے قدیم تاریخ

جو بُت اور تصویریں پائی گئی ہیں، وہ سب مسیح علیہ السلام کی ولادت کے بعد کے زمانہ کی ہیں[1]،
غرض رامائن کی قدامت ایک مشکوک مسئلہ ہے، اور اس لئے مسٹر وینکٹا رتنام کے اس
نظریے کے خلاف کہ یہ افسانہ مصری فرعون رامیسز ثانی (۱۳۰۰ ق م) کے متعلق ہے حجت
نہیں بن سکتا،

(باقی)

[1] بعض کے نزدیک آریہ قوم میں لکڑی کے بُت بنانے کا رواج بہت قدیم تھا، ملاحظہ ہو تاریخ
ہند قدیم مصنفہ بنرجی ص۲۹، پھر بھی پتھر کے بُت بعد کے عہد کی مخلوق ہیں، جو بدھ جی کی پرستش کے سلسلے
میں ظہور میں آئے، فارسی بُت کو لفظاً بودھ ہی سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے،

آزادی کا اخلاقی مفہوم

از

جناب پروفیسر متضد ولی الرحمن صاحب ایم اے

"عام خیال یہ ہے کہ آزادی ارادہ کے مسئلہ کا رس عرصہ ہوا، کہ تمام کا تمام نچوڑ لیا گیا ہے، یہ الفاظ ہیں جن سے جیمس نے جبر و اختیار پر اپنی بحث شروع کی ہے[1] ہر مفکر کی طرح جیمس بھی اس خیال سے متفق نہیں بقول پروفیسر پاولسن یہ ایسا مسئلہ نہیں، جو خاص حالات میں پیدا ہوا اور ان حالات کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا، نہ یہ ایسا مسئلہ ہے، جو صرف دینیات، یا کلام کے لئے ہے[2] جن حالات میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے، وہ ہمیشہ باقی رہتے ہیں، لہذا یہ مسئلہ بھی ہمیشہ باقی رہے گا، اس مسئلہ پر ہر دور میں ہر قوم نے بہت کچھ سوچا اور بہت کچھ کہا لیکن کسی کا ناخن بھی اس گرہ کو کھولنے میں کامیاب نہ ہوا،

اس مسئلے کا اخلاقی پہلو خصوصیت کے ساتھ تختۂ مشق بنا، کیونکہ اسی کے حل پر مذہب اور اخلاقیات کی ہستی و بقا موقوف ہے، لیکن وقت یہ ہے کہ جبر و اختیار میں سے کسی ایک کے انتخاب سے مذہب و اخلاقیات دونوں کی بنیادیں ہل جاتی ہیں، ہر زمانے اور ہر ملک کے مفکرین کی طرح مسلمان مفکرین بھی اس مسئلے میں صاف نہیں ہیں، قرآن شریف میں جہاں وَمَا تَشَاءُونَ

ل دیکھو اس کی کتاب "The Dilemma of determinism." The will to believe، جلد اول ص ۱۴۵، ۲ Ethic ص ۲۵۱،

اِلَّآ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ کے ہم معنی آیتیں ہیں، وہاں فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ کے ہم معنی آیتیں بھی ہیں، مسلمانوں نے تو یکسر اس بحث سے اپنا پیچھا چھڑا لیا، کہ اس مسئلے میں مبداء وحی و رسالت محمد رسول اللہ صلعم کی عجیب مصلحت بینی ہے، کہ آپ نے اپنی اُمت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی، اسی شدت سے اس میں بحث مناقشہ سے منع فرمایا[1]۔

زمانہ حال کے مغربی فلاسفہ میں بھی وہی تمام اختلافات پائے جاتے ہیں، جو متقدمین میں تھے، ذیل کا مضمون ڈاکٹر والٹر گڈنا ڈاورٹ (Dr. Walter Goodnow Everett) کی کتاب (Moral Values) کے باب دوازدہم کا آزاد ترجمہ ہے، ڈاکٹر موصوف انسان کو مجبوری میں مختار مانتا ہے، یعنی یہ کہ انسان ایک دائرے کے اندر محدود ہے، وہ اس دائرے کے اندر رہ کر جو کچھ چاہے کر سکتا ہے، جس خوبی سے مصنف نے اپنے دعوے کو ثابت اور واضح کیا ہے، وہ اوراق آیندہ کے مطالعے سے روشن ہوگی،

"مقصد"

۱۔ زیر بحث مسئلہ

آزادی کے مسئلے پر تمام بحث میں دو متخالف نظریات مابہ النزاع ہیں، جو جبر و اختیار کے نام سے معروف عام ہیں، جبر کے قائلین کا دعویٰ ہے کہ انسان کی ذہنی زندگی، اور عالم خارجی کے تمام واقعات و حادثات لازماً پہلے سے معین و مقرر ہوتے ہیں، یعنی یہ کہ ان کی پیدائش گذشتہ متقدم واقعات سے ہوتی ہے، یا یہ ان کے لازمی معلولات ہوتے ہیں، عمل کے تعلق سے اس عقیدہ

[1] سیرۃ النبی مصنفہ سید سلیمان ندوی جلد چہارم، صفحہ ۔۔۔، بحوالہ مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر،

کا مطلب یہ ہے کہ ہر فعل عام اس سے کہ اچھا ہے یا بُرا، انسان کی داخلی فطرت اور خارجی عوارض حالات یا بالفاظ دیگر فاعل کی مجموعی سیرت اور اس کے ماحول کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، عقیدہ جبر کے مطابق ایک شخص کی سیرت اور اس کا ماحول ایسی قوتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں، جنکا کھوج ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے میں بہت پیچھے تک لگایا جاسکتا ہے، اسی عقیدے کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اگر ہم کو کسی فعل کے مقدمات کا مکمل علم ہو، جو عملاً ناممکن ہے، تو ہم اس فعل کو سمجھ سکتے ہیں، اور معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ فعل ایسا کیوں ہے،

اس کے برعکس اختیار کا قائل دعوی کرتا ہے کہ ذہنی اور اخلاقی زندگی میں ایسے واقعات وحادثات ہوتے ہیں، جن کی توجیہ لازمی تعلقات کے ایسے جال سے نہیں ہوسکتی، یہ واقعات براہ راست اور از خود ارادے سے پیدا ہوتے ہیں، اور انسانی تجربے میں کلیۃً نئی تخلیق کی شکل میں نما ہوتے ہیں، اس نظریے کے مطابق ارادہ متقابل محرکات کی قوت کا اندازہ کئے بغیر فیصلہ صادر کرسکتا ہے، چنانچہ دو مثالوں میں بالکل ایک ہی جیسے مقدم نفسی حالات اور خارجی ماحول کے باوجود لازمی نہیں ہے کہ ایک ہی جیسا نتیجہ صادر ہو[1] بہ قول لوتزے آزادارادی کے ایسے افعال غیر صادر شدہ بھی رکھے جاسکتے ہیں" غیر معین اور بلا علت ہونے کے لحاظ سے کوئی منطقی وجہ اس امر کی نہیں کہ وہ صادر کئے ہی جائیں، لہذا آخری نتیجہ یہ ہے کہ انسانی عمل میں ایک عنصر اپنی ذاتی ماہیت نہ کہ ہمارے محدود علم کی وجہ سے ایسا ہے جو ہمیشہ کے لئے ناقابل توجیہ رہتا ہے، اور جس کو نہ صرف ناقابل توجیہ

---

[1] ریشڈال نے اس صورتِ حال کو دو توام بھائیوں کی فرضی مثال سے واضح کیا ہے، جو بالکل ایک ہی سی طبیعتیں لے کر پیدا ہوئے، اور پیدائش کے بعد بالکل ایک ہی جیسے عمرانی اور دیگر اثرات میں رہے، اختیاریت کے نزدیک ان میں سے ایک ولی بن سکتا ہے، اور دوسرا شیطان، دیکھو نظریہ خیر و شر جلد دوم ص ۳۰۳، (مصنف)

اور پُر اسرار کہنا چاہیئے، بلکہ وہ محض اتفاق کا نتیجہ ہوتا ہو۔

آیندہ اوراق میں اس عقیدے کے مطابق آزادی اور ذمہ داری کی تاویل کی کوشش کیجائے گی، کہ ذہن اور عالم خارجی کے واقعات میں متعین و مقرر تعلقات ہوتے ہیں، کیونکہ خیال ہے کہ صرف اسی طرح حکمی (سائنٹفک) تفکر اور عملی اخلاقیات کے مقاصد پورے ہوتے ہیں، اس میں تو شبہہ ہی نہیں ہو سکتا کہ سائنس کی ترقی اور اس کے دائرۂ عمل کی توسیع کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ صرف طبیعی مظاہر تک محدود نہیں رہی، بلکہ انسانی اعمال میں بھی داخل ہو چکی ہے، نفسیات، اخلاقیات، معاشیات اور تاریخ کے سے جو علوم انسانی فعیت پر بحث کرتے ہیں، وہ اپنے وجود اور اپنی ترقی کے خاطر یہ فرض کرنے پر مجبور ہیں، کہ انسانی افعال، جو بہت زیادہ پیچیدہ اور متنوع ہوتے ہیں، لازمی تعلقات و اضافات کے سلسلے میں واقع ہیں، جب تک ہماری فکر کسی سلسلۂ واقعات پر بحث کرتی ہے، اسوقت تک وہ مجبوراً ان کو کسی طرح متعلق فرض و متصور کرتی ہے، اس طریقے سے متصور کرنے سے انکار در اصل فکر کرنیکے انکار کے ہم معنی نہیں، اس کی وجہ یہ ہے، کہ واقعات کے لازمی تعلقات کا تخیل ہی جس کو عموماً اصول تعلیل کہا جا سکتا ہے، فکر کا عالمگیر اصول ہے، یہ صحیح ہو کہ ہم رفتہ رفتہ اور طویل تجربہ کے بعد اس اصول سے واقف ہوتے ہیں، اور ایک دفعہ واقف ہوجانے کے بعد پھر ہم اسکو واقعات کی توجیہ کے لئے عالمگیر اور لازماً صحیح سمجھتے ہیں، یہاں مسئلۂ تعلیل پر ما بعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر سے بحث ممکن نہیں، لہذا ہم مجبوراً اپنے آپ کو اس بیان تک محدود رکھتے ہیں، کہ فکر کی ضرورت کے معنوں میں اصول تعلیل کا مطلب یہ ہو کہ کسی نئے واقعے کی وجہ یا بنیاد کو ہمیشہ گذشتہ واقعات میں تلاش کرنا چاہیئے، یہ قول رینی ڈال "مطلقاً نئی اور ماضی سے غیر متعلق ابتدا ناقابلِ فکر ہے" اختیار کا حامی اکثر واقعات کے لئے اس اصول کی ہمہ گیری کا تو قائل ہے، لیکن وہ اعتراض کرتا ہو، کہ انسانی عمل میں بعض واقعات بہ ذات خود ایسے ہوتے ہیں، کہ جن پر مقدم واقعات کے تعلق

سے غور نہیں کیا جاسکتا، اس کے علاوہ اگر اخلاقی انتخابات کو ان مقدمات کیساتھ ملانے کی کوشش اخلاقیات میں فساد برپا کرتی ہے، تو کیا اس کوشش کو ترک کر دینا ہی بہتر نہیں، کہا جاتا ہے کہ زندگی، سائنس سے بڑھکر ہے، اور اخلاقی مقاصد معقولات فکر سے بالاتر ہیں، اس اعتراض کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ہم دیکھیں گے، کہ کوئی نظری مقصد مستقلاً کسی اخلاقی مقصد کے منافی ہے، تو ہم کو مجبوراً کسی ایک کو ترک کرنا ہی پڑے گا، اسوقت یا تو علمی محرک شکست کھائے گا، یا اخلاقی، اس کا انحصار اس فرد میں کسی ایک مقصد کے غلبہ پر ہے، لیکن اس مشکل کا یہ حل ہمارے تفکر میں ایک مستقل اور ناقابل برداشت ثنویت کو متضمن ہے جس کو صرف بہ صورت بیچارگی تسلیم کیا جاسکتا ہے، لیکن ہم کیوں نہ یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں کہ یہ دونوں مقاصد متحد ہیں، بلکہ یہاں تک کہ اپنے کردار پر لازمی تعلقات کے سلسلے کی صورت میں غور کرنے کا نظری محرک ہمارے اخلاقی مقاصد کا ممد ہے، اس مقدمہ کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ نظری مقاصد بہ ظاہر قیاس جبر کے متقاضی ہیں، اگر اخلاقی مقاصد اس قیاس کے منافی نہیں، تو ہم عقلاً اس کو تسلیم کر لینے پر مجبور ہیں، اور اگر اخلاقی مقاصد اختیاریت کے معاند ثابت ہوں، تو جبریت کے حق میں فیصلہ قطعی ہو جاتا ہے،

۲- کانٹ کی ثنویت

اکثر کوشش کی گئی ہے کہ ان دونوں نظریات کو ایک مابعد الطبیعیاتی عقیدے کی بنا پر مان لیا جائے جس کے مطابق جبریت تجربی دائرے کے اندر محدود ہو جاتی ہے، اور آزادی ایک ایسی مختلف دنیا میں منتقل ہو جاتی ہے جس پر سائنس کے معقولات ناقابل اطلاق ہیں، اس عقیدے کی قدیم صورت کانٹ کے ہاں پائی جاتی ہے جس نے "محسوس" اور "معقول" عوالم میں امتیاز کیا ہے، حسی تجربے کی ظاہری دنیا میں اصول تعلیل عمیم الاطلاق اور کلیتہً صحیح ہے، یہاں آزادی محال ہے کیونکہ تجربی نوعیت طبعی نظام کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے لیکن انسان "معقول" یا اشیاء بانفاسہا کی دنیا کا باشندہ بھی ہے، اس اعلیٰ شہریت

کی وجہ سے وہ طبعی قانون اور ضرورت کا محکوم نہیں رہتا، مختصر یہ کہ اس تجربی دنیا میں ہم آزاد نہیں کیونکہ تمام محرکات، حسیات اور تصورات معین و مقرر ہوتے ہیں لیکن عقل کی اس ابدی دنیا میں ہماری آزادی اس شرط بلا قید زمان غیر معین انتخاب میں کام کرتی ہے۔[1]

اس قسم کی ثنویت میں جو فلسفیانہ مشکلات پیدا ہوتی ہیں، ان پر یہاں بحث نہیں ہوسکتی، ان سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی یہ اخلاقی حیثیت سے بھی غیر تشفی بخش رہتی ہے، اس میں آزادی اور اختیار کو بالآخر ایک ہی کر دیا جاتا ہے، اس کے علاوہ اس میں کسی اور تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہتی، پھر یہ اس واقعہ کو بھی ملحوظ نہیں رکھتی کہ ہمارا اخلاقی کردار اولاً تجربی دنیا میں ہوتا ہے، جہاں زمانی انتخابات اور ارضی تجربات ہوتے ہیں، انسان کا ذی عقل ہونا اور اس کا محض احساسی تجربات تک محدود نہ ہونا آزادی کے لئے ایک نہایت اہم واقعہ ضرور ہے، لیکن اس واقعہ پر آزادی کے عقیدے کو مبنی کرنا

---

[1] اسی موخر الذکر نقطۂ نظر سے کانٹ کو اختیاریت کا حامی کہا جاسکتا ہے، لیکن اس کے فکر کا ایک اور پہلو بھی ہے جس میں آزادی فرائض کے تصور کی مدد سے عقلی تعیین کے ہم معنی ہے، دیکھو نوٹ مندرجۂ اخلاقیات کے مابعد الطبیعیاتی عناصر کا دیباچہ (انگریزی ترجمہ از ایبٹ ص ۲۹۲، اس نوٹ میں صاف طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ آزادی کے مختلف درجے ہوتے ہیں، بلند ترین درجہ وہ ہے، جس پر فرائض کا تصور ہماری تعیین یا ہم کو مجبور کرتا ہے،

زمانۂ حال کی تصوریت کی بعض صورتوں میں بھی اسی طرح کی ثنویت بہ شکل عنصر پائی جاتی ہے اس کے مطابق نفسیات تمام ذہنی اعمال کو لازمی طور پر معین سمجھتی ہے، لیکن دقت یہ ہے کہ نفسیات کی تمام تاویلات عملی مقاصد کو پورا کرتی ہیں، اس لئے اخلاقیات کے لئے وہ صحیح نہیں، دیکھو میونسٹر برگ کی کتاب سائیکالوجی اینڈ لائف ص۹، و ص ۲۲۲-۲۲۱، اس دوطرفہ نظریے کے ایک اور مختلف بیان کے لئے دیکھو روائس کی کتاب دی سپرٹ آف موڈرن فلاسفی ص۴۲۴ - ص۴۲۸، نیز دی ورلڈ اینڈ دی انڈیوی جوئل سلسلۂ ثانی ص ۳۳۱-۲۲۳، (مصنف)

فطرتِ انسانی کے مختلف عناصر کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج پیدا کرنے سے بالکل مختلف ہے اسی طرح یہ اس انکار سے بھی مختلف ہے، کہ اعلیٰ عقلی زندگی ایک ایسے ذریعہ کی مالک ہو جس کی محض مدد سے وہ آزادی حاصل ہو سکتی ہے، جو ہمارے لئے ممکن ہے، علی تعیین کو ملزم قرار دیکر آزادی کو نجات دلوانے کی کوشش دراصل کسی اور راستے کو اختیار کرنے، اور اخلاقی زندگی کے منتظم اعمال سے بچنے کی کوشش ہے،

۳ - اختیاریت کی طبعی تاریخ

یہ بلاشبہہ صحیح ہے کہ عام غیر ناقدانہ خیال ہمیشہ اختیاریت کا حامی ہوتا ہے، اور یہ کہ جبریت اپنے موجودہ مرتبہ تک رفتہ رفتہ اور حکمی تفکر کی ترقی کی وجہ سے پہنچی ہے، لیکن سوال یہ ہو کہ اس واقعے کی توجیہ کیا ہوگی، ؟ اس سوال کا تفصیلی جواب تو یہاں ممکن نہیں لیکن تفکر انسانی کے بعض تاریخی پہلو ایسے ہیں، جن کی مدد سے ہماری سمجھ میں آسکتا ہے، کہ انسان کی باطنی زندگی کو عرصہ دراز تک کیوں لازمی تعیین کا استثنا اور شاید واحد استثنار سمجھا جاتا رہا، اس سلسلے میں قدرت کے متعلق ابتدائی انسان کا خیال اور حکمی تصوریت کی ترقی کی تاریخ خاص طور پر سبق آموز ہیں،

سب جانتے ہیں، کہ ابتدائی تفکر حیاتیت[1] کا قائل ہوتا ہے، یہ جاندار اور بے جان دنیا کو خود اپنی روح جیسی روحوں سے آباد کرتا ہے، یہ تمام فعلیت کو ایک ایسے شعور کا نتیجہ سمجھتا ہے، جو ان انفرادی اشیار میں متمکن ہے، جن سے وہ فعلیت صادر ہوتی ہے چشموں کا ابلنا، دریاؤں کا بہنا، سمندروں کی بیتاب حرکات، ہواؤں کا چلنا، درختوں کی زندگی، اور ان کا نشوونما، ان سب کو ایسی جاندار روحوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جن کے مشابہ روح خود انسان اپنے اندر پاتا ہے، لہٰذا ہر واقعہ اور حادثہ اتنا خود رَد اور خود مختار ہوتا ہے، جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا، ہوا جس طرف کو جاتی

[1] Animism

چلتی ہو، اس وقت تک قدرت کی یکسانیت کا تخیل پیدا نہیں ہوا تھا، جس طرح وحشی اپنے آپ کو ایسی چیز
اور ہیجانات کی وجہ سے کبھی یہ کام کرتا ہوا پاتا ہو اور کبھی وہ کام جن کی ابتدا اور معنوں کا اسکو علم نہیں
بالکل اسی طرح وہ قدرت کو متصور کرتا ہو، اس کے اعمال بھی اسی قدر ناقابلِ توجیہ ہوتے ہیں
میں بھی کسی ایسے اصولِ وحدت کا اتنا ہی فقدان ہوتا ہے، جن کی وجہ سے یہ سب ایک باہم
اور متوازن کل کی صورت اختیار کرتے ہیں، وحشی انسان کا مذہب اس طریقِ تفکر کی یادگار ہے فطرت
کی طاقتوں کی تسکین، اور ان کو مہربان بنانے کی کوشش ابتدائی مذہبی رسوم اور عبادات کی
مرکزی غایت ہے، اس غایت کے حصول کے لئے عبادت کرنے والا وہی طریقے اختیار کرتا ہے
جن کو وہ انسانی تعلقات میں مؤثر سمجھتا ہو، یہ بالکل وہی طریقے ہوتے ہیں، جن سے کوئی دوسرا
شخص خود اس کی مہربانی اور عنایت کو حاصل کر سکتا ہے، یعنی ہدایا، خوشامد اور محبت و عزت
کا اظہار،

لیکن مشاہدے اور تفکر کی ترقی کے ساتھ ساتھ فطرت میں عام اعمال اور یکسانیتوں کا
تخیل آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے، چنانچہ احساسی تجربے کی بے شمار اشیار کی ایک جماعت بنائی جاتی
ہے، اصطلاحات جو طبعًا منطقی توجیہ کے پیش رو ہوتے ہیں، بروئے کار آتے ہیں، اب ہوا اور
پانی خود مختار ہستیاں نہیں رہتے، بلکہ وہ کلی ہستیوں یا طاقتوں کا مظہر بن جاتے ہیں، غیر نامی
فطرت کی ناقابلیتِ حرکت اور اضافی ناقابلیتِ تغیر نے اس دنیا میں علّی توجیہ میں آسانی پیدا کی
چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ پتھر صرف اسی وقت حرکت کرتا ہے، جب اس پر کوئی طاقت عمل کرتی ہو
پانی بلندی کی طرف نہیں بہتا، بلکہ ہمیشہ پستی کی طرف رُخ کرتا ہے، لیکن درختوں اور جانداروں
کی زندگی اب بھی بہت پُراسرار رہتی ہے، درختوں میں انسان کو زندگی کا راز سادہ ترین
شکل میں دکھائی دیا، درخت ایک ننھے سے بیج سے پیدا ہو کر کارآمد اور خوبصورت شکل اختیار

کرتا ہے، بہ ظاہر یہ اصولِ ضرورت کا محکوم معلوم نہیں ہوتا، اور نہ اس پر عام قوانین کا اطلاق ہوتا ہے، اس کا نشو و نما ایسے پر اسرار طریقے سے ہوتا ہی جسکو وہ سمجھ نہیں سکتا، یہ نشو و نما مختلف اجزاء کے جمع ہونے سے نہیں ہوتا جیسے کہ پتھروں کے ڈھیر کا نشو و نما ہوتا ہے، بلکہ غذا کی تحلیل کے داخلی عمل سے ہوتا ہی اسی پُر اسراری کا احساس تھا، جسکی وجہ سے قدیم رومن ان دیوتاؤں کے سامنے عاجزی کرتا تھا، جو نشو و نما پانے والے درختوں کی زندگی کے نگران تھے،

عالمِ حیوانی اس سے بھی زیادہ پُر اسرار اور خود اسکی فطرت کے قریب تھا، بہائم اپنی یقینی جبلت اور پر زور فعلیت کی وجہ سے انسان کے قریب ترین رقیب تھے، یہ اکثر اپنے مکر و فریب سے انسان کو عاجز اور اپنی قوت سے اسکو مغلوب کرتے تھے، ان میں ایک قوت تھی جو کسی قانون کے تابع نہ تھی، بلکہ بہ ذاتِ خود قانون تھی، جو غیر مرئی داخلی اعمال کی وجہ سے بدلتی رہتی تھی، نہ کہ خارجی مجبوریوں کی وجہ سے فعلیت کے اس آلے کی باطنیت اور پیچیدگی، بالکل نا قابلِ توجیہ تھی، حیوان پرستی کا عام واقعہ اس امر کی شہادت ہی، کہ صدیوں تک انسان نے حیوانی کردار کو ایک راز سمجھا، جو احترام کے لائق تھے، نہ کہ توجیہ کے، تفکر کی اضافی پختگی کے بعد اسکی سمجھ میں آیا کہ حیوانی زندگی کے تمام عجائب معین مظاہر کے دائرے کے اندر واقع ہیں، اور یہ اصولِ تعلیل کے مستثنیات نہیں،

سب سے آخر میں انسان نے خود اپنی طرف توجہ کی، یہ صحیح ہی کہ انسانی بچے کی طرح نوعِ انسانی بھی عرصۂ دراز تک خارجی اشیاء کے ساتھ مشغول رہی لیکن بالآخر اس نے خود اپنی طرف توجہ کی، جوں جوں انسان خود اپنی ہستی، فطرت پر اپنے روز افزوں غلبے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے تعلقات، صداقت، حسن اور نیکی کی اپنی تحسین کے عجائب کو متحقق کرتا گیا، ویسے ہی وہ یہ بھی دریافت کرتا گیا، کہ وہ خود کائنات کے عجائب و اسرار کا سرتاج ہے، اب صرف ایک عالم رہ جاتا ہی، جس کی توجیہ وہ نہیں کر سکتا، یعنی وہ قلعہ جس میں اندھے اور بلا علت واقعات پناہ گزین ہیں، لیکن

سائنس نے اس قلعہ میں بھی رفتہ رفتہ دخل پالیا ہے۔ اس نے اپنی سلطنت کو آہستہ آہستہ اس کے پیچیدہ اور متنوع میدان تک پھیلا لیا ہے، اور اس کے مظاہر کو امتحان و توجیہ کے تابع بنالیا ہے، لازمی علاقے کا اصول وہ رہنما زنجیر رہا ہے، جس کی مدد سے انسان نے اپنے آپ کو آہستہ آہستہ غلطی اور توہم کی خطرناک بھول بھلیوں سے محفوظ کیا ہے، صرف ایک مثال لو اور ان مفید نتائج پر غور کرو جو ذہنی امراض کے واقعات پر علّی توجیہ کے اطلاق سے مترتب ہوئے، جنون کی تمام صورتیں اور بھوتوں کی ناقابلِ توجیہ دنیا سے نکال لیا گیا، اس طرح مجنونوں کو ناقابلِ بیان بے رحمیوں ... سے نجات ملی، علمی توجیہ کی ترقی کی وجہ سے سحر اور جادو اور دیگر توہمات معقول آدمیوں کیلئے کالعدم سے ہو گئے ہیں، اسکے علاوہ انسان کی اعلیٰ روحانی زندگی نے کسی قیاسی اور متلون صورت میں اپنا کشف نہیں کیا ہے، بلکہ اب یہ مقدم واقعات پر مبنی ہو گئی ہے، گذشتہ چند سالوں میں ایسے قوانین کو دریافت کرنے کی اہم کوشش ہوئی ہے، جو ان گہرے مذہبی تجربوں پر حکمراں ہیں، جو ابتک خصوصیت کیساتھ ناقابلِ توجیہ سمجھے جاتے تھے، لیکن بہرصورت ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ اگر علّی توجیہ کا کام پورا بھی ہوجائے تب بھی اسرار باقی ہی رہیں گے، ایک ننھے سے بیج کا بڑھنا، ہر ذرّے کا حرکت کرنا، اور شعوری زندگی کے تمام مدارج ان اسرار کی مثالیں ہیں، لیکن یہ اسرار ایسے ہیں، جو تحقیق کی دعوت دے رہے ہیں، یہ ناقابلِ علم نہیں کہ جن کی تحقیق ناممکن ہو، تمام واقعات کے مرتب تعاقبات میں اُن واقعات کے تعلقات کو سمجھنے سے ان کی عجائبیت اور ان کی قیمت میں کسی طرح کمی نہ آئے گی،

یہ اجمالی خاکہ ہے علمی علم کی دنیا کی ترقی کا، اس دنیا میں تمام واقعات لازمی طور پر متعین ہوتے ہیں، اس ترقی کی تاریخ ہی سے اختیاریت کی طبعی تاریخ بھی واضح ہو جاتی ہے، اختیاریت علمی تصورات کی ترقی میں سب سے آخری رکاوٹ ہے، بقول پروفیسر ہوک ... کہ تمام واقعات ان عوارض حالات سے معیّن تعلقات رکھتے ہیں، جو ان سے فوراً قبل موجود تھے، اب تمام

قابل منکرین کے ہاں لائق قبول ہے، اور اسکو یہ انسانی ارادوں کے سوا باقی تمام واقعات کے لئے صحیح مانتے ہیں، یہ بجا درست ہے کہ عمومی وضاحت و تعین اور عمومیت اطلاق برابر ترقی پر ہو، اور یہ ترقی انسانی ذہن کی ترقی، اور انسانی تجربے کی تنظیم و توسیع کا نتیجہ ہے، واقعات کے تمام شعبوں میں سے متفاوت طرق تفکر آہستہ آہستہ محو ہوئے ہیں یہاں تک کہ اب وہ ارادے کے پراسرار قلعے کے ماسوا ہر جگہ سے ناپید ہو گئے ہیں، باقی ہر مقام پر یہ عقیدہ اس قدر مضبوطی کیساتھ قائم ہو چکا ہے کہ بعض منکر تو اسکی ضد کو ناقابل تصور سمجھتے ہیں، اور بعضوں کا خیال ہے، کہ یہ ہمیشہ سے ناقابل تصور ہے، ہر عملی طریق عمل اس کو فرض کرتا ہے، اور سائنس کی ہر کامیابی اس کی تائید کرتی ہے، کیا یہ اندیشہ کہ سائنس کے طریقے کو تسلیم کرنے سے یہاں فساد پیدا ہوگا، اتنا ہی بے بنیاد نہیں جتنا کہ یہ عقیدہ کہ سائنس فطرت کے عجائب اور حسن کو تباہ کر دیتی ہے؟

۴ ۔ جبریت و اختیاریت کا مابہ الاشتراک

پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، کہ جبریت و اختیاریت دونوں، اخلاقی زندگی کے واقعات کی تاویل کی کوششیں ہیں، ہم یہانتک کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کسی نہ کسی معنوں میں آزادی کو اس زندگی میں بطور ایک عنصر کے تسلیم کرتے ہیں، حقیقی فرق ایک ایسے واقعے کی توجیہ کا ہے، جس پر دونوں متفق ہیں، اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ دونوں ابتدا ہی میں اس عام اور غیر ناقدانہ عقیدے سے انکار کرتے ہیں، کہ حسب خواہش عمل کرنے کی طاقت اور فطرت اور سوسائٹی میں بلا روک ٹوک اور اپنی خوشی کے مطابق کام کرنے کی قدرت کا نام آزادی ہے، ظاہر ہے کہ ایسی آزادی خیالی دنیا کے سوا، اور نہیں ملتی، فطرت پر اپنی تمام حکومت کے باوجود انسان کتنی ہی ایسی رکاوٹوں سے دوچار ہوتا ہے، جن کو وہ رفع نہیں کر سکتا، تھوڑی دیر کے غلبے کے بعد جلد ہی وہ فطرت کی قوتوں کے زبردست دیوتا کے سامنے اپنی جان قربان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اسی طرح سوسائٹی بھی اس

کی ذاتی آزادی کے لئے حدود قائم کرتی ہے، بعض اشخاص تو عمرانی ماحول کے ایسے غلام ہوتے ہیں کہ وہ کبھی بھی اس کی زنجیروں کو توڑ کر حقیقی انفرادی زندگی اختیار نہیں کر سکتے، پھر جب ہم اپنے باطن پر غور کرتے ہیں، تو ہم کو امکانی فعلیت کی ایسی حدود دکھائی دیتی ہیں، جو خود ہماری فطرت نے قائم کی ہیں، اور اس فطرت کو خود ہم نے منتخب نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی جڑیں خاندان اور قوم کی گذشتہ تاریخ میں راسخ ہیں، یہ یا وہ صنف شخصیت بننے کی خواہش تک موروثی میلانات کا نتیجہ ہوتی ہے، بقول میتھو آرنلڈ:-

ہمارے مقید ارادے خواہ مخواہ کڑھتے ہیں، اور دنیا پر غلبہ پانے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے تمام افعال ایسے شرائط کے ماتحت صادر ہوتے ہیں، جو ہمارے مقرر کردہ نہیں، ہم اسی زندگی میں پیدا ہوئے ہیں، اور یہی زندگی ہمارا سانچا ہے،

"زندگی میں پیدا ہوئے ہیں! انسان اپنے والدین سے پیدا ہوتا ہے، اور اُن کا خون بالکل اسی طرح سموتا ہے، جس طرح ان کا خون اس میں سمویا جاتا ہے، اس طرح ہر نیا شخص نیکی کی جڑیں مستقبل میں بہت دور تک پھیلاتا ہے،

"زندگی میں پیدا ہوئے ہیں! ہم یہاں اپنے ساتھ تعصبات لیکر آتے ہیں اور یہاں آنے کے بعد ہر وہ چیز ہم پر اثر کرتی ہے، جس کے قریب ہم جاتے ہیں، ہم کو اُن سُرُون کے پیچھے چلنا ہے، جنکو ہم خود نہیں نکالتے"

ان تمام واقعات کا اقرار اس قدر عام ہے کہ معقول اشخاص میں اس کے متعلق کوئی بحث نہیں ہوتی، اختیاریت کا حامی صفائی کیسا تھ تسلیم کرتا ہے، کہ غیر معین انتخاب کا میدان بہت تنگ ہے اور یہ کہ جبریت انسانی عمل کے بہت بڑے حصے پر بلا شرکت غیرے حکمراں ہے، اس کا دعویٰ بالآخر اس دعوے میں تحویل ہو جاتا ہے، کہ بعض مثالیں ایسی ملتی ہیں، جن میں ایک شخص دو متبادل طرق عمل

میں کسی ایک کو منتخب کر سکتا ہے، اور اس انتخاب میں وہ ذات کوئی اثر نہیں رکھتی، جو ماضی کی پیداوار ہے؛ لہذا انتخاب سے قبل اس ذات کا مکمل علم بھی مشاہدہ کرنے والے کو واقعی فیصلے کے اندازہ کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتا، اس کے برخلاف جبریت کا اصرار ہے، کہ نفس یہ انتخاب ذات کی سیرت پر منحصر ہے، اور ذات اپنی تمام قوتوں کو حاوی ہے، لہذا اس ذات کا مکمل علم ہر انتخاب کے فہم کو شامل ہے، اس مسئلے کی تنگی کی توضیح کے لئے فاعل کو ایک دائرے کے مرکز پر کھڑا ہوا فرض کرو، اس مرکز سے جو نصف قطر محیط کی طرف جاتے ہیں، وہ عمل کے راستوں کو ظاہر کرتے ہیں، اس دائرے کے اندر اور باہر کی قوتیں فاعل کی حرکات کی سمت کو معین کرتی ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا ایک راستے کو چھوڑ کر دوسرے کا انتخاب بھی معین ہوتا ہے؟ اطلاقی آزادی کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا،

پھر تدبر اور انتخاب بھی اس بحث کے دونوں فریقوں میں مسلّم ہیں، لیکن یہ معروف عام نفسیاتی عمل زیر بحث مسئلے کے لئے اس قدر اہم ہے، کہ اس کی مزید توضیح لازمی ہے، اگر یہ نام نہاد انتخاب شعوری تامل کا نتیجہ نہیں، بلکہ اُن جبلتوں اور ہیجانات کا نتیجہ ہے، جو ہم میں اندھا دھند کام کرتے ہیں، تو کوئی بحث پیدا ہی نہیں ہوتی، سب کو تسلیم ہے، کہ جن افعال کا سرچشمہ ان جبلتوں میں ہے، وہ موروثی جبلتوں اور خارجی محرکات کے تعامل سے معین ہوتے ہیں،

۵ - انتخاب کا طریقہ،

زیر غور اخلاقی انتخاب صرف دو یا زائد متخالف محرکات یعنی غایتوں کے تصورات اور ان کے لازمی جذبات کی موجودگی میں شعوری تامل کے وقت واقع ہوتا ہے؛ حقیقی معنوں میں شعوری انتخاب غایات کے تصورات کے ساتھ پیدا ہونے والے جذبات، دونوں کو شامل ہوتا ہے، یہی جذبات بعض اوقات عمل کا حقیقی محرک یعنی حرکت دینے والے "عناصر" کہلاتے ہیں، ان دونوں عناصر کی علٰحدگی ایک کاذب تجرید ہے، تمثّلی اور تأثری عناصر مختلف درجوں میں نمایاں ہوتے ہیں، ان میں سے کبھی ایک آگے ہوتا ہے، اور کبھی دوسرا،

لیکن اخلاقی فعل میں موجود دونوں ہوتے ہیں، مادی ہفاد ہوس بھی کبھی اندھی نہیں ہوتی، اس کا اندھا پن
کسی نہ کسی مُدرک غایت کا راستہ اختیار کرتا تھا، اس کے برخلاف ہمارا سرد ترین تصور بھی حیثیت کی آتش
گرمی ضرور پیدا کرتا ہے، کہ خود اپنے لئے دلچسپی اور توجہ حاصل کرے، عمل کا بہت بڑا حصہ تو بلا شبہ عادت
کے زیر نگرانی ہوتا ہے، ایک شخص کوشش کا راستہ یا حصول غایت کا ایک طریقہ انتخاب کرتا ہے، تو اس عادت
یا طریقے کی تفاصیل خود بہ خود پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن انتخاب کے حقیقی عمل میں وقفہ ضروری ہوتا ہے، یہ وقفہ بیا ہو
چھوٹا، اس وقفے میں امکانی انتخابات میں رہتے ہیں، اور ہم پر غلبہ پانے کے لئے اس درجہ کشش سے
باہمی مقابلہ کرتے ہیں، جو ان میں ہمارے لئے ہوتا ہے، اس کش مکش میں محرک کے زور کا اندازہ محض خارجی
معیار کے مطابق نہیں، بلکہ انتخاب کے وقت ذات کی حالت کی بنا پر ہونا چاہئے، یہی ذات ہر محرک کو اس کا مخصوص
درجۂ شدت عطا کرتی ہے، یا زیادہ صحت کے خیال سے یوں کہو کہ معلومہ محرک، جو من جملہ ان بہت سی فعلیتوں
کے ہے، جس سے مجموعی ذات مرکب ہوتی ہے، اپنی شدت کے لئے اس مجموعی ذات کا دست نگر ہوتا ہے۔

جبریت کے خلاف تمام تعصب کا بہت بڑا حصہ اس خیال کا نتیجہ ہے، کہ اس کی وجہ سے اخلاقی عامل
خارجی اور خود مختار قوتوں، یا تصورات کا شکار ہو جاتا ہے، لیکن اصلیت یہ ہے کہ اگر تمام خیالات عواطف
اور ترجیحات کو ذات کی تعیّنات سمجھا جائے، تو اصلی جبر خود جبری ہوتا ہے[1]، لہٰذا جو قوی محرک قائل جبریت
کے نزدیک، بالآخر ہم پر غلبہ پاتا ہے، وہ صرف وہ ہوتا ہے، جو ہم میں پایا جاتا ہے، یا جس کو ہم خود
بہت زیادہ قوی سمجھتے ہیں، نہ کہ وہ جو ایک بے غرض تماشائی کو بہت زیادہ دلکش دکھائی دیتا ہے،
ہو سکتا ہے کہ جو محرک ایک شخص کے لئے بہت زیادہ قوی اور شدید ہوتا ہے، وہ دوسرے کے لئے
کوئی دلکشی نہ رکھتا ہو، بلکہ یہاں تک ممکن ہے کہ دوسرا شخص اس کی وجہ سے سرد ہو جائے، اور اس کو
اس سے نفرت ہو جائے، بعض اوقات کہا جاتا ہے، کہ فلاں شخص نے کمزور تر محرک کے مطابق عمل کیا،

---

[1] Egery Determinism is Auto-Determinism.

اس قول کے واحد معنی یہ ہو سکتے ہیں، کہ اس شخص نے وہ راستہ منتخب کیا ہے، جو دوسروں کو بہت کم مرغوب ہے یا جس کو وہ خود، بعد کے تجربے کی روشنی میں بُرا اور احمقانہ سمجھتا ہے، قوی تر محرک کی فتح کی تردید اُن مثالوں سے بھی نہیں ہوتی، جن میں ایک فعل جو کسی شخص کی نفسیاتی خواہشات یا اس کے کسی طبعی ہیجان کے لئے دلکش ہے، کسی ایسے فرض کے مقابلے میں مسترد کر دیا جاتا ہے، جو مجوزہ تشفی کے مقابلے میں بہ ظاہر غیر دلکش بلکہ نفرت انگیز معلوم ہوتا ہے، ایسی مثالوں میں اخلاقی مطالبے کی شدت بعض اوقات تو غیر مخلل احساس فرض سے مطابقت کا نتیجہ ہوتی ہے، جس کی جڑیں جبلت اور عادت میں ہوتی ہیں، اور بعض اوقات ہماری مجموعی فطرت کے ظاہری تقاضوں اور ہماری زندگی کے مجموعی اغراض کے ساتھ اتفاق میں لیکن یہ خیال کہ ضعیف تر محرک قوی تر محرک پر غالب رہا، بعد میں سوچنے سے یہ معلوم کر کے غلط ثابت ہوتا ہے، کہ اس فعل کے صدور کے وقت ہماری تصدیق وسیرت، ہمارا مذاق اور میلان ایسے تھے کہ منتخبہ فعل فی الواقع ہم کو باقی تمام افعال کی بہ نسبت بہتر معلوم ہوا، اب ان تصدیق سیرت، مذاق اور میلان کے متعلق جنھوں نے ہمارے انتخاب کو معین کیا، کیا کہا جا سکتا ہے، کیا یہ اسباب ذات کی ایسی قوت کا اظہار ہیں، جس کے طریق اثبات وانکار سے عمل میں ایک ایسا عنصر داخل ہو جاتا ہے، جس کی کوئی علت نہیں؟ نہیں بلکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، ہم کو ماننا پڑتا ہے، کہ یہ اسباب ایسے نہیں، جو خود بخود پیدا ہوئے ہیں، اور جو ارادے کے کہنے پر نیست سے ہست ہوئے ہیں، فی الواقع یہ ذات کی مجموعی گذشتہ زندگی کا نتیجہ ہیں،

شعوری تأمل کی صورت میں جو انتخاب بھی ہوتا ہے، اس کی توجیہ سوائے اسکے اور کسی طرح نہیں ہو سکتی، کہ یہ مقدم اور تعیین کرنے والے محرک کا نتیجہ ہوتا ہے، کسی فعل کا "کیوں" لازماً ایک معین تعلق پر دلالت کرتا ہے، اگر کسی انسانی فعل کا "کیوں" نہ ہو، تو پھر وہ فعل ناقابلِ تصور اشیاء کی دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے، جبریت کا دعوی ہے کہ یہ سوال کہ اس شخص نے اس خاص طریقے سے کیوں عمل کیا؟ کبھی بھی احمقانہ سوال نہیں ہوتا، یہ ہو سکتا ہے، کہ کسی خاص مثال میں ہم کو اس کے جواب کا علم نہ ہو، وہ فرض کرتی ہے کہ

ہر نتیجے کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے، اس کے برعکس اختیاریت کا دعویٰ ہے، کہ ایسے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا، یہ اس وجہ سے نہیں کہ ہم لاعلم ہیں، بلکہ اس سبب سے کہ انسانی افعال لازماً علتوں کا نتیجہ نہیں ہوتے، اگر ہم اس سے سوال کریں کہ "اس شخص نے کیوں اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر فقیر کے لئے پیسہ نکالا؟ تو اس کا جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اس لئے کہ اس نے ایسا کیا..... اس کا مطلب قریب قریب یہ ہے، کہ چونکہ انسانی افعال "آزاد" ہوتے ہیں، لہٰذا ان کی کوئی علت نہیں ہوتی، اور ان کے صادر ہونے کی علت کی تلاش لاحاصل ہے"

اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ جس انتخاب کی کوئی بنیاد، یا تعیین کرنے والا محرک نہیں، وہ معقول انتخاب نہیں ہو سکتا، اور کیا ہم معقول انتخاب کو اس کے محرک کا نتیجہ کہنے پر اسی طرح مجبور نہیں ہیں کہ بلیرڈ کے متحرک گیند کو اس گیند کی علت کہنے پر، جس سے یہ جا کر ٹکراتی ہے، اگر ہم انسانی فعل کے "کیوں" کو ترک کرنے اور اس کو اتفاق اور ناقابلیت تصور کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں، تو ہم کو اس پر کسی نہ کسی اصول تعیین کا اطلاق کرنا ہی پڑے گا، اس پر بحث کرنے کی میرے نزدیک ضرورت ہی نہیں کہ انسانوں کے عمل پر حکم لگانے میں ہم ان کے اعمال کو کسی نہ کسی علت کا نتیجہ سمجھتے ہیں،

لیکن اختیاریت کا وکیل فوراً جواب دیتا ہے، کہ "تم خود اپنے منہ سے جبریت کی تردید کر رہے ہو، تم کہتے ہو کہ ذات اپنے محرکات کی تقویت کرتی ہے، اور ان ہی محرکات کے مطابق ان کا انتخاب کرتی ہے، اختیاریت سے میری مراد یہ نہیں کہ ایک فعل کی کوئی علت ہی نہیں، بلکہ یہ کہ ذات اس کو خود اپنی ملی توانائی سے پیدا کرتی ہے، اس طرح یہ تمام بحث ذات، اس کی ماہیت اور اس کے مبدء پر ختم ہوتی ہے،

(باقی)

سیرت عمر بن عبد العزیز

حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ اموی کے سوانح حیات اور انکے مجددانہ کارنامے، طبع دوم، قیمت ہے، ضخامت ۱۹۰ صفحے۔ "منیجر"

تذکرۂ طاہر

یعنے

سوانح خود نوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خان طاہر مرحوم

(۳)

امتحان مدارس ریاست کا راقم الحروف سے تعلق، نکاح ثانی کے تقریباً دو سال کے بعد رئیسۂ عالیہ نے میرے خاندان کی علمی عظمت وحیثیت کو مدنظر رکھکر باوجود عدم قابلیت سوم ذیقعدہ ۱۳۰۱ھ کو اولاً طلبۂ مدارس ریاست کے سالانہ امتحان لینے کا حکم میرے نام صادر فرماکر شرف خاص بخشا،

نگرانی مدرسۂ جہانگیری بعد ازاں چہارم ربیع الاول ۱۳۰۲ھ کو مدرسۂ جہانگیری کا انتظام اور اسکی نگرانی مجھ کو تفویض فرمائی، یہ مدرسہ تعلیم قرآن مجید کے لئے یکم صفر ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۲۹۹ فصلی سے رئیسۂ عالیہ نے قائم کیا تھا، جب اس کا انتظام میرے سپرد ہوا، تو میں نے رئیسۂ عالیہ سے عرض کرکے مولانا مولوی ابو الخیرات سید احمد صاحب دہلوی مرحوم کو مہتمم مدرسۂ جہانگیری مقرر کرایا، مولینائے ممدوح علم ریاضی کے ایک مستند زبردست عالم تھے، ساتھ ہی اس کے یکم رجب ۱۳۰۲ھ سے مدرسۂ مذکور میں میں نے تعلیم قرآن کے ساتھ عربی وفارسی تعلیم کا بھی اضافہ کیا، اسلئے کہ بغیر تعلیم عربی وفارسی کے قرآن کریم کی تعلیم سے جو مقصد تھا، وہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا،

نگرانی مدرسۂ صدیقی والاجاہ مرحوم نے یتیم اطفال کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جو مدرسۂ صدیقی کے نام سے مشہور تھا، رئیسۂ عالیہ نے ان کی وفات کے بعد یکم ذی قعدہ ۱۳۰۲ھ سے اسکو

مدارسِ ریاست میں شامل کر لیا تھا، ہیزدہم ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ سے رئیسۂ عالیہ نے اس کا انتظام بھی میرے سپرد فرما کر مزید قدر افزائی فرمائی، یہ مدرسہ والاجاہ مرحوم کے عہد میں مکان پائگاہ متصل نور محل میں قائم تھا، رئیسۂ عالیہ نے ان کی وفات کے بعد جب ان کا شاندار حجرۂ مزار بصرفِ کثیر تعمیر کرایا، تو بست ودوم شوال ۱۳۱۳ھ کو ایک فرمان رئیسۂ عالیہ کا میرے نام اس مضمون کا شرف صدور لایا، کہ چونکہ نواب صاحب بہادر مرحوم کی عزیز ترین زندگی کا بیش بہا حصہ خدمتِ اسلام نشر علوم کتاب وسنت میں بسر ہوا ہے، اور ان کو شغل واذکارِ کتاب وسنت سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ تھی، اسلئے مدرسۂ صدیقی مزارِ والاجاہ مرحوم کے عماراتِ ملحقہ میں (جو خاص اسی مقصد سے تعمیر ہوئی ہیں) منتقل کر دیا جائے، تاکہ قرآن وحدیث کے درس وتدریس کا ثواب علی الاتصال پہونچتا رہے، اور اطفال یتیم کے قرآن خوانی کی آواز سے ان کی روح کو راحت ومسرت حاصل ہوتی رہے، چنانچہ اس حکم کی اسی وقت تعمیل کیگئی، اور وہ مدرسۂ مزارِ والاجاہ مرحوم کی عماراتِ ملحقہ میں منتقل کر دیا گیا،

عمارت مذکور پر حسب ذیل کتبہ کندہ ہے،

از وفاتِ امیر والاجاہ	در تب وتاب یک جہاں افتاد
بر مزارش نگاشت کلکِ قضا	تفرجنت نشیمن او باد،

مررشتۂ تعلیمات ریاست کی افسری اور تمام مدارس ریاست کی نگرانی، اس واقعہ کے تقریباً ڈیڑھ دو برس کے بعد جب رئیسۂ عالیہ سفر شملہ وپنجاب وغیرہ سے مراجعت فرمائے بھوپال ہوئیں، تو انھوں نے بست ودوم شعبان ۱۳۱۵ھ میں مجکو تمام مدارسِ ریاست اور مفصلات کا افسر اعلیٰ یعنی آنریری ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن مقرر فرمایا،

مدارس ریاست کی عام حالت جس وقت میں نے مدارسِ شہر ومفصلاتِ ریاست کا چارج لیا، اس وقت مدارسِ ریاست کی حالت حسب ذیل تھی،

شہر خاص بھوپال میں سات مدارس تعلیم قرآن مجید و عربی و فارسی و ہندی و انگریزی کے قائم تھے اُن کے نام یہ ہیں، مدرسۂ سلیمانی، مدرسۂ جہانگیری، مدرسۂ صدیقی، مدرسۂ وقفی، مدرسۂ جہانگیر آباد، مدرسۂ انگریزی، مدرسۂ ہندی، مفصلات میں فارسی و اردو و ہندی کے اکثر مدارس اس تفصیل کے ساتھ قائم تھے، ضلع مشرق میں ۱۹، ضلع مغرب میں ۱۴، ضلع جنوب میں ۱۲، ضلع شمال میں ۱۰، مگر عجیب بات یہ تھی، کہ مدارس ریاست کو قائم ہوئے ایک مدت دراز گذر چکی تھی، اور بیش قرار رقم تعلیمات و وظائف میں صرف ہوتی تھی، مگر کبھی کوئی طالب علم معمولی لیاقت کا بھی جو فارغ التحصیل ہو کر میرے عہدۂ ڈائرکٹری تک کسی مدرسہ سے نکلا ہو دیکھا اور سنا نہیں گیا، نہ ریاست میں میرے ڈائرکٹری سے قبل کوئی مستقل باضابطہ سررشتہ تعلیمات قائم تھا، جو تمام مدارس کی انتظامی اور تعلیمی نگرانی اور اصلاح کرتا، بلکہ صورت یہ تھی کہ ہر ایک مدرسہ کے متعلق ایک مختصر سا عملہ رہا کرتا تھا، جو اس مدرسہ کے مہتمم کے ماتحت ہوتا تھا، اور ہر مدرسہ کا مہتمم بجائے خود جدا جدا ایک مختار کل افسر کی حیثیت رکھتا تھا، ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار نہ تھا اور نہ عام نگرانی کسی افسر خاص کے متعلق تھی،

نصاب تعلیم | یہی حال نصاب تعلیم کا تھا، ہر ایک مہتمم مدرسہ نے اپنی پسند اور مذاق طبعی کے موافق بے ضابطہ ایک معمولی نصاب تعلیم درس نظامیہ کے طریق پر بنا رکھا تھا، مگر اس کی بھی پوری پابندی نہیں کیجاتی تھی، شاید ابتدائی درجہ کے طلبہ اس کی پابندی کرتے ہوں، مگر عام طور پر ہر ایک طالب علم جس کتاب کو پسند کرتا، یا جس کتاب کو استاد مناسب سمجھتا، اس کو پڑھایا کرتا تھا، بجز معمولی دیکھ بھال کے انضباط اوقات کا بھی کوئی باضابطہ انتظام اور خاص رجسٹر نہ تھا،

مدرسۂ سلیمانی ایک جامعہ کلیہ کی حیثیت رکھتا تھا، اس میں بھی محض ضابطہ پرسی کے طریقہ پر ایک دستور العمل اور نصاب تعلیم قدیم سے چلا آتا تھا، مگر ان پر کبھی پورے طور پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی،

امتحان کا کوئی خاص انتظام تھا | طلبہ کے امتحانات کی یہ صورت تھی کہ مہتمان مدارس بطور خود زبانی امتحان لے لیا کرتے تھے، تحریری امتحان کا کوئی قاعدہ جاری نہ تھا، نہ کوئی رجسٹر خاص امتحان کا رہا کرتا تھا، نہ درجات امتحان کے اعتبار سے طلبہ کو ترقی دی جاتی تھی، نہ انکے فیل ہونے پر انکا نام خارج کیا جاتا تھا،

وظائف کی حالت | جو وظائف طلبہ کو دیئے جاتے تھے وہ محض مہتمان مدارس اور زیادہ تر ارباب رسوخ کی سفارش پر مقرر کر دیئے جاتے تھے، طلبہ کی کامیابی یا ناکامی یا اہلیت کو ان میں کوئی دخل نہ ہوتا تھا، نہ انکی عمر اور مدت تعلیم کا لحاظ رکھا جاتا تھا،

کوئی کتبخانہ ریاست کے نام سے قائم نہ تھا | ریاست میں کوئی پبلک لائبریری یعنی کتب خانہ ایسا موجود نہ تھا، جو ریاست کے جانب سے رفاہ عام کی غرض سے قائم ہوا ہو، ہر مدرسہ میں متفرق طور پر کم و بیش مطبوعہ اور غیر مطبوعہ درسی اور غیر درسی کتابیں رہا کرتی تھیں، انہی کو کتب خانہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، ایک مدرسہ کا طالب علم دوسرے مدرسہ کی موجودہ کتابوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا تھا، نہ شائقین علم کو ان سے مستفید ہونے کا موقع ملتا تھا، وہ کتابیں نمایشی طور پر زینت مدرسہ تصور کی جاتی تھیں، اور صرف مدرسین اور مہتمان مدارس کے وقت گذاری کیلئے ایک دلچسپ مشغلہ کا کام دیتی تھیں،

انتظام جدید :-

محکمۂ سررشتہ تعلیمات کا اجرا | میں نے سب سے پہلے مدارس شہر بھوپال کے علاحدہ دفتر کو یکجا کر کے ایک باضابطہ مستقل محکمۂ سررشتۂ تعلیمات ریاست کی تشکیل کی، اور ہر ایک مہتمم مدرسہ کو اسکے مدرسہ کا مدرس اعلیٰ قرار دیا، تاکہ وہ درجۂ تکمیل کے طلبہ کو درس دیا کرے، اس جدید انتظام اور اجرائے سررشتۂ تعلیمات کے وقت اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا، کہ کوئی شخص اہل عملہ میں سے بلا وجہ یا قصور محض انتظاماً موقوف

یا جائے،

اور ماہرین تعلیم کی مجلس شوریٰ | اسکے ساتھ ہی میں نے رئیسہ عالیہ سے اجازت لے کر دہم ربیع الاول ۱۳۲۱ھ
ے، ایک مجلس شوریٰ انجمن نظارۃ المعارف العمومیہ کے نام سے قائم کی، جس کا کام ضوابط و قواعد سررشتہ تعلیم
از سرنو ترتیب و تنظیم عمل میں لانا تھا، علماے ریاست و مشاہیر علماے ہند کے مشورہ سے ابتدائی و اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کیلئے
ے جدید نصاب جاری کیا گیا، مجوزین نصاب کے سلسلہ میں حضرت شمس العلما، علامہ شبلی رح اور مولینا مولوی
ابراہیم صاحب آروی رح کا اسم گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، انجمن کے سالانہ اجلاس کم سے کم دو
بہ ہوا کرتے تھے، دوازدہم اکتوبر ۱۹۰۳ء میں اس انجمن کی پہلی روداد اردو اور انگریزی میں چھپ کر
ائع ہوئی،

اب تعلیم کا اجرا، | کمل تعلیم کی مدت نو سال قرار دیگئی، اور نصاب تعلیم کو چار درجوں پر تقسیم کیا گیا، درجۂ
یہ، درجہ رشدیہ، درجہ امدادیہ، درجہ تکمیلیہ،

نقشہ ہاے انضباط اوقات جاری کئے گئے، اور ان کی جانچ کے لئے انسپکٹروں کا تقرر عمل میں آیا،

اعد امتحان | ماہواری امتحان طلبہ کا امتحان مدارس کے متعلق رکھا گیا، سالانہ امتحانات کے لئے حکم جاری
کیا گیا، کہ تحریری امتحان ہو، پرچہائے امتحان نہایت احتیاط اور رازداری کے ساتھ مختلف اور غیر متعلق علمائے
یاست سے مرتب کرائے جاتے تھے، اور جیسا کہ قاعدہ ہے، وہ سربستہ لفافوں میں عین امتحان کے
قت طلبا، کو تقسیم کر دیئے جاتے تھے، تمام طلبہ ریاست کا امتحان محکمۂ سررشتۂ تعلیمات کے مکان میں جو
ن سرکاری کے متصل واقع تھا لیا جاتا تھا، اور خاص خاص اہلِ علم جن کو مدارس ریاست سے کوئی تعلق
ہ ہوتا تھا، وہ نگرانی کے لئے متعین کئے جاتے تھے، بعد ختم امتحان حسب قاعدہ رزلٹ طبع کرا کر بغرض
اطلاع مہتممان مدارس کے پاس بھیجدیا جاتا تھا،

قواعد تقسیم وظائف، | طلبہ چونکہ ارباب رسوخ کی سفارش پر مدارس میں داخل کئے جاتے تھے، اس لئے

ان کے وظائف ابتدا، سے بلا تقسیم درجات چلے آتے تھے، اور مدت تعلیم مقرر نہ ہونے کے سبب وہ بجائے نام سلسلۂ تعلیم جاری رکھکر سالہا سال وظیفہ پاتے رہتے تھے، جب میں نے وظائف کا باقاعدہ انتظام اور ان کو درجات تعلیم کے لحاظ سے تقسیم کرنا چاہا، تو مجھ کو سخت دشواری پیش آئی، رئیسۂ عالیہ چونکہ ایک عالی صفات خدا ترس اور فیاض رئیسہ تھیں، اسلئے وہ طلبہ کے وظائف کو کم کرنا یا بند کرنا پسند نہیں کرتی تھیں، اور اس کو ایک قسم کی خیرات و مبرات تصور فرماتی تھیں مگر مشکل یہ تھی کہ اگر وظائف بدستور سابق جاری رکھے جاتے تو تعلیمی مقاصد کو سخت نقصان پہنچتا، ناچار میں نے رئیسۂ عالیہ کی مرضی کو مدنظر رکھکر یہ حکم جاری کیا، کہ جو طلبہ جس طریقہ پر وظیفہ پا رہے ہیں، وہ بدستور پاتے رہیں، البتہ درجات تعلیم کے لحاظ سے ان کی درجہ وار تقسیم کر دیجائے، اور جب وہ اپنی مدت تعلیم پوری کر لیں، اور بجائے اون کے نئے طلبہ داخل ہوں، تو اون کے وظائف ابتدار سے اُن کی اہلیت دیکھ کر مطابق تعداد مندرجۂ نقشہ مجریہ وظائف مقرر کی جائے، اور درجات کا میابی کے موافق اون میں اضافہ کیا جائے،

مدارس کے داخل و مخارج۔ مدارس کی آمدنی وصرف ماہواری کا تعلق ابتدار سے مہتمان مدارس کے ہاتھ میں تھا، وہی خزانہ عامرۂ ریاست سے آمدنی وصول کرتے تھے، اور وہی صرف کیا کرتے تھے، میں نے آمدنی وصرف کا تعلق بدستور مہتمان مدارس سے قائم رکھا، اور تمام مدارس ریاست کا تعلیمی سالانہ بجٹ قرار دیکر یہ حکم جاری کیا کہ مہتمان مدارس بدستور اپنے طور پر ماہواری آمدنی مطابق تجویز سرشتہ تعلیمات کے اپنے دستخطوں سے وصول کرتے رہیں، اور مصارف معینہ میں ان کو خرچ کرتے رہیں، اور تمام حسابات ماہواری و سالانہ جانچ کی غرض سے محکمۂ سرشتہ تعلیمات میں ارسال کرتے رہیں، بعد مصارف جو زر توفیر بچے وہ ریاست کے خزانہ عامرہ میں داخل کرتے رہیں،

ایک مستقل کتبخانہ ریاست قائم کیا گیا۔ ساتھ ہی اس کے میں نے رئیسۂ عالیہ کی منظوری سے منجانب ریاست

ایک پبلک لائبریری کی بنیاڈالی، اوراس کا نام کتب خانہ شاہجہانی تجویز کیا، اور تمام مدارس ریاست سے مطبوعہ اور قلمی نوادر کتب فراہم کرکے اوران کو ایک خاص ترتیب وتہذیب کیساتھ نہایت خوشنما الماریوں میں سجاکر بروقت افتتاح رئیسۂ عالیہ سے یہ درخواست کی کہ وہ اپنے کتب خانہ محل سرکاری کی نادراور عزیزالوجود کتابیں اس کتب خانہ کیلئے مرحمت فرمائیں، تاکہ طلبۂ مدارس وعام باشندگان ریاست اور بیرونی ممالک کے علماء اور سیاحان شایق علم کو یکساں اس سرچشمۂ علم سے اپنی تشنگی بجھانے کا موقع ملے، رئیسۂ عالیہ نے فیاض دلی کے ساتھ یہ درخواست منظور فرمائی، اس طرح ایک بہترین بیت علم و حکمت ریاست میں قائم ہوگیا،

رئیسۂ عالیہ کے جانب سے مزید مراعات وعزت افزائی،

دوئم ذیقعدہ ۱۳۱۲ھ کو رئیسۂ عالیہ نے عزت افزائی اورسہولت کار کی نظر سے تمام مدارس ریاست کے زرتوفیر صرف کرنے کا مجکو اپنی ذاتی رائے وتجویز سے مجاز قرار دیا، اور مہتمم خزانۂ ریاست کو اس کے مجرا دینے کی ہدایت فرمائی، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں نے کبھی ایک حبہ بھی اپنی رائے یا حکم سے صرف نہیں کیا،

حکم تحریر مراسلہ بنام مہتممان محکمات وناظمان ہرچہار اضلاع،

میرے زمانۂ ڈائرکٹری کے شروع میں مہتممان محکمات وناظمان ہرچہار اضلاع مطابق دستور قدیم بروقت ضرورت احکام لکھ کر سررشتۂ تعلیمات میں بھیجا کرتے تھے، رئیسۂ عالیہ نے پنجم رجب ۱۳۱۶ھ کو حکم صادر فرمایا، کہ تمام مہتممان محکمات ریاست وناظمان ہرچہار اضلاع بجائے احکام مراسلہ لکھ کر افسر اعلیٰ محکمۂ تعلیمات کے نام ارسال کیا کریں،

نہایت افسوس ہے کہ انتظام مدارس ریاست ومفصلات اور نظم تعلیم جس بلند معیار اور اعلیٰ نصب العین کو ملحوظ رکھکر شروع کیا گیا تھا، ہنوز اس کے سنگ بنیاد ہی رکھنے کی نوبت آئی تھی، کہ انقلاب روزگار کے ظالمانہ دست بردا اور بیدردانہ غارتگری نے اس کے مرکز ثقل ہی کو متزلزل کردیا، یعنی حضور رئیسۂ عالیہ خلد مکان نے بست وہشتم صفر ۱۳۱۹ھ کو آغوش لحد میں استراحت فرمائی،

(غفر اللہ لہا و برد اللہ مضجعہا) ظاہر ہے کہ جب وہ ذات قدسی صفات جو سرگرمی عمل کی محرک اعظم تھی، وہی نہیں رہی، تو تمام جذبات قلبی و احساسات دلی ایک آہ سرد کے ساتھ ٹھنڈے پڑ گئے طبیعت کی افسردگی اور دماغ کی پراگندگی سے مجبور ہو کر اور اسوقت کے فضاے ملکی سے متاثر ہو کر مجھ کو انتظام مدارس اور محکمہ سررشتہ تعلیمات کی خدمت سے سبکدوش ہونے کا خیال پیدا ہوا، اور میں نے اپنی علٰحدگی کی باضابطہ درخواست علیا حضرت سرکار عالیہ کے حضور میں پیش کر دی اور حسب منشاے سرکار عالیہ مدرسۂ صدیقی کو عمارات ملحقہ مزار والاجاہ مرحوم سے اٹھا کر مدرسۂ جہانگیری میں شامل و منتقل کر دیا، حکم سرکاری پہنچنے کے بعد پنجم جمادی الاول ۱۹۰۱ء کو میں نے عہدۂ ڈائرکٹری سے مستعفی ہو کر محکمہ سررشتہ تعلیمات کا انتظام نواب عبد الجبار خاں صاحب بہادر مرحوم سابق وزیر ریاست بھوپال کو تفویض کر دیا۔

یہاں تک تو اُن سرسری واقعات کا ذکر تھا، جن کا مدارج دنیوی اور دولت و مال و جاہ سے تعلق ہے، اور جس کی خوش آیند آرزؤں اور تمناؤں میں ارباب دنیا طلب آغاز شعور سے اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک ہر قسم کے مصائب و متاعب برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، اور اسکی راہ طلب میں اپنا پسینہ اور خون تک بہانے میں دریغ نہیں کرتے، مگر ساتھ ہی اسکا بھی ہے کہ مستعار کے مختلف لمحات دوادار مشغول بدو شعور و عنفوان شباب کے گذشتہ واقعات پر بھی ایک نظر ڈالنی ضروری ہے تاکہ فطرت انسانی کے طبعی جذبات اور حیات مادی کے پراسرار حالات پر کچھ نہ کچھ اثر پڑے وما الحیوٰۃ الدنیا الا لعب و لھو کی اصل حقیقت اور قدر و قیمت بھی واضح اور منکشف ہو جائے، جو ارباب شہود و حق آگاہ کی نگاہ فطرت شناس میں حقیقت بین میں ایک خندۂ گل، سایۂ ابر اور موج سراب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، ؎

چو گل در باغ ہستی فرصت یکخندہ میباشد	نسیم صبح می گوید کہ بر بندید محملہا
زمیں شد یم چہ شد آسماں شدیم چہ شد	بچشم خلق سبک یا گراں شدیم چہ شد
بہ ہیچ رنگ درین بوستاں قرارے نیست	تو گر بہار شدی ما خزاں شدیم چہ شد (باقی)

حیدر آباد دکن

کے

اردو اخبارات اور رسائل

از

جناب سید تمکین صاحب کاظمی منشی فاضل، ایف آر، اے ایس، ام آر اے، ایس

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اردو کی ایجاد، اصلاح اور خدمت تینوں کے سہرے حیدر آباد دکن کے سر نظر آتے ہیں، دنیا جانتی ہے کہ وہ زبان جو آج اردو کہلاتی ہے، اسی دکنی زبان کا نقش ثانی ہے جو بقول

اک بات بچھر سی بہ زبانِ دکنی تھی

امیر خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے پہلے کا دکنی منظوم کلام منظرِ عام پر آچکا ہے، اور نثر کے فقرے اور جملے بیسیوں کتابوں میں نظر آتے ہیں، اسی طرح اردو میں سب سے پہلے اپنے دیوان کو مرتب اور مکمل کرنے کا فخر ولی کو حاصل ہے، یہ لطیفہ بھی قابلِ غور ہے، کہ نہ صرف اردو کا پہلا شاعر (ولی) دکنی تھا بلکہ اردو کی پہلی شاعرہ حضرت محمد قادری خاکی (۱۱۹۲ھ) کی اہلیہ بھی دکنی ہی تھیں، اور اردو کی سب سے پہلی شاعرہ جس نے اپنا دیوان مرتب اور مدون کیا، ماہ لقا بائی چندا دکنی تھی، اور ہندوستانی خاتون کی اولین تصنیف جو متحف برطانیہ میں داخل ہوئی وہ دیوان چندا ہی تھا بعض حضرات کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ تراجم کی ابتدا بھی دکن ہی سے ہوئی، گلستان اور بوستان اور رباعیاتِ عمر خیام اور بعض قصص اور مثنویوں کا ترجمہ منظوم اور منثور اس وقت دکن میں ہوا ہے، جبکہ ہندوستان یا شمالی ہند میں اردو اچھی طرح بولی بھی نہ جاتی تھی، اسی طرح انگریزی کی فنی ہیئت، طب اور تاریخ کی اہم کتابوں کا ترجمہ دکن

میں ان دنوں ہوا ہے، جب کہ ہندوستان میں کسی کو ترجمہ کا خیال تک نہ تھا، غور کیجئے کہ وہی بات جو کبھی اس زبان دکنی تھی آج منجھ کر اتنی صاف ہو گئی ہے کہ دنیا بھر کے علوم و فنون اس زبان میں منتقل ہو گئے ہیں، اور ایک یونیورسٹی اسی زبان کی قائم ہو گئی ہے، معاف کیجئے کہیں آپ یہ خیال نہ کریں کہ میں عصبیت میں مبتلا ہو کر اس طرح لکھ رہا ہوں، بلکہ واقعات، حالات اور مواد اس کے شاہد ہیں،

یہی حال اردو رسائل کا بھی ہے، افسوس ہے کہ اب تک کسی نے حیدرآباد کی صحافتی خدمات پر نظر نہیں ڈالی، عام طور پر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سب سے پہلا رسالہ دلگداز تھا، جسے مولینا شرر نے جاری کیا، غالباً یہ غلط فہمی ادیب الہ آباد کی پھیلائی ہوئی ہے، ادیب بابتہ جنوری ۱۹۱۲ء کے صفحہ ۴۲ پر اخبار اور اخبار نگاری کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس پر فٹ نوٹ دیتے ہوئے اڈیٹر نے لکھا ہے،

"۱۸۸۷ء میں سب سے پہلا رسالہ دلگداز مولینا عبدالحلیم شرر نے نکالا تھا، اسلئے اوّلیت کا فخر ممدوح کو ہے"،

اڈیٹر ادیب کو سخت مغالطہ ہوا ہے، دلگداز کو کسی طرح بھی اوّلیت کا فخر حاصل نہیں ہو سکتا، ہندوستان میں ۱۸۳۳ء سے اخبارات اور رسائل کی اشاعت شروع ہو چکی تھی، ۱۸۳۷ء میں بنارس سے خیر خواہ ہند نامی ایک اخبار جاری ہوا، ۱۸۴۶ء میں اسی نام کا ایک اخبار مرزاپور سے جاری ہوا، ۱۸۴۹ء میں بنارس سے مرأت العلوم کا اجرا ہوا، ۱۸۵۶ء میں سیالکوٹ سے معلم العلماء، آگرہ سے معدن القوانین، اور سیالکوٹ ہی سے نور علی نور نامی اخبار جاری ہوا، مگر کوئی ماہوار رسالہ اس وقت تک ہندوستان سے جاری نہیں ہوا تھا، سب سے پہلا ماہوار رسالہ جو جاری ہوا، وہ "رسالہ طبابت" تھا جو حیدرآباد دکن سے ۱۸۵۸ء میں جاری ہوا، یہ رسالہ گویا دلگداز سے انتیس سال پہلے جاری ہوا، یہ ایک فنی طبی رسالہ تھا جس میں ڈاکٹری اور یونانی طب پر مضامین شائع ہوتے تھے، یہ رسالہ مدرسہ

طبیہ حیدرآباد دکن کی زیر نگرانی اجرا ہوا تھا، طبیب اپنے تجربات اور عمل جراحی کے نتائج اس میں لکھا کرتے تھے، اور مفید طبی معلومات بھی بہم پہنچائی جاتی تھیں، یہ رسالہ مدت تک جاری رہا ہے، اسکی دوسری جلد کے پہلے نمبر میں سے جو اگست ۱۸۶۲ء صفر ۱۲۷۹ھ میں شائع ہوا ہے، ایک حصہ نمونۃً نقل کیا جاتا ہے،

"ایک عورت قوم سے اہل اسلام کے کہ عمر اسکی قریب پچپن سال کی، ساکن قصبہ بیڑ کی، نام اس کا پاپا بی غرہ شہر شوال المکرم ۱۲۷۸ھ کو نزدیک اس فدوی کے آئی، اور ایسا بیان کی کہ یہ رسولی مجھے تین سال سے ہے، اور دن بدن ترقی پر ہے، القصہ اس فدوی نے اوّل اس بیمار کو بیہوش کرکے یومرل آرٹری ٹرنکٹ سے باندھ کر ایک کیپسل سے بیضاوی شکل کے مانند چیر کر پوست کو تشریح کر کر اس رسولی کو امانت نکال لیا، اور ذرا بھی مادہ اس رسولی کا رہنے نہ دیا، بعد از آرٹری وغیرہ کو باندھ کر لب زخم کو ملا کر ٹانکے دے کر اوڑھی زنک پلاسٹر کے تسمے لگا دیا، اور انٹی فلوجسٹک ٹریٹمنٹ کے حال پر رکھا، چند روز میں عنایت الٰہی سے بیمار درست ہوگئی، اور وہ رسولی دو اونس پانچ ڈرام تھی"

(فلینگ)

اسی رسالہ کی جلد سوم نمبر ۴ بابت ماہ رجب ۱۲۷۹ھ کے ایک مضمون کا ٹکڑا ملاحظہ کیجئے،

"فاسفورس ہیڈروجن، یہ بھی ایک شفاف اور بیرنگ گاس ہے، اور حیوانی مادوں کی سڑاوٹ سے پیدا ہوتا ہے، اور اس کی بو ایسی ہے جیسا کہ مچھلی کی بو ہے، یہ گاس بھی انسان کی جان کو اور صحت کو بہت مضر ہے، اور اہل کیمیا اسکو ایسی پاکی سے تیار کر سکتے ہیں کہ تیار ہوتے ہی فوراً سلگ کر جل جاتا ہے، (دیکھو دکن میں اردو طبع دوم ص۱۶۱)

اردو کا یہ سب سے پہلا ماہوار رسالہ تقریباً آٹھ سال تک جاری رہا ہے، اسکے بعد ایک نرا علمی ادبی رسالہ مخزن الفوائد کے نام سے ۱۸۷۴ء ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد سے جاری ہوا، جسکے اڈیٹر مولوی سید حسین

رامی (نواب عماد الملک مرحوم) تھے، اس میں علمی ادبی، اخلاقی، تاریخی، بہترین مضامین شائع ہوتے
، اور اسکی طباعت دار الطبع سرکار عالی میں ہوتی تھی، اس رسالے میں سید حسین بلگرامی کے علاوہ
باقر علی خان بہادر، مولوی مشتاق حسین، مرزا قربان علی سالک، آغا مرزا نواب سرور جنگ مرحوم
مہدی علی (محسن الملک مرحوم) وغیرہ مضامین لکھا کرتے تھے، اس طرح یہ رسالہ بھی رسالۂ دلگداز
بارہ تیرہ سال پہلے جاری ہوچکا تھا، اردو زبان میں سب سے پہلا ماہوار رسالہ (رسالۂ طبابت) جاری کرنے
حیدرآبادی کو حاصل ہے، اور اردو میں سب سے پہلا علمی ادبی اخلاقی ماہوار رسالہ (مخزن الفوائد) جاری
نے کا فخر بھی حیدرآبادی کو ہے،

مخزن الفوائد جلد اول نمبر ۹ میں بابت ماہ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ سے مولوی سید حسین بلگرامی کے ایک مضمون
ادر ہوا کا ایک ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے،

"یہ تو معلوم ہوچکا کہ ابخروں کے ٹھنڈے ہوکر بھاپ کی شکل میں جانے سے ابر پیدا ہوتا ہے
جب تک ابخرے کم کم اور آہستہ آہستہ جمتے رہتے ہیں، اسوقت تک ابر ہی ابر پیدا ہوتا ہے مینہ
نہیں برستا، مگر جب آمد ابخروں کی زیادہ ہوتی ہے، اور سرعت کیساتھ تہ پر تہ جمنی شروع ہوتی
ہے، اسوقت پانی کے ذرے جن سے یہ ابر مرکب ہے، دوسرے سے مل مل کر بڑے قطرے
بننے لگتے ہیں، اور اپنے بوجھ سے زمین پر گرنے لگتے ہیں، اور مینہ برسنے لگتا ہے"

یہ رسالہ چار چھ سال تک جاری رہا، افسوس ہے کہ اسکے پرچے میرے پاس نہیں رہے، اسلئے
ہیں کہا جاسکتا، کہ کب بند ہوا،

اس رسالے کے اجراء سے پانچ سال پہلے جریدۂ اعلامیہ ۱۲۸۶ھ میں جاری ہوچکا تھا، جسے آقا
زین العابدین شیرازی مرتب کرتے تھے، اور دار الطبع سرکار عالی میں طبع ہوتا تھا، اس کے اغراض و
مقاصد دفتری اور محکماتی تغیر و تبدل، موسمی رپورٹ، نرخ اجناس، محکمہ جاتی (ڈپارٹمنٹل) امتحانات

کے نتائج اور سرکاری اشتہارات شائع کرنا تھے، یہ ہفتہ وار اخبار اب تک جاری ہے، اور اپنے اغراض و مقاصد کا حامل، اس میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ ملک کی دولت آبادی دیسی کاغذ پر طبع ہوتا ہے، آدھا حصہ دار الطبع سرکار عالی کے حسین ٹائپ میں اور آدھا حصہ لیتھو میں طبع ہوتا ہے، غالباً اتنا قدیم کوئی ہفتہ وار اخبار اب نہیں ہے،

جریدۂ اعلامیہ کے بعد آصف الاخبار کا نام لیا جا سکتا ہے، جو فروری ۱۸۷۸ء سے رزیڈنسی سے نارائن راؤ مدلیار کی ملکیت میں ہفتہ وار جاری ہوا، اس کے متعلق بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کب تک جاری رہا،

۱۸۸۰ء میں رزیڈنسی ہی سے شفیق ہفتہ وار سید حسین رضوی کی ملکیت میں جاری ہوا جسکا تعلق غالباً کسی انجمن سے تھا،

۱۸۸۰ء ہی میں انجمن اخوان الصفا کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ ادیب جاری ہوا، جو بہت جلد بند ہو گیا،

۱۸۸۲ء میں مولوی محب حسین کی ادارت میں معلم شفیق ماہوار جاری ہوا، اور دو سال تک ماہوار رہکر ۱۸۸۴ء سے ہفتہ وار ہو گیا، مگر افسوس ہے کہ اس ہفتہ وار پرچے نے بھی زیادہ عمر نہیں پائی،

۱۸۸۲ء ہی میں رزیڈنسی سے حاجی محمد قاسم کرنان نے شوکت الاسلام ہفتہ وار جاری کیا، دراصل یہ اخبار ابتداءً پونا سے جاری ہوا تھا، مگر چند ہی پرچے پونا سے شائع ہوئے تھے کہ کرنان صاحب حیدرآباد آ گئے، اور شوکت الاسلام بھی یہیں سے نکلنے لگا، یہ اخبار حال تک جاری تھا، ابتداءً آٹھ دس سال مسلسل شائع ہوتا رہا، مگر درمیان میں چھ ماہی تہ ماہی ہو گیا، آخر میں صرف ملک معظم کی سالگرہ مبارک اور دسمبر اور سال نو کی تقریب میں نکلا کرتا تھا، آٹھ دس سال ہوئے کہ حاجی

قاسم صاحب نے انتقال کیا، اوران کے فرزند نے اسی طرز پر اُسے جاری رکھا، مگر دو ایک سال سے شاید بند کر دیا گیا ہی بہرحال اپنی نوعیت اور قدامت کے لحاظ سے ایک ہی پرچہ تھا،

مئی ۱۸۸۳ء سے مولوی مشتاق احمد احقر نے ایک صنعتی اور حرفتی ماہوار پرچہ فنون کے نام سے جاری کیا، مگر زیادہ جاری نہ رہ سکا، چونکہ اس پرچہ کے فنی ہونے کی وجہ سے کامیابی سے چلنے کی توقع نہ تھی، اسلئے عوام کے ذوق کے مدنظر مولوی مشتاق احمد نے جون ۱۸۸۳ء سے گلکدۂ مشتاق کے نام سے ایک شعروسخن کا ماہوار گلدستہ نکالا، جو مدت تک جاری رہا، ستمبر ۱۸۸۳ء میں مولوی مشتاق نے ایک اور ماہوار رسالہ "مذاقِ سخن" جاری کیا، جس میں نظم اور نثر دونوں کی رعایت تھی، یہ پرچہ البتہ کچھ دنوں تک جاری رہا،

۱۸۸۳ء ہی میں مولوی محمد سلطان عاقل نے "ہزار داستان" روزانہ جاری کیا جو اس زمانے کے مذاق کے موافق تھا، مگر اسکی عمر بھی زیادہ نہ ہو سکی،

۱۸۸۳ء ہی میں مولوی سید ابراہیم عفو نے مئی ۱۸۸۳ء سے "داستانِ سیاح" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا، جو جلد ہی بند ہو گیا،

اپریل ۱۸۸۳ء میں مولوی سید احمد زید بلگرامی، اور مولوی سید حسن حشن بلگرامی نے "ارم دکن" جاری کیا،

۱۸۸۴ء میں انجمن مستفیدانِ علوم فنون رزیڈنسی کیجانب سے مولوی عزیز الدین نے ایک ماہوار رسالہ رفیق دکن جاری کیا، جو مدت تک نکلتا رہا،

۱۸۸۴ء کی ابتدا میں زید اور حشن بلگرامی نے ملکر ایک روزنامہ پیک آصفی کے نام سے جاری کیا،

۱۸۸۴ء سے معلم شفیق جو مولوی محب حسین کی زیر ادارت ۱۸۸۲ء سے ماہوار جاری تھا ہفتہ وار بن گیا،

مئی ۱۸۸۵ء سے مولوی عبد الجلیل نعمانی نے "طغرائے اعجاز" کے نام سے ایک پندرہ روزہ گلدستہ جاری کیا،

مئی ۱۸۸۵ء ہی سے نواب عبد اللہ خان ضیغم (داماد آنریبل سر شرف الامراء؟) نے "جوہر سخن" کے نام سے ایک ماہوار گلدستہ جاری کیا،

۱۸۸۵ء کے اوائل سے نواب حسام الملک خان خانان بہادر کی سرپرستی اور سید حسین قابل کی ادارت میں ایک اخبار "آصفی" جاری ہوا،

۱۸۸۶ء میں فروری سے حاجی کرتان نے اخبار شوکت الاسلام کے ضمیمہ کے طور پر "مسرت القلوب" ہفتہ وار جاری کیا،

جون ۱۸۸۷ء میں دکن پنچ کے نام سے ایک ہفتہ وار پرچہ کشن راؤ جی نے جاری کیا، جس کے مہتمم عبد الکریم ظریف اور مدیر غریب الدین غریب تھے، یہی پرچہ آگے چل کر مشیر دکن بن گیا، جو ابتک جاری ہے،

جون ۱۸۸۷ء ہی سے قلعہ گولکنڈہ سے مشتاق احمد احقر نے "افسر الاخبار" جاری کیا،

جولائی ۱۸۸۷ء سے مولوی عبد السلام ترشی نے "خیال محبوب" نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا،

دسمبر ۱۸۸۷ء سے الطاف حسین قابل اور محمد عباس مہجور نے "گل و بلبل" کے نام سے ایک ماہوار گلدستہ جاری کیا،

۱۸۸۷ء ہی میں اورنگ آباد سے ایک ماہوار گلدستہ "مطلع سخن" بشیر الدین نے جاری کیا،

جنوری ۱۸۸۸ء سے حسن بن عبد اللہ نواب عماد نواز جنگ بہادر نے "حسن" نام سے ایک بہترین علمی ادبی، تاریخی ماہوار رسالہ جاری کیا، جس میں مولوی حبیب الرحمن خان شروانی، سر رچرڈ میڈ ما

عبداللہ کوئلم، مسٹر سی ایل ، شادر وغیرہ مشاہیر کے مضامین طبع ہوتے تھے، یہ رسالہ مدت تک جاری رہا، ۱۸۹۲ء سے اس میں ایک ضمیمہ تاریخ حسن، واقعات دکن کے نام سے اضافہ ہوا تھا جو بڑی کارآمد چیز تھی، یہ حیدرآباد کا اولین معیاری رسالہ تھا جو آجکل کے ٹھوس اور بلند معیار رسائل کی طرح مرتب کیا جاتا تھا، یہ رسالہ ۱۸۹۲ء تک جاری رہا،

۱۸۸۸ء میں منشی نثار علی شہرت نے سفیر دکن کے نام سے ایک اخبار جاری کیا،

۱۸۸۹ء میں محبوب القلوب کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری ہوا،

۱۸۹۲ء میں مولوی محب حسین نے معلم نسواں کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا،

۱۸۹۳ء میں مولوی مجیب احمد تمنائی نے سحر بیان کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا،

۱۸۹۵ء میں سید علی رضا نے منتخب روزگار کے نام سے ایک ماہوار رسالہ کا اجراء کیا،

۱۸۹۵ء میں میں سید احمد ناطق نے ملک و ملت کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا،

۱۸۹۶ء میں ایک ماہوار رسالہ افسر جاری ہوا جسے دو سال تک مولوی محب حسین مرتب کرتے رہے، اور ان کے بعد مولوی عبدالحق بی اے (حال معتمد انجمن ترقی اردو پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے مرتب کرنا شروع کیا،

۱۸۹۶ء ہی میں منشی قدرت اللہ مضطر نے ایک ہفتہ وار اخبار نظارۂ عالم جاری کیا،

۱۸۹۶ء میں چونکہ مولینا عبدالحلیم شرر حیدرآباد آگئے تھے، اس لئے انھوں نے دلگداز بھی یہیں سے جاری کیا، جو ایک سال تک حیدرآباد سے شائع ہوتا رہا اور پھر لکھنؤ منتقل ہوگیا،

۱۸۹۷ء میں مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے زیر سرپرستی "دبدبۂ آصفی" ماہوار جاری ہوا، جس کے مدیر پنڈت رتن ناتھ سرشار تھے، ایک مدت تک یہ رسالہ بڑی آب و تاب سے جاری رہا،

۱۸۹۷ء میں مولوی سلیمان قدسی نے شمس الکلام ماہوار جاری کیا،

سنہ ۱۸۹۷ء ہی میں مولوی غلام حسین داد نے پیام محبوب کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا،

سنہ ۱۸۹۸ء میں نواب لقمان الدولہ بہادر نے میڈیکل جرنل کے نام سے ایک طبی ماہوار رسالہ جاری کیا،

سنہ ۱۸۹۸ء ہی میں غلام صمدانی گوہر نے ایک ماہوار رسالہ جلوۂ محبوب کے نام سے جاری کیا،

سنہ ۱۸۹۸ء ہی میں حافظ جلیل حسن صاحب (نواب فصاحت جنگ بہادر) جلیل نے محبوب الکلام ماہوار جاری کیا،

سنہ ۱۸۹۹ء سے دکن پنچ مشیر دکن کے نام سے موسوم ہوا، جو روزنامہ کی شکل میں اب تک جاری ہے

سنہ ۱۸۹۹ء ہی میں مولوی امجد علی اشہری نے سفیر دکن کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا،

سنہ ۱۹۰۱ء میں محمد ابراہیم خان نے ایک ہفتہ وار اخبار جام جمشید کے نام سے جاری کیا،

سنہ ۱۹۰۲ء میں راجہ راے رایان بہادر کی سرپرستی میں مولوی نادر علی برتر غازی پوری نے نسیم دکن ماہوار جاری کیا، اس رسالے میں تین حصے علحدہ علحدہ مضامین کے ہوا کرتے تھے، ایک حصہ میں طرحی غزلیں ہوتی تھیں، دوسرے حصے میں علمی ادبی مضامین ہوتے تھے، مولینا عبدالحلیم شرر، قطب الدین تسلی، مولوی محب حسین، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ اس حصہ کیلیے مضامین لکھا کرتے تھے، تیسرے حصہ میں ایک ناول مسلسل شائع ہوتا تھا،

سنہ ۱۹۰۲ء ہی میں شمس العلما نواب عزیز جنگ بہادر نے عزیز الاخبار ہفتہ وار جاری کیا،

سنہ ۱۹۰۳ء میں مولوی عبدالرحیم وکیل نے دکھنی کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا،

سنہ ۱۹۰۳ء ہی میں مولوی ظفر علی خان بی اے (مدیر زمیندار) نے دکن ریویو کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جو بڑا ٹھوس علمی ادبی رسالہ تھا، اس میں مولوی ظفر علی خان کے علاوہ مولوی محفوظ علی بدایونی، مولوی عبدالحق بی اے، مولوی عزیز مرزا بی اے وغیرہ جیسے اچھے اچھے انشاپرداز

مضامین لکھتے تھے، چند سال تک حیدرآباد سے جاری رکھ کر مولوی ظفر علی خان نے اس رسالے کو بمبئی سے بھی نکالا مگر پھر حیدرآباد لاکر مولوی مودود احمد تشنہ کے ہاتھ فروخت کر دیا، افسوس ہے کہ تشنہ صاحب اُسے جاری نہ رکھ سکے،

۱۹۰۳ء ہی میں مولوی ظفر علی خان نے افسانہ کے نام سے ایک ماہوار پرچہ جاری کیا، جس میں رینالڈز کے مشہور ناول اسرار لندن وغیرہ کا ترجمہ شائع ہوتا تھا، یہ پرچہ زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا،

۱۹۰۴ء میں مولوی محب حسین نے علم و عمل کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا،

۱۹۰۴ء ہی میں سراج الدین احمد خان نے معیار الانشاء کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا،

۱۹۰۴ء ہی میں جناب امیر حمزہ نے نظامی کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جو کم و بیش گیارہ سال تک نکلتا رہا،

۱۹۰۵ء میں منشی پیارے لال نے محبوب گزٹ ہفتہ وار جاری کیا،

۱۹۰۵ء ہی میں مولوی غلام حسین داد نے الہادی ماہوار رسالہ جاری کیا، جو مدت تک جاری رہا، غلام حسین صاحب کے انتقال کے بعد بھی ایک اور صاحب نکالتے رہے، تقریباً دس سال جاری رہ کر بند ہوا،

۱۹۰۵ء ہی میں مولوی سید رضی الدین حسن کیفی اور مولوی نوازش علی مست نے صحیفہ ہفتہ وار جاری کیا، جو مدت تک بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا، ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں مولوی اکبر علی صاحب نے اُسے مرتب کرنا شروع کیا، اور آخر میں اُسے روزنامہ بنا دیا، جو ابتک جاری ہے،

۱۹۰۶ء میں منشی محمد قاسم نے المحبوب ہفتہ وار جاری کیا، (باقی)

تلخیص و تبصرہ

بلقان کے مسلمان

جامعہ الجزائر کے ایک استاد جی، ایچ، بوسکے (G. H. Bousquet) نے حال میں ریاستہائے بلقان کی سیاحت کی تھی، وہاں مسلمانوں کی نسبت جو معلومات حاصل ہوسکے موصوف نے انکو ایک مضمون میں شائع کر دیا ہے[1] ہم اس مضمون کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں،

یوگوسلاویا میں تقریباً سولہ لاکھ مسلمان آباد ہیں، جو وہاں کی مجموعی آبادی میں بقدر دس فی صدی کے ہیں، ان میں سات لاکھ پچاس ہزار بوسینا ہرزیگووینا کے علاقہ میں ہیں، یہ سب زبان اور نسل کے لحاظ سے سردی ہیں، بقیہ جنوبی سرویا میں آباد ہیں، جہاں اکثریت ترکی اور خصوصاً البانی نسل کے لوگوں کی ہے، معاشرتی اور اقتصادی حیثیت سے ترک اور البانی سروی مسلمانوں سے بہت گرے ہوئے ہیں، اور برخلاف سردی مسلمانوں کے یوگوسلاویا کی قومی زندگی میں مطلق ضم نہیں ہوئے ہیں، یہ لوگ ترکی فتوحات کے بعد اسلام لائے تھے، انکی حیثیت نسلی نہیں بلکہ ایک مذہبی اقلیت کی ہے، معاشرتی نقطۂ نظر سے یہ لوگ ابھی منزل ارتقا میں ہیں، موجودہ حکومت میں دو مسلمان وزرا بھی شامل ہیں،

جہاں تک مذہبی ارکان کا تعلق ہے، یوگوسلاویا کے مسلمان رمضان کے روزوں کے بہت

---

[1] مسلم ورلڈ جنوری ۱۹۳۷ء

پابند ہین، لیکن دوسرے فرائض کی پابندی نسبتہً کم ہے، سفر کی گوناگون دشواریون کی وجہ سے
حاجیون کی تعداد کم رہتی ہے، مذہبی گروہ بندیاں بھی کم ہوتی جارہی ہیں، مجلس علما کے ایک فیصلہ
مورخہ ۱۱ رجولائی ۱۹۳۱ء کے مطابق یوگوسلاویا کی جمعیتہ اسلامیہ نے ان تمام گروہ بندیوں کو جو دستور
اور روح اسلام کے خلاف ہیں، ممنوع قرار دیا ہے، یہ جمعیتہ اپنا مستقل بجٹ رکھتی ہے، اور اس
کی آمدنی زیادہ تر لاوارث جائدادوں، سرکاری امداد اور مسلمانوں کے ٹیکسوں سے پوری ہوتی ہے،
سیاسی نقطۂ نظر سے مسلمانون کو شہری حقوق حاصل ہیں، ان کے مذہبی حقوق بھی محفوظ ہیں،
اوران کے شرعی معاملات مذہبی عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں، سروی مسلمانوں میں تعدد ازدواج
کی مثالیں شاذ ونادر پائی جاتی ہیں، اگر کسی شخص کی بیوی موجود ہے تو کوئی امام اس کا دوسرا نکاح
نہیں پڑھا سکتا، جب تک وہ شخص یہ ثابت نہ کرے کہ اس کی مالی حالت کافی طور پر قابلِ اطمینان ہے،
اور وہ عقد ثانی کے لئے معقول وجوہ رکھتا ہے، پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرنے کی بھی کوشش
کی جاتی ہے، نابالغوں کی شادی کا رواج بھی تقریبًا بالکل اٹھ گیا ہے، یوگوسلاویا کے مسلمان
حنفی مذہب کے پیرو ہین، قبول کا اظہار عروس خود کرتی ہے، اور شہروں میں اکثر نکاح کے وقت
وہ قاضی کے سامنے آبھی جاتی ہے، دیہاتوں میں دستور یہ ہے کہ عروس کی طرف سے اس کا
کوئی قریبی عزیز ناکح کے پاس چلا جاتا ہے، اکثر صورتوں میں دولہا دولھن نکاح سے قبل بھی
ایک دوسرے سے واقف رہتے ہیں، پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا، طلاق بہت شاذ ہوتی ہے، اور
جب کبھی ہوتی ہے لوگ اسکو نہایت برا سمجھتے ہیں، آج کل یہ کسیقدر زیادہ ہوگئی ہے، پھر بھی
جب تک قاضی کو اطمینان نہ ہو جائے کہ شوہر سچائی کے ساتھ طلاق دے رہا ہے، وہ اُسے باقاعدہ
طور پر رجسٹر میں درج نہیں کرتا، یوں رفتہ رفتہ طلاق کی شکل قانونی علحدگی کی ہوتی جاتی ہے،
نوجوانوں میں برقعہ تیزی سے اٹھتا جاتا ہے، جو مسلمان زیادہ روشن خیال ہیں، وہ اسے بالکل

اتحاد دینا چاہتے ہیں،

بلغراد میں مسلمان طلبہ کی سرگرمیاں بہت نمایاں ہیں، ان کا ایک خوبصورت دارالاقامہ ہے جس میں ڈیڑھ سو طلبہ کے رہنے کی جگہ ہے، اسے وہاں کی انجمن اسلامیہ نے جو غیرت کے نام سے موسوم ہے قائم کیا تھا بعض غیر مسلم طلبہ بھی اس میں رہتے ہیں، یوگوسلاویا میں طلبہ کا سب سے زیادہ خوبصورت دارالاقامہ یہی معلوم ہوتا ہے، اسکے قریب ہی لڑکیوں کے لئے بھی ایک مکان انجمن غیرت نے کرایہ پر لے رکھا ہے، جس میں غالباً پندرہ طالبات رہتی ہیں،

مختصر یہ ہے کہ جہانتک ہم نے دیکھا یوگوسلاویا کے مسلمان کم از کم ان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال افراد تہذیب جدید کو اختیار کرنے کی بہت زیادہ کوشش کر رہے ہیں، دوسرے یہ کہ وہاں مختلف مذاہب کے پیرؤں کے باہمی تعلقات نہایت دوستانہ ہیں،

بلغاریا کے مسلمانوں کی حالت یوگوسلاویا کے مسلمانوں سے بہت مختلف ہے، بلغاریا کی تقریباً ساٹھ لاکھ کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد قریب آٹھ لاکھ ہے، یوں بہ نسبت یوگوسلاویا کے وہاں مسلمانوں کا تناسب زیادہ ہے، لیکن ان کی حیثیت زیادہ تر نسلی ہے، بلغاریا کے مسلمانوں میں سے تین چوتھائی ترک ہیں، جو بیشتر شمالی بلغاریا کے علاقہ شوملہ میں آباد ہیں، ایک لاکھ مسلمان ایسے ہیں، جن کا مذہب دراصل کسی قدر مبہم و مشتبہ ہے، صرف جنوبی بلغاریا میں وہ بلغاری مسلمان پائے جاتے ہیں، جو سترہویں صدی میں اسلام لائے تھے، اور جن کو ہم پوماک (Pomaks.) کہتے ہیں،

ان میں سے مسلمانوں کا کوئی حصہ بلغاری قوم میں اُس طرح نہیں مل جُل گیا ہے، جس طرح سروی مسلمان اپنے ملک والوں میں مل گئے ہیں، بلغاریا کے مسلمانوں کی معاشرتی اور دماغی سطح وہاں کے بقیہ باشندوں سے فروتر ہے، بلغاریا کے ترک ایک عجیب دشواری میں مبتلا ہیں

وہاں انکو اپنے اصلی وطن ترکی سے زیادہ مذہبی آزادی حاصل ہے، پھر بھی جو لوگ زیادہ تعلیم یافتہ ہیں انکی نگاہیں انقرہ کی طرف لگی ہوئی ہیں، اور ان میں سے اکثر جلد بلغاریا چھوڑکر ترکی چلے جانے والے ہیں، پومک مسلمانوں کو بلغاریا کی قومی زندگی میں حصہ لینے کا حق حاصل نہیں، حالانکہ وہ صرف سلافی زبان بولتے ہیں،

صوفیا کی یونیورسٹی میں مسلمان طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، چند سال ہوئے ایک مسلمان لڑکی بھی یونیورسٹی میں تھی، بہرحال دوسری حیثیتوں سے بلغاریہ کے مسلمان شمالی افریقہ کے مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں، شہر فلیپو پولیس کے ترکوں نے ٹوپی کا استعمال ترک کر دیا ہے عورتوں نے برقعہ اٹھا دیا ہے، مگر یہ حالت ہر جگہ نہیں ہے، مدرسوں میں دس گیارہ سال تک کی عمر کے لڑکے اور لڑکیاں ساتھ بیٹھ کر پڑھتی ہیں،

قانونی معاملات میں بلغاریا کی مسلمان اقلیت کے ساتھ غیر معمولی طور پر فیاضانہ برتاؤ کیا جاتا ہے، ان کو شہریت کے حقوق عیسائی بلغاریوں کے برابر ملے ہیں، اور اپنے ذاتی معاملات میں اسلامی قانون کے تابع ہیں، بلغاریہ میں غیر مذہبی شادی تسلیم نہیں کی گئی ہے،

مسلمانوں کے اپنے مدرسے ہیں جن میں پچاس ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں، ان مدرسوں کی زبان ترکی ہے لیکن بلغاری زبان بھی پڑھائی جاتی ہے، ان مدرسوں کے ذرائع آمدنی حسب ذیل ہیں:۔ لاوارث جائدادوں کے محاصل، سرکاری امداد، بعض قومی جائدادوں کی آمدنی، ٹیکس جو مسلمانوں پر عائد کئے جاتے ہیں،

صرف قاضیوں، مفتیوں اور ان کے نائبوں کو براہ راست حکومت سے تنخواہ ملتی ہے صوفیا میں عدالت عالیہ کا اجلاس ہوتا ہے، جس کا صدر بلغاریہ کا مفتی اعظم حسین احمد وف ہے

وہ بلغاری زبان سے بالکل ناواقف ہے جنگ عظیم کے بعد مفتیوں کے فیصلہ کی رو سے یہ قانون نافذ کر دیا گیا ہے، کہ نکاح کے لئے لڑکوں کی عمر کم سے کم اٹھارہ سال اور لڑکیوں کی سترہ سال ہونی چاہئے، اس سے کم عمر والوں کا نکاح پڑھانے کا اختیار امام کو نہیں ہے، جبتک فریقین معقول وجوہ کی بنا پر مفتی سے خاص اجازت حاصل نہ کرلیں،

خلاصہ یہ کہ بلغاریہ کے مسلمانوں کے ساتھ جن کی حیثیت حقیقۃً ایک نسلی اور مذہبی اقلیت کی ہے، اکثریت کا سلوک انتہائی رواداری کا ہے، مگر بظاہر یہ لوگ اکثریت میں شامل ہونا نہیں چاہتے ہمارے نزدیک ان کے مستقبل کی فلاح کی اور کوئی دوسری صورت نہیں،

البانیا کے مسلمانوں کا حال یوگوسلاویا اور بلغاریا دونوں ریاستوں کے مسلمانوں سے بہت کچھ مختلف ہے، البانیا ایک چھوٹا سا ملک ہے، تقریباً بلجیم کے برابر، نہایت غریب، آبادی دس لاکھ سے کچھ زیادہ ہے، ایک لاکھ کیتھولک ہیں، دو لاکھ یونانی کلیسا کے پیرو، اور سات لاکھ پچاس ہزار مسلمان ہیں، یہاں کے لوگ دیر میں اسلام لائے، اور بہتیرے محض نام کے مسلمان ہیں، شمالی علاقوں میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان شادی بیاہ کی رسم جاری ہے، مسلمان عہدہ داروں کی ایک بہت بڑی تعداد بکتاشی فرقہ سے تعلق رکھتی ہے، اس فرقہ کے لوگ شراب پیتے ہیں، اور سوائے خرگوش کے ہر قسم کی غذا کھاتے ہیں،

حکومت البانیا نے مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا ہے، ملکی قوانین غیر مذہبی اصولوں پر مدون ہو رہے ہیں، البانیا میں اسوقت ایک مجموعہ قوانینِ تجارت، ایک مجموعہ قوانینِ فوجداری، اور ایک مجموعہ قوانینِ دیوانی موجود ہے، پہلے دونوں اطالوی ضابطہ تجارت و فوجداری پر مبنی ہیں، ان کے علاوہ ایک ضابطہ دیوانی بھی مرتب کیا جا رہا ہے، یہ ضابطہ دیوانی کسی ایک غیر ملکی ضابطہ سے ماخوذ نہیں ہے، بلکہ فرانس اور اٹلی کے مختلف ضابطوں پر مبنی ہے، علاوہ بریں انکی

بعض دفعات البانیا کے مخصوص معاشرتی مسائل سے متعلق ہیں، مثلاً شادی سے پہلے نسبت کا توڑ دینا یا فریقین میں سے کسی ایک کی نااہلی کے باعث اولاد نہ ہونے پر طلاق حاصل کر لینا، جہانتک ملکی قوانین کا تعلق ہے، البانیا میں اسلامی قانون کا نفاذ تقریباً موقوف ہو گیا ہے،

"ع ز"

بایاں ہاتھ

دنیا میں ۴ سے لیکر ۸ فی صدی آدمی ایسے ہوتے ہیں، جو اپنا کام زیادہ تر بائیں ہاتھ سے کرتے تھے، ان کو بائیں ہاتھ کے استعمال میں ویسی ہی آسانی ہوتی تھی، جیسی دوسروں کو داہنے ہاتھ کے استعمال میں ان میں سے بعض بڑے بڑے آدمی بھی تھے، مثلاً مصر کے بہتیرے فراعنہ، روما کے اکثر قیاصرہ، بائبل کے نبیامین، سکندر اعظم، شارلیمین اور مائیکل انجیلو (اٹلی کا مشہور آرٹسٹ اور شاعر) موجودہ زمانہ میں اس قسم کی سب سے زیادہ ممتاز شخصیت شہنشاہ جارج ششم کی ہے، ان میں یہ بات بھی ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو یکساں آسانی کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں،

اہل سائنس کے ہاں اس امر میں اختلاف ہے، کہ بعض لوگ بائیں ہاتھ کے استعمال میں زیادہ آسانی کیوں محسوس کرتے ہیں، کچھ ماہرین فن کا خیال ہے، کہ یہ ایک کسبی چیز ہے، بعض کہتے ہیں، کہ یہ ایک پیدائشی خصوصیت ہے، پہلے گروہ کے نزدیک اس کا تعلق مندرجۂ ذیل باتوں سے ہے،:-

بچپن میں بچہ کو کس طرح گود میں لیتے ہیں، اُسے تربیت کیونکر دی جاتی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ دوسروں کو دیکھ کر وہ ایسا کرنے لگا ہو، دوسرا گروہ اس خصوصیت کا تعلق جسم انسانی کی ترکیبی ساخت سے بتاتا ہے، وہ اس کے متعدد اسباب بیان کرتا ہے، مثلاً جسم کے دونوں نصف کی غیر مساوی تقسیم جو مرکز ثقل کو اس کی جگہ سے منتقل کر دیتی ہے، دماغ کے دونوں پہلوؤں میں خون کی غیر مساوی رسد، دماغ کے ایک پہلو کا فعلی غلبہ، اور ایک آنکھ کا بہ نسبت دوسری آنکھ کے زیادہ قوی ہونا، چنانچہ

...لگایا ہے کہ تقریباً ۵۰ فی صدی بائیں ہاتھ والے بائیں آنکھ والے بھی ہوتے ہیں، اور تقریباً
...فی صدی داہنے ہاتھ والوں کی داہنی آنکھ بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہے،

ساخت کے لحاظ سے کاسہ سر کا ایک بازو دوسرے بازو سے چھوٹا یا نیچا ہوتا ہے، جن
...وں کے کاسہ سر کا داہنا حصہ زیادہ ابھرا ہوا ہوتا ہے، عموماً ان کے جسم کے تمام داہنے حصہ میں
...دہ قوت ہوتی ہے، پھر بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایسے لوگ زیادہ تر بائیں ہاتھ والے ہوتے ہیں، اسکی
...بعض ماہرین نفسیات کے نزدیک یہ ہے کہ دماغ کے داہنے نصف کرہ کا غلبہ بائیں ہاتھ والوں
...اور بائیں نصف کرہ کا داہنے ہاتھ والوں میں ہوتا ہے، اسی بنا پر یہ نظریہ بھی قوی معلوم ہوتا ہے
...چیز بہت کچھ پیدائشی اور موروثی ہے، چنانچہ ایسے خاندانوں میں جہاں والدین میں سے ایک
...نوں بائیں ہاتھ والے ہیں، بائیں ہاتھ والے بچوں کا اوسط (۱۷،۳۴) فی صدی پایا گیا ہے، اور
...خاندانوں میں جہاں والدین میں سے کوئی بھی بائیں ہاتھ والا نہیں ہے، یہ اوسط صرف (۲،۱)
...مدی ہے، اگر ماں باپ دونوں بائیں ہاتھ والے ہیں، تو بچہ بھی تقریباً ہمیشہ بائیں ہاتھ
...ا ہوتا ہے،

اکثر ماہرین نفسیات اس رائے پر متفق ہیں کہ بچوں سے بائیں ہاتھ کے استعمال کی عادت
...ڑانی نہیں چاہئے، ان کا خیال ہے کہ اگر کسی بچہ کو اسکی اس عادت کے خلاف کرنے پر مجبور کیا جائیگا
...میں اُسے فطرۃً آسانی معلوم ہوتی ہے، تو وہ اعصابی کمزوری اور بے آرامی محسوس کرنے لگیگا
...خانوں میں بائیں ہاتھ والوں کے اوسط کی زیادتی ٹھیک اسی سبب کا نتیجہ بتائی جاتی ہے، تجربہ سے
...ر ہوتا ہے کہ اگر ایسے بچوں کو ان کی عادت کے خلاف کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، تو ان میں
...، (۱۱) فی صدی لکنت کرنے لگتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ یہ تبدیلی اُن اعصاب کے فعل میں خلل انداز ہوتی
...، جن سے پڑھنے لکھنے اور گفتگو میں کام لیا جاتا ہے، لیکن اس مسئلہ میں بھی بعض علماے نفسیات

کو اختلاف ہے، مثلاً نیو یارک کے ڈاکٹر لوئی بِش (Louis E. Bisch) کی رائے ہے کہ ایسا کرنے سے کوئی مضرت نہ ہوگی، انکا خیال ہے کہ بچہ صرف عارضی طور پر لکنت کرنے لگے گا، اور شکایت آسانی سے رفع کیجا سکتی ہے،

فاضل ڈاکٹر سیموئل اورٹن نیو یارک (Samuel T. Orton) کا بیان ہے کہ ہر سو بچوں میں تقریباً چالیس فطری طور پر بائیں ہاتھ والے ہوتے ہیں، ان میں سے دس تو اپنی فطرت پر قائم رہتے ہیں، اور تیس اسے تربیت کے سبب سے بدل دیتے ہیں، ڈاکٹر موصوف نے ایسے پانچسو سے زیادہ واقعات کے مطالعہ میں یہ دیکھا ہے، کہ جیسیوں والدین نے اپنے بچوں کی عادت بدل کر اور انھیں بائیں ہاتھ کے بجائے داہنے ہاتھ کے استعمال پر لگا دیا، صرف تین والدین ایسے ملے جنھوں نے اسکے برعکس کوشش کی،

(ل - ڈ) "ح ز"

ابن رشد

مشہور مسلمان اندلسی حکیم جو مسلمانوں میں ارسطو کے فلسفہ کا بہترین شارح سمجھا جاتا ہے، اور جس کی تصنیفات مدتوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں، سوانح اور اس کے فلسفہ پر تبصرہ، اور اسی ضمن میں مسلمانوں کے علم کلام و فلسفہ پر بھی ریویو، اور یورپ میں اسلامی علوم کی اشاعت کی تاریخ اور فلسفہ جدیدہ و قدیمہ کا موازنہ بھی آگیا ہے، ابن رشد کے متعلق اتنا بڑا ذخیرۂ معلومات کسی مشرقی زبان میں کیا مغربی زبان میں بھی نہیں مل سکتا،

ضخامت ۲۸۹ صفحے، قیمت: ۔ سے ر

"منیجر"

اخبار علمیہ

جسمانی صحت اور دماغی قوت

جو لوگ اپنی بعض جسمانی کمزوریوں کے باعث یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے انھیں مندرجہ ذیل واقعات سے اپنے اندر جوش عمل پیدا کرنا چاہئے:

ماہرین نفسیات کی ایک جماعت اپنے تجربات کی بنا پر بیان کرتی ہے، کہ برخلاف عام رائے کے بہترین دماغ اور بہترین قابلیتیں، بہترین دماغی صحت سے نہیں، بلکہ اکثر جسمانی یا اعصابی نقائص سے پیدا ہوتی ہیں، یہ گروہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں موجودہ زمانہ کی سب سے زیادہ ممتاز مثال امریکہ کے پریزیڈنٹ روزولٹ کو پیش کرتا ہے، روزولٹ ۱۹۲۱ء میں شدید اعصابی کمزوریوں کا شکار ہوگیا تھا، لیکن محض اپنے آہنی عزم کی قوت سے جدوجہد کرتا ہوا دس سال بعد ریاستہائے متحدہ امریکہ کا صدر ہوگیا، ڈاکٹر ڈونلڈ لیرڈ (Donald Laird) اوستاذ نفسیات کالگیٹ یونیورسٹی امریکہ کا خیال ہے کہ اگر روزولٹ اس مرض میں مبتلا نہ ہوگیا ہوتا، تو وہ صدارت تک ہرگز نہ پہونچتا، اس خیال کی تائید میں وہ دکھاتے ہیں، کہ پریزیڈنٹ روزولٹ کی موجودہ سیاسی زندگی نسبۃً کس قدر ہموار اور جوش و حوصلہ سے خالی ہے، حالانکہ اب اسکی صحت بہت اچھی ہے، بمقابلہ اسوقت کے جب وہ مریض تھا، لیکن اسی حالت میں انتہائی جوش و خروش کیساتھ ترقی کے لئے کوشش کرتا تھا، ڈاکٹر موصوف امریکہ کے ممتاز ترین طلبہ کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

طلبہ اعلیٰ ترین ذہن و دماغ کے مالک تو ضرور تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ جسمانی اور اعصابی کمزوریوں اور دماغی الجھنوں میں بھی مبتلا تھے، ان کی بعض شکایتیں یہ تھیں: مرگی کے دورے، لنگڑا پن، کمزور اور بیمار جسم، بدصورت داغدار چہرے، اور مختلف دماغی الجھنیں؛ ڈاکٹر لیرڈ ایسے کمزور اشخاص کی حیرت انگیز ترقی کی توجیہ انگلستان کے مشہور فلسفی فرانسس بیکن (Francis Bacon) کے اس قول سے کرتے ہیں "جس شخص میں کوئی ایسا نقص مستقل طور پر ہوتا ہے، جو دوسروں کی نظروں میں اُسے حقیر کر دیتا ہے، وہ اپنے اندر اس حقارت سے نجات پانے کے لئے ایک دائمی تازیانہ کی خلش بھی محسوس کرتا رہتا ہے" لارڈ بائرن (Byron) کا ایک پیر ٹیڑھا تھا، لیکن یہی نقص ہمیشہ اُسے ادب اور شاعری میں امتیاز حاصل کرنے کے لئے ابھارتا رہتا تھا، علاوہ بریں وہ تیراکی میں بھی بڑا مشاق تھا، کانٹ کو نقرس کی شکایت تھی، مگر اسی کمزوری کی وجہ سے وہ عزلت پسند ہو گیا اور پھر فلسفہ پر ایک زبردست کتاب لکھی، جو دنیا کی مشہور ترین فلسفیانہ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے؛ نٹشے کو جسم کے شدید درد سے تکلیف رہا کرتی تھی، لیکن یہی تکلیف اُس تصنیف کا باعث ہوئی، جس نے دنیا کے سامنے فوق الانسان (Super-man) کا نظریہ پیش کیا، بیتھاون (Beethoven) کا چہرہ داغدار، ناک چھوٹی، اور بدصورت تھی، دمہ اور بہرے پن کی بھی شکایت تھی، ان تمام باتوں کی اُسے ہر وقت کوفت رہا کرتی تھی، مگر انہی نقائص کے احساس نے اُسے نہ صرف جرمنی بلکہ دنیا کے ممتاز ترین طرح سازوں کی صف میں جگہ دلوائی اور اس نے بعض ایسے گیت تصنیف کئے، جو اپنا جواب نہیں رکھتے، اسی طرح سیزر، سقراط، مولیری (سترھویں صدی کا مشہور فرانسیسی ڈراما نویس) رشلو (سترھویں صدی میں فرانس کا زبردست وزیر اعظم) موزارٹ (اٹھارھویں صدی میں آسٹریا کا ممتاز طرح ساز اور ماہر موسیقی) اور شلر (اٹھارھویں صدی کا مشہور جرمن شاعر اور ڈراما نویس) ان سب کو مرگی کے دورے ہوا کرتے تھے،

مختصرات سائنس

امریکہ کے ریڈیو کارپوریشن نے ایک حیرت انگیز ایجاد پیش کی ہے، جس سے تیز موٹر چلانے والے فوراً متنبہ کر دیئے جاتے ہیں، دو برقی آنکھیں موٹر کی رفتار دیکھتی رہتی ہیں، اور بجلی کے جس خزانہ سے ان کا تعلق ہوتا ہے، وہاں موٹر کی رفتار کا اندازہ صحیح صحیح درج ہوتا رہتا ہے، جوں ہی رفتار حد سے زیادہ تیز ہوئی، یہ طلسمی ایجاد دو میں سے ایک بات کرتی ہے، یا تو ایک سرخ جھنڈی موٹر ڈرائیور کے سامنے لا دیتی ہے، جس پر لکھا ہوتا ہو کہ "تمھاری رفتار حد سے زیادہ تیز ہے" یا کسی پولیس مین کو آواز دیتی ہے،

شہر کے رہنے والے ہر منٹ گرد کے (۹۰۰،۰۰۰،۰۰۰) ذرے سانس کے ذریعہ اپنے پھیپھڑوں تک پہونچاتے رہتے ہیں، یہ ذرّے صرف خوردبین سے دیکھے جاسکتے ہیں، ان میں سے (۹۰۰۰۰۰) ذرّے پھیپھڑوں میں رہ جاتے ہیں، اور ان سے صحت کیلئے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے،

انسان کے شدید ترین دشمنوں میں سے ایک دشمن موسم بھی ہے، امریکہ میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۵ء تک (۵۲۲۴) آدمی آندھیوں سے ہلاک ہوئے، اور (۲۳۰۰۰۰۰۰) ڈالر کی جائداد تلف ہوئی، طوفانوں سے اور زیادہ نقصان پہونچا، یعنی اسی مدت میں (۳۰۵۹۷۰۰۰) ڈالر کی جائداد تباہ ہوگئی، لیکن سب سے زیادہ بربادی سیلاب سے ہوئی، ۱۹۰۳ء سے ۱۹۳۵ء تک (۳۰۰۰) آدمی ہلاک ہوئے، اور (۱۶۵۰۰۰۰۰۰) ڈالر کی جائداد کا نقصان ہوا،

قلب کی بیماری

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اچانک موت قلب کی بیماریوں سے واقع ہوتی ہے، بہتیرے آدمی جنکو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہے قلب کے حملوں سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں، وہ سُن چکے ہیں کہ اس مرض سے قلب کی حرکت دفعتہً بند ہو جاتی ہے، لیکن جدید ترین تحقیقات یہ ہے کہ ہائی بلڈ پریشر کوئی تشویشناک مرض نہیں ہے، بہت سے لوگ اس کے ہوتے ہوئے بیس تیس، اور چالیس سال تک بھی زندہ رہتے ہیں، قلب کی بیماری سے جو موتیں واقع ہوتی ہیں، ان میں صرف (۷) سے (۱۰) فی صدی تک اچانک ہوتی ہیں، ان میں بھی بہت کم ایسی ہوتی ہیں، جن کے آثار پہلے سے ظاہر نہ ہو جائیں تاہم قلب کی بیماریاں ایسی نہیں ہیں جن پر خاص توجہ نہ کی جائے، ۱۹۳۵ء میں تین لاکھ امریکن اسی میں ہلاک ہو گئے، ۱۹۳۶ء کے آخر تک بیس لاکھ امریکن قلب ہی کے مریض تھے، امریکہ میں امراضِ قلب کی کثرت تمام دوسرے امراض سے زیادہ ہے، مرنے والوں میں مردوں کا شمار بمقابلہ عورتوں کے سہ چند رہتا ہے، قلب کی بیماریوں میں جتنے آدمی آج مر رہے ہیں تاریخ کے کسی دور میں نہیں مرے، پانچ سال سے ۹ سال کی عمر تک جو موتیں قلب کی بیماریوں سے واقع ہوتی ہیں، ان کا شمار اتفاقی حوادث اور نمونیا کی موتوں سے جن میں لوگ سب سے زیادہ ہلاک ہوتے ہیں، کچھ ہی کم رہتا ہے، دس سال سے چودہ سال کی عمر تک تمام دوسرے اسباب سے زیادہ قلب کی بیماریاں موت کا سبب ہوتی ہیں، پندرہ سے چونتیس سال کی عمر تک اموات کے لحاظ سے قلب کی بیماریاں دوسرے درجہ پر اتر آتی ہیں، اسکے بعد آخر عمر تک اور امراض سے زیادہ امراضِ قلب سے موت واقع ہوتی ہے،

"ع ز"

پیشکشِ تہنیت

بتقریب جشنِ سیمین

اعلحضرت نظام الملک آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

از

یحییٰ اعظمی

سزد امروز اگر خاکِ دکن بر خویشتن نازد
کہ بر اوجِ کمالش گنبدِ چرخِ کہن نازد

خوشا وقتے کہ اندر سینہ می رقصد دلِ کشور
خوشا روزے کہ بر خود اینچنیں ملک و وطن نازد

مبارک "جشنِ سیمیں" آں شہِ اقلیمِ دانش را
کہ بر ذاتِ ہمایونش جہانِ علم و فن نازد

جہانبانے کہ مشرق تا بہ مغرب گردِ او گردد
جہاندارے کہ بر ذاتش ز کشمیر تا دکن نازد

چناں آئین و اسرار و رموزِ سلطنت داند
کہ بر تدبیرِ او امروز اعصار و زمن نازد

بلے فرماں دہی زیبد چنیں فرمانروائے را
کہ بر نظم امورش مملکت بر خویشتن نازد

بریں چشم و چراغِ دودمانِ "آصفی" آرے
روا باشد اگر دیہیم و اورنگِ دکن نازد

نہ تنہا ہند بر جود و نوالش مفتخر آمد
عرب نازد، عجم نازد، ختا نازد، ختن نازد

ز عالش فرات و نیل شو بد زندگی دارد	به بحر بیکرانش دجلهٔ و گنگ و جمن نازد
ز بذل و جود او چون شیخ یکساں بهره اندوزد	بدورِ عدلِ عثمانی سزد گر برہمن نازد
چناں از آبیاری آب و رنگے تازه افزاید	که گل بر رنگ و بوئے خویش در صحن چمن نازد
سریر آرائی ملکِ هنر او را ہمی زیبد	که بر منشورِ علم و حکمتش اقلیمِ فن نازد
ادیبے سحر پردازے که بر هر حرفِ رنگینش	قلم نازد، زبان نازد، ادب نازد، سخن نازد
بسیطِ خاک را دیوانِ اشعارش بوجد آرد	اگر بزمِ فلک بر نظمِ پروین و پرن نازد
ز بس نطقِ گہربارش جواہر پاره ها ریزد	برین نسبت ہمی زیبد اگر دُرِّ عدن نازد
فروغِ بزمِ امکان است و می زیبد اگر بر وے	جہانِ آب و گل نازد، نظامِ جان و تن نازد
الٰہی باغِ گیتی از وجودش خرمی گیرد	چمن تا بر شقیق و ارغوان و نسترن نازد
نسیمِ لطفِ حق باشد چمن آرائے اقبالش	صبا تا بر بہارِ لاله و سرو و سمن نازد

نگہدار اے خدا آں شاہِ آصفجاہِ سابع را

که بروے عہدِ حاضر نازد و عصرِ کہن نازد

مطبوعات جدیدہ

مرقع سخن شائع کردہ سلسلۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن تقطیع بڑی ضخامت ۴۹۲ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۵ر پتہ سلسلۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن،

سلسلۂ ادبیات اردو حیدر آباد کو جاری ہوئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا، لیکن اس قلیل مدت میں متعدد مفید کتابیں شائع کر چکا ہے، حال میں اُس نے اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے جشن سیمیں کی یادگار میں مرقع سخن کے نام سے دکن کے پچیس مشاہیر شعراء کا تذکرہ شائع کیا ہے، اس کی تالیف میں جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ، طلبہ، فارغین اور دوسرے اہل قلم کی کوششیں شریک ہیں، یہ تذکرہ پانچ دوروں پر تقسیم ہے، پہلا دور ۱۱۵۰ھ سے ۱۲۰۰ھ تک، دوسرا ۱۲۰۰ھ سے ۱۲۲۵ھ تک، تیسرا ۱۲۲۵ھ سے ۱۳۰۰ھ تک، چوتھا ۱۳۰۰ھ سے ۱۳۳۰ھ تک، پانچواں ۱۳۳۰ھ سے عہد حاضر تک، ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے، جس میں اس دور کی ادبی خصوصیات کا تذکرہ ہے، اس کے بعد اس عہد کے چند مشاہیر شعراء کے حالات، ان کے کلام کا نمونہ، اور اس پر تبصرہ ہے، اور شعراء کے تذکرہ کے ساتھ اون کے اور ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے وہ ہم عصر شعراء جو اوس عہد میں دکن گئے یا جن کی شہرت شمالی ہند میں تھی، نام دیدیے گئے ہیں، اس طرح یہ تذکرہ گویا دکن کی شاعری اور اس کی تدریجی ترقی کی پوری تاریخ ہے،

پہلے دور میں شاہ سراج الدین سراج، درگاہ قلی خاں قلی سالار جنگ، میر نوازش علی شیدا، شاہ تجلی علی تجلی، دوسرے دور میں شیر محمد خان ایمان، ماہ لقا بائی چندہ، محمد صدیق قیس، مہاراجہ چندولال شاداں

تیسرے دور میں میر شمس الدین محمد فیض محمد بدر الدین خان منظم الملک بدر، گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقی، میر احمد علی عصر، محمد فیاض الدین خان مشرف جنگ فیاض میر اصغر حسین ناجی، چوتھے دور میں ڈاکٹر احمد حسین مائل، سید جلال الدین توفیق، سید رضی الدین حسن کیفی، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، محمد عزیز الدین خان عزیز، غلام مصطفے رسا، پانچویں دور میں میر محمد علی مسرور، محمد حبیب الدین صغیر، سید امجد حسین امجد، میر تراب علی خان سعید اور محمد بہبود علی صفی کے حالات ہیں، حالات کے ساتھ ان کے اور ان کے اکثر ہم عصر دکنی شعراء فرمانروایان دکن اور متعدد ادب و شعر کے قدر دانوں کی تصاویر بھی دیدی گئی ہیں، جنسے معنوی خوبیوں کیساتھ یہ تذکرہ حسن ظاہر کا بھی مرقع بن گیا ہے،

رسولِ مقبول، مولفہ جناب مولینا عتیق احمد صاحب صدیقی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸ر، پتہ مکتبۂ قاسم العلوم دیوبند،

یہ سیرت کا رسالہ چھوٹے بچوں کے لئے لکھا گیا ہے، جو سلسلۂ مطبوعات مجلس دار التالیف دیوبند کی طرف سے شائع ہوا ہے، اس میں ابتداء میں پیغمبر کی ضرورت تمثیلی پیرایہ میں سمجھائی گئی ہے، اور مشاہیر انبیاء اور ان کی کتابوں کے نام بتائے گئے ہیں، اس کے بعد عرب جاہلی سے لیکر وفات نبوی تک مختصر سیرت پاک ہے، پھر اخلاق نبوی کا مختصر تذکرہ ہے، انبیاء کے متعلق ضروری عقائد ہیں، آخر میں آنحضرت صلعم کے متعلق غیر مذاہب کے اکابر کی رائیں ہیں، کتاب کی زبان میں بچوں کی خاطر سہولت کی گو کوشش کی گئی ہے، پھر بھی عربی کے موٹے موٹے لفظ بے اختیار قلم سے نکل گئے ہیں، جن کے معنی کہیں کہیں حاشیوں میں لکھ دیئے گئے ہیں، درسی کتابوں کے طرز پر ہر بیان کے آخر میں اس کا خلاصہ اور مشقی سوالات دیدیئے گئے ہیں، اور یہ اچھا کیا گیا ہے،

اتنا افسوس ہے کہ طرز بیان اور تمثیل میں انبیاء علیہم السلام کی جو حیثیت ظاہر کی گئی ہے، وہ نہ اکابر کی سطح کے مطابق ہے، اور نہ حقیقت سے قریب تر ہے، واقعات میں بھی غلطیاں ہیں، اہم اکثر

آنحضرت صلعم کی پھوپھی بتایا گیا ہے، (ص۲۴) حالانکہ وہ آپ کی دایہ اور خادمہ تھیں، حضرت خدیجہؓ کا مال لیکر جہاں پہلی دفعہ آپ گئے"۔ اس کی نسبت لکھا ہے کہ آپ نے دمشق و شام وغیرہ ملکوں میں فروخت کیا"۔ اس ایک فقرہ میں تین غلطیاں ہیں، دمشق ملک نہیں، دمشق آپ کا جانا ثابت نہیں، اس سفر میں شام کے سوا آپ کا کسی اور ملک میں جانا مذکور نہیں، اس طرز کے اور بھی مسامحات ہیں، ضرورت ہے کہ دیوبند کے مرکز سے جو چیز نکلے وہ اسکی سطح کے مطابق ہو،

نظامِ عمل، مولفہ مولانا محمد عبد الحامد قادری بدایونی تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت اوسط، قیمت:- عاہ، پتہ:- محمد عابد القادری صاحب دار التالیف مولوی محلہ بدایوں،

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، مسلمانوں کے لئے ان کی پیدائش سے لیکر موت تک کا نظام العمل ہے، اس میں اسلامی عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، رسوم، حکومت، تجارت وغیرہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے متعلق جن کی ایک مسلمان کو ضرورت ہوسکتی ہے، قرآنی احکام، احادیث نبوی، اسوۂ صحابہ اور فقہی مسائل دیدیئے گئے ہیں، آیاتِ قرآنی اور احادیث کا ترجمہ بھی ساتھ ساتھ ہے، ص ۱۵۰ میں "غریب" کو مفلس کے شاید ہم معنی سمجھا گیا ہے،

ہمارے نبی کے صحابہؓ، مؤلفہ مولینا اعجاز الحق صاحب قدوسی، تقطیع چھوٹی، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت اوسط، قیمت:- ۸ر

مسلمانوں کے لئے صحابۂ کرام کے اعمالِ حسنہ بہترین اسوۂ زندگی ہیں، اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر دار المصنفین نے سیر الصحابہ اور اسوۂ صحابہ شائع کی، مولانا اعجاز الحق صاحب نے چھوٹے بچوں کی تعلیمی ضرورتوں کا خیال کرکے صحابۂ کرام کے مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اسوۂ حسنہ لیکر آسان زبان

...جمع کر دیئے ہیں جو بچوں کی اخلاقی تعلیم کے لئے بہترین نصاب ہے،

فردوسِ خیال از جناب محمود صاحب اسرائیلی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

فردوسِ خیال جناب محمود صاحب اسرائیلی کے اردو اور فارسی رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے، اس میں اخلاق و حکمت مذہب و معاشرت اور مختلف عقائد و خیالات پر حکیمانہ رباعیاں اور قطعات ہیں، آخر میں چند مزاحیہ قطعات ہیں، خیالات میں حکمت اور کلام میں پختگی نمایاں ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ اربابِ ذوق میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا،

حیات حافظ خواجہ قطب الدین احمد، | مرتبہ جناب حکیم خواجہ شمس الدین احمد صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۴ صفحات کاغذ کتابت و طباعت اوسط پتہ نیچرل نامی پریس لکھنؤ

خواجہ قطب الدین احمد مرحوم لکھنؤ کے خاندانِ خواجگان کے پرانے باوضع بزرگوں میں تھے لکھنؤ کا مطبع نامی انہی کا قائم کیا ہوا ہے جس میں متعدد گراں پایہ اور نایاب کتابیں شائع ہوئیں، انکے فرزند رشید حکیم خواجہ شمس الدین احمد صاحب نے انکے سوانح حیات مرتب کئے ہیں، گو ایسے اشخاص کے سوانح لکھنا جنکا پبلک زندگی اور قومی و ملکی معاملات کو کوئی خاص تعلق نہیں رہا عام فائدہ اور دلچسپی کی چیز نہیں تاہم یہ سوانح عمری اس حیثیت سے لوگوں کے لئے بڑی سبق آموز ہے کہ خواجہ صاحب مرحوم نے محض اپنی محنت اور دیانت سے ایک معمولی حالت سے اتنی ترقی کی جو دوسروں کیلئے ایک اچھے نمونہ کا کام دے سکتی ہے،

شیدلا اور دوسری کہانیاں - از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن پروفیسر جامعہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

یہ کتاب چھ روسی کہانیوں "شیدلا چھوٹے کی کہانی" "کسان اور لومڑی" "عقاب اور مکڑی" "فلسفی اور ماہی گیر" "انسان" کا مجموعہ ہے، جو بچوں کیلئے لکھا گیا ہے چھوٹی کہانیاں دلچسپ نصیحت آمیز اور بچوں کے پڑھنے کے لائق ہیں،

(م)

سیرۃ النبی کے بعد مسلمانوں کے لئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ
سکتے ہیں، وہ حضرات صحابۂ کرام ہیں، دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان
م کو انجام دیا، اور اردو میں صحابۂ کرام کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدیں اعادیث
یر کے ہزاروں صفحات سے چنکر مرتب کیں، اور بہ حسن و خوبی شائع کیں، ضرورت ہے کہ حق طلب اور
یت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفوں کو پڑھیں، اور اس شمعِ ہدایت کی روشنی میں چلیں جو
ج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدوں کی علٰحدہ علٰحدہ قیمتیں حسب ذیل
ں جن کا مجموعہ [illegible] ہوتا ہے لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف [illegible] میں یہ دس
دیں کامل دی جاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار،

...د اول، خلفائے راشدینؓ،	[illegible]	جلد ششم، سیر الصحابۂ ششم،	[illegible]
...د دوم، مہاجرینؓ اول،	[illegible]	جلد ہفتم، سیر الصحابۂ ہفتم،	[illegible]
...د سوم، مہاجرینؓ دوم،	[illegible]	جلد ہشتم، سیر الصحابیاتؓ،	[illegible]
...د چہارم، سیر الانصارؓ اول،	[illegible]	جلد نہم، اسوۂ صحابۂ اول،	[illegible]
...د پنجم، سیر الانصارؓ دوم،	[illegible]	جلد دہم، اسوۂ صحابۂ دوم،	[illegible]

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ۱۰۷۱ اپریل ۱۹۳۶ء

معارف

مجلسِ دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت فی پرچہ

[illegible]

السیرۃ

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا گیا
اب تک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے، جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے،

تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایت صحیحہ ثابت ہیں اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ آیتیں قرآن پاک، صحیح احادیث سے اسلام کے صحیح عقائد کئے جائیں۔
پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کی عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،
چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد [illegible] حصہ دوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]
تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ چہارم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]
[illegible] تقطیع کلاں [illegible]

جلد ۳۹	ماہ محرم الحرام ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۳۷ء	عدد ۴

مضامین

شذرات

مارچ کا آخری ہفتہ ہماری تعلیمی کانفرنس علی گڈہ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا تھا، ۲۶ سے لیکر ۲۹ تک دن رات کانفرنس کے کئی کئی شعبون کے اجلاس ہوتے رہے، ان مین سے شعبہ تعلیم ابتدائی، شعبہ تعلیم ثانوی، شعبہ تعلیم اعلیٰ شعبہ مدارس اسلامیہ، شعبہ علوم وفنون اسلامی، شعبہ اردو، شعبہ اقتصادیات وغیرہ شعبون کے الگ الگ جلسے الگ الگ صدرنشینون کے زیر صدارت مختلف تاریخون مین ہوئے، جہانتک عالمانہ مقالون اور فاضلانہ خطبون کا تعلق ہے کانفرنس کا یہ اجلاس بیحد کامیاب ہوا، اگر اہل کانفرنس ان مقالون اور خطبون کا ایک مجموعہ جلد از جلد شائع کرسکین تو قوم کے ہاتھون مین وہ آئینہ دیدینگے، جس سے اس کو اپنے چہرہ کا ہر خط وخال نمایان نظر آجائیگا۔

کانفرنس مین سب سے پہلی اور سب سے اہم تجویز مسلم یونیورسٹی مین، ایک صنعتی کالج کے قیام کی تھی، جس کیلئے قوم سے تیس لاکھ کا مطالبہ کیا گیا تھا، مگر مجوز صاحب کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہ یہ صنعتی کالج قائم کرنا چاہتے ہین، اور نہ سنجیدہ طور سے انھون نے اس کو پیش کیا ہے، بلکہ مقصود یا تو چندہ تھا، یا قوم کے مطالبہ کی دفع الوقتی اس لئے یہ تجویز صرف سنادی گئی، اس کے عملی طریقون اور شکلون پر گفتگو نہین ہوئی،

مسلمانون مین انگریزی تعلیم کے بدیر رواج پانے اور نئی تعلیم مین پیچھے رہجانے کا حقیقی سبب مدتون تک یہ بتایا جاتا رہا ہے کہ علماے کرام نے اس کی سخت مخالفت کی تھی، لیکن چند سال کے بعد جب مسلمان صنعتی تعلیم مین

پیچھے رہجائین گے تو معلوم نہین اس کا الزام کس کے سر دھرا جائیگا، کیونکہ معلوم رہے کہ علماے کرام نے صنعتی تعلیم کے کسی شعبہ کی تعلیم کو ابھی تک حرام نہین قرار دیا ہے، بااین ہمہ سرکاری منصب کے خواہشمندون کی جماعت مین ابھی تک ادھر توجہ نہین کی جارہی ہے،

زمانہ روز بروز یہ ثابت کر رہا ہے کہ کسی قوم کی ترقی کا معیار یہ نہین ہے کہ اس مین کتنے جج، کتنے ڈپٹی، کتنے انسپکٹر اور کتنے وکیل ہین، یہ غلامون کی ذہنیت تھی اور ہے کہ ہم غلام آپس مین اس پر فخر کرتے ہین کہ ہم مین سے کتنون کو بادشاہ کی طرف سے زرین طوق اور زرین کمر اور زرین تمغے ملے ہین، ترقی کا معیار یہ ہے کہ ہم مین کتنے عالم، کتنے محقق، کتنے مجاہد کتنے کارفرما پیدا ہوئے ہین، ہم مین زندگی کی طاقت کتنی پیدا ہوئی ہے اور ہماری زندگی کے مختلف شعبون مین کتنی چہل پہل اور عملی رونق آئی ہے،

کانفرنس نے اس سلسلہ مین ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ مسلمانون کے پچھلے پچاس سال کے تعلیمی کاروبار اور آگے کے پروگرام پر اہلِ فکر اصحاب سے مبسوط و مدلل مضمون لکھوائے ہین، ان مین سے بعض بعض مضمون بہت اچھے ہین، اور اس قابل ہین کہ ان کی روشنی مین ہم آیندہ کا پروگرام طے کر سکین،

ہم کو مسلمانون کی زندگی کی ہر روش مین یہ نظر آرہا ہے کہ ان مین اور ان کے رہنماؤن مین زمانہ کے اثرات کا بُعد بڑھتا جاتا ہے، قوم کے نوجوان کہین اور جا رہے ہین اور ان کے بوڑھے رہنما کہین اور جانا چاہتے ہین، دونون کے ذوق، میلان، اور منزلِ مقصود کے تخیل مین اتنا فرق پیدا ہو گیا ہے کہ دونون کا ہم سفر بننا سخت مشکل بلکہ محال ہوتا جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ نوجوان اپنے اکثر رہنماؤن کے ساتھ عقیدت اور ان کی اطاعت چھوڑ رہے ہین، اور رہنما اپنی قوت و طاقت کھو رہے ہین، اب موقع ہے کہ علماے روشنضمیر آگے بڑھین،

اور نوجوانون کی رہنمائی کا صحیح فرض انجام دین،

علی گڈھ کانفرنس مین امسال ایک علمی و تعلیمی نمائش بھی تھی، علمی حصہ مین بہت سے شاہی فرامین، اردو اور فارسی کی قلمی کتابین، اور خوشنویسون کے ہاتھون کے قطعے، اور مصورون کے ہاتھون کی تصویرین تھین، اردو کی قلمی کتابین ہمارے دوست ڈاکٹر سید حفیظ صاحب (الہ آباد) کی اور فارسی کتابین مولوی ظفر حسن صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمۂ آثار قدیمہ آگرہ کی تھین، ان مین سے دو کتابین خاص کر ذکر کے قابل ہین، ایک شہزادہ دارا شکوہ کا فارسی دیوان جس مین شہزادہ کا تخلص قادری تھا، اور دوسرا تزک عالمگیری معلوم نہین یہ دوسرا نسخہ کیا تھا،

بہت دنون سے جی چاہتا تھا کہ اسلامیہ اسکول **اٹاوہ** کو جس کی تعریفین اکثر کانون سے سنا کرتے تھے، اپنی آنکھون سے دیکھین علی گڈہ سے واپسی مین ۳۰ر مارچ کو اٹاوہ اترے، اسکول کو دیکھا، اس کے تینون بورڈنگ دیکھے، اس کا کتبخانہ اور تاریخی نمائش خانہ دیکھا، وہان کے استادون سے ملنا ہوا، لڑکون کا رہنا سہنا دیکھا، خوشی ہوئی کہ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا، مولوی بشیر الدین صاحب جیسے انتھک کام کے دھنی منیجر، اور مولوی سید الطاف حسین صاحب جیسے نیک، سادہ اور محنتی ہیڈ ماسٹر اگر ہمارے دو چار اسلامی اسکولون کو بھی مل جاتے تو ہماری تعلیمی درماندگی بہت کچھ کم ہو جاتی،

اہل علم کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ دائرۂ معارف نعمانیہ حیدرآباد کی طرف سے مولانا ابوالوفا قندھاری نے قاضی ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار تصحیح و تعلیق کے بعد مصر سے چھپوا کر شائع کی ہے، کتاب الخراج کے بعد قاضی صاحب کی یہ دوسری کتاب اہل علم کے حلقہ تک پہنچی ہے،

مقالات

خلیل اللہ کی بشریت

حضرات انبیاے کرام کے اوصاف غالبہ

انبیا کے اوصاف کمالی

خلیل اللہ کے لغوی معنی "خدا کے دوست" کے ہیں، اور یہ حضرت ابراہیمؑ کا لقب ہے، لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے انبیاے کرام اللہ تعالیٰ کے دوست نہ تھے، کیا کوئی پیغمبر ایسا بھی ہو سکتا ہے جو خدا کا دوست نہ ہو، پھر صرف حضرت ابراہیمؑ ہی خلیل اللہ کیوں ہوں،

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب کلیم اللہ مشہور ہے، جس کے معنی ہیں "خدا سے باتیں کرنیوالا" "جس نے خدا سے باتیں کیں" لیکن کیا کوئی پیغمبر ایسا بھی ہے جس سے خدا نے کسی نہ کسی طرح باتیں نہ کی ہوں، پھر حضرت موسیٰؑ ہی کلیم اللہ کیوں کہلائیں،

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کہتے ہیں، حالانکہ تمام انبیاء اور نہ صرف انبیاء بلکہ ہر انسان کی روح خدا ہی کی روح ہے، پھر صرف حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کیوں کہیے،

اسی طرح اگر کوئی شخص حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو بہ تخصیص شاہد و مبشر و نذیر و داعی الی اللہ و سراج منیر کہے تو ایسا کہنا کیونکر درست ہوگا، درآنحالیکہ ہر نبی شہادت دینے والا نیکوکاروں کو بشارت سنانے والا گنہگاروں کو تنبیہ کرنے والا، خدا کی طرف پکارنے والا، اور روشنی بخشنے والا چراغ

بن کر آیا؟

عام لوگوں کو یہ شبہ اسلئے پیش آتا ہے، کہ وہ زبان کے ایک نکتہ سے پہلوتہی کرتے ہیں، وہ نکتہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے صرف اسی وصف سے ملقب کیا جاتا ہے، جو وصف اس میں بمرتبۂ کمال ہوتا ہے، بات ہر شخص کرتا ہے، اسلئے لغت کے لحاظ سے ہر شخص ابو الکلام ہے، مگر استعمال میں ابو الکلام اسی کو کہیں گے جسمیں کلام کی خوبی، برجستگی، یا طول وجہ کمال ہو،

آنکھیں اور ہاتھ کس انسان کے پاس نہیں اسلئے اولی الایدی والابصار (ہاتھوں اور آنکھوں والے) سبھی ہیں، مگر قرآن پاک نے اسکو خاص طور سے انبیاے کرام کا وصف قرار دیا، اور فرمایا۔

واذکر عبدنا ابراھیم واسحاق ویعقوب اولی الایدی والابصار (ص ۴)	اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے،

ہاتھ عمل کے لئے اور بصارت علم کے لئے ہے، اس سے مقصود انسان کی عملی اور علمی قوتوں کا کمال ہے، چونکہ حضرات انبیاءؑ کی عملی اور علمی دونوں قوتیں مرتبۂ کمال پر ہوتی ہیں، اس لئے تمام انسانی طبقوں میں اولی الایدی والابصار (ہاتھوں اور آنکھوں والے) کے لقب کے وہی مستحق قرار پائے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالی نے مختلف انبیاء علیہم السلام کو مختلف اوصافِ کاملہ سے یاد فرمایا حضرت ابراہیمؑ کی نسبت فرمایا،

واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا (نساء)	اور خدا نے ابراہیم کو دوست بنایا،

حضرت موسیٰ کی نسبت ارشاد ہوا،

وکلم اللہ موسیٰ تکلیما، (نساء ۲۳)	اور اللہ تعالی نے موسیٰ سے بہت سی باتیں کیں،

حضرت اسماعیلؑ کو فرمایا،

اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (مریم-۴) اسماعیل وعدہ کے سچے تھے،

حضرت ایوبؑ کے متعلق ارشاد باری ہے،

اِنَّا وَجَدْنَاہُ صَابِرًا ، (ص) ہم نے اسکو صابر پایا،

غور کیجئے کہ انبیاءؑ میں کون نہیں جس سے خدا نے دوستی نہیں کی، یا خدا نے اس سے باتیں کیں نہ، یا وہ وعدہ کا سچا نہ تھا، یا حق کی راہ میں وہ صابر نہ ٹھہرا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دوستی کے وصف سے صرف حضرت ابراہیمؑ کو، ہم کلامی کے وصف سے صرف حضرت موسیٰؑ کو صدق وعدہ کے وصف سے صرف حضرت اسماعیلؑ کو، اور صبر کے وصف سے صرف حضرت ایوبؑ کو ممتاز فرمایا، حالانکہ خود قرآن کہتا ہے کہ

وَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ (اے رسول آپ بھی ویسے ہی صبر کیجئے جیسے

مِنَ الرُّسُلِ (احقاف ۵) ہمت والے رسولوں نے کیا ہے،

مگر اس عموم کے باوجود تمام انبیاء میں سے مخصوص طور پر صرف حضرت ایوبؑ ہی کو صابر کہکر یاد فرمایا گیا، جس کے یہ معنی نہیں کہ نعوذ باللہ دوسرے انبیاء اس صبر کے وصف سے معرا تھے، بات یہ ہے کہ گو ہر شخص کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کی استعدادیں ملتی ہیں، مگر ان میں سے ایک ہی دو استعدادوں کا کمال نصیب ہوتا ہے، بالقوی استعدادوں کی فعلیت زمانہ کے اقتضا، حالات کی مناسبت، وقت کی ضرورت اور پیش آمدہ واقعات کے مطالبہ کی بنا پر ہوتی ہے، جہاد کا حکم ہر پیغمبر کو ہوا، مگر ہر ایک کی زندگی میں اس کے مناسب حالات پیش نہیں آئے، اسلئے حضرت موسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی پاک زندگیوں میں جہاد کے جو مناظر پیش آئے، وہ دوسرے پیغمبروں کے سامنے پیش نہیں آئے،

غرض کسی شخص میں کسی وصف کا موجود ہونا اور بات ہے، اور اس وصف کے کلی ظہور کے مواقع پیش آنا، اور ان کے مطابق اس وصف کا بمرتبہ کمال ظاہر ہونا اور بات ہے، انبیا کا کسی وصف خاص سے ملقب اور ممتاز ہونا پہلے اوصاف کی بنا پر نہیں، بلکہ دوسرے اوصاف کی بنا پر ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ، حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ، حضرت عیسیٰؑ روح اللہ، حضرت اسمٰعیلؑ صادق الوعد، اور حضرت ایوبؑ صابر ٹھہرے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ نے نسلاً بعد نسلٍ دوستی کا جو وعدہ فرمایا، اور جس کی علامت کے طور پر ان کی اولاد در اولاد کو نبوت و برکت سے سرفراز فرمایا، یہ دوستی کا کمال کسی نبی کو عنایت نہیں ہوا، حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر جس طرح ہم کلامی کا شرف بخشا گیا، وہ کسی اور نبی کے حصہ میں نہیں آیا، حضرت عیسیٰؑ کو روح الٰہی کا فیضان جس کمال کے ساتھ ملا، وہ کسی اور نبی کو نہیں دیا گیا، چنانچہ فرمایا،

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ	یہ پیغمبر ان میں سے بعض کو بعض پر ہم نے
عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ	برتری دی، ان میں سے کوئی تو ایسے
وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا	ہیں جن سے خود اللہ نے کلام کیا، اور
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ	بعض کے درجے بلند کئے، اور مریم کے
بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط	بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں دیں، اور
(بقرہ-۳۳)	روح القدس سے ان کی تائید کی،

اس پاک آیت میں تین پیغمبروں کا وصفِ امتیاز بیان کیا گیا، پہلے حضرت موسیٰؑ کا کہ ان کو کلیمیت ملی، اور سب سے آخر میں حضرت عیسیٰؑ کا کہ ان کو معجزات اور روح القدس کی تائید بخشی گئی، دونوں کے بیچ میں ایک پیغمبر کا ذکر ہے، جس کو درجوں اور مرتبوں کی بلندی ملی، یہ بیچ کے پیغمبر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کی شریعت وسط اور صراط مستقیم اور موسویت اور عیسویت

میں معتدل ہے، اسلئے آپ کا ذکر بھی ان دونوں کے بیچ میں ہے،

ہمارے رسول اللہ صلعم کو درجوں اور مرتبوں کی جو بلندی ملی، اسکی تفصیل اور تشریح جتنی بھی کیجائے کم ہے

اور قرآنِ پاک میں جابجا اسکی تشریح ہے، منجملہ اس کے ایک یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کلیمیت اور حضرت عیسیٰؑ کو تائید بروح القدس کی جو فضیلت عطا ہوئی، وہ شخصی فضیلتیں ہیں، اور ہمارے رسول کو جن درجوں اور مرتبوں کی فضیلت عطا ہوئی، وہ شخصی کے علاوہ دینی وعمومی ہیں، آپ کو جو بالذات فضیلت بھی عطا کی گئی، مثلاً خاتمیت، وہ بھی آپ کی کتاب، آپ کی شریعت، اور آپ کی امت کو شامل ہے، آپ کے دین کو عموم بخشا گیا، آپ کو نبی الامم اور نبی الانبیاء دونوں بنایا گیا، آپ کے دین پر دین الٰہی کے ہر گوشہ کی تکمیل کی گئی، آپ کی کتاب کو خاتم الکتب اور ناسخ الکتب بنایا گیا، اور قیامت تک کیلئے اسکی حفاظت کا وعدہ کیا گیا، اور آپ کی امت کو آخر الامم کا لقب ملا، ع

ہر چند وصفت می کنم لیکن ازاں بالاتری

بایں ہمہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں، کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کو خدا نے ہم کلامی کا شرف نہیں بخشا، یا روح القدس کی تائید عطا نہیں ہوئی، یہ دونوں باتیں آپ کو بھی ملیں، لیکن یہ باتیں آپ کا وصفِ امتیازی نہیں بنائی گئیں، بلکہ اور دوسری دوسری باتوں کو آپکا وصفِ امتیازی ٹھہرایا گیا، مثلاً فرمایا:-

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ	ہم نے تجھکو گواہ اور خوشخبری سنانیوالا
مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ، (فتح-۱)	اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا،
يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا	اے پیغمبر ہم نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری
وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ	سنانے والا اور ڈرانیوالا، اور خدا کی طرف
بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ، (احزاب)	پکارنے والا اور روشن کرنیوالا چراغ بناکر بھیجا،

یہ آپ کے منجملہ دیگر امتیازی صفات کے چند امتیازی صفات ہیں، جن کا یہ منشا نہیں کہ ان صفات سے دیگر انبیاء علیہم السلام خالی تھے، بلکہ یہ ہے کہ ان اوصاف کمالیہ کا یہ اجتماع ان کی ذات میں اس درجۂ کمال میں نہ تھا، جو محمد رسول صلعم کی ذات پاک میں تھا، چنانچہ پورے قرآن میں کسی خاص پیغمبر کے یہ اوصاف بتخصیص نام لیکر سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے نہیں قرار دئے گئے، کیونکہ مقام مدح میں وہی اوصاف بیان کئے جاتے ہیں، جو کسی موصوف کے اوصاف امتیازی اور کمالی ہوتے ہیں جنکو اوصاف غالبہ کہتے ہیں،

اسی نکتہ کو مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالے تحذیر الناس میں یوں بیان فرماتے ہیں

> مگر کوئی ملقب ہوتا ہے تو اپنے اوصاف غالبہ کے ساتھ ملقب ہوتا ہے، مرزا جان جاناں صاحبؒ اور شاہ غلام علی صاحبؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور شاہ عبد العزیز صاحبؒ چاروں صاحب جامع بین العلم والفقر تھے، پر مرزا صاحب اور شاہ غلام علی صاحبؒ تو فقیری میں مشہور ہوئے اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبد العزیز صاحب علم میں، وجہ اس کی یہی ہے کہ ان کے علم پر ان کی فقیری غالب تھی، اور ان کی فقیری پر ان کا علم، اگرچہ ان کے علم سے اُنکا علم، یا ان کی فقیری سے ان کی فقیری کم نہ ہو، سو انبیاء میں علم عمل سے غالب ہوتا ہے اگرچہ ان کا عمل اور ہمت اور قوت، اوروں کے عمل اور ہمت اور قوت سے غالب ہو، بہرحال علم میں انبیاء اوروں سے ممتاز ہوئے ہیں، (ص ۵۰)

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

> "نبوت کمالات علمی میں سے ہے، اور آپ جامع العلوم ہیں، اور انبیاء باقی جامع نہیں، (ص ۵۰)

غرض یہ ہے کہ مقام مدح میں خاص خاص انبیاء علیہم السلام کے وہی اوصاف

جاتے ہیں، جن میں ان کو دوسروں پر امتیاز اور فضیلت حاصل ہو، اسی بنا پر آنحضرت صلعم کی مدح میں جو شاہد و مبشر و نذیر و داعی الی اللہ و سراج منیر کے الفاظ بالاطلاق آئے ہیں، ان کا یہی مقصد ہے، کہ آپ میں یہ اوصاف مجتمعہ ایسے مرتبۂ کمال پر تھے، جو کسی اور نبی میں نہ تھے،

اوصافِ کمالی کے علم کے طریقے، انبیاء علیہم السلام کے یہ امتیازی اوصاف دو طریقوں سے معلوم ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ بہ نصِ صریح ان کا اظہار ہو، جیسے حضرت موسیٰؑ کیلئے کلیمیت، حضرت عیسیٰؑ کے لئے تائید بروح القدس یا حضرت اسمٰعیلؑ کیلئے صدقِ وعد، اور حضرت ایوبؑ کے لئے صبر، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لفظوں میں اس وصف کی تصریح نہ ہو، مگر ان کی زندگی کے عملی کارناموں میں وہ وصف نمایاں نظر آتا ہو، جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام میں نذیریت کا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام میں مبشریت کا کمال،

نذیریت کے کمال کے یہ معنی ہیں، کہ اس میں خدا کی قہاری وجباری اوصاف کا ظہور زیادہ ہو، اور کمال مبشریت کے یہ معنی ہیں، کہ خدا کے فضل و کرم اور رحمت عام کا رنگ زیادہ نمایاں ہو، جیسا کہ خدا نے آنحضرت صلعم کو مبشر وغیرہ لکھکر فرمایا، تو وہیں اسکی تصریح فرمائی،

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا،	اور ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کے لئے خدا کی طرف سے بڑی
(احزاب - ۶)	مہربانی (فضل) ہے،

کمالِ نذیریت میں اللہ تعالیٰ کے قہر و عذاب کا پہلو اس کے فضل و کرم سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے، جیسے نوح علیہ السلام اپنی ہزار سالہ تبلیغ کی ناکامی سے جب مایوس ہوئے، تو ان کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ خدا کی بارگاہ میں کفار کی پوری نسل کی بربادی و ہلاکت کی دعا مانگی، عرض کی :-

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ	اے میرے پروردگار تو زمین پر کافروں

وَّيَارًا اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا، رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا۔

(نوح - ۲)

میں سے کوئی گھر بسانے والا مت چھوڑ، بیشک اگر تو اُن کو چھوڑے گا، تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے، اور ان کی اولاد جو ہوگی وہ بھی بدکار اور سخت کافر، اے میرے رب مجھے اور میرے والدین کو، اور جو میرے گھر میں با ایمان آئے، اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بخش دے، اور ظالموں

اس آیت میں نذیریت اور بشیریت دونوں کے جلوے ہیں، مگر غور کیجئے کہ نذیریت کا غلبہ بشیریت سے کتنا زیادہ ہے، اہلِ ایمان کے لئے صرف مغفرت کی دعا کے ساتھ ساتھ پورے روئے زمین کے کافروں اور ان کی پوری نسل کی ہلاکت کی دعا ہے، اور پھر انہی کی کامل تباہی و بربادی کی خواہش پر دعا کا خاتمہ ہے، اور آخر ساری قوم تباہ و برباد ہوگئی،

حضرت موسیٰ اہلِ فرعون کے حق میں یہ دعا مانگ کر اپنی نذیریت کی شان کا کمال ظاہر فرماتے ہیں:-

رَبَّنَا اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا

ہمارے پروردگار تونے فرعون اور اس کے درباریوں کو شان و شوکت اور دولت دنیا میں دی ہے، اے ہمارے پروردگار تاکہ تیرے راستہ سے بہکا دیں اے ہمارے پروردگار انکی دولت کو مٹا دے اور انکے دلوں کو

حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ
(یونس - ۱۰)

سخت کر دے تو وہ ایمان نہ لائیں، یہانتک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں،

اس کے بالمقابل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفتِ تبشیر کا کمال ملاحظہ ہو، کہ اللہ تعالیٰ اُن سے اُن لوگوں کی نسبت جب دریافت کرے گا، جو ان کے بعد شرک میں مبتلا ہوئے، تو موقع پاکر عرض کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی شان رحمت سے اپیل کرتے ہیں،

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ، اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ
(مائدہ - ۱۶)

میں نے اُن سے وہی کہا جو تو نے حکم دیا کہ میرے اور اپنے رب کو پوجو اور جب تک میں ان کے درمیان تھا اون کو دیکھتا بھالتا تھا، اور جب تو نے مجھے وفات دی، تو ہی ان کا نگہبان تھا، اور تو ہر چیز کی خبر رکھتا ہے، اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اگر تو اُن کو معاف کر دے تو تو قدرت اور حکمت والا ہے،

اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی کی یہ تحریک اُن کے حق میں ہے، جن کی نسبت حضرت عیسیٰؑ خود ہی نذیری فرما چکے ہیں،

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ
(مائدہ - ۱۰)

بیشک جو کسی کو خدا کا شریک بنائیگا، تو اللہ نے جنت اُس پر حرام کر دی ہے، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے،

گویا ایں ہمہ اُن کی بخشش کے لئے بھی رحمت الٰہی کی سلسلہ جنبانی فرماتے ہیں، ظہور محمدی کی بشارت

کا پیغام لے کر بھی وہ آئے ملاور کھا،

مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَاتِي مِنْ بَعْدِي	اس رسول کی بشارت لیکر آیا ہوں جو
اسْمُهُ أَحْمَدُ،	جو میرے بعد آئے گا، اور جسکا نام احمد ہے!

حضرت ابراہیمؑ کی بشارت | اس سے زیادہ جمال بشارت حضرت ابراہیمؑ کے روے اقدس میں ہے، وہ مجمع خیر و برکت لے کر آئے، نبیوں اور رسولوں کے مورث قرار پائے، اسماعیلؑ و اسحاقؑ کے خاندانوں کی برکتیں اُنہی کے ذریعہ اتریں اور آدم کے سارے گھرانوں کو ان کے ذریعہ ہدایت کی روشنی ملی، نبی الحرمین رحمۃ للعٰلمین علیہ السلام کے ظہور کی دعا انھوں نے کی،

دعاے خلیل و نوید مسیحا

اور دونوں مُبشر!

(باقی)

الجہاد فی الاسلام

اس کتاب میں اسلامی جہاد کی حقیقت بتائی گئی ہے، اسلام کے قوانین صلح و جنگ کی تفصیل کرکے دوسرے مذاہب کے قوانین جنگ سے ان کا مقابلہ کیا گیا ہے، اور موجودہ یورپین قوانین جنگ پر تبصرہ کرکے ان پر اسلامی قانون کا تفوق ثابت کیا گیا ہے، اور مخالفین کے تمام شکوک و شبہات زائل کئے گئے ہیں،

ضخامت:- ۴۹۰ صفحے. لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ. قیمت:- ۳ع

"منیجر"

رامچندرجی کی کہانی

از

جناب سبطین احمد صاحب بی، اے، بدایوں،

(۳)

افسانے کے افراد متعامات | پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ مسٹر ٹنکیا ر تنام کی تصنیف کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ہندی تمدن اور ہندو روایات خالص آریہ قوم کی تخلیق نہ تھیں، بلکہ اس کے برعکس ایسی شہادتیں موجود ہیں جو ظاہر کرتی ہیں، کہ ہندو تہذیب کے بہت سے آئین اور ہندو ادبیات کی بعض روایتیں دوسری قوموں اور دوسرے ممالک کا عطیہ ہیں، اس صورت میں رامائن کے افسانہ کو بدیسی چیز سمجھنا قرائن کے خلاف نہیں کہا جاسکتا،

مسٹر ونکیا ر تنام کے تخریبی استدلال کا ملخص جو اس مضمون کی دوسری اشاعت میں پیش کیا گیا تھا یہ امر واضح کر چکا ہے کہ رامائن مختلف اور متضاد بیانات سے بھری ہوئی ہے، اور اکثر واقعات باہم مربوط نہیں کئے جاسکتے، لہذا یہ قرینہ پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے واسطوں سے گذر کر وہ ہندوستان پہنچی، دوسرے ہندوستان کے قدیم آثار میں کوئی شہادت اس کے بیان کی تصدیق کرنے والی نہیں تھی جس کی بنا پر اسکو کسی ہندوستانی راجہ سے متعلق کہا جاسکے، تیسرے رامائن کی قدامت مشتبہ ہے لہذا اس کا سنہ تصنیف مصر کے رامینز ثانی سے قبل نہیں سمجھا جاسکتا، ان بحثوں کے بعد وہ موافقات جو

ونیکٹا رتنام کا نظریہ قبول کرنے سے روک سکتے تھے، ہٹ جاتے ہیں، اب تعمیری استدلال کا جائزہ لینا باقی رہ جاتا ہے، جو زیادہ تر لغوی اور لسانی تحقیق پر مبنی ہے،

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ تاریخ کا آخری ذریعۂ اطلاع الفاظ ہی ہوتے ہیں، تحریری اور تعمیری آثار، کتبے اور عمارتیں ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد مورخ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، اسوقت وہ لغات سے مدد لیتا ہے، اور اُن کی زبان سے بھولا ہوا افسانہ سنتا ہے، لیکن مسٹر ونیکٹا رتنام کی تحقیق کے نمونے پیش کرنے سے پہلے رامیسز ثانی سے تعارف ضروری ہے،

مصر کے تمدن کی تاریخ مسیح علیہ السلام سے چار یا پانچ ہزار سال پہلے شروع ہوتی ہے، یہ مسئلہ نزاعی ہے، کہ قدیم مصری قوم وہیں کی رہنے والی تھی، یا کسی دوسرے ملک سے جاکر آباد ہوئی تھی، چار یا پانچ ہزار قبل مسیح سے لیکر سکندر کی فتوحات تک، مصر میں تقریباً تیس شاہی خاندان حکمران رہے، ان میں بعض ایک دوسرے کے ہمعصر اور ایک ہی وقت میں ملک کے مختلف حصوں پر قابض تھے، شمالی مصر کے سلاطین کا پایۂ تخت اکثر شہر منفس رہا، جنوبی حکومتوں کا صدر مقام شہر طبس تھا، ان تمام خاندانوں میں اٹھارھویں اور انیسویں سلسلے زیادہ مشہور تھے، رامیسز ثانی کا تعلق اٹھارھویں سلسلے سے ہے، اور اور اس کا دورِ حکومت تیرھویں صدی قبل مسیح تھا، مگر یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ فراعنۂ مصر کے سن بہت مشتبہ ہیں، اور بعض قیاسات میں صدیوں کا تفاوت ہے،

رامیسز کا خاندان نوعروج خاندان تھا، جس کے اقتدار کی شروعات اسکے دادا رامیسز اول سے ہوئی، رامیسز اول کا جانشین اس کا بیٹا سیتی ہوا، جس کے بعد رامیسز ثانی تخت پر بیٹھا، رامیسز کی فتوحات کا حال مسیرو کی اس عبارت سے ظاہر ہے،

پھر اس کی توجہ ڈیلٹا کی طرف مبذول ہوئی، شام میں فراعنہ کے مقبوضات کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے، اور شام کے قریب حطیوں کی ایک زبردست سلطنت عروج پارہی تھی، چنانچہ ستر ہوئیں

خاندان کے آخری فرعون مجبوراً منفس شہر میں زیادہ قیام رکھتے تھے (جہاں سے شامی علاقوں کی نگہبانی زیادہ آسان تھی) رامیسز ثانی کو محسوس ہوا کہ خاکنائے سویز کے قریب کسی مضبوط مقام پر قبضہ رکھنا نہایت ضروری ہے تاکہ وہاں حفاظت کے ساتھ قیام کیا جاسکے، چنانچہ زالو کے قریب ایک سرسبز اور صحت بخش مقام پر اوس نے قلعہ بنایا، جس کا نام اپنے نام پر رکھا، اور جس کا حال اس زمانہ کے شاعر ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں، یہ قلعہ ایک سرحدی چوکی کا کام دیتا تھا، جہاں سے بادشاہ دشمنوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا......"

"رامیسز ثانی کے دوسرے اور چوتھے سال جلوس میں دو مرتبہ خاکنائے عبور کر کے فوج کشی کی گئی، ان دونوں مہمات کے مقصد بغیر خون بہائے پورے ہوگئے، چوتھا سال جلوس ختم ہوا تھا، کہ خاطی قوم نے بغاوت شروع کی جس کی وجہ سے دونوں ریاستوں میں اَن بَن ہوگئی، اور ایک باقاعدہ جنگ وجدال کی نوبت پہونچ گئی، ختیاسرو نے اپنے بھائی مزاسرو کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا، اور تجیر سپاہیوں کو جمع کر رہا تھا، رامیسز نے حملے سے پہلے ہی دفع دخل مقدر کی ٹھان لی، اوس نے لشکر فراہم کیا جس میں مصریون کے علاوہ لی بیا اور ایتھوپیا کے لوگ بھی شامل تھے، اس سپاہ نے دریا کو زالو کے قریب عبور کیا، اور کنعان کے ملک سے تیزی کیساتھ گزر کر لطانی کی وادی میں اور بعد ازان دریائے اورنتش کی وادی میں پہنچ گئی، ختاسرو، لبنان کے جنگلوں میں چھپا ہوا پڑا تھا، اس کے جاسوس صحیح اطلاعیں پہنچا رہے تھے، رامیسز حرکت کر کے ......پہونچا جہاں دو بدویوں سے اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش کی ......رامیسز نے خاندانی لشکر لیکر حملہ کیا، دشمن کی حربی گاڑیاں اسکو گھیر گھیر لیتی تھیں، آٹھ مرتبہ اوس نے دھاوا کیا، اور دشمن کی صفیں درہم برہم کر دیں، ایک مرتبہ وہ بالکل تنہا رہ گیا، مگر اپنی بہادری اور اوسان ٹھکانے رہنے کے سبب سے بچ گیا، ختاسرو پسپا ہوا، کیونکہ مقابلہ بے سود تھا،.......رامیسز نے ارادہ کر لیا کہ اس مہم کے واقعات مثلاً جاسوسوں کی مار پیٹ، شامیوں کا فرار ہونا، اور قادیش شہر کا حوالہ کیا جانا، ابوسمبل، لکسر اور رامیسئم

وغیرہ مقامات پر مندروں کی دیواروں پر منقوش کر دیئے جائیں، پنتور کی نظم بھی انہی واقعات کو بیان کرتی ہے۔

قادیش کی نسبت پروفیسر پیٹری لکھتا ہے کہ

"قادیش کے متعلق پہلا سوال تو یہ ہے کہ وہ کہاں واقع تھا، بعض نے اس کا محل وقوع جھیل نجی منددیر بتایا ہے، اور بعض نے اس بنا پر کہ قادیش تصویر میں پانی سے گھرا ہوا دکھایا گیا ہے، اس جزیرہ کو قرار دیا ہے، جو جھیل کے اندر واقع ہے؛

یہ تھی وہ مہم جو مسٹر وینکا ٹرتنام کے بقول رامائن کی بنیاد اولین ہے، جہاں تک حربی نقل و حرکت کا تعلق ہے، رامیسز کی مہم راجندر جی کے سفر سے پوری مطابقت رکھتی ہے، جس طرح رام اپنے دار السلطنت روانہ ہو کر گنگا عبور کرتے ہیں، پھر ڈنڈک ارن یام نامی جنگل میں داخل ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کے سرحد پر لنکا کا محاصرہ کیا جاتا ہے، اور راون قتل ہوتا ہے، اسی طرح رامیسز شہر منفس سے روانہ ہو کر دریائے نیل کو عبور کرتا ہے، اور تنتا کے بیابان میں داخل ہوتا ہے، اور سرحد پر پہنچکر قادیش کا محاصرہ کرتا ہے، جو دریا سے گھرے ہوئے ایک جزیرہ پر واقع ہے، یہاں تک کہ ختا سر قتل ہو جاتا ہے،

اس شامی جنگ کے علاوہ رامیسز نے مصر کے جنوب میں ایتھوپیا یا نیوبیا پر بھی حملہ کیا تھا، ابوسمبل وغیرہ میں مندروں کی دیواروں پر دکھایا گیا ہے، کہ نیوبیا کے مفتوح سردار اس کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں، اور ان میں جنوب کے رہنے والے حبشی بھی ہیں، مال غنیمت اسکے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، جس میں اور جانوروں کے علاوہ بندر بھی شامل ہیں، مسٹر وینکا ٹرتنام کے بقول صدیوں بعد رامیسز کی نسبت جو افسانے مشہور ہوئے، ان میں یہ دونوں لڑائیاں ایک داستان میں گوندھ دی گئیں، اور چونکہ ہر افسانہ بغیر چاشنی عشق کے دخل کے بے تمک معلوم ہوتا ہے، کسی شاعر نے جنگ کا سبب بصنعت حسن التعلیل رامیسز کی ملکہ کی چوری کو قرار دیدیا، اور یہ خیال غالباً یونانیوں کی اس روایت سے اڑا لیا گیا جس کو ہومر کی ایلیڈ نے حیات دوام نصیب ہو چکی ہے،

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، کتاب کا اصل استدلال مصری اور ہندی ناموں کی تطبیق ہے، اور یہی مصنف کی اَن تھک محنت کا کارنامہ ہے، ان تمام ناموں کو پیش کرنا تو اس مضمون کے حدود سے باہر ہے، چند مقامات اور افراد کا تطابق بطور نمونہ حاضر کیا جاتا ہے،

ابتدا، رام ہی سے کرنا چاہئے، مصنف کے بقول ہندی رام مصری رامیسز کی دوسری شکل ہے رام کو ہندوستانی کہنے سے سب سے پہلے تو یہ بات مانع ہے، کہ ہندوستان میں کوئی تاریخی شہادت یا کوئی یادگار ایسی باقی نہیں، جسکو یقین کے ساتھ رام کے ساتھ علاقہ ہو، برخلاف اس کے رامیسز کے مجسمے اور بہتر شاعری کی نظم جس کے نسخے پیپرس کے پتوں پر لکھے ہوئے آج بھی موجود ہیں، رامیسز کے وجود پر ناقابلِ انکار شہادتیں ہیں، پھر ہندوستانی رامائن میں رام کا جو حلیہ بیان کیا گیا ہے، وہ رامیسز کے مجسموں پر پورا اُترتا ہے اس نظریہ کی تائید اس امر سے ہوتی ہے، کہ رام کا لفظ ہندی نہیں، بلکہ سامی الاصل ہے چنانچہ اسیریا کے شاہی خاندان میں ایک بادشاہ اس نام کا مذکور ہے، رام کی اصل غالباً شہر طب کے مصری دیوتا کا نام ہے، جو ہیروغلفی رسم الخط میں "امن رع" پڑھا گیا ہے، چونکہ ہیروغلفی الفاظ بائیں جانب سے دائیں طرف کو اور دائیں طرف سے بائیں جانب کو دونوں طرح پڑھے جا سکتے ہیں، اس لئے "آمن رع" کو "رع آمن" بھی پڑھ سکتے ہیں جس کا ہندی تلفظ، رامان یا راما ہوگا، ہندوستانی دیوتا سندر "راآمن" یا "سندر رمن" بھی جس کے نام پر اب تک لوگ بچوں کو یہ نام دیتے ہیں، اصل میں مصر کے اس دیوتا کو سمجھنا چاہئے جس کو "آمن رع سندر" یا بہ تغیر ترتیب "رع آمن سندر" کہتے تھے طب کا ایک کتبہ ٹیورن میں موجود ہے جسکے لکھنے والے اسی "رع آمن دیوتا" کے پجاری ہیں،

ہندوستان میں رام کی پیدائش ایک پُراسرار صورت سے واقع ہونا بیان کی جاتی ہے، جو اس تاریخی تحقیق کی طرف اشارہ کرتی ہے، کہ رامیسز کا خاندان ایک نوعروج خاندان تھا چنانچہ مصریات کا ماہر پروفیسر بیزی لکھتا ہے:۔

"اس خاندان کی ابتدا نامعلوم سی ہے، پہلے رامیسز نام کا ایک وزیر آمن ہوتیپ کے عہد میں مذکور ملتا ہے، رامیسز اول اور اس کا بیٹا سیتی غالباً شاہی خاندان سے رشتہ رکھتے تھے"

بال کھنڈ میں سیتا اور رام کی شادی کے وقت رام کا جو نسب نامہ دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ وشنو سے برہما جی پیدا ہوئے، برہما کے لڑکے اکش وشو تھے، اور اکش وشو کا بیٹا دسرتھ یعنی رام کا باپ تھا، اس نسب نامہ سے بھی رام کے غیر ہندوستانی اور سامی ہونے کا پتہ چلتا ہے، کیونکہ مصنف کے بقول یہ امر قریب قریب تحقیق ہو چکا ہے کہ برہما جی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دوسرا نام ہے، اور اکش وشو اسحاق کی دوسری شکل ہے۔[1]

دراوڑی زبانوں میں رام کا لفظ اپنی زیادہ صحیح صورت میں موجود ہے، مثلاً تامل اور ملایالم زبانوں میں رام کو "رامن" بولتے ہیں، جو "رع آمن" کی بجنسہ نقل ہے، مصری "رع آمن" کا نون سنسکرت نے جو آخری حروف کو غیر ساکن رکھنے کی عادی ہے، حذف کر دیا، اور میم کی حرکت قائم رکھی، چنانچہ رام بنا لیا، اس لغوی بحث سے کافی قرائن یہ باور کرنے کے لئے پیدا ہو جاتے ہیں، کہ رام کسی سامی النسل فرمانروا کا نام تھا، اور اس لفظ کی اصل بھی سامی زبان کا کوئی لفظ ہے، رامیسز میں اگرچہ ایک ٹکڑا زیادہ ہے لیکن رام اور رامیسز کو ایک شخص سے منسوب سمجھنے میں تامل نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ رامیسز وہ شخص ہے جس کو بہت سے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا رہا، مس ایڈورڈس کہتی ہے،

"مصری تاریخ میں رامیسز ثانی ہمیشہ سے ایک مرکزی شخصیت رہا ہے، اور رہے گا، اس کو یہ امتیاز درجہ کچھ تو استحقاقاً اور کچھ اتفاقاً حاصل ہو گیا ہے،...... اس کی تقدیر میں تھا کہ مرنے کے بعد دوسروں

---

[1] برہما کا ماخذ ہے، "برہم ہتی" جس کے معنی ہیں، وہ جو آدمیوں کی تعداد بڑھاتا ہے، اور کتاب پیدائش میں حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا ہے، کہ اب تیرا نام ابرم نہیں، بلکہ ابراہام ہوگا، کیونکہ میں نے تجھ کو بہت سی قوموں کا باپ بنایا ہے، (دیکھئے ۱۷ تا ۵)

کی شہرت غصب کرنے ہی نہیں، بلکہ صحیح نام فراموش ہوجاتا، اور مختلف مرفی ناموں سے یاد کیا جانا بھی مقصد تھا،

یہی وہ رامیسز ہے جس کی عظمت اور شوکت نے اُس کی ذات کو ایک افسانہ کا ہیرو بنا دیا، یہ افسانہ

ہندوستان پہنچا، اور بہت سی تحریف و تصریف کے بعد کسی ہندی شاعر نے اسکو نظم کر دیا،

راماین کا دوسرا زبردست کردار سیتا جی ہیں، راماین کا بیان ہے، کہ یہ نام اسلئے پسند کیا گیا تھا کہ جنک نے ہل چلاتے وقت ان کو پایا تھا، بہ الفاظ دیگر وہ کسی عورت کے بطن سے پیدا نہ ہوئی تھیں، بلکہ دھرتی ماتا کی اولاد تھیں، لیکن سیتا ایک بہت ہی قدیم مصری نام ہے، جو دوسرے مصری ناموں کے ساتھ اکثر لگا ہوا ملتا ہے، مثلاً سیتہ ہوتر زمین اور گاے کی دیوی کو کہتے تھے، سیت آمن" اٹھارھویں خاندان میں جس سے رامیسز کا تعلق تھا، بعض شہزادیوں کا نام ہے، سیتا تما ایک مطانی بادشاہ کا بھی نام تھا، چنانچہ یہ ایک قدیم لفظ ہے، جس کے معنی زمین یا زمین کی دیوی کے ہیں آج بھی یہ نام مصر میں رائج ہے، اور شاید ہندوستان سے زیادہ وہاں اب بھی دولتمند خواتین کے نام کے ساتھ عزت اور ادب کے لحاظ سے اسکو لگا دیا جاتا ہے، قاہرہ میں آج بھی ایک مسجد "سیتا زینب" کی مسجد کہلاتی ہے،

طل العمرنا کے محفوظ خطوط سے معلوم ہوتا ہے، کہ مطانی بادشاہ دسرتھ کی بہن مصر کے فرعون آمن ہوتپ ثالث کو بیاہی گئی تھی، اور اس سے ایک لڑکی سیت آموں تھی، جو دسرتھ کی بھانجی اور مصر کے موتھ فرعون آمن ہوتپ چہارم کی بہن تھی،

طب کے پجاریوں نے آمن ہوتپ کو کافر ٹھہرایا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ یادگاروں میں جہاں کہیں اس کا نام تھا مٹا دیا گیا، اس کے بعد مصر کے سلاطین میں دوسرا مشہور فرمانروا رامیسز ثانی ہوا، رامیسز ثانی کے باپ سیتی اوّل نے آمن ہوتپ چہارم کی پوتی سے شادی کی، اور یوں یہ نیا خاندان قدیم سلطانی خانوادہ سے منسلک ہوگیا، مرور زمانہ سے دسرتھ، سیتا اور رامیسز کے باہمی رشتے تو فراموش

ل۵ املا مشتبہ ہے۔

ہوگئے، لیکن ان ناموں کے گرد بہت سے روایات اور افسانے پیدا ہوگئے، چنانچہ بودھی روایت میں سیتاجی کو رام کی بہن بتایا گیا ہے، جو اس قیاس کی تائید کرتا ہے، کہ رامائن کا افسانہ کسی دور دراز ملک اور بہت گذرے ہوے زمانہ کے چند واقعات کی بگڑی ہوئی صورت ہو، ممکن ہے کہ رامیسز کی بی بی کا نام بھی سیتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے، کہ وہ اسکی بہن بھی ہو، کیونکہ فراعنہ مصر بہنوں سے شادیاں کر لیتے تھے، دوسرا قیاس جو مسٹر وینکٹا رتنام کے نزدیک زیادہ قرین عقل ہو، یہ ہو کہ سیتا سے مراد کوئی حصۂ ملک ہوگا، جو شامی سرداُ نے غصب کر لیا ہوگا، کیونکہ سیتا کے اصلی معنی زمین ہیں،

رام کا حریف مقابل راون ہے، جو رامائن کے تمام افراد میں سب سے زیادہ عجیب وغریب ہے، کیونکہ وہ ایک برہمن اور ویدوں کا مفسر بھی بتایا جاتا ہے، راون کا ماخذ سنسکرت کا لفظ "راو" بتایا جاتا ہے جس کے معنی ہیں چلانا یا پکارنا، اسکی توجیہ کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ راون اور شیو میں جنگ ہوئی، راون نے اس پہاڑ کو جس پر شیوجی بیٹھے ہوئے تھے، اکھاڑ کر آسمان کی طرف پھینک دیا، شیوجی نے غصہ میں پاؤں کے انگوٹھے سے پہاڑ کو دبایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ پھر زمین پر آگرا، اور راون کا ہاتھ اسکے نیچے دب گیا، اور وہ چلانے لگا، آخر شیوجی نے ترس کھا کر راون کا ہاتھ نکال دیا، اسوقت سے راون شیو کا معتقد ہوگیا، اور جب ہی سے راون کہلایا، "دس کنتھ" اور "دس گریو" اس کا لقب ہے، کیونکہ رامائن کے مطابق وہ دس سر والا انسان تھا، جب راچندرجی سے جنگ ہورہی تھی، تو ایک سر کٹنے کے بعد اس کی جگہ نیا سر پیدا ہوجاتا تھا، یہانتک کہ رام کی تلوار نے ایک سو ایک[1] سر کاٹ ڈالے، رامائن نے راون کو پولستیا کی اولاد بتایا ہے، اور "سرپا دیو" اور "راکشش" کے لقب سے یاد کیا ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ ایک جابر اور ظالم فرمانروا تھا، اب پولستیا لفظ فلسطینی کی ہندوانی شکل ہے، اور اس قیاس کی تائید اس تاریخی واقعہ سے ہوتی ہے، کہ انسائکلوپیڈیا ببلکا کے بقول فلسطینی رامیسز سوئم کے زمانے میں تمام شمالی شام کو فتح کر چکے تھے، اور اغلب ہے کہ حطیوں کی طاقتور سلطنت انہی کے ہاتھوں برباد ہوئی، ان کے بعض لوگ

حطیوں کی طرف سے رامیسز دوئم کے مقابلہ میں شریک جنگ رہے تھے، ان واقعات کی روشنی میں راون کو فلسطینی سلطان یقین کرنا چاہئے،

لفظ راون غالباً لبنان کی دوسری شکل ہے، ل اور ر قریب المخارج ہیں، اور ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں، یہی حال ب اور و کا ہے، لہذا لسانی قواعد کے تحت لبنان کو راون بن جانا بہت آسان ہے، اور لبنان ایک پہاڑ یا اس علاقہ کے حاکم کا نام تھا یا سمجھ لیا گیا،

ابوسمبل واقع نیوبیا میں پہاڑ کی چٹان کاٹ کر جو مندر تعمیر کیا گیا ہے، وہاں رامیسز کے کارنامے آج بھی تصویروں کی زبان سے سنے جا سکتے ہیں، کہیں قیدی قطار در قطار سامنے کھڑے ہیں، اور رامیسز کی خون آشام تلوار اپنی پیاس بجھا رہی ہے، اور کہیں اُن کے سر کے بال رامیسز پکڑے ہوئے ہے، حامی اور سردار سب حضور میں حاضر ہیں، لبنان کے حاکم ختا سر و کے دس سردار بھی موجود ہیں، یہ ہے صحیح تفسیر راون کے دس سروں کی،

راماین کے افسانے میں ایک اور اہم شخصیت والی کی ہے، جو جنوبی ہند میں بندروں کا بادشاہ ہے، سوگریو کے خوش کرنے کے لئے رامچندر جی والی کو قتل کر دیتے ہیں، یہ فعل اس سیرت کے خلاف ہے جو راماین میں رام کی دی گئی ہے، مگر یہاں اخلاقی پہلو سے بحث نہیں، البتہ یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، کہ اصلی رامچندر (یعنی رامیسز) ایک فاتح اور ملک گیر سلطان تھا، نہ کہ ایک مقدس نیک سیرت رشی، دوسرے یہ بے سبب آزردی، اور بلا وجہ خون ناحق ناقابل یقین ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ خود افسانہ نگار حالات سے باخبر نہیں، او اس کا سبب بجز اس کے کیا ہو سکتا تھا، کہ وہ ایک سُنی سنائی روایت کو نظم کر رہا تھا جس کے بعض واقعات نہ معلوم تھے اور نہ تحقیق ہو سکتے تھے،

نیل کے پہلے آبشار کے قریب فلی نام ایک جزیرہ واقع ہے، اس کے قریب کلب شاہ نامی شہر ہے، جس کا مشہور مندر مستطم چٹان کاٹ کر بنایا گیا ہے، یہاں سے آدھے میل پر اسی قسم کا ایک معبد اور ہے

جسکو بیت والی کہتے ہیں، یہ مندر رامیسز ثانی کی تعمیر ہے، جس کی دیواروں پر رامیسز نے نیوبیا والوں کے خلاف اپنی لڑائیوں کے کارنامے نقش کرادئیے ہیں، یہاں ایک تصویر میں دکھایا گیا ہے، کہ رامیسز کے سامنے نیوبیا والے تحفے اور نذریں پیش کر رہے ہیں، جن میں بندر بھی شامل ہیں، بندروں کی موجودگی کچھ حیرت انگیز نہیں، کیونکہ مصر میں اس جانور کو مذہبی نقطۂ نظر سے کافی عظمت حاصل تھی، آشوریہ کے بعض آثار میں بھی ان کی تصاویر پائی گئی ہیں، مصر میں ابوسمبل کے مندر میں بھی لنگوروں کی تصویریں موجود ہیں، قیاس یہ قائم ہوتا ہے، کہ نیوبیا کے بوزنہ پرستوں سے رامیسز کی ایک جنگ ہوئی، یہ جنوبی لڑائی اور شام میں لبنان والی جنگ ایک سلسلہ میں مربوط ہو کر ایک افسانہ بن گئیں، رامائن نگار نے غالباً والی کو سنسکرت "والا" سے ماخوذ سمجھ کر جس کے معنی دم ہیں، والی اور اس کی قوم کو بندر قرار دیدیا،

اسی طرح رامائن میں جو مقامات مذکور ہیں، اُن کی اصل بھی مصری معلوم ہوتی ہے، ہندوستان میں جس وقت یہ افسانہ پہنچا ہوگا، مقامات کے نام اصل مصری یا ان کی بگڑی ہوئی صورت ہوں گے، ہندی شاعر نے جب اس داستان کو ہندوستان کے ساتھ منسوب کرکے لکھنا شروع کیا، تو یہاں جو مقامات کچھ ملتے جلتے نام والے نظر آئے وہ مصری مقامات کی جگہ قائم کر دئیے، اجودھیا جو ہندوستان میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، ایگووان کا قائم مقام ہوگیا، اور ایگووان پلوٹارک کے بقول شہر تھبس کا دوسرا نام تھا، یہ ہندی نام تو افسانہ میں داخل ہوگیا، لیکن وہ حالات اور کیفیات جو مصری نام سے وابستہ تھیں، ہندوستانی مقام پر صادق نہ آئیں، لیکن ہندوستانی ذہنیت رامائن کے ترنم میں ایسی محو رہی، کہ اس تشتر گربگی کو محسوس نہ کرسکی، اصلی ایگووان واقعی کبھی ایک زبردست بستی تھا، مس ایڈورڈس لکھتی ہے،

"آج وہ تھبس کہاں ہے، جسکو ہیروڈوٹس، اسٹرابو اور عبداللطیف نے دیکھا تھا، آج وہ کھنڈر کہاں باقی ہیں، جو قرون وسطیٰ میں بھی اتنی دور تک پھیلے ہوئے تھے کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک آدمی آدھے دن میں پہنچتا تھا، آج جہاں ابوالہول نصب ہے، کبھی یہیں تاہ کے مندر کا دروازہ تھا

رامائن میں اجودھیا کی عظمت کو جو بیان دیا گیا ہے، وہ اجودھیا پر نہیں بلکہ ایگروان پر صادق آتا ہے
رامائن اجودھیا کو نسل انسانی کے مورث منوجی کا بنایا ہوا بتاتی ہے، ظاہر ہے کہ ان بستیوں میں جو ہندستان
کے منگولیہ قوم نے آباد کیں، یا ان کا مرکز رہیں اجودھیا سے کہیں زیادہ قدیم مقامات موجود تھے، مثلاً جمنا اور
گنگا کے درمیان ہستنا پور کی بستی جو آریوں کا مستقر رہ چکی تھی زیادہ حق رکھتی تھی، کہ منوجی کی تعمیر کہی جاتی، لیکن
یہ نا موزونیت ایک بدیسی داستان کو ہندی بنانے کا لازمی نتیجہ تھا، منفس کے متعلق قدیم مصری عقیدہ تھا، کہ اس
کو منا نے جو مصریوں کے نزدیک دنیا کا سب سے پہلا انسان تھا آباد کیا تھا، منفس یا ایگروان کی جگہ افسانہ
میں اجودھیا کا نام داخل ہو گیا، لہذا عظمت اور قدامت کی نسبت وہ تمام روایات جو منفس کے متعلق صحیح تھیں،
اب اجودھیا پر منطبق ہو گئیں،

یہ چند نمونے مسٹر ونیکاٹر تنام کی تحقیقات کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مصنف
کا دعویٰ قطعی حد تک ثابت ہے، خود مصنف کہتا ہے کہ میں تاریخ کی عدالت میں حاضر اور فیصلہ کا منتظر
ہوں، مسٹر ونیکاٹر تنام کے نظریہ میں سب سے بڑی کمی یہ ہے، کہ رامائن کی کوئی جنگ کسی خاتون یا ملکہ
کو دشمن سے چھین لینے کی خاطر نہیں لڑی گئی، لیکن افسانوں کی نشو و نما واقعات کو ٹھکرا دیتی ہے، ایک
چھوٹے سے بیج سے جس طرح بڑھ کر بڑا برگد پیدا ہو سکتا ہے اسی طرح ذراسی حقیقت چھوٹا سا واقعہ بے
سروپا داستانوں کی بنیاد بن جاتا ہے، حسن و عشق کی چاشنی کے بغیر داستان میں مزہ نہیں پیدا ہوتا،
بالخصوص تمام بڑے بڑے سورما جن کے فوجی کارنامے آنے والی نسلوں کی نگاہ میں اُن کو غیر فانی
بنا دیتے ہیں، ایسے افسانوں کا مرکز بن جاتے ہیں، جن میں عورت کے حُسن کو دخل ضرور ہوتا ہے، واردات
محبت کی رنگینی پر عجوبہ آفرینی مستزاد ہو جاتی ہے، چنانچہ دنیا کے تمام مشہور افسانے اس کا ثبوت
ہو سکتے ہیں، اور مثالوں کو چھوڑ دیجئے، اُن افسانوں کو لیجئے جو دکن میں اہل بیت رسول کے
متعلق گڑھے گئے، مثلاً یہ ہے واقعہ کربلا کا انتقام لینے کے سلسلے میں یزید اور محمد بن حنفیہ کو مقابل

کیا گیا ہے، اور زنگبار، فرنگ، حبش اور ترکستان کے بادشاہ ایک نہ ایک جانب سے شریک جنگ ہیں

اسی طرح خاور نامہ میں حضرت علیؓ کو بہت سے جادوگر دل، مردم خوار قومون، بلور، لوہے اور سونے کے شہرون میں رہنے والون سے لڑایا ہے، ان خاص مثالوں کو پیش کرنے سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ جب اہلبیت پاک کے متعلق انسان کی خیال آرائیاں اس حد تک پہنچ سکتی ہیں، تو ایک بھولے بسرے عہد کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا جاسکتا، حضرت علیؓ اور یزید تو تاریخی عہد کے لوگ ہیں، اور ان کی نسبت یہ دروغ گوئی اس قوم نے کی ہے، جو سیر اور تاریخ میں دنیا کی معلم اور بہترین مواد کی مالک تھی، رامیشر تو ایک نامعلوم عہد کی موہوم ہستی تھا، جسکو افسانہ نگار کی بیرحم طبع آزمائی سے بچانے کے لئے نہ کوئی سیرت نگار موجود تھا، نہ مورخ۔

مجمع الادب اسمٰعیل کالج جوگیشوری

انعامی مقابلہ

اسمٰعیل کالج میں ۷ر فروری کو جو "یوم دلی" منایا گیا تھا، اوسکی کل دلمی صورت سے مستقل و مفید بنانیکے لئے مجمع الادب نے یہ طے کیا ہے کہ ملک کے ادیبوں، انشاء پردازون اور مضمون نگارون سے درخواست کیجائے کہ وہ مندرجۂ ذیل موضوع پر اظہار خیال فرمائیں، جو مضامین سب سے اچھے سمجھے جائیں گے، ان کیلئے معقول انعامات پیش کئے جائینگے، انشاء پردازوں کے علاوہ تمام طلبہ سے بھی درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اس موضوع پر لکھیں، طلبہ کے مضامین میں سے بھی سب سے اچھے دو مضامین میں اول کو ایک سونے کا اور دوسرے کو چاندی کا تمغہ دیا جائیگا، موصولہ مضامین میں سے چند مضامین ایک کتاب کی صورت میں شائع کئے جائینگے، مضامین مندرجۂ ذیل پتہ پر یکم جولائی سنہ ۱۹۳۷ء تک پہنچ جانا چاہییں، طلبہ کو اپنے مضامین اپنے کالج یا اسکول کے افسر کے ذریعہ روانہ کرنا چاہئیں، کوئی ایسا مضمون جو کہیں پڑھا جاچکا ہو، روانہ نہ کیا جائے، (۱) اردو ادب شاعری میں دلی کا درجہ (۲) دلی سے پہلے گجرات، دکن اور شمالی ہند میں اردو کا درجہ (۳) دلی کی لسانی، ادبی، سماجی اور شعری خدمات (۴) موجودہ اردو ادبیات پر دلی کا اثر، مجمع الادب اسمٰعیل کالج جوگیشوری، نجیب اشرف ندوی صدر شعبۂ اردو

آزادی کا اخلاقی مفہوم

از

جناب پروفیسر معتضد ولی الرحمٰن صاحب ایم اے

(۲)

۶ - ذات کی ماہیت،

اُس ذات کے متعلق ہمارا کیا خیال ہے، جس کی علّی توانائی یہاں کام کر رہی ہے،؟ کیا یہ کہیں سے بھی نہیں آتی،؟ کیا اسکی کوئی تاریخ نہیں. جو اس کی موجودہ فعلیت کو معین کرتی ہے،؟ کیا یہ ایسی ناقابلِ احصار قابلیت کی حامل ہے، جو طرق عمل کا انتخاب یا ان کا رد اس طرح کرتی ہے کہ ارتقاء کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے،؟ اختیاریت ذات کے عدم تسلسل کے اقرار پر مجبور ہے، اس کے نزدیک ذات بذات خود ایک حقیقی علت ہے، یہ اصلی معنوں میں فعلیت کو پیدا کرتی ہے، کیا ذات کی یہ تاویل قابلِ قبول ہے،؟ اسی سوال کا ہم کو جواب دینا ہے، یہ تو یقینی ہے کہ ذات خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کرتی، اور یہ سب تسلیم کریں گے، کہ یہ اپنی ہستی کے اوائل میں کسی فعلیت کو بھی پیدا نہیں کیا کرتی. نہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی شہادت ہے، کہ اپنی ذی شعور زندگی کی ابتداء میں یا وجود میں آنے سے قبل ذات یہ سوچنے کے لئے سر جھکا کر بیٹھتی ہے، کہ وہ کس قسم کی ذات بننا پسند کرے گی جب اس میں شعور بیدار ہوتا ہے، تو یہ پہلے ہی سے ایسی فعلیتوں کا مجموعہ ہوتی ہے، جو ایک مخصوص راستے میں بہت تیزی کے ساتھ حرکت کر رہا ہے، جہاں تک ہم معلوم کر سکتے ہیں، وہ ایک خاص

وقت میں شروع ہوتی ہے، ایک مخصوص جسمانی ونفسی فطرت سے بہرہ ور ہوتی ہے، ایک مخصوص ماحول میں داخل ہوتی ہے، اور ایک خاص تعلیم وتربیت کا نقش قبول کرتی ہے، جن تصورات یا نصب العینوں کی وجہ سے وہ بعد میں ابتدائی حالت میں ترمیم کرتی ہے، یا اون سے تجاوز کرتی ہے، ان کا سرچشمہ بھی اس عمرانی تاریخی زندگی میں ہوتا ہے، جسے وہ اختیار کرتی ہے، تم نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ سے سوال کرو، کہ "اگر میں کسی اور زمانہ اور ملک میں، اور کسی والدین سے پیدا ہوتا، اگر میں مخالف جنس کا ہوتا، اگر میرے جسمانی وذہنی خصائص فطرۃً مختلف ہوتے اور اگر میری عقلی، اخلاقی اور مذہبی تربیت کسی اور طرح کی ہوتی، تو میری ذات کیسی ہوتی؟" اسکے بعد پھر اپنے آپ سے پوچھو کہ "میں یہ دوسری ذات کیوں نہیں؟" تو اس کا واحد جواب یہ ہوگا کہ جو ذات کہ اب میری ہے، وہ مختلف حالات کا نتیجہ ہے،

ذہنی زندگی میں تعین کے اس تخیل کو داخل کرنے کی مخالفت زیادہ تر اس بنا پر کیجاتی ہے کہ اس طرح عالم شعور میں تعین کی وہ قسم منتقل ہوجاتی ہے، جو میکانکی تعامل میں بروئے کار آتی ہے، اس خیال کو تسلیم کرلینے سے ذات ایک منفعل نقطہ بن جاتی ہے، جو خارجی اعمال کو آگے کی طرف بڑھاتا ہے، لیکن یہ خیال شخصیت کی زندگی کے تمام پیچیدہ باطنی اعمال اور تعمیری فعلیتوں کے مفہوم کو کلیۃً کھو دیتا ہے، تفکر اور خود تنقیدی، خود رہنمائی، اور ذات کی اخلاقی جد وجہد کی ترقی انسانی آزادی کے لازمی شرائط ہیں، اور یہ آزادی معقول بصیرت ہیں، اور اس کی وجہ سے تعین کا نتیجہ اور ذات کی رکن ہوتی ہے، یہ اپنے تجربوں، اپنے خیالات، اور اپنے علم سے مرکب ہوتی ہے، ہمارا دعویٰ صرف اسقدر ہے کہ یہ ترکیب کسی قیاسی اور بے اصول طریقے سے نہیں ہوتی، بلکہ واقعہ یہ ہے، کہ چونکہ عمل علم لازماً معقول، منتظم، اور ضروری عمل ہوتا ہے، اسلئے انسانی آزادی جبر کی صورت میں متصور کیجانی چاہئے، درخت کو سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی نشو ونما میں مجبور محض ہے لیکن

اس وجہ سے ہم ان کو منفعل کچھ نہ کرنے والا اور محض خارجی قوتوں کا نتیجہ نہیں سمجھتے، درخت اپنی زندگی اور نشو ونما کے تمام اعمال کی آلی وحدت ہوتا ہے، اور جب یہ تعمیری کام کرنا بند کر دیتا ہے، تو اس کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح ہم حیوان کے متعلق بھی یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ اپنی فعلیت سے علحدہ ہو کر نہیں، بلکہ خود اپنے حیرت انگیز جبلی اعمال کی وجہ سے معین ہوتا ہے، ذات بھی اپنی اُن تمام فعلیتوں کی آلی وحدت ہے، جو حیوانی زندگی کی فعلیتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ پر نور اور متنوع ہوتی ہیں، اور جس طرح غیر آلی فطرت کے میکانکی ضوابط نباتی زندگی، اور اس زندگی کے ضوابط عالم حیوانی کی پیچیدہ تر زندگی کے لئے غیر موزوں ہیں، اسی طرح ہمارا خیال ہے، کہ ذی شعور اور استدلال کرنے والی ذات کی فعلیتوں کے اظہار کے لئے اور زیادہ پیچیدہ ضوابط کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ ذات ہستی کے ان اولی مدارج سے بہت بلند ہے، اگر ذات کے اندر تعاقبات واقعات کے لئے "ضروری" ہے، لازمی ہے، تو یہ "ضروری" ہے، وہ نہیں، جو اُن تعاقبات کی یکسانیت کو ظاہر کرتا ہے، جن سے ایک مادی جسم دوسرے مادی جسم کے ساتھ ٹکرانے سے حرکت کرتا ہے، یہ محض میکانکی قوتوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ اپنے اعلیٰ اظہارات میں یہ نصب العینوں اور تصورات سے معین ہوتا ہے، اور اس تعیین میں فعل کی علت غائی، اس کی علت فاعلی بھی ہوتی ہے، ان تخیلات قیمت کی کشش کی وجہ سے، جو اغراض کو تحدی کرتے ہیں، اور ہم کو اپنا فرمانبردار بناتے ہیں، یہ تعیین کائنات میں وہ واحد مقام ہے، جہاں ہم نہایت وضاحت کیساتھ غائی اور فاعلی تعلیل کی عینیت مشاہدہ کرتے ہیں،

۷۔ غائی اور فاعلی تعلیل کا اتحاد،

مختصر یہ کہ ہماری تعیین ان غایتوں کے تصورات سے ہو سکتی ہے، جو خود اپنے تحقق کے محرکات بھی ہوتی ہیں، تصورات فاعلی کی قوتیں بھی ہوتے ہیں، یہی واقعہ ہماری آزادی کا حقیقی منبع ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری عقل میں تجاوز کرنے کا ایک اصلی عنصر شامل ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہم اس وقت کی غلامی سے خلاصی پاتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ غلامی سے خلاصی پانے کا یہی انسانی طریقہ ہے، لیکن اختیاریت کا حامی یہ فرض کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے، کہ ہر وہ چیز جو غائی تعلیل کے دائرے کے اندر ہوتی ہے، وہ علت فاعلی کے دائرے سے خارج ہوتی ہے، یہی فرض آزادی اور وجوب کے متعلق تفکر کی مقبول عام ثنویت کا سرچشمہ ہے، یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایک آیندہ واقعہ من حیث ہی موجود اور گذشتہ واقعات سے علحدہ ہو کر علۃ فاعلی ہوجائے، یہ خصوصیت صرف آیندہ واقعے کے موجودہ استحضار میں ہوتی ہے، غایت اگر کوئی اثر کرسکتی ہے، تو صرف اس طرح کہ وہ موجودہ تصور بن جائے اور یہ تصور مقدم عناصر سے تعمیر کیا جاتا ہے، انسان امکانی ضرورت کے لئے کب پس انداز کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ صرف اس وقت جب اس ضرورت کا خیال پیدا ہوتا ہے، اور یہ بھی اتنا ہی یقینی ہے کہ اس کا یہ موجودہ خیال زمانہ گذشتہ کی پیداوار ہے، اگر ہم کسی جوان آدمی میں کسی ایسے نصب العین کے ذریعہ سے بلند نظری پیدا کرنا چاہتے ہیں، جو زمانہ آیندہ میں قابلِ حصول ہوگا، تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ نصب العین اسکی موجودہ حالتِ نفس سے متعلق ہو، مقدم عمل اخلاقی تعین کے لئے اتنا ہی ضروری ہے، جتنا میکانکی عمل کے لئے، اگر ایک انجن کو بوسٹن سے نیویارک کی طرف ایسی طاقت سے حرکت دینے کی کوشش کرو، جو نیویارک میں پیدا کی گئی ہے، اور کسی طرح بوسٹن میں منتقل نہیں کی گئی، تو یہ کوشش جسقدر مہمل ہوگی، اسی قدر مہمل یہ خیال ہوگا، کہ زمانہ آیندہ کا کوئی واقعہ اس واقعے پر مقدم تصور کی حیثیت سے داخل ہوئے بغیر فعل پر اثر کرے گا، شعور کی ادنیٰ سطح پر اس تمام عمل کی مثال عضوی جبلتوں کی کارفرمائی میں ملتی ہے، بچوں کی پرورش گھونسلہ بنانے کی علت فرض کیجاتی ہے، لیکن یہ علت صرف اسی وقت کام کرتی ہے، جب ان عضوی اعمال میں مستحضر ہوتی ہے، جو رفتہ رفتہ گھونسلہ بنانے کی فعلیت کو معین کرتے ہیں،

اب اگر کہا جائے کہ ذات کی زندگی کو اس کی صبحِ آفرینش سے مسلسل فرض کرنے سے انسان فطرت کا جزو بن جاتا ہے، تو اس کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے، کہ ایسی صورت میں ہمیں فطرت کے تخیل کو اتنا بھرپور بنانا پڑے گا، کہ روحانی اعمال کی گنجایش نکل آئے۔ اس طرح ذات منفعل نہیں ہو جاتی، بلکہ متعول ہو جاتی ہے،[1] اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ انسان کے خود اپنی رہنمائی میں زندگی بسر کرنے، اپنے ہیجان اور اشتہا پر متصرف ہونے اور صداقت اور نیکی کی خواہش کرنے کی وقعت اور قیمت میں اس عقیدے سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، کہ یہ تمام اعمال قانون کی گرفت میں ہیں، برعکس اس کے اپنی زندگی کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھنا اپنی وقعت کو کم کرنا ہے،

یہ ملحوظ رہنا چاہئے، کہ آزادی کا مسئلہ کم از کم عوام کے تفکر میں ارادے کی ماہیت کے متعلق غلط خیال کی وجہ سے پیچیدہ ہو جاتا ہے، اکثر فرض کیا جاتا ہے کہ ارادہ ایک قوت ہے، جو ذات سے بالکل علحدہ ہے، اور یہ کہ یہ صرف انتخاب سے بروے کار آتا ہے، اور اس کے بعد ساکن و جامد ہو جاتا ہے، یہ گویا ایک ڈائنمو ہے، جو عند الضرورت استعمال کے لئے تیار رکھا جاتا ہے، ارادے کی ماہیت و نوعیت کے متعلق یہ عقیدہ ناقابلِ قبول ہے، ارادہ ان معنوں میں ذات کا ممیز حصہ نہیں

[1] ذہنی اور جسمانی اعمال کے تعلق کے مسئلے پر یہاں چند الفاظ کتنے موزوں ہوں گے، اس پر تفصیلی بحث کی گنجایش نہیں ہے، میں صرف اپنے عقیدے کو مختصراً بیان کرتا ہوں، میرا خیال ہے کہ ذات یعنی ذہن اور جسم ایسے معنوں میں ایک وحدت ہے، جو کسی ثنوی نظریے کی سمجھ میں نہیں آسکتے، تمام شعوری حالتیں جسمانی اعمال بھی ہوتی ہیں، اگر ہمارا موجودہ علم مناسب ہوتا، تو ہم تمام ذہنی تجربوں کو طبیعی ضوابط کی شکل میں اور اس کے برعکس بیان کر سکتے، لیکن جس علم سے یہ ممکن ہوتا، وہی علم ہماری ذہنی زندگی کے طبیعی ضوابط کو نہایت وضاحت کے ساتھ ان تمام ضوابط سے تمیز کرتا، جن میں دوسری قسم کی ہستیوں یا اشیاء کی فعلیتوں کو بیان کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ یہ ان کے معنون اور ان کی قیمت کو کلیۃً ان شعوری تجربات کے ذریعے

جن میں کہ متقدمین ماہرین نفسیات اسکو بیان کرتے تھے، ہمارے نزدیک بحالت کوشش فعل حقیقت میں یہ ذی فکر و ذی حیثیت ذات ہے، چنانچہ اس وقت کا میرا ارادہ میری مجموعی ذات ہے جو میرے تمام میلانات عادات حسیات، خواہشات، مقاصد اور نصب العینوں کو حاوی ہے اور جو اسوقت اپنا اظہار یعنی کوشش اور جد وجہد میں کر رہی ہے،

۸- اختیاریت اور عمل (Practice) کی مغایرت،

اختیاریت پر شاید سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ حقیقۃً موجودہ مسائل عمل کے سامنے بالکل بیبس ثابت ہوتی ہے، اگر نظری مقاصد ذات کو مسلسل اور لازماً متعین کرنے کی پر زور تائید کرتے ہیں تو عملی مقاصد کی تائید بھی اتنی ہی پر زور ہے، اگر اخلاقی زندگی مسلسل ترقی پذیر نہیں، اگر اس کے ماضی اور حال کے تعلق میں کوئی انقطاع ہے، تو ایک اچھا درخت بُرا پھل لا سکتا ہے، اور ہم اخلاقی زندگی میں جو سے گندم اور گندم سے جو کی توقع رکھ سکتے ہیں، آج اچھا بیج بونا کل کو بیکار ثابت ہو سکتا ہے، بدی اس خیال سے کیجا سکتی ہے کہ اس سے کوئی حرج واقع نہ ہوگا،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۱) کے اندر بتاتا ہے جن کا ایک اظہار طبیعی اعمال کی صورت میں ہوتا ہے، (مصنف) یہ بہت پرانی اور فلسفیوں کے لئے بہت پریشان کن بحث ہے، زمانہ حال میں پلانکز کے نظریہ مقادیر (Quantum Theory) اور آئن شٹائن کے نظریۂ اضافیت نے اسکی شکل ذرا بدل دی ہے، پھر طبیعیات میں مادے کی ماہیت بھی اب وہ نہیں رہی، جو پہلے سمجھی جاتی تھی، فعلیاتی نفسیات (Physiological psychology) اور خصوصاً انسان نما مشینوں (Robots) کی ایجاد نے دوسری طرف نفس کے وجود کو مشتبہ کر دیا ہے، غرض یہ عجیب تماشا ہے کہ بقول برٹرنڈ رسل مادی علوم میں سے مادہ غائب ہو رہا ہے اور نفسی علوم میں سے نفس یا یوں کہو کہ مادہ اور نفس کی تفریق مٹ رہی ہے، نفس وجسم کے تعلق کے متعلق ایک نئے خیال کے لئے دیکھو رسالہ مانسٹ بابت جنوری ۱۹۳۰ء میں مورٹن پرنس کا مضمون On mind-Body Problem and The survival of Consciousness After death. (مترجم)

اس طرح انسانی عمل کی توقعات اور اس عمل پر اعتماد کا خاتمہ ہو جاتا ہے، ثواب و عذاب، جوانوں کی تربیت، تعلیم، حکومت، نگرانی کوشش، ذمہ داری، یہ سب کے سب ایک پوشیدہ وجہ تعیین پر مبنی ہیں، اگر سزا کا کوئی اخلاقی جواز ہے، تو صرف یہ کہ یہ بدکار کی اصلاح کی خاطر ہوتی ہے، یا دوسروں کو بدکاری سے روکنے کے لئے دونوں صورتوں میں آیندہ فعل کی تعیین اس کا مقصد ہے، لیکن اگر خطا و صواب میں سے کسی ایک کے انتخاب کے دوسرے موقع پر بدکار اپنی اُس آزادی سے فائدہ اٹھائے، جو اس کے ماضی سے بالکل منقطع ہے، تو سزا بالکل بے اثر رہ سکتی ہے، اور اس حالت میں وہ ایک بے ضرورت اور مبنی بر شرارت ایذا رسانی بن جاتی ہے، یہ بے اثری ان تمام اشخاص تک پھیل سکتی ہے، جن کو اس سے متاثر کرنا مقصود تھا، یہ صحیح ہے کہ سزا اکثر بے اثر ہو سکتی ہے، اور فی الواقع ہوتی ہے، لیکن جبریت کا اصرار ہے کہ اس کی بھی ایک وجہ ہے، ہماری شان کے شایان یہ بات ہے کہ ہم اس وجہ کو معلوم کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں ماریں نہ کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں، اور ناکامی کو انسانی فطرت کی ستم ظریفی کی طرف منسوب کریں، اس میں کسے شبہ ہو سکتا ہے کہ خاندان، مدرسے، اور سلطنت میں بدکاروں کے خلاف کارروائی کی تمام ترقی جبریت کے اصول کے استعمال کا نتیجہ ہے، جس کے مطابق فعل کا کوئی جزو بھی بلا وجہ نہیں ہوتا، اعمال پر اثر ڈالنے کی حد تک جزا کا حال بالکل وہی ہے، جو سزا کا ہے، جزا کی موثریت بھی تمامتر اصول جبریت ہی پر مشروط ہے،

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ والدین بچے کے لئے بہترین ماحول کیوں تلاش کرتے ہیں،؟ وہ اسکی صحت کی طرف سے فکرمند کیوں ہوتے ہیں،؟ وہ تعلیم و تربیت کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں،؟ ظاہر ہے کہ محض اس وجہ سے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر سبب اسکی شکل پذیر زندگی کو خاص شکل دینے پر قادر ہے، لیکن اگر آزادی، عدم تعیین اور اختیاریت کے ہم معنی ہے، تو پھر اہم ترین فیصلے کے وقت یہ تمام احتیاطیں بیکار ثابت ہوں گی، حکومت کی تمام مشین کے پس پردہ جو نظریہ کام کرتا ہے، وہ

یہ ہے کہ انسان کی تعیین محرکات سے ہوتی ہے، لہذا امید وبیم اور جزا و سزا کے مناسب محرکات مہیا کئے جانے چاہئیں، عمرانی جد وجہد کے لئے کوئی چیز اتنی مہلک نہیں، جتنا یہ عام مسلّم اور معمول بہ عقیدہ کہ انسان ایسے افعال صادر کرسکتا ہو، جن کی کوئی علت نہیں، جو ترقی پذیر ذہنی واخلاقی زندگی کے تسلسل کو توڑتے ہیں، اور جو عمرانی تاریخی واقعات کے عظیم الشان نظام سے بے تعلق ہوتے ہیں انفیا کو بالعموم ذمہ داری کے خیال سے قبول کیا جاتا ہے، لیکن اس میں ذمہ داری کا حال کچھ بہتر نہیں، بقول ہارٹ مان اگر کوئی شخص اس آزاد ارادے کا مالک ہو، جس کی اختیاریت قائل ہے، تو سوسائٹی اس کے ساتھ وہی سلوک کرے گی، جو وہ مجنونوں کے ساتھ کرتی ہے، کیونکہ اس کے افعال بھی سزا اور اخلاقی ترغیب کے دائرے سے اتنے ہی خارج ہوں گے، یہ قول مبالغہ آمیز نہیں، اس قسم کے آزاد ارادے کے امکانات کے سامنے ہر شخص لرزہ براندام ہوگا، اختیاریت کا قائل خود پرزور الفاظ میں اصرار کرتا ہے کہ افعال بلا محرک اور غیر معین ہوتے ہیں، جو ذہنی زندگی کے تسلسل میں اچانک رونما ہوتے ہیں، اور اس میں وہ بالکل نئی تخلیق دکھائی دیتے ہیں، اس دعوے کے مطابق وہ توجیہ و تعریف سے کلیتہً خارج ہوجاتے ہیں، کسے معلوم ہے کہ ایک غیر مجبور اور غیر معین ارادہ عمل وسیرت میں کیا کیا انقلاب پیدا کرے گا ؟ تم اپنے ایک دوست کے خلوص، اس کی عزت اور ہمدردی پر کامل اعتماد رکھتے ہو، اگر اس دوست پر ایسے آزاد ارادے کا دورہ پڑے، تو وہ بدترین دشمن بن جا سکتا ہے، اپنے دوستوں اور ہم نشینوں پر ہمارا اعتماد اسی یقین پر مبنی ہے، کہ ان کا عمل کسی لحاظ سے بھی قیاسی یا اتفاقی نہیں ہوتا، بلکہ یہ ان کی سیرت کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، مختصر یہ کہ اختیاریت اخلاقی شعائر اور اخلاقی نظام کو صرف اس طرح محفوظ رکھ سکتی ہے، کہ وہ اس عقیدے کو نظری میدان کے بعض عام مسائل تک مختی کیا تم محدود کردے، لیکن جب نظریے سے عمل کے معینی واقعات کی توجیہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، تو یہ گونگا اور بے کار ہو جاتا ہے، عملاً آزاد ارادے کا حامی اکثر قائلین جبریت میں سے سب سے

زیادہ مجبور ہوا کرتا ہے،

اگر ہم اخلاقی مدد اور ترقی کے منبع کو تلاش کرتے ہیں، تو ہم اپنے آپ کو باور کرا سکتے ہیں، کہ وہ یا تو موجودہ محرکات کی تقویت میں ہوتا ہے، یا ان محرکات کے بجائے نئے اور موثر محرکات کی تعمیر میں، لیکن ان دونوں اعمال میں سے کوئی بھی مقدمات سے غیر متعلق فرض نہیں کیا جا سکتا، ان سے جو تغیر واقع ہوتا ہے، وہ مناسب طور پر کامیاب اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، عام طور پر یوں کہنا چاہئے کہ ہم اپنی اخلاقی مدد اور بصیرت کو بعض مخصوص علتوں کی طرف منسوب کر سکتے ہیں، ہماری ابتدائی تربیت یا تجربات کے تلخ سبق، یا کسی شریف شخصیت کے اثر میں سے کوئی بھی نہ بار آور نیج بن سکتا ہے جسکا پھل ہم ممنونیت کیساتھ بعد میں کھاتے ہیں، اس میں شبہہ نہیں کہ بعض مثالوں میں اخلاقی قوت کے حصول کا ان منافع تک کھوج نہیں لگایا جا سکتا، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کی کوئی علت نہیں۔ اکثر ہوتا ہے کہ بعض غیر اہم تجربات ایک عقیدے کی پرورش کرتے ہیں، اور غیر شعوری بصیرتیں اس کی آبیاری کرتی ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دن یہ عقیدہ پھوٹ کر ایک مصمم ارادے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور تمام زندگی کی رو بدل دیتا ہے، زیادہ غور و تامل سے معلوم ہوتا ہے، کہ اخلاقی قوت کے ایسے اضافے عسیر التحلیل تو ضرور ہوتے ہیں، لیکن گذشتہ تجربے سے بے تعلق نہیں ہوتے، اسکے برعکس گذشتہ تجربے سے ان کے تعلقات اتنے مقامات پر روشن ہوتے ہیں کہ ہم ان کو ان تجربات کا سلسلہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں،

لیکن اگر ہم اس عقیدے سے انکار کر دیں، کہ ارادہ اپنے انتخابات میں تعین کرنے والے حالات سے آزاد ہے، تو کیا آزادی کے تخیل کی اہمیت باقی رہتی ہے،؟ یا کیا ہم کو اس نصب العین کو ترک کر دینا پڑتا ہے، جو ہمیشہ سے نوعِ انسان کے اعلیٰ مقاصد کا جامع ہے،

(باقی)

تذکرۂ طاہر

یعنے

سوانح خود نوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خاں طاہر مرحوم

(۴)

کاتب الحروف کی حیات مستعار کی مختصر سرگذشت

سطور بالا میں جو کچھ میں نے بیان کیا، وہ تو میری زندگی کی یکرخی تصویر ہے جب اس تصویر کے دوسرے رُخ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھ کو بجز تاریکی کے کوئی شے نظر نہیں آتی، ؎

شکل ہستی و عدم آئینہ دکھلاتا ہے کہ ادھر سب نظر آتا ہے ادھر کچھ بھی نہیں

البتہ اس حیاتِ دوروزہ کی طول طویل شبہائے سیہ بختی میں کبھی کبھی روشنی امید کی ایک خفیف جھلک بھی نظر آجایا کرتی ہے، مگر اس کی مثال ایسی ہے جیسے صحرا میں کسی ندی کے کنارہ پر کرم شب تاب کی چمک جو نہ رہنمائی کا کام دے سکتی ہے، اور نہ باعثِ تسکینِ خاطر ہوسکتی ہے، میری زندگی کی تمامتر سرگذشت تو مختصراً صرف ان دو شعروں میں پوشیدہ ہے، ؎

مختصر حال چشم و دل یہ ہے اس کو آرام اس کو خواب نہیں

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم اب ہوئے خاک انتہا ہے یہ

لیکن اگر تکمیل سوانح اور درس عبرت کے لئے اسکی تفصیل کی بھی کسی قدر ضرورت ہو، تو

اس میں بھی کچھ عذر نہیں سُن لیجئے،

حلیہ میں خلقۃً نحیف الجثہ، احمر اللون، اخف اللحیہ، کشادہ چشم و ابرو اور متوسط القامت واقع ہوا ہوں اور جب سے میں نے اس سرائے ناپائدار ہستی میں قدم رکھا، اسی وقت سے نحافتِ جسمانی اور پیش آنے والے امراض و اسقام کے آثار نمایاں ہونے لگے، پھر جب میں سنِ شعور کو پہنچا تو ایک قلیل مدت تک اگرچہ میری صحت معمولی طور پر اچھی رہی، تاہم تقریبًا سولہ برس کی عمر ہی سے مجھ کو نوازل اور بعض امراضِ مزمنہ سے سابقہ پڑا، جس سے بہ مشکل جانبری نصیب ہوئی، مگر نجات حاصل نہیں ہوئی، اس سلسلۂ علالت نے مجھ کو زمانۂ دراز تک تعلیم کی برکتوں سے محروم رکھا، اور درس و تدریس سے ایک گونہ بیگانگی رہی، اگر میری والدہ محترمہ کی علمی قابلیت اور دینداری اور حضرت والد مرحوم کا فیضِ صحبت و تربیت اور میرے محترم استاذ مولٰنا محمد احسن صاحب بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ کا معجز نما طریقۂ تعلیم میری دستگیری اور رہنمائی نہ کرتا، تو شاید عمر بھر میں جاہل محض رہتا، یہ والدین اور استاذ مرحوم ہی کے انفاسِ گرامی کی برکت تھی، کہ باوجود گوناگوں امراض و وحشتِ خاطر کے کچھ نہ کچھ سلسلۂ تعلیم جاری رہا، اور ان کے اسوۂ حسنہ کی روشن عملی مثال نے مجھ کو ضلالت و جہالت محض کے ظلمات سے باہر نکالا، جب میں نے عنفوانِ شباب کی منزل میں پہلا قدم رکھا، اور عربی و فارسی میں کسی قدر شُد بُد ہو گئی، تو میں نے ہر طرف سے اپنے کو سامانِ عیش و تنعم اور برگ و سازِ جاہ و تحشم گھرا ہوا پایا، دنیا کے نشۂ عروج و اقبال کا اقتضا، تو عام طور پر یہی ہوا کرتا ہے، کہ آدمی دین و دنیا کے فرایض سے بیخبر ہو کر یا تو ہمہ تن عیش پرست اور راحت پسند بن جاتا ہے، اور فسق و فجور و لہو و لعب اور شغل چنگ و چغانہ اور دور بادہ و پیمانہ میں شب و روز مشغول و منہمک رہا یا دنیا طلبی کے حرص و ہوس سے مغلوب ہو کر بلا اندیشۂ جائز و ناجائز ہمہ وقت اکتساب زر و سیم و جمعِ مال و متاع و استحصالِ مراتب عز و جاہ میں اپنی عمر کا گرانقدر حصہ ضائع کیا کرتا ہے،

عَلَی المَرْءِ عارٌ کثرۃ المال بعدہٗ وَاَنتَ یا مَغْرُوْر مجتمعٌ للفخرِ

نہ ہوش دین کے باقی رہو نہ دنیا کے تری نگاہ مصیبت کا سامنا ٹھہری

بہت ممکن تھا کہ میرا بھی یہی حال ہوتا، کیونکہ اربابِ حرص و آز اور پرستارانِ جاہ و ہوس کی نگاہ ظاہر بیں میں کمالِ انسانی اور سعادت بشری کا یہی منتہا اور آخری سرحد ہے، لیکن حضرت والد مرحوم (جن کا قلب مصفا انوار ایمان سے روشن اور جن کی نگاہ دقیقہ رس فطرت انسانی کی رمز شناس تھی) مجھ کو ہمیشہ اپنے قول و عمل سے متنبہ کرتے رہتے تھے، کہ خبردار کبھی مال و متاع اور جاہ و حشمتِ دنیوی کے دامِ فریب میں نہ آنا، حُبُّ الدّنیا راس کل خطیئۃٌ دنیا کی محبت تمام گناہوں اور غلط کاریوں کی اصل و بنیاد ہے،

غافل مشو ز عشوۂ دنیا کہ این عجوز مکارہ می نشیند و محتالہ می رود

طلبِ آخرت کے ساتھ تو انسان مال و متاع اور عزّ و جاہ دنیا بھی حاصل کر سکتا ہے، اگر طلب دنیا کے ساتھ نعیم آخرت اور روح و ریحان رضاے الٰہی کبھی ہاتھ نہیں آیا کرتی، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے، اِنّ اللہ یُعطی الدّنیا علی نیّۃ الاٰخرۃ ولا یعطی الاٰخرۃ علی نیّۃ الدُّنیا

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت بہر در کہ شد ہیچ عزّت نیافت،

انسان کی سعادت و شرف کا مدار تزکیۂ روح تہذیب باطن محاسن اخلاق اتباع حق اور طلب رضاے الٰہی پر ہے، نہ چند روزہ دنیاے فانی کے جاہ و ثروت و مال و منال پر عیاذاً باللہ تعالیٰ

ایّاک والتّنعّم فانّ اللہ لیسوا بالمتنعّمین، ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے،

دولتِ دنیا کہ تمنّا کند با کہ وفا کرد کہ با ما کند

ان کلمات حکمت آیات وارشادات سراپا ہدایات پر غور کرنے اور عمل کرنے کی طرف اس زمانہ عنوان شباب اور ایام غفلت و بے نیازی میں تو کیا توجہ ہو سکتی تھی، مگر یہ ضرور ہے، کہ حضرت والد مرحوم کے مواعظ و نصائح دل پر کچھ نہ کچھ اثر کئے بغیر نہ رہے، رفتہ رفتہ جس قدر عمر بڑھتی جاتی تھی، اُسی قدر نئے نئے سامان دلکشی اور خود آشوبی کے طبیعت پر مستولی اور محیط ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ جوانی کا پوری قوت کیساتھ آغاز ہوا، اور جوش شباب کے دلفریب جذبات نے جنکو الشَّبابُ شُعْبَةٌ مِنَ الجنون کہا جاتا ہے، دل و دماغ پر ہر طرف سے ہجوم کیا، تو تمناہاے خفیہ نے نمایاں ہو کر دل میں چٹکیاں لینی شروع کیں اور زبان سے بے اختیار نکلنے لگا، ؎

راست می گویم و از گفتۂ خود دل شادم　　　بندۂ عشقم و از ہر دو جہان آزادم

چونکہ قدرت نے پہلے ہی سے میری طبیعت کو مہر و محبت کے آب و گل سے سرشت کیا تھا،

معمار وجود ارنہ زدے رنگ تواز حسن　　　درآب محبت گل آدم کہ سرشتے،

اسلئے اس باد تند کے پر زور جھونکوں نے میرے معصوم صفت دل کے نازک پودے کو متحرک زیر و زبر کرنا شروع کر دیا، کریشۃ بارض فلاۃ یقلبھا الرِّیاح ظھرا لبطن، ؎

صد نخل آرزو بہ دلم جا گرفتہ بود　　　طوفان عشق آمد و بر یک دگر شکست

کچھ دنوں تک یہ سوز نہانی اخگر زیر خاکستر کی طرح دل میں دبا رہا، لیکن جب سوز و گداز نے دل میں تپش پیدا کی، تو یہ نالہاے زیر لبی تسلی بخش نہ رہے، اور "نی گل وادیمون" کی بیابان گردی اور حسن و عشق کی داستان میں عمر کا ایک معتدبہ حصہ برباد ہو گیا،

نالہاے خانگی دل را تسلی بخش نیست　　　در بیابان می توان فریاد خاطر خواہ کرد

اگرچہ میں نہ کوئی اصطلاحی شاعر ہوں اور نہ سخن طرازی و سخن سنجی کا مجھکو دعوی ہے، لیکن بدو فطرت سے طبع موزوں ضرور ساتھ لایا ہوں، اور ابتداے تعلیم سے ذوق شعر و سخن کی چاشنی کا لذت آشنا

ہوں، اسلئے برسوں کوچہ شعر و سخن کی خاک اُڑانا پڑی، اور جلوت و خلوت میں شب و روز اسی سوز و ساز اور ہجوم ناز و عرض نیاز میں زندگی کے دن کاٹنا پڑے، ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

گلستان کے باب پنجم میں حضرت سعدی شیرازی رہ فرماتے ہیں، کہ "در ایام جوانی چنانکہ افتد و دانی باشاہدے سیرے وسرّے داشتم" خیر وہاں تو ایک شاہد تھا، مگر جب اس صنم کدۂ ہستی کو آنکھ کھول کر دیکھا، تو ہر طرف ایک عجیب و غریب عالم حیرت نظر آیا، ایک دل ہزار آرزو، ایک سر ہزار سودا، ایک صید ہزاروں صیاد، ایک جانفگار اور ہزاروں ناوک سوفار ؎

کہاں کہاں میں بچاؤں کہاں کہاں دیکھوں ہے خار زار محبت میں آبلہ دل کا

غرض برسوں اس فن کی کوچہ گردی، اور اس بادۂ مرد آزما کی شور و مستی میں بسر ہوئے، ہر وقت ایک نہ ایک جلوۂ ہوش ربا سامنے تھا، اور جس طرف نظر اٹھتی تھی، ایک ایک زلف و گیسو کا دام فریب پھیلا نظر آتا تھا، اگر ایک پھندے سے دل کو بمشکل رہائی نصیب ہوتی تھی، تو دوسرے پھندے میں دل الجھ کر رہ جاتا تھا ؎

ہے ترا سلسلۂ زلف بھی کتنا دل بند پھنسنے سے پہلے بھی مشکل تھا چھٹنا دل کا

تالیف دیوان و تذکرۂ بزم سخن: اسی عالم جوش و خروش اور مشغلۂ شعر و سخن میں غزلیات و اشعار فارسی و اردو کا ایک بڑا ذخیرہ جمع اور مرتب ہو گیا تھا، جو شاید دو کلیات ضخیم کے برابر ہوتا، مگر اسکے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، کچھ زمانہ گذرنے کے بعد جب دل ان رنگ رلیوں سے پھیکا پڑا، تو وہ مجموعۂ غزلیات و اشعار بھی تاراج دست تغافل اور نذر آتش کر دیا گیا ع

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

خدا جانے کس طرح ابتدائی عمر کے معدودے چند اشعار اور غزلیں فارسی اور اردو کی بعض اوراق میں لکھی ہوئی پڑی رہ گئی تھیں

ان کو بعض احباب نے ترتیب دیکر فارسی غزلیات و اشعار کا مجموعہ بنام خرمن گل اور غزلیات و اشعار اردو کا مجموعہ بنام نالۂ دل طبع کراکے شائع کر دیا، سچ یہ ہے کہ فارسی اور اردو کلام دونوں محتاج نقد و نظر و انتخاب تھے، مگر افسوس ہے کہ مجھ کو ان پر نظر ثانی کرنے کی نوبت نہیں آئی اسی ابتدائی زمانہ میں ایک تذکرہ شعراے اردو کا میں نے مرتب کیا اور اس کا نام بزم سخن رکھا، یہ تذکرہ ۱۲۹۸ھ میں چھپکر شائع ہو چکا ہے،

تالیف گلگشت گلستاں | اسی اثنار میں مجھ کو گلستان سعدی کے تتبع پر ایک کتاب تالیف کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور میں نے قریبًا ایک باب گلستاں کے طرز پر لکھا، جس کا مسودہ اب تک میرے پاس موجود ہے، مگر بعض دیگر اشغال و افکار پیش آجانے کے سبب سے یہ ارادہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، اور یہ باب بھی غیر مطبوعہ رہا، میں نے اس کتاب کا نام گلستاں کے نام پر دبستاں تجویز کیا تھا، مگر حضرت والد محترم نے یہ خیال کر کے کہ کہیں غلطی سے لوگ اسکو گلستاں کا جواب نہ سمجھیں، جس طرح کہ مولینا جامی رح نے بہارستان اور حکیم قاآنی نے پریشان اور خوانی نے خارستان لکھی ہے، یہ کتاب تو در حقیقت حضرت سعدی رح کی زبان و کلام کا تتبع ہے نہ جواب اسلئے انھوں نے اس کا نام گلگشت گلستان رکھنا زیادہ موزوں و مناسب سمجھا،

تالیف موارد المصادر | اسی زمانہ میں ایک کتاب مصادر فارسی میں استاذ مرحوم کی مدد سے تالیف کی، حضرت والد مرحوم نے اس کا نام موارد المصادر للصادر والوارد رکھا، اور اس میں مصادر عربی کا اضافہ کیا، یہ کتاب بھی زیور انطباع سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکی ہے،

بزم مشاعرہ کا انعقاد | حضرت والد محترم نے ہم دونوں بھائیوں کی ادبی قابلیت اور سخن طرازی و سخن فہمی کی لیاقت بڑھانے کے لئے ایک بزم مشاعرہ محل سرکاری پر قائم کی تھی، جو ہر ماہ کے آغاز میں ایک مرتبہ منعقد کیجاتی تھی، ہم دونوں بھائی بھی اپنی اپنی غزلیں لکھ کر لیجاتے تھے، اور

میرے محترم مرحوم دوست منشی امجد علی صاحب اشہری ساکن قصبۂ کچھوچھ ان غزلوں کو پڑھکر مشاعرہ میں سُنایا کرتے تھے،

چونکہ والد مرحوم کو ہم لوگوں کی اصلاحِ حال اور درستی مآل کا خیال بدرجۂ اتم رہا کرتا تھا، جس وقت ان کو شعر وسخن میں میرا سخت انہماک اور زلف وخط وخال کے مضامین میں میرا ہمہ وقت مشغول رہنے کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے جذباتِ نفسانی کے مد وجزر کو ملحوظ رکھکر بحکم الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ مجھکو ہر وقت فکر شعر وسخن میں مصروف رہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی، اور مطالعہ کتب حدیث و تصوف و رقائق کے جانب توجہ دلائی،

تالیف کتاب خطیرۃ القدس میں نے اسی زمانہ میں کتب حدیث شریف سے متعدد احادیث قدسیہ جمع کر کے ان کو ایک رسالہ کی صورت میں مرتب کیا، اور اسکو حضرت والد محترم کے ملاحظہ میں پیش کیا، والد مرحوم نے نہایت پسند کیا، اور اس کا نام خطیرۃ التقدیس رکھا اور خود اپنی قلم سے اس کا دیباچہ تحریر کیا، یہ مجالۂ نافعہ ماہ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں چھپکر مشتہر ہوا، یہ زمانہ میری زندگی کا بہترین زمانہ تھا، اسی زمانہ سے کتب دینیات اور علوم وکتاب وسنت کے جانب میلان خاطر پیدا ہوا، اور زیادہ وقت اسی قسم کی کتابوں کے مطالعہ میں گذرنے لگا، مگر افسوس ہے کہ یہ مبارک مشغلہ زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکا، حضرت والد مرحوم کی وفات کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا، ؎

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

والد مرحوم کے زمانہ حیات تک مجھ کو بجز مشاغل علمی معاملاتِ دنیا کے کسی کاروبار سے سروکار نہ تھا، ان کی وفات کے بعد جب اپنے حال پر نظر کی تو اپنے کو طرح طرح کے مشکلات وافکار میں مبتلا پایا، اور تمام خانگی وملکی وقومی ومذہبی معاملات کا مدار اپنے ہی دوش ناتواں پر پایا، ؎

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

خدا ہی خوب جانتا ہے کہ کتنے دن اور کتنی راتیں اور کتنا وقت اضطراب و بیداری اور تردد و قلق کے ساتھ معاملات دنیوی کی گتھیوں کے سلجھانے اور تدبیر منزل نظم و نسق انتظام خانہ داری اور بند و بست جاگیر وغیرہ کی کشمکش میں گزارنا پڑا، جب اس طرف سے کسی قدر فراغت حاصل ہوئی تو پھر وہی قدیم ذوق شعر و سخن غالب آیا، اور زیادہ وقت اسی میں صرف ہونے لگا، یا انہمہ نہ اب وہ اگلا سا جوش و خروش دل میں باقی تھا، نہ ویسا اطمینان اور فراغ خاطر حاصل تھا، جب اپنے ماحول پر غور کیا، تو نہ وہ اگلی سی علمی صحبتیں باقی پائیں، نہ وہ بابرکت دینی مجلسیں نظر آئیں جہاں شب و روز قال اللہ و قال الرسول کا ذکر رہا کرتا تھا، چند ہی سال میں شہر کی کایا پلٹ ہو چکی، اور مغربی طرز خیالات و معاشرت کی ہوائیں چلنا شروع ہوئیں، بیرونی ممالک کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد روز بروز ریاست میں بڑھ رہی تھی،

انقلاب خیالات اور علوم جدیدہ کی طرف میلان خاطر

میرے حلقۂ احباب میں بھی بعض تعلیم یافتہ لوگ شامل ہو گئے تھے ان کی وجہ سے مجھ کو بھی یورپ کے علوم جدیدہ کی جانب میلان خاطر پیدا ہوا، تاریخ یورپ اور فلسفہ و سائنس مغربی سے کان آشنا ہوئے، یہاں سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا، جسقدر میری معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، اسی قدر مشرقی علوم سے بیگانگی، اور مذہبی خیالات میں پستی و تساہل ترقی کرتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ذات و صفات باری تعالیٰ، حشر و نشر، دوزخ و جنت، حساب و کتاب، گناہ و ثواب، خطاب و عتاب، روح و مادہ، تکوین حیات، تخلیق کائنات ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی، جس پر میرا عقیدہ علیٰ حالہٖ قائم رہا ہو، اور دل میں یہ خیال نہ آنے لگتا ہو سے

خرید اری ہو شہد و شیر قصر و حور غلماں کی — غم دیں بھی اگر سمجھو تو ایک دھندا ہے دنیا کا

مغرب کی نظر فریب روشنی نے میری نگاہ خیرہ کر دی، فلاسفۂ مغرب کی تیز روشنی کے

سامنے علمائے اسلام کی تحقیقات مغلس کا چراغ نظر آنے لگی، اور بے ساختہ منہ سے نکلنے لگا،

عالمان را ہست علم ورہ بہ اوج راز نیست — ہست مرغ خانہ را بال وپر پرواز نیست

خبر ز زندہ دلی نیست اہل مدرسہ را — کہ دل بسان مگس در کتاب می میرد

برسوں میں اسی صحرائے پرخار کی خاک بیزی اور اس کے کانٹوں سے عطر گلاب کھینچنے کی سعی لاحاصل میں لگا رہا، یہ چند سال مجھ پر ایسے گذرے ہیں کہ میں گویا الحاد وزندقہ کے نار جحیم کے کنارے پر پہونچ چکا تھا، اور قریب تھا کہ میں طعمۂ آتش ہوجاؤں،

سرسید مرحوم کی تالیفات کا مطالعہ اور ان سے خط وکتابت کا آغاز

اسی اثنا میں مجکو سرسید احمد خاں بہادر مرحوم کی تالیفات کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اور میں نے ان سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری کیا، اور ان سے تفسیر احمدی خطبات احمدیہ، اور مجموعہ لکچرز منگا کر ان کو اوّل سے آخر تک پڑھا، اور ایک ہزار روپیہ تعمیر اسٹریچی ہال کی مد میں ارسال کیا،

مولینا شبلی کی تصانیف کا اثر اور انکا ورود بھوپال

اسی عرصہ میں حضرت مولینا شبلی کی کتاب المامون طبع ہوئی، اور بھوپال میں خاصکر اس کتاب نے ایک عام ذوق تاریخ اسلام کے مطالعہ کا پیدا کر دیا، اور جو مخالفت تحریک علی گڈھ اور سرسید سے عام طور پر برپا تھی اوس کا آہستہ آہستہ ازالہ صرف سلسلۂ تصانیف علامہ شبلی و دیگر اسلامی تاریخی کتب کی اشاعت و عام مطالعہ سے ہوتا گیا، حضرت علامہ سے اس عرصہ میں خط وکتابت رہی اور بہ اصرار وہ بھوپال طلب کئے گئے، انکی اول تشریف آوری سرسید کے حیدر آباد ڈیپوٹیشن کے موقعہ پر ہوئی، غریب خانہ نور محل میں ان کا قیام رہا، اور یہیں انھوں نے اپنا مشہور قصیدہ فارسی جسکا مقطع ہے، ع

شہ نظام است بزید کہ نظامی باشم

طبع کرایا، اللہ اللہ کیا پر لطف صحبتیں تھیں، قریبًا تمام علماء وشعرائے بھوپال سے مولینا کے علمی مباحث رہتے تھے

جس نے بھوپال جیسے قدامت پرست مقام پر ایک عام ہیجان برپا کر کے دورِ اصلاح کا آغاز کر دیا،

سرسید مرحوم کا ورود بھوپال | دہم جولائی ۱۸۹۱ء کو سرسید مرحوم نے مجھکو ایک خط لکھا، اور میری تحریک پر بھوپال میں آنے کی خواہش ظاہر کی، اور مجھ سے مشورہ لیا، بعد ازاں ستمبر ۱۸۹۱ء میں وہ بھوپال رونق افروز ہوئے، اُن سے دو چار ملاقاتوں کی عزت حاصل ہوئی، اور بہت سے مسائل زیر نظر پر انکی رائے عزّا سے مزید روشنی پڑی، بست و چہارم مئی ۱۸۹۴ء میں سرسید مرحوم نے مجھ کو ازراہِ عنایت دو جلدیں تہذیب الاخلاق کی اپنے خط کیساتھ ارسال کیں، اور نہایت مہربانی و شفقت آمیز الفاظ میں تحریر فرمایا کہ یہ دونوں جلدیں میری ملکیت ہیں کالج سے انکو کچھ علاقہ نہیں، اس لئے بطور نذر آپ کی خدمت میں مرسل ہیں امید ہے کہ آپ قبول فرمائیں گے،

امداد مدرسۃ العلوم | زمانۂ اقامتِ بھوپال میں رئیسۂ عالیہ خلد مکان نے دس بارہ ہزار روپیہ کالج کی امداد میں سرسید مرحوم کو عطا فرمائے پھر بلحاظ مزید شفقت دو دو ہزار روپیہ میاں عالمگیر محمد خانصاحب میاں صدر محمد خانصاحب مرحوم، برادر معظم مرحوم اور کاتب الحروف کی جانب سے امدادِ کالج میں رئیسۂ عالیہ نے مرحمت فرمائے،

شرکتِ کانفرنس | وقتِ مراجعت علی گڈہ سرسید مرحوم نے مجھسے وعدہ لیا کہ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدۂ علیگڈہ میں جو بماہ دسمبر ۱۸۹۱ء میں ہونے والی ہے، بذاتِ خود شریک ہو کر مسلمانانِ ہند کی قومی و تعلیمی معاملات میں سرگرمی اور اسلامی شان و عظمت کے آثار کالج کی حالت اور تعلیم کی روز افزوں ترقی کو اپنی آنکھ سے معائنہ کرون، اور اسکی امداد میں کوشش کرون چنانچہ مین نے حسب وعدہ علیگڈہ پہونچکر شرکتِ کانفرنس کی عزت حاصل کی، اگرچہ سرسید مرحوم کو اسوقت مصروفیت بہت تھی، تاہم دو ایک بار ان کے فیض صحبت اور خیالات سے مستفید ہونے کا زرین موقع ملا، یازدہم دسمبر ۱۸۹۵ء میں سرسید مرحوم نے مجکو تحریر فرمایا کہ میں آپ کو اپنا دلی دوست اور معین و مددگار اس

قومی کام کو سمجھتا ہوں جس کے انجام پر میں نے اپنی عمر صرف کی ہے، اور مجھ کو امید ہے کہ آپ ہمیشہ اس کام کے مددگار رہیں گے،

اسلامیہ کلب بمبئی کی ممبری | اسی سال حسنِ اتفاق سے اسلامیہ کلب بمبئی کا میں ممبر منتخب کیا گیا، اور آنریبل سر فاضل بھائی و سرام نے بذریعہ خط مورخہ یازدہم مارچ ۱۸۹۵ء میں مجھ کو مطلع فرمایا، اگرچہ مجھ کو اس کے کسی سالانہ جلسہ میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا، مگر میں نے اسلامیہ کلب کے مقاصد کو مدنظر رکھکر ایک خطبہ البیان کے نام سے چھپوا کر سکریٹری اسلامیہ کلب بمبئی کے پاس ارسال کیا، اور اسکی بقیہ تمام جلدیں میں نے کالج کے حق میں وقف کر کے سرسید مرحوم کی خدمت میں روانہ کر دیں،

سرسید مرحوم نے مجھ کو ٹرسٹی بنانیکی خواہش کی | بعد ازاں سرسید مرحوم نے مجھ کو تحریر فرمایا کہ میں آپ کو کالج کا ٹرسٹی بنانا چاہتا ہوں، ہاں یا نا جو منظور ہو، اس سے جلد مطلع کیجئے، میں نے اس کے جواب میں یادآوری و مہربانی کا شکریہ ادا کر کے اور افسوس کیساتھ بعض مجبوریوں کا اظہار کر کے جو اس وقت لاحق حال تھیں، معذرت کی اور لکھا کہ یہ تو میری عین آرزو تھی، اور ٹرسٹی ہونا میرے لئے ہر طرح عزت کا باعث تھا، مگر بعض وجوہ سے مجبوراً میں اپنی اس دلی تمنا کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی رکھتا ہوں، اور کالج کی جو مدد و کوشش میرے امکان میں ہے، اس کے کرنے کے لئے نہایت مسرت کیساتھ میں اب بھی موجود ہوں اور آیندہ بھی رہونگا، اور جب کبھی مجھکو ذرا بھی موقع ملے گا، تو بلا تامل حاضر خدمت ہو کر جو ارشاد ہوگا، اسکی تعمیل اپنے لئے باعث عزت خیال کرونگا،

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی ممبری | اسی زمانہ میں حضرت شمس العلماء علامہ شبلی مرحوم نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سالانہ جلسہ میں میرے ممبر بنائے جانے کی تحریک کی، اور مسٹر آزملڈ پروفیسر علی گڈہ کالج نے تائید کی، جو ممبروں کے اتفاق رائے سے منظور ہوئی،

(باقی)

حیدرآباد دکن

کے

اردو اخبارات اور رسائل

از

جناب سید تمکین صاحب کاظمی منشی فاضل ایف ار اے ایس ام ار اے ایس

(۲)

سنہ ۱۹۰۱ء میں مولوی ظفریاب خان نے "ادیب" ماہوار جاری کیا، اوس کی ترتیب وغیرہ اور مالی امداد بھی مولینا سید خورشید علی (ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی وغیرہ) کیا کرتے تھے کئی سال تک ادیب جاری رہا،

سنہ ۱۹۱۰ء میں دکن لا رپورٹ کے نام سے ایک قانونی ماہوار رسالہ جاری ہوا جسکے اڈیٹر ابتدا مسٹر اصغر بیرسٹر (جسٹس نواب اصغر یار جنگ بہادر) مولوی غلام اکبر خان (جسٹس نواب اکبر یار جنگ بہادر) وغیرہ تھے، یہ رسالہ ابتک جاری ہے،

سنہ ۱۹۱۱ء میں نواب ممتاز یار الدولہ نے مدرسہ آصفیہ ملک پیٹھ سے ایک ہفتہ وار اخبار آصفیہ گزٹ جاری کیا، جو دو سال تک نکل کر بند ہو گیا،

سنہ ۱۹۱۱ء ہی میں ماہوار صحیفہ جو مولوی اکبر علی کی ادارت میں نکل رہا تھا، روزنامہ ہو گیا، جو اب تک موجود ہے،

۱۹۱۱ء ہی میں مولوی محمد علی خان ناظم نے عثمان گزٹ ہفتہ وار جاری کیا جو جلد ہی بند ہوگیا،

۱۹۱۱ء ہی میں مستقر ضلع بیدر سے ایک ہفتہ وار اخبار بیدر گزٹ کا اجرا ہوا،

۱۹۱۲ء میں امیر حسن صاحب نے معارف کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا جو ایک سال تک جاری رہ کر بند ہوگیا،

۱۹۱۲ء ہی میں احمد اللہ بیگ اور رگھوناتھ راؤ درد نے ادیب الاطفال کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جو چند مہینوں تک جاری رہ کر بند ہوگیا،

۱۹۱۲ء میں میں حکیم نادر علی نے گلدستۂ نادر ماہوار جاری کیا،

۱۹۱۲ء ہی میں انجمن محبوبیہ کوٹلہ عالیجاہ سے احمد علی جودت نے دربار کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا،

۱۹۱۳ء میں راے گوبند پرشاد نے شاہد سخن کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا،

۱۹۱۴ء میں نواب عماد الملک بہادر کوتوال بلدہ نے پولیس گزٹ جاری کیا جو حیدرآباد کی کوتوالی ہی سے متعلق تھا،

۱۹۱۴ء ہی میں ہز اکسلنسی سر مہاراجہ یمین السلطنۃ کی سرپرستی میں تزک عثمانیہ ماہوار جاری ہوا

۱۹۱۴ء ہی میں مولوی غلام محمد وفا اور رگھوناتھ راؤ درد نے تاج نکالا جو اس عہد کا واحد معیاری رسالہ تھا، مسلسل دو سال تک جاری رہکر یہ رسالہ ۱۹۱۶ء میں بند ہوگیا، اور پھر اپریل ۱۹۲۴ء سے دوبارہ جاری ہوا، مگر ایک ہی سال نکل کر پھر بند ہوگیا، جس کے بعد ہی ایک معیاری رسالہ تھا،

۱۹۱۵ء میں مولینا ہوش بلگرامی نے ذخیرہ ماہوار جاری کیا، اور حیدرآباد میں ایک علمی اور ادبی فضا پیدا کر دی، ترتیب رسالہ کا ڈھنگ بھی نہایت اچھا رکھا، بڑے اعلیٰ پایہ کے

مضامین شائع کئے،

۱۹۱۶ء میں مولانا نظام شاہ لبیب نے افادہ ماہوار جاری کیا، جو اپنی نوعیت کا بہترین رسالہ تھا،

۱۹۱۷ء میں حکیم بشیر احمد صاحب نے ایک طبی ماہوار رسالہ المعالج جاری کیا،

۱۹۱۷ء ہی میں مولوی رحمت اللہ صاحب مددگار معتمد (حال نواب رحمت یار جنگ بہادر کوتوال بلدہ) نے محکمۂ مالگذاری سے وقائعِ مال جاری کیا، جو محکمۂ مالگذاری اور موسمی رپورٹ اور دیگر تفصیلات کا حامل ہوتا تھا،

۱۹۱۷ء ہی میں ترلوکی ناتھ سہائے نے نظائر برٹش انڈیا کے نام سے ماہوار رسالہ جاری کیا جس میں پریوی کونسل اور عدالتہائے برٹش انڈیا کے فیصلے ترجمہ کرکے شائع کئے جاتے تھے،

۱۹۱۸ء ہی میں عبدالرب صاحب کوکب نے بچوں کے لئے ایک ماہوار رسالہ اتالیق جاری کیا،

۱۹۱۸ء میں مولوی مظہر حسین صاحب ناظم زراعت سرکار عالی نے ایک زرعی ماہوار رسالہ رہبر مزارعین جاری کیا،

۱۹۱۸ء ہی میں غالباً مولوی نصیر الدین ہاشمی نے انجمن ثمرۃ الادب سے ثمرۃ الادب ماہوار رسالہ جاری کیا،

۱۹۱۸ء ہی میں ایک ماہوار رسالہ شعلہ جاری ہوا، جو جلد ہی بند ہوگیا،

۱۹۱۸ء ہی میں عبدالوہاب صاحب عندلیب نے ایک مذہبی ہفتہ وار رسالہ واعظ جاری کیا، جو ۱۹۱۹ء سے ہفتہ وار نکلنے لگا،

۱۹۱۹ء میں صغرا بیگم صاحبہ اہلیہ ہمایوں مرزا بیرسٹر نے ایک نسوانی ماہوار رسالہ النساء جاری کیا جو مدت تک جاری رہا،

۱۹۲۰ء میں پنڈت وشنو مادھو راؤ نے ایک قانونی ماہوار رسالہ دوست جاری کیا،

۱۹۲۰ء ہی میں مرغوب الدین صاحب بی اے نے ایک تعلیمی ماہوار رسالہ نونہال جاری کیا

۱۹۲۱ء میں مولوی سید احمد محی الدین بی اے نے اخبار رہبر دکن روزانہ جاری کیا جو اب تک جاری ہے،

۱۹۲۱ء ہی میں مولوی عبدالحق بی اے معتمد انجمن ترقی اردو نے اورنگ آباد سے رسالہ اردو سہ ماہی جاری کیا،

۱۹۲۲ء ہی میں مولوی مرزا رفیق بیگ نے ایک صنعتی و حرفتی ماہوار پرچہ نمایش کے نام سے جاری کیا جو عرصہ تک کامیابی کیساتھ چلتا رہا، مگر ۱۹۲۹ء کے بعد ایک آزاد نے اس پرچے کو اپنے ہاتھ میں لے کر نہ صرف علمی و ادبی بنانا چاہا، بلکہ ذاتی بغض و عناد کا مظاہرہ کرنے کے لئے بھی نمایش ہی کے اوراق استعمال کئے گئے جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ پرچہ بند ہو گیا،

۱۹۲۲ء ہی میں ابوالمکارم محمد انوار اللہ صاحب نے ایک ماہوار رسالہ ترقی جاری کیا جو نہایت ٹھوس اور معیاری رسالہ تھا، اس کے لکھنے والے بھی نہایت قابل اور تجربہ کار تھے ہونہار لیکن سید خورشید علی ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی اس کے سرپرست تھے، اور قلمی و مالی امداد آخر تک کرتے رہے، یہ پرچہ حسن اور تاج کے بعد جاری ہوا تھا، مگر اس نے اس مردہ حسن میں جان ڈال دی تھی جو ایک مدت پہلے جاری تھا، افسوس ہو کہ ابوالمکارم صاحب کی علالت اور ذاتی مصروفیتوں کی وجہ سے ترقی کو رو بہ انحطاط ہونا پڑا،

۱۹۲۲ء ہی میں ایک زنانہ رسالہ مریم بیگم صاحبہ اہلیہ ولی الدین صاحب نے خادمہ کے نام سے ماہوار جاری کیا،

۱۹۲۲ء ہی میں مولوی سید محمد ضامن کنتوری نے لسان الملک کے نام سے ایک ماہوار رسالہ

جاری کیا، جو بلحاظ مضامین و ترتیب نہایت بلند پایہ تھا،

۱۹۲۳ء میں مولوی غلام محمد وفا نے رسالہ تاج کو جو اس سے پہلے مکمل کر بند ہوچکا تھا دوبارہ جاری کیا، مگر افسوس ہے کہ ایک ہی سال کے بعد یہ رسالہ پھر بند ہوگیا، تاج کا نقش ثانی نقش اول سے ہر طرح اعلیٰ تھا،

۱۹۲۳ء ہی میں نظام کالج اردو میگزین سہ ماہی جاری ہوا، جس کے معتمد نواب طاہر علی خان بی، ایچ ڈی تھے اور اڈیٹر محمد امیر خاں صاحب غربت، یہ رسالہ ایک سال تک جاری رہا،

۱۹۲۳ء میں سید محمود یداللہی صاحب نے الصدق کے نام سے ایک ماہوار رسالہ مہدوی حضرات کے لئے جاری کیا،

۱۹۲۳ء ہی میں ایک تعلیمی ماہوار رسالہ المعلم کے نام سے مولوی محمد عظمت اللہ خان بی اے اور مولوی سید محمد حسین جعفری بی اے نے جاری کیا، جو اب مولوی سجاد مرزا ام اے صدر کلیۃ المعلمین کی ادارت میں جاری ہے،

۱۹۲۳ء ہی میں جناب رومی نے ایک ہفتہ وار اخبار راز جاری کیا،

۱۹۲۳ء ہی میں سراج الدین صاحب نے ایک مذہبی ماہوار رسالہ معلم العلوم کے نام سے جاری کیا،

۱۹۲۳ء ہی میں سراج الدین صاحب نے اور ایک ماہوار مذہبی رسالہ توحید کے نام سے جاری کیا،

۱۹۲۳ء ہی میں مولوی سید باقر حسین طارق نے ایک مذہبی ماہوار النور کے نام سے جاری کیا،

۱۹۲۳ء ہی میں ابو العلاء نور محمد صاحب نے ایک مذہبی رسالہ صراط المستقیم کے نام سے جاری کیا،

۱۹۲۳ء میں محب اللہ خان بہادر عالی رفاعی نے ایک انجمن ارباب اردو کے نام سے قائم کرکے اس کے زیر انتظام تحفہ ماہوار جاری کیا، جو نہایت عمدگی سے ایک سال تک نکلتا رہا، مگر منتظم رسالہ کی بے عنوانیوں کی وجہ سے نواب عالی نے اس رسالہ کو دوسرے شخص کے حوالہ کردیا، مگر وہ بھی جاری نہ رکھ سکے، تحفہ بھی ایک ٹھوس علمی و ادبی رسالہ تھا، جس نے حیدر آباد کے علمی ذخیرہ میں خاصا اضافہ کیا،

۱۹۲۴ء ہی میں سکندر آباد سے افضل شریف صاحب نے ارتقاء جاری کیا، جو ڈیڑھ دو سال تک جاری رہا،

۱۹۲۴ء ہی میں سکندر آباد سے اور ایک ماہوار رسالہ رہبر تعلیم جاری ہوا، جو تعلیمی رسالہ تھا،

۱۹۲۴ء ہی میں ابو المکارم انوار اللہ صاحب نے ترجمان کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جو ایک ہی اشاعت کی حد تک رہا،

۱۹۲۴ء ہی میں دور ترقی کے نام سے ڈاکٹر جیلانی بیگ صاحب نے ایک ماہوار رسالہ چھپوایا، مگر وہ پریس سے باہر نہ آسکا،

۱۹۲۵ء میں رائے بھوانی پرشاد نے سائین کی صدا کے نام سے ایک ماہوار مذہبی اخلاقی رسالہ جاری کیا،

(باقی)

خلفائے راشدین

سیر المہاجرین کا حصہ اول، یہ چاروں خلفاء کے ذاتی حالات، فضائل و مذہبی و سیاسی کارناموں اور فتوحات کا آئینہ ہے، حجم ۴۰۰ صفحے، قیمت ۳ سے ۳ر

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

کیا ہم دوسروں کے دل کی بات معلوم کر سکتے ہیں

مندرجۂ بالا عنوان سے ایڈوین ٹیل (Edwin Teale.) کا ایک نہایت دلچسپ مضمون رسالہ پاپولر سائنس بابت مارچ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا ہے، جس میں ٹیلی پیتھی (Telepathy) کے مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے، ٹیلی پیتھی کے معنی ہیں خیالات کا بغیر حواس خمسہ کی مدد کے ایک شخص کے دماغ سے دوسرے شخص کے دماغ تک منتقل ہونا خواہ وہ دوسرا شخص کتنے ہی زیادہ فاصلہ پر کیوں نہ ہو، نفسیات کا یہ حیرت انگیز پہلو اب تک تحقیق کی روشنی میں نہیں آیا تھا، چند سالوں سے اہل سائنس نے اس پر توجہ کی ہے، اور اب دنیا کے ہر حصہ میں اس پر تجربے کئے جا رہے ہیں، امریکہ کے سائنس دانوں نے خصوصیت کیساتھ اس مسئلہ میں زیادہ دلچسپی لی ہے، مضمون کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

میرے ایک دوست نے خواب میں دیکھا کہ اس کا لڑکا جو ایک دور دراز مقام پر کالج میں تعلیم پا رہا تھا، فوٹ بال کھیلنے میں گر گیا، اور اس کا ٹخنہ ٹوٹ گیا، دو روز بعد لڑکے کا خط آیا کہ میرے ٹخنے میں موچ آگئی ہے، لیکن دوسرے روز ایک خط اور آیا، جس میں لکھا تھا کہ اکسرے سے معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ٹخنہ ٹوٹ گیا ہے،

چند روز ہوئے جزیرہ ہوائی سے اطلاع آئی کہ بریان (L. W. Bryan.) نامی ایک شخص نے خواب میں دیکھا، کہ ایک سپاہی پریشانی کی حالت میں کوہ آتش فشاں ماونالوا

(Mauna Loa.) کے کنارے مارا مارا پھر رہا ہے، واقعہ یہ تھا کہ فوج کا ایک سپاہی گم ہو گیا تھا، اور ایک ہفتہ سے لوگ اوسے جنگلوں میں تلاش کر رہے تھے، بیدار ہونے کے بعد بریان فوراً پہاڑ کے اس حصہ پر پہونچا، اور ٹھیک اسی مقام پر سپاہی کو پایا، جہاں خواب میں اسے دیکھا تھا،

اس قسم کے واقعات کی توجیہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا وہ محض اتفاقی واقعات ہیں؟ یا کیا وہ انسان کی سریع الاعتقادی، اور توہم پرستی کا نیجہ ہیں؟ کیا وہ سراسر دھوکا اور فریب ہیں، یا کیا وہ دماغ کے کسی ایسے حصہ کا وجود ثابت کرتے ہیں، جس کی تلاش و تحقیق ابھی تک نہیں ہوئی ہے، اور جس سے مستقبل کے لئے بڑے بڑے امکانات ہیں؟ دنیا کے ہر حصہ میں ماہرین سائنس ان سوالات پر بحث کر رہے ہیں، اور مختلف ملکوں میں ٹیلی پیتھی پر تجربے کئے جا رہے ہیں، چنانچہ پچھلے چند مہینوں میں حیرت انگیز تحقیقات ہوئی ہیں،

ہم میں سے اکثر آدمیوں کو ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جن کی توجیہ ہم نہیں کر سکتے، کبھی کبھی ایک لمحہ کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ جو چیز اس وقت پیش آرہی ہے، اس سے قبل بھی پیش آچکی ہے، کبھی کبھی ہم کسی ایسے شخص کا خیال کرنے لگتے ہیں، جس کو ہم نے مہینوں یا سالوں سے نہیں دیکھا ہے، اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں اس سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے، اکثر ایک ہی ایجاد کے پیٹنٹ کے لئے متعدد درخواستیں تقریباً ایک ہی وقت میں آجاتی ہیں، ایک روز ایک عورت سو کر اٹھی، تو اس کے دل میں یہ بات جمی ہوئی تھی، کہ ایک دور کا ہمسایہ جو بیمار بھی نہیں تھا، رات کو مر گیا، چند گھنٹوں کے بعد اطلاع پہونچی کہ وہ ہمسایہ دراصل رات کو مر گیا،

تقریباً ہر کتب خانہ میں ایسی کتابیں موجود ملیں گی، جن میں اس قسم کے محیر العقول تجربات درج ہوں گے، لیکن شک کرنے والا یہ کہہ سکتا ہے، کہ یہ واقعات ثبوت کے لئے کافی نہیں، کیونکہ جو خواب

یا پیشین گوئی صحیح ثابت ہوتی ہے، اُسے تو مشہور کر دیا جاتا ہے، مگر ہزاروں پیشین گوئیاں جو صحیح ثابت نہیں ہوتیں ان کا ذکر بھی کبھی نہیں ہوتا، مثلاً اس ہسپانی عورت کا واقعہ جس نے خواب میں دیکھا تھا، کہ لاٹری میں اس کا نمبر انعام حاصل کرے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور انعام اُسی کو ملا، تمام دنیا کے اخباروں نے اس واقعہ کی اشاعت کی، بعد کو ایک سائنس داں نے تفتیش کر کے معلوم کیا کہ اس عورت کے علاوہ سو آدمیوں نے اور بھی جو اس لاٹری میں شریک تھے، خواب دیکھا تھا کہ ان کا نمبر انعام حاصل کریگا لیکن انھیں انعام نہیں ملا، لہذا اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے ضروری ہے، کہ کامیاب اور ناکامیاب دونوں قسم کی پیشین گوئیاں سامنے رکھی جائیں،

حال کے تجربہ کرنے والے اسی نقطۂ نظر سے تمام اعداد و شمار جمع کر رہے ہیں ٹیلی پیتھی کے متعلق مختلف سائنس داں مختلف طریقوں سے تجربے کر رہے ہیں، لیکن اس وقت تک سب سے زیادہ کامیاب ڈیوک یونیورسٹی (شمالی کارولینا، امریکہ) کے پروفیسر ڈاکٹر رائن (Rhine) کا تجربہ ثابت ہوا ہے، اور ان کے تجربہ سے جو نتائج حاصل ہوئے ہیں، وہ ٹیلی پیتھی کی تحقیق میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، ڈاکٹر موصوف اس نتیجہ پر پہونچے ہیں، کہ ہر شخص میں ٹیلی پیتھی کی قابلیت کچھ نہ کچھ ہوتی ہے، اور بعض آدمیوں میں یہ قوت خاص طور پر ودیعت ہوتی ہے، نیز یہ قابلیت خاندانوں میں وراثۃً منتقل ہوتی رہتی ہے، یہ بھی دیکھا گیا ہے، کہ تکان، پریشانی، اور منشیات کے استعمال کا اثر بھی ٹیلی پیتھی کی قابلیت پر پڑتا رہتا ہے، مثلاً تجربہ سے پہلے معمول نے جب کوئی نشاط انگیز اور مدر چیز استعمال کی تو ان میں ٹیلی پیتھی کی قوت بڑھ گئی، اور جب کوئی ایسی چیز استعمال کی جس سے طبیعت میں سستی اور اداسی پیدا ہوتی ہے، تو اس قوت میں بھی ضعف محسوس ہونے لگا،

چند روز ہوئے میں نے ڈاکٹر رائن کے معمل میں جاکر دیکھا کہ ٹیلی پیتھی کے متعلق ایک نہایت حیرت انگیز تجربہ کیا جا رہا ہے، بالائی منزل کے ایک کمرہ میں ایک شخص گھڑی لئے ہوئے ایک میز

کے قریب بیٹھا تھا، میز پر تاش کے پچیس پتوں کی ایک چھوٹی سی گڈی رکھی ہوئی تھی، پتوں پر حسب ذیل پانچ قسم کے نشانات تھے؛ ایک ستارہ، ایک صلیب، چند موج نما لکیریں، ایک مستطیل اور ایک دائرہ، ہر نشان کے پانچ پانچ پتے تھے، اس شخص نے گڈی میں سے ایک پتا اٹھایا اور ساٹھ سکنڈ تک اس کو غور سے دیکھتا رہا، جوں ہی سکنڈ کی سوئی ساٹھ کے عدد سے گذری اس نے وہ پتا رکھکر دوسرا پتا اٹھایا، اسی طرح ساٹھ ساٹھ سکنڈ تک وہ یکے بعد دیگرے تمام پتوں کو غور سے دیکھتا رہا، ٹھیک اسی وقت تین ہزار میل کے فاصلہ پر کیلی فورنیا کے ایک محل میں ایک دوسرا شخص ایک ہاتھ میں پنسل اور دوسرے ہاتھ میں ویسی ہی گھڑی لئے ہوئے خاموش بیٹھا ہوا تھا، جس وقت پہلا شخص کوئی پتا اٹھا کر اسے دیکھتا اوسی وقت یہ دوسرا شخص بھی نوٹ کرتا جاتا، کہ اس کے خیال میں کس نشان کا پتا منتخب کیا گیا ہے، ڈاکٹر رائن کا خیال یہ ہے کہ اگر دوسرے شخص نے محض حسن اتفاق سے صحیح نشان کا پتہ نوٹ کیا ہے، تو ایسا اتفاق زیادہ سے زیادہ بیس فی صدی ہو سکتا ہے، لیکن جب کامیابی بیس فی صدی سے زیادہ ہو، تو سمجھنا چاہئے کہ حسن اتفاق کے علاوہ اور کوئی پر اسرار شے بھی کارفرما ہے، اور اسی کو ہم ٹیلی پیتھی کہتے ہیں،

اب آئیے ان کے نتائج پر نظر ڈالیں، ڈیوک یونیورسٹی کے ایک طالب علم کی ابتدائی (۶۰۰) کوششوں میں (۲۳۸) کامیاب ثابت ہوئیں، اس سے بھی زیادہ کامیاب ایک دوسرا طالب علم ثابت ہوا، اس نے (۱۱۲۵۰) بار تجربہ کیا، اور شروع سے آخر تک اوسطاً ہر پچیس پتوں میں نو پتے صحیح نوٹ کئے، ایک بار اس نے مسلسل (۲۵) پتے یکے بعد دیگرے صحیح نوٹ کئے، ڈاکٹر رائن کے ایک لاکھ تجربوں میں جو درجنوں معمولوں پر کئے گئے ہیں، اوسطاً پچیس میں سات سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں،

ریاستہائے امریکہ میں اس وقت کم از کم ایک درجن کالج اور یونیورسٹیاں ڈاکٹر رائن کے تجربوں میں شریک ہیں، چنانچہ اسی سلسلہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کے محقق ڈاکٹر اسٹابرڈکس

(مسٹر ...) کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا، تجربہ کے وقت انھوں نے تاش کا ایک پتا اٹھایا، اتفاق سے فونٹن پن کی روشنائی اس پر گر گئی، جس سے پتا خراب ہو گیا، چونکہ گڈی قیمتی تھی، ڈاکٹر موصوف پتے کے خراب ہو جانے سے بہت جھلائے، بہرحال اس کے بعد جب انھوں نے اپنے معمول کے اندراجات کا معائنہ شروع کیا، تو انھوں نے دیکھا، کہ اس پتے کا اندراج بالکل صحیح کیا گیا ہے، نیز اس کے متعلق حاشیہ پر ایک خاص نشان بھی بنا دیا گیا ہے، اس نشان کی وجہ معمول نے یہ بیان کی کہ اس پتے کے نوٹ کرنے کا خیال میرے ذہن میں ایسی معمولی شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ میں نے سوچا، کہ اس کے انتخاب کے وقت ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے، ڈاکٹر رائن کو ٹیلی پیتھی کی تحقیق کا خیال ایک خاص واقعہ سے پیدا ہوا، وہ یہ ہے:-

ایک عورت نے رات کو خواب میں دیکھا کہ اس کے بھائی نے اپنے کھلیان میں جاکر جو نو میل کے فاصلہ پر تھا، پستول سے خودکشی کر لی ہے، وہ چیختی ہوئی اٹھی، اور اسی وقت رات کو اپنے شوہر کے ساتھ بھائی کے کھلیان پر پہنچی، وہاں پہنچکر دیکھا، کہ گولی سر سے پار ہو گئی ہے، جیسا کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا، اور لاش ٹھنڈی ہو چکی ہے، "ع ز"

فینلینڈ کے مسلمان

فینلنڈ یورپ کے اخیر کنارہ میں سویڈن کے پاس ایک ملک ہے، جہاں پہلے کوئی مسلمان نہ تھا، لیکن جب روس کے اشتراکی انقلاب سے مجبور ہو کر روس کے اکثر مسلمان آس پاس کے ملکوں میں نکل گئے، جہاں ان کی مذہبی آزادی کے لئے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا، تو ان مسلمانوں میں بڑی تعداد جو تاتاری تھی، اپنے اصلی وطن ایدل اور ال کو چھوڑ کر یورپ کے شمالی ملکوں میں جاکر بس گئی پھر یہاں سے بڑھکر فینلینڈ میں رہ پڑی، ان میں سے بعض تجارت کے ذریعہ پہلے سے فینلنڈ کے اصلی باشندوں

کے ساتھ راہ و رسم رکھتے تھے،

ان مسلمانون کے روس سے چلے جانے، اور فنلنڈ میں رہ پڑنے کے بعد سے ان کے واقعات اور حالات معلوم کرنے کی مشرقی مسلمانوں میں سے کسی نے کبھی کوشش نہیں کی، مجھے جہانتک علم ہے استاذ محقق بشر فارس پہلے مشرقی شخص ہیں، جنھون نے ادھر توجہ کی، اور فنلنڈ کے مسلمانون کے حالات معلوم کرکے اس پر ایک مضمون لکھا،

آج کل فنلنڈ کے مسلمانوں کی تعداد سات سو کے قریب ہے، اتنے کم ہونے پر بھی ان میں پورا اتحاد اور اتفاق ہے، وہ مذہب اسلام پر برابر قائم ہیں، اور اس کی تعلیمات کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اپنے اخلاق و آداب اور چال چلن کی بہتری کی وجہ سے فنلنڈ کے اصلی باشندوں کی نگاہوں میں کافی عزت و حرمت رکھتے ہیں، اور ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں،

فنلنڈ کی حکومت نے ۲۴ر اپریل ۱۹۲۵ء کو باقاعدہ طور پر مسلمانوں کو اپنی رعایا تسلیم کرلیا ہے، نیز حکومت نے فنلنڈ کی انجمن جمعیۃ اسلامیہ کو بھی جسکو وہاں کے معزز مسلمانوں نے اپنی جمعیت کو متحد و متفق رکھنے کی غرض سے فنلنڈ کے پایۂ تخت ہلسنجفور میں قائم کیا تھا، قانونی حیثیت سے تسلیم کرلیا ہے، آجکل اس انجمن کے صدر سید ظہور طاہر ہیں،

یوں تو مسلمان فنلنڈ کے سترہ شہروں میں بستے ہیں، مگر ان کی بڑی تعداد ہلسنجفور تمبری، اور توا کو میں رہتی ہے، تقریباً سب کے سب تجارت پیشہ ہیں، اور لین دین کے معاملات میں اپنی سچائی اور ایمانداری کے لئے مشہور ہیں،

فنلنڈ کی حکومت نے وہاں کے مسلمانون کو وہ سب شہری اور ملکی حقوق دیئے ہیں، جو وہاں کی اور قوموں اور اصلی باشندوں کو حاصل ہیں، ان پر حکومت کی ملازمتون کا دروازہ کھلا ہے، اور مسلمان ہر قسم کی ملازمتون کے امیدوار ہو سکتے ہیں،

فینلنڈ کے مسلمانوں کا ایک باقاعدہ امام بھی ہے، جو آجکل حکیم ولی احمد ہیں، یہ فینلنڈ کے پایۂ تخت ہلسنکفور میں رہتے ہیں، اور ارشاد و افتاء کا کام انجام دیتے ہیں، شادی بیاہ اور ترکہ کے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں، اور پیدا ہونے اور مرنے والے مسلمانوں کا حساب رکھتے ہیں، اور ان سب کیساتھ مذہبی تعلیم اور اساتذہ کے انتخاب کے شعبوں کی نگرانی بھی کرتے ہیں،

مسلمانوں کے شادی بیاہ کے تمام معاملات شریعتِ اسلامیہ کے احکام کے مطابق انجام پاتے ہیں، زیادہ تر نکاح آپس ہی میں ہوتا ہے، کبھی کبھی بعض مسلمان ان عیسائی عورتوں سے بھی شادی کر لیتے ہیں، جو مذہبِ اسلام قبول کر چکی ہوتی ہیں،

فینلنڈ کے مسلمان اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں، چنانچہ اس غرض سے انھوں نے کئی مذہبی مدرسے قائم کئے ہیں، جہاں لڑکوں کو ہفتہ میں دو تین گھنٹے ترکی زبان میں مذہبِ اسلام اور اسلامی اور ترکی تاریخ پڑھائی جاتی ہے، نماز روزہ وغیرہ کے مسئلے سکھائے جاتے ہیں، قرآن مجید حفظ کرایا جاتا ہے، اور فنِ تجوید کی تعلیم دیجاتی ہے،

دینی مدرسوں میں سب سے بڑے دو مدرسے ہیں، ایک ہلسنکفور میں ہے، اور دوسرا تمبری میں انجمن جمعیۃ اسلامیہ انھی مدارس کے طالب علموں کے سامنے وقتاً فوقتاً دینی، وطنی اور تاریخی مسئلوں پر خطبے دیا کرتی ہے، تاکہ ان طالب علموں کی نظر وسیع ہو، اور آیندہ چلکر مذہب و ملت کی خدمت انجام دے سکیں،

فینلنڈ کے مسلمانوں میں اب تک قومیت کا جذبہ کارفرما ہے، اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ خطوط و رسائل ہیں، جو جمعیۃ اسلامیہ کے سکریٹری سید ابراہیم عارف اللہ نے ۱۹۳۳ء میں فینلنڈی زبان میں اپنی قوم کے نام شائع کئے کئے ہیں، جن میں ان ترکوں کی مدد اور حمایت کی پرزور درخواست کی ہے جو روس کے اشتراکیوں کے پنجۂ ظلم میں گرفتار ہیں،

فینلنڈ کے مسلمان ترکی حروفِ تہجی کو جدید لاطینی رسم الخط کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، اور اسلامی عیدوں کے علاوہ ترکی اور قومی جشن بھی مناتے ہیں، خاصکر میلاد النبی کے جلسوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں،

علاوہ ازیں مسلمان اپنے گھروں پر کثرت سے میلاد النبی کے جلسے کرتے ہیں جنہیں عموماً تمام مسلمان شرکت کرتے ہیں، ان جلسوں میں تلاوتِ قرآن کے بعد امام ترکی زبان میں ایک مناسب خطبہ دیتا ہے،

فینلنڈ میں مسلمانوں کی تین چھوٹی مسجدیں پائی جاتی ہیں جنہیں جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے، اور جہاں مسجدیں نہیں ہیں وہاں کسی ایک شخص کے مکان پر جمع ہو کر نماز پڑھائی جاتی ہے، عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے علاوہ اور کسی نماز میں مسلمان عورتیں شریک نہیں ہوتیں،

مسلمان عورتوں کو فینلنڈ کی عورت کی طرح ہر قسم کی آزادی حاصل ہے سوائے اسکے کہ وہ ناچ اور گانوں وغیرہ میں شریک نہیں ہوتیں، اور اسلامی احکام کی اتباع کرتی ہیں فینلنڈ کی قانون کے مطابق مسلمان عورت بھی وہاں کی دوسری قوموں کی عورتوں کی طرح سترہ سال کی عمر سے پہلے نکاح نہیں کر سکتی۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ فینلنڈ کے مسلمان شراب اور دوسری نشہ آور چیزیں قطعاً نہیں استعمال کرتے ہیں سال کی عمر تک کوئی ایسا مسلمان نہیں ملا جو شراب یا کسی نشہ آور چیز کے استعمال کرنے کے جرم میں فینلنڈ کی پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوا ہو" ی"

خلافت اور ہندوستان

آغازِ اسلام سے اس عہد تک مسلمانانِ ہند اور خلفاے اسلام سے جو تعلقات رہے ہیں، ان کی تشریح اور سلاطینِ ہند کی تاریخ، سکوں اور کتبوں سے ان تعلقات کا ثبوت، ضخامت ۱۰۹ صفحے قیمت :-۸ر

دنیا اسلام اور خلافت

موجودہ عہد میں خلافتِ عثمانیہ کے قیام و بقا کے لئے دنیا کی مسلمان قومیں کیا جد و جہد کر رہی ہیں، مصنف کے سفرِ یورپ کے دلچسپ معلومات ہیں، ضخامت ۵۰ صفحے، قیمت ۶ر

"منیجر"

اخبار علمیہ

طبّی امداد بذریعہ ریڈیو

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے محکمۂ صحت عامہ نے جہاز کے مسافروں کی طبی امداد کا ایک نہایت قابلِ قدر انتظام کیا ہے، اگر کوئی مسافر جہاز پر بیمار ہو جائے، اور ڈاکٹر کی عدم موجودگی یا مرض کی صحیح تشخیص نہ ہونے کی وجہ سے مریض کو افاقہ نہ ہو رہا ہو، تو جہاز کا کپتان فوراً ریڈیو پر ڈاکٹر (Medico) کی اطلاع کرتا ہے، جب کسی جہاز سے ریڈیو پر "ڈاکٹر" (میڈیکو) کی آواز سنائی دیتی ہے، تو اسکی حد کے اندر ریڈیو کے تمام دوسرے پیغامات فوراً موقوف کر دیئے جاتے ہیں، اس ناگہانی اطلاع کے معنی یہ ہوتے ہیں، کہ کسی جہاز پر کوئی مسافر سخت بیمار ہو گیا ہے، اور ڈاکٹر علاج کے لئے موجود نہیں ہے، اس اطلاع کے پاتے ہی کوئی ریڈیو اسٹیشن جو بحری پیغامات حاصل کرتا رہتا ہے، جہاز کے کپتان سے مریض کا حال دریافت کرکے اُسے فوراً ہی ٹیلیفون کے ذریعہ سے محکمۂ صحتِ عامہ کے قریب ترین بحری ہسپتال میں پہونچا دیتا ہے، ہسپتال کے ڈاکٹر جمع ہو کر مرض کی تشخیص کرتے ہیں، نسخہ تجویز کرتے ہیں، اور اپنی رائے سے اس ریڈیو اسٹیشن کو بذریعہ ٹیلیفون مطلع کر دیتے ہیں، ریڈیو اسٹیشن یہ پیغام فوراً جہاز کے کپتان تک پہنچا دیتا ہے، اس طرح پندرہ منٹ کے اندر طبی مشورہ حاصل ہو جاتا ہے، جب سے یہ انتظام شروع ہوا ہے، بے شمار آدمیوں کو شدید ترین امراض سے نجات مل چکی ہے، اور ہزاروں جانیں بچائی جا چکی ہیں،

اس کے علاوہ محکمۂ مذکور نے امریکہ کے تمام بڑے بڑے بندرگاہوں پر جہاز کے کپتانوں اور جہازرانوں کے لئے ڈاکٹری کی ابتدائی تعلیم کے لئے بھی جس سے فوری طبی مدد پہنچائی جاسکے لکچروں کا انتظام کیا ہے،

عکسی کتب خانے

عنقریب ایک ایسی مشین رائج ہو جانے والی ہے، جو علمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دے گی کتابوں کی ضخامت کم کرنے کے لئے امریکہ میں ایک جدید قسم کا کیمرا ایجاد کیا گیا ہے، جس میں سینما کے فلم کی طرح اخباروں اور کتابوں کے فوٹو نہایت چھوٹے پیمانہ پر تیار کئے جاتے ہیں، اتنے چھوٹے پیمانہ پر کہ مطبوعات کی موجودہ ضخامت گھٹ کر ۱/۱۰۰ رہ جائیگی، برٹش میوزیم، نیویارک پبلک لائبریری اور امریکہ کے بعض دوسرے کتب خانوں میں اس کیمرے کا استعمال شروع ہو گیا ہے، اور پرانے اخباروں کے فائل اس کے ذریعہ محفوظ کئے جا رہے ہیں، چنانچہ نیویارک پبلک لائبریری میں اخبار نیویارک ہیرلڈ ٹربیون (Herald Tribune) کے مکمل فائل کا مطالعہ صرف چند فٹ لمبی فلم پر کیا جاسکتا ہے، فلم تیار کرنے کے بعد ایک مشین میں لگا دی جاتی ہے، جس کے زیریں حصہ میں ایک پردہ لگا ہوتا ہے، اس پردہ پر خطوط اپنے اصلی سائز سے بھی بڑے دکھائی دیتے ہیں، اور بالکل اتنے ہی صاف، یہ مشین چھوٹے چھوٹے کتب خانوں کی دسترس سے بھی باہر نہیں ہے، پورا جیسیں تصویریں لی بھی جاسکیں، اور دیکھی بھی جاسکیں، پچاس ڈالر میں خریدا جاسکتا ہے، بڑی اور بہترین قسم کی مشین کی قیمت پانچ ہزار ڈالر ہے، گھر کے استعمال کے لئے چھوٹی چھوٹی مشینیں امریکہ اور یورپ کے بازاروں میں آگئی ہیں،

آثارِ حیات

روس کے بعض محققین جو مشرقی سائبیریا میں طبقاتِ ارض کا مطالعہ کر رہے ہیں بیان کرتے ہیں

کہ ایسی زمین میں بھی جو صدیوں سے برف کے نیچے دبی ہوئی ہے، حیات کے آثار پائے جاتے ہیں، اور اس کے اندر ایسے کیڑے برآمد ہوئے ہیں جنہیں زندگی کی استعداد ابھی باقی ہے، ان لوگوں نے برف سے ڈھکی ہوئی زمین کے چند ٹکڑے ایک گہرے گڈھے سے کھود کر نکالے، اور پگھلنے کے لئے ان کو آب مقطر میں چھوڑ دیا، اس کے بعد خوردبین سے معائنہ کرکے دیکھا کہ اس میں جھینگا مچھلی کی شکل کے چھوٹے چھوٹے زندہ کیڑے موجود ہیں، ماہرین سائنس کا اندازہ ہے کہ یہ کیڑے برف کے نیچے ایک خوابیدہ حالت میں کم از کم تین ہزار برس سے موجود ہیں،

برقی کمبل

امریکہ کے ایک موجد نے ایک ایسا کمبل تیار کیا ہے جس کی بناوٹ میں برقی تار لگے ہوئے ہیں سوتے وقت بجلی کی بیٹری سے جو پلنگ کے سرہانے رکھی رہتی ہے، ایک تار کے ذریعہ اس کا تعلق قائم کر دیا جاتا ہے، باہر سردی خواہ کتنی ہی شدید ہو، سونے والا آرام سے سوتا رہتا ہے مشین میں یہ رعایت بھی رکھی گئی ہے کہ کمبل کو جسقدر گرم کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن اگر کمبل حد سے زیادہ گرم ہو جائے تو برقی رو خود بخود منقطع ہو جاتی ہے، اور سونے والے کو تکلیف نہیں ہوتی، یہ کمبل دھویا بھی جا سکتا ہے، اور اس کے استعمال کرنے میں ڈھائی تین آنہ رات سے زیادہ بجلی کا خرچ نہیں ہے

سویٹ روس کے کتب خانے

سویٹ روس میں اسوقت (۲۰۹، ۹) رجسٹرڈ کتب خانے ہیں، اس تعداد میں (۲۷، ۳۶) پبلک لائبریریاں، (۲۲۵۷) دیہی کتب خانے، اور (۵۹۳) بچوں کے مخصوص کتب خانے شامل ہیں، ان میں کتابوں کی مجموعی تعداد چھ کروڑ ساٹھ لاکھ ہے،

برقی ٹائپ رائٹر

حال میں ایک جدید قسم کا برقی ٹائپ رائٹر ایجاد کیا گیا ہے جس میں وقت اور زحمت کو بچانے کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے، کاغذ اور کاربن کے اوراق ایک کشتی میں رکھ کر اس ٹائپ رائٹر کے سامنے رکھدیئے جاتے ہیں، اور یہ خود بخود ان کو کھینچ کر مشین میں لگا لیتا ہے، ٹائپ کرنے والے کو یہ زحمت نہیں کرنی پڑتی کہ ایک ورق کے ختم ہونے کے بعد دوسرا خود بخود مشین میں لگ جاتا ہے،

انگریزی حروف تہجی

اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ انگریزی حروف تہجی کی اصل فنیشین (Phenician) ہے لیکن حال کی تحقیقات سے یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے، ۲۵ سال قبل شام کے علاقہ راس شمرا میں جو مٹی کی تختیاں برآمد ہوئی تھیں، ان کے کتبوں کے مطالعہ سے اب تحقیق ہوا ہے کہ وہ حروف یونانی حروف سے ملتے جلتے ہیں، نہ کہ فنیشین حروف سے، اور انگریزی حروف انہی سے ماخوذ ہیں،

خطرہ کی گھنٹی

موٹر ڈرائیور جو دور کی مسافت میں کبھی کبھی اونگھنے لگتے ہیں، اور اونگھنے کی وجہ سے اکثر حادثات پیش آجاتے ہیں، ان کے لئے خطرہ کی گھنٹی ایجاد ہوئی ہے، یہ گھنٹی ڈرائیور کے گلے میں بندھی رہتی ہے، جوں ہی وہ اونگھتا ہے، اس کی ٹھوڑی گھنٹی کے بٹن پر لگتی ہی، اور وہ گھنٹی بجنے لگتی ہے،

"ع ز"

باب التقریظ والانتقاد

ضرب کلیم

پتہ: مکتب خانۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور، قیمت مجلد عہ، غیر مجلد عہ، ضخامت ۱۸۲ صفحے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی اردو نظموں کا یہ تازہ مجموعہ چند مہینے ہوئے چھپ کر شائع ہوا ہے، شذرات میں اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، مگر اب تنقید کی حیثیت سے اس کو ناظرین کے سامنے پیش کرنا ہے، اس مجموعہ میں ڈیڑھ سو نظمیں ہیں، جن کو اسلام اور مسلمان، تعلیم و تربیت، عورت، ادبیات، فنون لطیفہ، سیاسیات مشرق و مغرب اور محراب گل افغان کے چند عنوانوں پر تقسیم کیا گیا ہے، کتاب کا آغاز اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال خلد اللہ ملکہ کے سرنامہ سے کیا گیا ہے، ہر عنوان کے تحت میں متعدد نظمیں ہیں، جن میں شاعر نے حقائق کے چہرہ سے پردہ اٹھایا ہے، اور جیسا کہ کتاب کی لوح پر نقش ہے، یہ دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے؛ یا یوں کہئے کہ دورِ حاضر پر ایک حکیم شاعر کے نقطۂ نظر سے فلسفیانہ تبصرہ ہے،

ضرب کلیم کے اقبال، بانگ درا والے اقبال نہیں، بانگِ درا میں جذبات ہیں، ضرب کلیم میں حقائق ہیں، حکیم شاعر نے بڑے بڑے مذہبی قومی سیاسی اور تمدنی مسائل پر شاعری کے پردہ میں اپنی سنجیدہ رائے ظاہر کی ہے،

مجموعہ کے ہر شعر کی بندش نہایت سادہ، برجستہ، تکلفات سے پاک اور حشو و زوائد سے خالی ہے، مختصر سے مختصر لفظوں میں بڑے سے بڑے خیال کو خوبصورتی سے ادا کیا گیا ہے،

افسوس ہو کہ غزل کی طرح ان نظموں کے چند شعروں کو نقل کرکے ان کی خوبی کی داد نہیں دیجا سکتی جب تک پوری پوری نظمیں نقل نہ کی جائیں، اور یہ ایک رسالہ کی بساط سے باہر ہے ضرورت ہے، کہ مسلمان اسکو خریدیں اور پڑھیں،

جنوری کے جامعہ میں ایک فاضل نقاد نے جو اقبال کے اس مجموعہ کو بھی تلی رائین، روشن تعلیمات اسبہ پردہ حقائق" ماننے کے باوجود اپنے مسلک کی بنا پر شاعر کے چند خیالات سے اختلاف کیا ہو، اقبال نے اس میں مہدی کے عنوان سے چند شعروں کی ایک نظم لکھی ہے،

قوموں کی حیات انکے تخیل پہ ہو موقوف	یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغ چمن کو
مجذوب فرنگی نے بانداز فرنگی	مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہو بیزار	نومید نہ کر آہوے مشکین ختن کو

اس پر نقاد مذکور کا یہ حسن ظن ہو کہ اس شعر میں "اقبال کا روے سخن انھی کی طرف ہے کیونکہ مہدی کے عقیدے کے **قرآنی** ہونے سے سب سے پہلے انھی نے علی الاعلان انکار کیا ہے"؛

لیکن کیا یہ واقعہ ہے ؟ مہدی کے عقیدے کے "قرآنی" ہونے سے تو علی الاعلان انھی کو کیوں ہمارے اہل سنت کو انکار ہے، منکرین حدیث تو منکرین حدیث، اہل حدیث تک بھی کسی قرآنی مہدی کے یعنی کسی ایسے مہدی کے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہو قائل نہیں، جو سنی مانتے ہیں وہ روایات کی بنا پر مانتے ہیں قرآن کی بنا پر نہیں اب رہا روایات کی عدم صحت کی بنا پر انکار تو آج سو صدیوں پہلے ابن خلدون اپنے مقدمہ میں انکار کر چکا ہو اور سرسید اور انکے ساتھیوں کا مسلک بھی انہیں معلوم ہو اس پر ایک آدھ رسالے بھی اسی زمانہ میں لکھے جا چکے ہیں اور انگریزوں اور مہدی سوڈانی کی خونریز جنگ کے بعد سے تو مہدی سے انکار تقرب شاہی کا بڑا ذریعہ رہا، اسلئے اس میں بھی نقاد کو اولیت کا شرف حاصل نہیں،

شاعر کا مقصد تو یہاں مہدی کے تخیل سوپر مین (فوق البشر) کا نظریہ ہے، جس سے نطشے نے

جرمن قوم کے سامنے ایک ترقی یافتہ آیڈیل قوم کا نمونہ پیش کرکے اس پر ترقی کی راہیں کھولدیں اسی طرح شاعر کے خیال میں مسلمانوں کو چاہیئے کہ مہدی کے آیڈیل نمونہ کے مطابق اپنے کو بنانے کی کوشش کریں یعنی اس تخیل سے مفید کام لیا جائے، غرض اس شعر کو ظہور مہدی کی پیشینگوئی کی واقعیت و عدم واقعیت سے کوئی تعلق نہیں،

اسی کتاب میں "الہام اور آزادی" کے عنوان سے اقبال کی دوسری نظم ہے جس میں ایک شعر ہے،

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے، غارتگر اقوام ہے وہ صورت چنگیز

ظاہر ہے کہ اس میں کھلا ہوا اشارہ مدعی قادیان کی طرف ہے، مگر نقاد موصوف اس پر حاکمیت محکومیت کو نبوت کا معیار سمجھنے لگے ہیں، اور یہ انکشاف فرماتے ہیں کہ "اکثر انبیاء علیہم السلام محکوم اقوام ہی میں مبعوث کئے گئے ہیں، جس کے خاص علل و اسباب ہیں"

لیکن اول تو سیر انبیاء سے ان میں سے اکثر کو محکوم اقوام میں سے ثابت کرنا مشکل ہے، پھر اصلی بات یہ ہے کہ شاعر کا مقصد یہاں نبوت سے نہیں دعوائے تجدید سے ہے، تیسرے یہ ہے کہ اس نے محکوم قوم اور حاکم قوم نہیں بلکہ آزاد شخص اور محکوم شخص کہا ہے، آزاد قوم اور محکوم قوم نہیں چنانچہ شاعر پہلے کہتا ہے:۔

ہو بندۂ آزاد اگر صاحب الہام ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز

دیکھیے بندۂ آزاد کہا ہے حاکم قوم کا فرد نہیں کہا ہے، اس کے بعد دوسرا شعر ہے،

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے غارتگر اقوام ہے وہ صورت چنگیز

یہاں بھی محکوم شخص کہا ہے، محکوم قوم کا فرد نہیں کہا ہے، شاعر کا مقصود یہ ہے کہ غلامانہ ذہنیت کیساتھ دعوائے تجدید و الہام بربادی کا موجب ہے، اور آزادی کی دعوت کیساتھ جو تجدید عمل میں آئے وہ قوم کی زندگی کا سبب ہوتا ہے، شاعر نے اسی کتاب میں ایک نظم امامت پر لکھی ہے، جس کے بعض

اشعار یہ ہیں

ہے وہی تیرے زمانہ کا امام برحق ۔۔۔ جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے ۔۔۔ فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنہ، ملت بیضا ہے امامت اسکی ۔۔۔ جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

اسی کتاب میں "پنجابی مسلمان" کے عنوان سے یہ چند شعر ہیں،

مذہب میں بہت تازہ پسند اسکی طبیعت ۔۔۔ کرلے کہیں منزل تو گذرتا ہے بہت جلد

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا ۔۔۔ ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے ۔۔۔ یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

اقبال اپنی قوم کے نباض ہیں، انھوں نے جو کچھ جانا ہے، اوسکو نظم میں ادا کیا ہے، مگر ظاہر ہے کہ تاویلی فرقہ کے کسی علمبردار پر یہ حقیقت کتنی شاق ہو سکتی ہے، اسلئے نقاد مذکور نے اپنی طرف سے ایک شعر اس میں اضافہ کرکے ایسے فرقہ کے لئے تسلی کا سامان پیدا کرنا چاہا ہے، نقاد شاعر کی تضمین ملاحظہ ہو

لیکن اُسے مل جائے جو اچھا کوئی رہبر ۔۔۔ بگڑا ہوا مدت کا سنورتا ہے بہت جلد

ہمارا قیاس ہے کہ اس شعر میں نقاد شاعر کا روئے سخن خود اپنی اور اپنے مسلک کی طرف ہی، جسکو وہ شاید سمجھتے ہیں، کہ پنجاب میں فروغ ہو رہا ہے، لیکن اگر ہمارے اس قیاس کو خاکساری کے خلاف سمجھا جائے، تو قادیان کے مسلک کیطرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اسکو بھی پنجاب میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی تھی، واللہ اعلم بالصواب۔ "م"

مقالات شبلیؒ حصہ دوم

مولینا کے ادبی مضامین کا مجموعہ، ضخامت ۲۰۳ صفحے، قیمت ۱۲ آنے، "منیجر"

ہندوستانی رسالوں کے

چند

سالنامے اور خاص نمبر

الفرقان شہید نمبر مرتبہ جناب مولینا منظور صاحب نعمانی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۴۴ صفحات،

کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت قسم اول ۱۰؍ قسم دوم ۸؍ پتہ :۔ دفتر الفرقان بریلی،

الفرقان عرصہ سے علم و مذہب اور اصلاحِ عقائد و رسوم کی مفید خدمت انجام دیرہا ہے، چند مہینے ہوئے اُس نے اس مقدس جماعت کے سرگروہ حضرت مولینا اسمٰعیل شہید اور حضرت مولینا سید احمد بریلوی رحمہما اللہ کی یادگار میں الفرقان کا شہید نمبر نکالا ہے، ان دونوں جلیل القدر ہستیوں نے اسلامی ہند کے اس دورِ زوال میں جبکہ ایک طرف مسلمانوں کی ظاہری سطوت کا چراغ گل ہو رہا تھا، اور دوسری طرف ہندی عقائد و رسوم نے اسلام کی صورت مسخ کردی تھی، ہندوستان میں ان کے خلاف علمی اور عملی جہاد کا علم بلند کیا، اور اسی راہ میں جامِ شہادت پیا، اگر یہ جہاد کامیاب ہوگیا ہوتا تو شاید آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی، لیکن یہ کسقدر افسوس کا مقام ہے، کہ خواص اور اہل علم کے علاوہ اچھے خاصے پڑھے لکھے مسلمان، ان شہدائے حق کے حالات سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اور بعض بے بصیرت جماعتوں نے ان کے متعلق عجیب گمراہ کن خیالات پھیلا دیئے ہیں، اسلئے ضرورت تھی کہ ان کے اعمال جلیلہ اور صحیح حالات کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے، الفرقان کے فاضل اڈیٹر شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے شہید نمبر نکال کر اس ضروری فرض کو ادا کیا، اگرچہ یہ حالات ان بزرگوں کے کارناموں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں، تاہم سرسری واقفیت کیلئے کافی ہیں، گو ان بزرگوں کے پرانے طرز کے سوانح حیات موجود ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ کوئی باہمت بزرگ

موجودہ مذاق کے مطابق تذکرۃ الشہیدین کے نام سے ان کے حالات مرتب فرمائیں، اور ہم کو اس اعلان سے خوشی ہے کہ اسی خانوادۂ سیادت کے ایک نوجوان سعادتمند عالم مولینا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدرس دار العلوم ندوہ نے اس خدمت کو انجام دیدیا ہے، اور وہ عنقریب شائع ہوگی، الفرقان کے اس نمبر کے آخر کے بعض مباحث میں قلم الفرقان کے سنجیدہ طرز سے ہٹ گیا ہے، جو عموماً ایسی تحریروں میں ہوا کرتا ہے،

ادب لطیف سالانہ نمبر، مرتبہ جناب چودھری برکت علی و مرزا ادیب بی اے،

تقطیع بڑی، ضخامت ۲۲۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ دفتر ادب لطیف لوئر مال روڈ، لاہور،

ادبی رسالوں میں ادب لطیف نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے، گذشتہ سال اس نے افسانہ نمبر نکالا تھا، اس سال کا سالنامہ اس نے ہر حیثیت سے افسانہ نمبر سے بڑھا دیا، ہر ذوق کے مضامین کا اچھا مجموعہ فراہم کیا گیا ہے، علمی اور سنجیدہ مضامین میں "ڈیڑھ سو برس پہلے کی علمی بحثیں" "مغل شہزادی جہان آرا" دنیا تذکرۃ مفید اور پر از معلومات ہیں "مشرق پر مغرب کی یلغار" اور "ہسپانیہ میں اسلام کے نقش قدم" اگرچہ سرسری ہیں لیکن عام افادہ سے خالی نہیں، ان کے علاوہ بعض اور علمی مضامین ہیں لیکن وہ بعض نامور علماء کے مضامین سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں، افسانوں میں "پریم کتھا" "آخری قدم" "شکستہ رباب" موثر "ملکۂ مقدمیہ" "تین پیسہ کی چھوکری" "لاشوں کا شہر" "پڑھنے کے لائق اور صبح کی ڈاک" اور "درس حیات" خاصے دلچسپ ہیں، نظم کی چاشنی بھی ہے، لیکن نثر کے مقابلہ میں اس کا مزہ پھیکا ہے،

عالمگیر کا سالنامہ مرتبہ حافظ محمد عالم صاحب تقطیع بڑی، ضخامت ۱۲ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ؎، پتہ دفتر عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور،

عالمگیر نے حسب معمول ۳۶ء کا سالنامہ بڑے اہتمام کے ساتھ نکالا ہے، علمی تحقیقی، ادبی افسانے ہر قسم کے مضامین کا اچھا ذخیرہ فراہم کیا ہے، ان میں مولینا عنایت رسول مرحوم چریا کوٹی کا مضمون

"غاران کی تحقیق" "تحقیق اور تبرک دونوں حیثیتوں سے لائق مطالعہ ہے"، "شاہزادہ مراد بخش" "اردو نثر پر ایک نظر" "کولمبس" "خیام کے محاسن" اگرچہ سرسری ہیں، لیکن عام معلومات کے لئے خاصے ہیں، اول الذکر مضمون کے بعض پہلوؤں پر ہندوستانی میں اس سے زیادہ مبسوط اور تفصیل سے لکھا جا چکا ہے، عربوں کی جہازرانی کی اشاعت کے بعد ابن ماجد کے حالات اردو دان طبقہ کے لئے نئے نہیں ہیں، افسانوں میں زمین کی تحریر "آنسوؤں کی بوندیں" "پر عظمت" "ہر فرعونے راموسیٰ" "جہازی لیٹرن" "ایثار محبت" "قاہرہ کی ایک رات" "ناخواندہ مہمان" اور "تموت کی دولھن" دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں، نظموں کا حصہ بھی خاصہ ہے،

ہمایون کا سالنامہ مرتبہ جناب شبیر احمد صاحب، بیرسٹرایٹ لا، تقطیع اوسط ضخامت ۱۴۴ صفحے

کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ: ۳ لارنس روڈ لاہور،

ہمایوں جس سلامت روی کی چال چل رہا ہے، اسکی مثال بعض پرانے زمانہ کے رسائل کے علاوہ نئے دور میں نہیں مل سکتی، اسکی ترقی و تنزل میں کوئی فرق نہیں، اس کا ۳۶ء کا سالنامہ اگرچہ ظاہری زیبایش اور ضخامت میں گذشتہ سالناموں کے مقابلہ میں ہلکا ہے لیکن معنوی اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا، خصوصاً فاضل اڈیٹر کے قلم سے "بزم ہمایوں" میں اردو ہندی مسائل اور "جہان نما" میں سیاسیات عالم پر نہایت مفید تبصرہ ہے، اسی قلم کا مضمون "تجزیہ نفس" بھی لائق مطالعہ ہے، ان مفید مضامین کے علاوہ عام دلچسپی کے لئے افسانوں کا چٹخارہ بھی شامل ہے، "زہرہ کا عشق" "الٹ پھیر" اور "نا پختہ جوڑے" دلچسپ افسانے ہیں نظم کا حصہ بھی غنیمت ہے،

مشورہ آگرہ نمبر، مرتبہ جناب ضیاء اکبرآبادی تقطیع اوسط ضخامت سوا پانسو صفحات

کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت مرقوم نہیں، پتہ دفتر مشورہ کٹرہ حاجی حسن آگرہ،

ارض اکبرآباد، دو متضاد اوصاف یعنی جنت سازی و جنت فروشی، اور شعر و ادب کی ایسی برابر کی حامل ہے، کہ دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا مشکل ہے، مشورہ ان دونوں کمالات کا تحریری

مرقع اور آگرہ کی تجارتی، صنعتی اور ادبی ڈائرکٹری ہے، ایک حصہ میں آگرہ کی جنت سازی اور جنت فروشی کے جملہ متعلقات پر تفصیلی معلومات ہیں، دوسرے حصہ میں مختلف طبقات کے مشاہیر کا مختصر تذکرہ ہے، تیسرے حصہ میں آگرہ کی مختلف صنعتوں کا تذکرہ، اور یہاں کے علماء و کلاء، اطبا، تجار، صناع، اور اہل حرفہ کے نام اور پتے ہیں، چوتھے حصہ میں انہی طبقات کے ہندوؤں کے حالات ہیں، پانچویں حصہ میں جو آٹھ دوروں پر تقسیم ہے، یہاں کے قدیم و جدید شعراء اور ادباء کے حالات ہیں جس میں مشہور صوفی بزرگ حضرت ابوالعلاء احراری المتوفی ۱۰۶۱ھ سے لیکر صبیح اکبرابادی المولود ۱۳۳۶ھ خلف مدیر رسالہ تک کے تمام ادوار کے شعراء اور ادیبوں کے حالات، ان کے کلام کا نمونہ اور بعض کی تصاویر ہیں، غرض یہ رسالہ اکبرآباد کے متعلق ہر قسم کے معلومات کا ذخیرہ بلکہ کتب خانہ ہے،

صدائے نسواں خلیل نمبر مرتبہ راجہ غلام احمد صاحب فرزل و انور صاحب بزمی تقطیع اوسط، ضخامت ۱۳۶ صفحات کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت مذکور نہیں، پتہ دفتر صدائے نسواں دہلی،

ابھی دو ہی تین مہینے ہوئے صدائے نسواں کا عید نمبر نکل چکا ہے، اب اوس نے خلیل نمبر نکالا ہے، جو ایک نسوانی رسالہ کو دیکھتے ہوئے بہت کامیاب ہے، مذہبی اصلاحی افسانے ہر قسم کے مفید اور دلچسپ مضامین ہیں، جن کو مرد اور عورت یکساں دلچسپی کیساتھ پڑھ سکتے ہیں لیکن خاص عورتوں کے فائدہ کے مضامین کی کمی ہے،

حکیم حاذق کا سالنامہ (سنگ جواہر) مرتبہ جناب حکیم محمد عبد الرحیم صاحب تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ کتابت خراب، دفتر رسالہ حکیم حاذق، گجرات پنجاب،

یہ سالنامہ جملہ ضروری طبی معلومات کا ذخیرہ ہے، اس میں عورتوں، مردوں، بچوں کے جملہ علامۃ الورود امراض اور ان کے علاج پر مضامین اور مختلف امراض کے مجربات، ادویہ اور ان کے خواص پر کافی معلومات اور مضامین ہیں، طبی نقطہ نظر سے بظاہر نہایت مفید معلوم ہوتا ہے، جس سے عام اطبا بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں

نئے رسالے اور اخبارات

مجلہ طیلسانئین (سہ ماہی) مرتبہ مجلس طیلسانئین جامعہ عثمانیہ تقطیع اوسط ضخامت ۱۵۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ سے عثمانی، پتہ:۔ دفتر طیلسانئین بازار گھانسی، حیدرآباد،

جامعہ عثمانیہ نے ایک قلیل مدت میں اپنے طلبہ اور فارغین کی جس صلاحیت و استعداد کا ثبوت دیا ہے، اس کا ایک نمونہ مجلہ عثمانیہ ہے، جو کئی سال سے نہایت کامیابی کیساتھ نکل رہا ہے، دوسرا تازہ نمونہ مجلہ طیلسانئین ہے، یہ رسالہ فارغین جامعہ عثمانیہ نے نکالا ہے، اس میں بیشتر انہی کے مضامین و مقالات شائع ہوا کریں گے، ابھی اس کا صرف ایک ہی نمبر نکلا ہے، جس سے اس کے مستقبل کا اندازہ ہوتا ہے تمام مضامین معیاری، مفید اور پراز معلومات ہیں، امید ہے، اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جائے گا، اور وہ بہت جلد ہندوستانی زبان کے بلند پایہ رسائل میں ممتاز درجہ حاصل کر لیگا، طیلسانئین کیلئے اگر کوئی خوبصورت اور ہلکا لفظ ہو سکتا، تو بڑا اچھا ہوتا جسم ادب پر یہ لبادہ بڑا بھاری ہے،

بہارستان (ماہوار) مرتبہ جناب اختر صاحب وارثی تقطیع اوسط، ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت سالانہ للعہ ششماہی عار فی پرچہ ۱ر، پتہ دفتر بہارستان محلہ عالی خورد جالندھر،

بہارستان ایک علمی وادبی رسالہ ہے، ابھی اس کے صرف تین نمبر نکلے ہیں، اور ہر نمبر اپنے ماقبل سے بڑھ کر ہے، مضامین کے اعتبار سے وہ اکثر رائج الوقت رسالوں سے بلند ہے، وہ محض تفریحی لٹریچر پیش نہیں کرتا، بلکہ ادبی اور تفریحی مضمونوں کے ساتھ اس میں مفید علمی اور تاریخی مضمون بھی ہوتے ہیں، اگر اسکی یہ رفتار قائم رہی، تو وہ بہت جلد ہندوستانی زبان کے سنجیدہ رسائل کی صف

میں آجائے گا،

شاہراہ۔(ماہوار) مرتبہ جناب مولوی فصیح الزمان صاحب صدیقی تقطیع بڑی ضخامت ۳۲ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت صرف ۴ر محصول ڈاک، پتہ دفتر شاہراہ لال باغ نمبر ۱۲ متصل مسجد مولوی خیرالدین بمبئی،

یہ ایک مذہبی اخلاقی اور اصلاحی رسالہ ہے، جس کا مقصد صرف مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی مذہبی خدمت ہے، اسی لئے اس نے اپنی کوئی قیمت نہیں رکھی، اس کے مقصد کے لحاظ سے بیشتر مضامین مذہبی اور اصلاحی ہوتے ہیں، تاریخی مضامین اور افسانے بھی نظر آتے ہیں، لیکن مذہبی رنگ لئے ہوئے ایک حصہ شعر و شاعری کا ہے، مگر اس میں زیادہ تر منقولات ہوتے ہیں، امید ہے کہ یہ مخلص خادم مسلمانوں میں مقبول ہوگا،

ہمدرد جامعہ۔(ماہوار) مرتبہ جناب ناظم صاحب ہمدرد جامعہ تقطیع اوسط ضخامت ۳۲ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر ہمدردانِ جامعہ کے پاس مفت بھیجا جاتا ہے،
پتہ:- جامعہ ملیہ دہلی،

کئی سال ہوئے جامعہ کے بعض مخلص کارکنوں نے جامعہ کی مالی حالت درست کرنے کے لئے ہمدردانِ جامعہ کے نام سے اس کے مالی معاونین کا ایک حلقہ قائم کیا تھا، یہ رسالہ اسی کا آرگن ہے جس میں جامعہ کے حالات اور قومی تعلیم پر مفید مضامین ہوتے ہیں، اور حلقہ کی ہر مہینہ کی آمدنی کا گوشوارہ ہوتا ہے،

حکیم دکن(ماہوار) مرتبہ جناب حکیم انیس احمد صاحب خیرآبادی تقطیع اوسط ضخامت ۵۰ صفحات کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت سالانہ عارفی پرچہ ۳ر، پتہ یونانی طبی بورڈ حیدرآباد دکن،

یہ رسالہ اعلیٰ حضرت کے جشن سیمیں کی یادگار میں حیدرآباد کے یونانی طبی بورڈ نے جاری کیا ہے،

اس میں طب یونانی کے مختلف پہلوؤں پر نہایت مفید اور پر از معلومات مضامین اور امراض و علاج کے متعلق مفید معلومات ہوتے ہیں، امید ہے کہ یہ رسالہ حیدرآباد میں طب یونانی کی مفید خدمت انجام دیگا،

مسجد، (ہفتہ وار) مرتبہ جناب سید سرور شاہ صاحب گیلانی، تقطیع اوسط اخباری ضخامت غیر معین، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ للعہ شششاہی سے سہ ماہی عہ پتہ دفتر مسجد مصری شاہ لاہور

اسلام کے عہد زرّیں میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز مسجد تھی، ان کے جملہ قومی اور مذہبی امور اس ایوان الٰہی میں طے ہوتے تھے، لیکن اور شعبوں میں مسلمانوں کے انتشار کیساتھ ساتھ مسجد کی مرکزیت بھی جاتی رہی، سید ولایت شاہ گیلانی نے مساجد کو دوبارہ ان کی حیثیت پر لانے کے لئے اُن کی تنظیم کی تحریک شروع کی ہے، یہ اخبار اسی تحریک کا آرگن ہے، اس تحریک کے فرائض نہایت مفید اور وسیع ہیں، جس میں مساجد کی ظاہری تنظیم کے ساتھ ائمۂ مساجد کی تعلیم و تربیت، ان کا صحیح انتخاب، خطبات کی وحدت، ان کو مفید بنانا، بیت المال کا قیام، زکوٰۃ کی تحصیل اور اسکی تنظیم، مساجد کے متعلق قرآنی مکاتیب، اور کتب خانوں کا قیام وغیرہ بہت سے اہم اُمور داخل ہیں، اگر یہ مفید تحریک مسلمانوں میں مقبول ہو جائے، تو ان کی بہت سی اجتماعی گتھیاں آسانی کے ساتھ سلجھ سکتی ہیں، اس تحریک کی اشاعت کے ساتھ یہ اخبار جمعہ میں پڑھنے کے لئے ہر ہفتہ کسی مفید مذہبی موضوع پر ایک خطبہ بھی دیتا ہے، اسکے علاوہ مختلف مفید مذہبی مضامین اور معلومات پیش کرتا ہے، بقدر ضرورت سیاسی خبریں بھی ہوتی ہیں،

صبح دکن، (ہفتہ وار) مرتبہ جناب احمد عارف صاحب و علی اشرف صاحب تقطیع اوسط، اخباری ضخامت ۱۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت سالانہ سے ۳ ر ششماہی للعہ فی پرچہ ۳ ر پتہ :- غالبًا دفتر صبح دکن حیدرآباد کافی ہوگا،

اعلیٰ حضرت کے جشن سیمیں کے برکات میں سے ایک برکت یہ بھی ہے، کہ اسکی یادگار میں مملکت آصفیہ میں متعدد اچھے اخبارات و رسائل کا اضافہ ہوا، انہی میں ایک صبح دکن ہے، اگرچہ ابھی اس کے

صرف چند ہی نمبر نکلے ہیں، لیکن وہ ہندوستانی زبان کے کسی بہتر سے بہتر ہفتہ وار سے کم نہیں، مضامین کے تنوع، انتخاب اور ترتیب سے سلیقہ مندی نمایاں ہے، علمی ادبی یا تاریخی مضامین، موجودہ سیاسی، اقتصادی اور دوسرے اہم مسائلِ حاضرہ پر تبصرہ، مملکت آصفیہ، برطانوی ہند اور بیرونی ممالک کی خبریں وغیرہ جملہ اخباری مضامین کے لحاظ سے پڑھنے کے لائق اخبار ہے، امید ہے کہ وہ دکن اور بیرون دکن ہر مقام پر قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا،

ندیم (ہفتہ وار) مرتبہ جناب محمود الحسن صاحب صدیقی، بی اے علیگ، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، ٹائٹل دیدہ زیب، قیمت سالانہ سے، ششماہی عہ، فی پرچہ امر، پتہ ندیم بھوپال،

سرزمین بھوپال میں ہمیشہ سے علم و ادب کا مذاق رہا ہے، اور مختلف اوقات میں یہاں سے متعدد اچھے رسائل نکل چکے ہیں، لیکن ادھر عرصہ سے سناٹا تھا، اب ندیم پھر نوید ادب لیکر نکلا ہے، یہ ایک علمی و ادبی اخبار ہے، بقدر ضرورت سیاست سے بھی علاقہ رکھتا ہے، ہر ہفتہ علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی ہر رنگ کے اچھے مضامین پیش کرتا ہے، اہم سیاسی اخبار کا خلاصہ بھی دیتا ہے، امید ہے کہ یہ اخبار صاحب ذوق طبقوں میں مقبول ہوگا،

مسلم یونیورسٹی گزٹ (ہفتہ وار) مرتبہ وائس چانسلر درحم علی صاحب ہاشمی، تقطیع اوسط اخباری، صفحات کی تعداد متعین نہیں معلوم ہوتی، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ للعہ، پتہ: مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

مسلم یونیورسٹی کے لئے کسی ایسے اخبار کی بڑی سخت ضرورت تھی، جو مسلمانوں کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرتا رہے، وائس چانسلر صاحب نے اس ضرورت کا احساس کرکے آغاز سال (۱۹۳۷ء) سے مسلم یونیورسٹی گزٹ کے نام سے یہ ہفتہ وار جاری کیا ہے، جس میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے حالات

ہندوستان کی مختلف قوموں کی تعلیمی اور تمدنی سرگرمیاں، اور سیاست و حکمت پر مضامین اور عالم اسلامی کی خبریں ہوا کریں گی، ابھی غالبًا ابتدائی مراحل کیوجہ سے ان مقاصد کی پوری پابندی نظر نہیں آتی، مگر امید ہے کہ وہ بہت جلد مسلم یونیورسٹی کے معیار پر آجائے گا، چند صفحات انگریزی کے بھی ہوتے ہیں،

قوم (ہفتہ وار) مرتبہ جناب ابو سعید عبد القیوم صاحب، تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۱۲ صفحات، قیمت مرقوم نہیں، پتہ نمبر ۱۵ ابربی اسٹریٹ بنگلور،

یہ اخبار بنگلور سے نکلتا ہے، ہفتہ وار اخباروں میں خاص ہے، ہفتہ بھر کی سیاسی خبریں اور مختلف ممالک کے اہم سیاسی حالات دیتا ہے، کبھی کبھی بعض مستقل اور مفید مضامین بھی نظر آتے ہیں، اہم حوادث پر تبصرہ ہوتا ہے، مجموعی حیثیت سے پڑھنے کے لائق ہوتا ہے،

آئینہ (ہفتہ وار) مرتبہ جناب قاضی محمد حامد صاحب حسرت، تقطیع اخباری ضخامت ۸ صفحات کاغذ کتابت وطباعت اوسط، قیمت سالانہ سے ششماہی عہ، سہ ماہی عارضی پرچہ ار پتہ دفتر آئینہ فیض آباد،

یہ اخبار ابھی تھوڑے دنوں کو جاری ہوا ہے، اگرچہ وہ ظاہری شکل و صورت میں اچھے ہفتہ وار اخبارات سے کم نہیں ہے، لیکن خبروں اور مضامین کے لحاظ سے ابھی بالکل ابتدائی منزل میں ہے، سیاسی خبروں کا حصہ بہت کم ہوتا ہے، کبھی کبھی ادبی مضامین اور عام معلومات کی بعض چیزیں بھی نظر آتی ہیں، لیکن ابھی اسکو بہت ترقی دینے کی ضرورت ہے،

شیرازہ (ہفتہ وار) مرتبہ جناب محمود فضل صاحب بی اے، تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۱۶ صفحات کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ سے ششماہی عہ پتہ برکت علی روڈ دل محمد اسٹریٹ لاہور

شیرازہ ایک ادبی اور مزاحیہ اخبار ہے، بیشتر مضامین میں خاصی ظرافت کی چاشنی ہوتی ہے، لیکن کہیں کہیں ذرا تیز ہوکر پھیکی پڑجاتی ہے، خوش قسمتی سے اسکو سالک صاحب جیسے صاحب سلوک بزرگ اور سندباد جہازی جیسے تجربہ کار دریائی مسافر کی رہبری کا فخر ہے، حوادث و افکار اور اشارات خصوصیت کیساتھ زیادہ پر لطف ہوتے ہیں، امید ہے کہ زندہ دل اصحاب اس پیغام طرب کا گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کریں گے،

مطبوعاتِ جدیدہ

قنوطیت یعنی فلسفہ یاس

از جناب میر ولی الدین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، بیرسٹرایٹ لا استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۱۰ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت معلوم نہیں مصنف سے ملے گی۔

یہ مسئلہ کہ دنیا میں رجائیت الذت اور خیر زیادہ اور اصل شے ہے، یا قنوطیت الم اور شر زمانۂ قدیم سے مختلف فیہ چلا آتا ہے، ہر دور میں دونوں خیال کے حکما رہے ہیں، اور دوسرے خیال کے حکما کی تعداد زیادہ ہے حتیٰ کہ یہ مادی دور بھی جبکہ ساری دنیا تعیش اور مادیات کے سیلاب میں بہی چلی جارہی ہے، ایسے حکما سے خالی نہیں، فاضل مصنف نے اس کتاب میں فلسفہ جدیدہ کی روشنی میں اخلاقی نظری، اور تاریخی دلائل اور حکمائے مغرب کے اقوال وآراء سے دکھایا ہے، کہ اصل شے یاس اور قنوط ہے، دنیا اسباب الم سے بھری ہوئی ہے، جہاں سکون ومسرت کا نام نہیں، پھر ان دلائل پر تنقید کرکے ان کی قوت دکھائی ہے، آخر میں حقیقی مسرت کا راز ظاہر کیا ہے، اگرچہ اس کتاب میں اس مسئلہ پر خالص فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بحث ہے، لیکن ایک حد تک یہ مسئلہ مذہبی بھی ہے، دنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے مختلف پیرایوں میں اس حقیقت کو پیش کیا ہے، بعض مذاہب کی تو یہ اساسی تعلیم ہے، کہ دنیا صرف دار المحن ہے، جہاں لطف ومسرت کا نشان نہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رنج والم کے ہجوم کے مقابلہ میں حقیقی مسرت کا وجود بہت کم ہے، جو چیزیں ہم کو بظاہر سامانِ مسرت معلوم ہوتی ہیں، وہ بھی محض آنی اور اعتباری ہیں اور ان کا خمیازہ ان سے کہیں زیادہ سخت ہے، لیکن اس حقیقت کو مان لینے کے بعد کارخانۂ عالم درہم ہوا جاتا تھا، اس لئے بعض مذاہب نے اس میں یہ اعتدال پیدا کر دیا، کہ اگرچہ دنیا دار المحن ہے لیکن خاص تو تیں

کی پابندی سے سکون قلب حاصل ہوسکتا ہے، اور یہی اصل حقیقت ہے، اسی حقیقت کو لائق مصنف نے نہایت دلنشین اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے، موقع بہ موقع حکیمانہ اشعار کی آمیزش نے انداز بیان کو زیادہ موثر بنا دیا ہے، کتاب اس لائق ہو کہ نہ صرف فلسفہ کی حیثیت سے بلکہ ایک دلکش حقیقت کی حیثیت سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

مقالہ تحفظ علوم قدیمہ از جناب سید محمد ہاشم صاحب ندوی رکن دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن تقطیع بڑی ضخامت ۸۴، صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر، پتہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

یہ مقالہ مولینا ہاشم صاحب ندوی نے آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کے میسور کے اجلاس میں پڑھا تھا اس میں علوم و فنون کے آغاز ان کی عہد بعہد کی ترقی اور تنزل کی اجمالی سرگزشت بیان کی گئی ہے پہلے علم و فن کے قدیم گہواروں، بابل، فارس اور یونان کی علمی ترقی و تنزل کے مختصر حالات ہیں، پھر اسلامی دور میں امویہ دمشق، عباسیہ بغداد اور امویہ اندلس کے علمی خدمات اور ان کے عہد کی علمی ترقیوں کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں ابن رشد اور ابن سینا کے فلسفہ اور اسکے اثرات بھی آگئے ہیں، پھر عربی کتابوں کے لاطینی تراجم، مشرقی علوم سے مستشرقین کی دلچسپی یورپ میں ابن رشد اور ابن سینا کے فلسفہ کی اشاعت و مقبولیت، مشرقی سوسائٹیوں اور درسگاہوں کے قیام اور بعض مستشرقین کے علمی خدمات کا تذکرہ ہے، پھر ان کے اثر سے مصر میں مشرقی علوم سے دلچسپی، اور نوادر کتب کی طبع و اشاعت کا مختصر ذکر ہے، پھر ہندوستان کے مشرقی علوم کے اداروں کے حالات ہیں، اس ضمن میں بعض ان علماء کے نام بھی آگئے ہیں، جنھوں نے اپنے ذاتی شوق سے نوادر کتب شائع کئے، آخر میں دائرۃ المعارف کی جو ہندوستان میں عربی نوادر کتب کی اشاعت کا تنہا ادارہ ہے، تاریخ اور اس کے تفصیلی حالات، اس کے کارکنوں اور رفقاء کے نام اور اسکے مطبوعات کی فہرست ہے، اس طرح یہ مقالہ علوم کی تاریخ پر ایک مفید تبصرہ ہے،

علامہ شبلی بحیثیت شاعر از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی تقطیع اوسط

ضخامت ۴۰ صفحات کاغذ سپید دبیز ٹائپ صاف و روشن قیمت مرقوم نہیں، پتہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھ کاٹھیاوار،

مولینا شبلی کی علمی خدمات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی شاعرانہ حیثیت پر اب تک کسی نے مستقل نہیں لکھا، قاضی احمد میاں نے اس مقالہ میں جسکو انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے جلسہ میں پڑھا تھا، اس فرض کفایہ کو ادا کیا ہے، یہ مقالہ مولینا مرحوم کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے، مولینا مرحوم کی شاعرانہ فطرت اور ان کی شاعری کے محرکات اور اسباب کو دکھانے کے بعد انکی اردو شاعری پر جس کا بڑا حصہ بلکہ تقریباً کل مذہبی قومی سیاسی اور تاریخی نظموں اور بعض وقتی منظومات پر مشتمل ہے، تفصیلی تبصرہ کرکے دکھایا ہے، کہ اگرچہ اس صنف شاعری کے موجد دوسرے بزرگ تھے، لیکن اس خشک اور بے مزہ واقعہ نگاری میں مولینا نے شاعرانہ لطافتیں اور آب و رنگ پیدا کرکے اس کو واقعی شاعری بنا دیا، اس سلسلہ میں مولینا کے سیاسی خیالات اور اس عہد کے بعض واقعات بھی آگئے ہیں، جو بجائے خود مولینا کے خدمات کا ایک اہم پہلو ہیں، آخر میں مولینا شبلی اور مولینا حالی کی شاعری کا موازنہ کرکے دونوں کا فرق واضح کیا گیا ہے،

تقریر سیرت، مولینا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلما، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۶۲ صفحات کاغذ معمولی کتابت وطباعت اچھی قیمت عہ، پتہ دفتر اخبار انصاری، بلیماران دہلی،

مولینا احمد سعید صاحب نے ناگپور کے جلسۂ سیرت کے موقع پر یہ تقریر فرمائی تھی، جسے اب ادارۂ اخبار انصاری نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اس میں مذہب، اخلاق، تہذیب، معاشرت کی دینی تعلیمات اور سیاست و اقتصادیات وغیرہ کے مسائل حاضرہ بیان کئے گئے ہیں، رنگ واعظانہ ہے، جا بجا لطیفوں، چٹکلوں اور قصص و حکایات کی آمیزش نے اسکو زیادہ پرلطف بنا دیا ہے، مولینا کی تقریر کے قدردانوں کیلئے جنھیں خود انکی زبان سے سننے کا کم موقع ملتا ہے یہ کتاب دلچسپ تحفہ ہے، اس تقریر سیرت میں چند صفحے اردو شعر و ادب پر ہیں، ان میں مشہور شاعر جرات کا نام بھی امان آیا گیا ہے، حالانکہ تذکروں میں قلندر بخش لکھا ہے، زیب النساء کی طرف جو شعر منسوب کیا گیا ہے، وہ حقیقت میں صیدی کا ہے،

"م"

سیرۃ النبی کے بعد مسلمانوں کے لئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ ہو سکتے ہیں، وہ حضرت صحابہ کرام ہیں، دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان کام کو انجام دیا، اور سارے صحابہ کرام کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدیں احادیث و سیر کے ہزاروں صفحات سے چھانٹ کر مرتب کیں، اور بہ حسن و خوبی شائع کیں، ضرورت ہے کہ ہر طالب اور ہدایت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفوں کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی دیکھیں جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدوں کی علیحدہ علیحدہ قیمتیں حسب ذیل ہیں، جن کا مجموعہ [illegible] ہوتا ہے، لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف [illegible] میں یہ دسوں جلدیں کامل دی جاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار۔

جلد اول، خلفائے راشدینؓ [illegible] — جلد ششم، سیر الصحابہ ششم، [illegible]

جلد دوم، مہاجرین اول [illegible] — جلد ہفتم، سیر الصحابہ ہفتم، [illegible]

جلد سوم، مہاجرین دوم، [illegible] — جلد ہشتم، سیر الصحابیات، [illegible]

جلد چہارم، سیر انصار اول، [illegible] — جلد نہم، اسوۂ صحابہ اول، [illegible]

جلد پنجم، سیر انصار دوم، [illegible] — جلد دہم، اسوۂ صحابہ دوم، [illegible]

مہتمم دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۵۷

مئی سنہ ۱۹۳۷ء

معارف

مجلس المصنفین کا علمی رسالہ
دار المصنفین کا ماہوار رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

جلد ۳۹ | ماہ صفر المظفر ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۳۷ء

مضامین

شذرات

ذیحجہ ۱۳۵۵ھ کے معارف مین "ذبح عظیم" پر جو مضمون شائع ہوا ہے، اس کو پڑھکر میرے ایک خیرخواہ دوست نے مجھے لکھا ہے کہ آپنے "ذبح عظیم" کی تفسیر رویائے تمثیلی مانکر روحانی قربانی کرنے مین غلطی کی ہے، اس سے بعض اسلامی مسائل پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے، جب مین نے اس نظر سے مضمون مذکور کو پڑھا تو مجھے بھی اپنی غلطی محسوس ہوئی اور ظاہر ہوا کہ میرا اصلی مقصود واضح نہین ہوا، بلکہ نقص تعبیر سے مضمون مذکور مین تضاد سا پیدا ہوگیا ہے، یعنی یہ کہ ایک طرف بعض مفسرین کی تفسیر کے مطابق "ذبح عظیم" سے سنت اضحیہ اسلام کو مراد لینا صحیح بتایا ہے، اور آگے بڑھکر اس سے روحانی قربانی مراد لی ہے، مین اپنی اس غلطی سے شرمندہ ہون، خدا معاف فرمائے،

میرا اصلی مقصود یہ تھا کہ "ذبح عظیم" کی صحیح تفسیر جانور کی وہی قربانی ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ذبیح بیٹے کے بدلہ مین کی تھی اور جو ملت ابراہیم مین سنت قرار پائی، مگر یہ قربانی درحقیقت جس طرح ان مقدس باپ بیٹون کی ربانی اطاعت و فرمانبرداری اور جانسپاری کی تمثیل تھی، ایسے ہی آج بھی اسلام مین یہ قربانی مسلمانون کے انھی جذبات کی تمثیل ہے، یہی وجہ ہے کہ قربانی کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ والی یہ دعا ہم پڑھتے ہین،

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ	میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کیلئے
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ	ہے جو عالم کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہین
اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (انعام - ۲۰)	اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے، اور مین فرمانبردارون مین پہلا ہون

عام مسلمان کہتے ہیں وانا من المسلمین (اور مین مسلمانون میں سے ہون) کیونکہ اس راہ کی اولیت و پیشوائی حضرت ابراہیم کیلئے ہے اور عام مسلمان اس مین ان کے متبع اور پیرو ہیں،

اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کی قربانی کی غرض وغایت مسلمانون کی دلی کیفیت یعنی تقوی کو قرار دیا ہے، فرمایا،

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ	خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہین پہنچتا
يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ، (ج - ۵)	بلکہ تمھارا تقوی پہنچتا ہے،

ہمارے ہان تاریخ ہند کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اسکی پہلی جلد تاریخ سندھ پر مشتمل ترتیب پا چکی ہے آب غزنویہ کا دور زیر تالیف ہے بمبئی کے ایک مرحوم مسلمان ہیڈ ماسٹر کے ترکہ سے اسکی تیسری جلد کے لئے پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کے ذریعہ سے مرحوم کے عزیزون نے پانچ سو روپیے دینا منظور کیا ہے، جس مین سے ڈھائی سو کا چک دفتر میں وصول ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو مغفرت، اور ان کے عزیزون کو اسکا اجر عطا فرمائے،

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد اسلام کی تاریخ کا سب سے درخشان عہد حضرات تابعینؒ کا ہے، سیر الصحابہ کے بعد دار المصنفین کے رفیق مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب نے تابعین کے سوانح پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جو اس سال پریس مین چھپنے کو جا رہی ہے،

سلف امت نے خدا اُن پر رحمت فرمائے اپنے پچھلون کے لئے علم و فضل کی جو یادگارین چھوڑی ہین حق یہ ہے کہ وہ اسلام کا معجزہ ہین، علماے اسلام مین جس قدر اپنے بزرگون کے متروکات کی قدر بڑھتی

جاتی ہے، یہ کنز مخفی اپنے گوشون سے نکل نکل کر وقف عام ہو رہا ہے، افسوس ہوتا ہے کہ زمانہ کی ناقدری
سے جب ان علوم میں خزان کا دور ہے، ان کی کتابوں کی اشاعت کا موسم بہار ہے،

اسلام کے مسائل مالیہ میں ایک مدت تک صرف قاضی ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج لوگون کے
ہاتھون مین رہی، کچھ سال ہوے کہ اسی بحث پر ۱۳۴۷ھ مین یحییٰ بن آدم قرشی المتوفی ۲۰۳ھ کی کتاب الخراج
مطبعۂ سلفیہ مصر سے چھپ کر شائع ہوئی، اس کے بعد دائرۃ المعارف حیدرآباد سے قاضی ابو یوسف اور امام
زفر کے شاگرد ہلال بن یحییٰ بن مسلم رائی کی کتاب الوقف منظر عام پر آئی، اور اب ابو عبید قاسم بن سلام المتوفی
۲۲۴ھ کی کتاب الاموال شائع ہوئی ہے، ازہر کے ایک فاضل عالم محمد حامد الفقی نے اس کی تصحیح کی ہے
اور اس پر مفید حاشیے لکھے ہین، اسلام کے مالی مسائل پر ایسی وسیع اور مفید تصنیف کوئی نہیں شائع ہوئی
تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے کیسے کیسے اچھے اور اچھوتے مضمونون پر کیسی عمدہ عمدہ کتابین لکھی ہیں

مارچ کے شذرات مین انگریزی اسکولون اور کالجون کے مسلمان طالب علمون مین عربی زبان کی
تعلیم کی نسبت جو کچھ لکھا گیا تھا، اسکی نسبت ہم سے پوچھا گیا ہے کہ عربی صرف و نحو کو آسان طریقہ سے پڑھنے
کی کیا صورت ہے، اس کا مفصل جواب تو مستقل مضمون کا طالب ہے، مگر مختصر یہ ہے کہ صرف و نحو کو نظری
کے بجاے عملی حیثیت سے پڑھایا جاے جس کا ایک اسلوب خاص مولانا حمید الدین صاحب کی اسباق النحو
اور ہماری دروس الادب مین بتایا گیا ہے، دار العلوم ندوہ، اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر مین اس کا کافی
کامیاب تجربہ کیا جاچکا ہے،

مقالات

خلیل اللہ کی بشریت

حضرات انبیا کرام کے اوصاف غالبہ

(۲)

نمرود کی آگ اُن کے لئے ٹھنڈی ہو جاتی ہے، اور ندا آتی ہے، کہ سلامتی ہو ابراہیم کی سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰہِیْمَ بت پرست باپ کو سمجھاتے ہیں نہیں مانتا، اور کفر پر اڑا رہتا ہے، تو اس کو خدا کا ڈر ہلکے لفظوں میں سناتے ہیں،

یٰٓاَبَتِ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّکَ	اے میرے باپ میں ڈرتا ہوں کہ
عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَکُوْنَ	تجھے رحمت والے خدا کی طرف کوئی عذاب
لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا،	نہ چھوئے تو تو شیطان کا ساتھی بنے،

(مریم ۳)

باپ نے یہ سُن کر بیٹے کو سزا کی دھمکی دی، اور گھر سے نکل جانے کا حکم دیا، بیٹا اب بھی باپ کی خیرخواہی میں مصروف ہے، سلام کرتا ہے، اور اپنے خدا سے اس کے گناہوں کی معافی کیلئے دعا کا وعدہ کرتا ہے،

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا (مریم ۳)

ابراہیم نے کہا تم پر سلامتی ہو، میں تمہارے لئے اپنے رب سے دعا مانگونگا کہ تمہارے گناہ معاف فرمائے، وہ مجھ پر مہربان ہے، اور میں تم سے اور تمہارے معبودوں سے الگ ہوتا ہوں اور اپنے رب سے دعا کرتا ہوں، اور امید ہے کہ میں اس دعا میں بے نصیب

حضرت ابراہیمؑ نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا، اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کی،

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ. (ابراہیم ۶)

اے ہمارے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ اور ایمان والوں کو اس دن بخشدے جب حساب کتاب قائم ہو،

یہ بشارت کی پے درپے التجا کافر باپ کے حق میں ہے، اور جب آنحضرت صلعم کو اور مسلمانوں کو مشرکوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت آئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس فعل کی توجیہ فرمائی،

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (توبہ ۱۴)

اور ابراہیم کا اپنے باپ کی مغفرت کی دعا مانگنا نہ تھا، مگر وعدہ کے سبب جو اس نے اس سے کیا تھا، پھر جب ابراہیم پر ثابت ہوگیا، کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے الگ ہوگیا، بیشک

اس آیت پاک سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا اس توقع میں تھی کہ اُن کا باپ مسلمان ہو کر رحمتِ الٰہی کا مستحق ٹھہرے، لیکن ان کی یہ توقع درست نہیں نکلی، دوسری بات یہ کہ حضرت ابراہیمؑ چونکہ کمال بشریت سے ممتاز تھے، اس لئے خدا نے ان کی نرم دلی اور بردباری کی تعریف فرمائی،

اس طرح حضرت لوطؑ کی قوم کی تباہی کی خبر جب مہمان فرشتوں نے ان کو سنائی تو ان کو بڑا صدمہ ہوا، اور بارگاہِ الٰہی میں اس کی طرف سے عرض معروض کرنے لگے، تو خدا نے پھر ان کی نرم دلی اور بردباری اور حق ظاہر ہونے کے بعد انکے رجوعِ حق کی مدح فرمائی،

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ	تو جب ابراہیم سے خوف جاتا رہا،
الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى	اس کو (اولاد کی) بشارت مل چکی ہم
يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ	سے لوطؑ کی قوم کے بارے میں جھگڑنے لگا،
لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ o يٰۤاِبْرٰهِيْمُ	بیشک ابراہیم بردبار، نرم دل اور رجوع
اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ	کرنے والا تھا، (خدا نے فرمایا) اے
اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ	ابراہیم اس خیال کو چھوڑ دے، تیرے
عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ،	رب کا حکم آچکا، اور لوطؑ کی قوم کو وہ عذاب
(ہود - ۷)	آنے ہی والا ہے، جو واپس نہ ہوگا،

حضرت ابراہیمؑ قوم لوطؑ کی طرف سے کیونکر جناب باری سے جھگڑنے لگے، ایک دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ حضرت لوطؑ کو پیش کر کے رحمتِ الٰہی کے خواستگار ہوئے،

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ	جب ہمارے فرشتے ابراہیم کے
بِالْبُشْرٰى قَالُوْۤا اِنَّا مُهْلِكُوْۤا اَهْلِ	پاس (اولاد کی) بشارت لے کر آئے،

هٰذِهِ الْقَرْيَةِ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا قَالُوا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَنْ فِيهَا لَنُنَجِّيَنَّهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ

(عنکبوت ۴)

انھون نے بیان کیا کہ ہم اس آبادی کے رہنے والون کو ہلاک کرنے آئے ہیں، بیشک وہ ظالم ہیں، ابراہیم نے کہا اس گاؤں میں لوط ہیں، اُنھون نے کہا کہ ہم کو خوب معلوم ہے، جو اس میں ہیں، ہم ان کو اور ان کے گھر والوں کو بچا لین گے لیکن انکی بیوی کو

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے اسی عرض و معروض کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت بارگاہِ الٰہی سے ان کو یہ خوشخبری سنائی گئی، اور ہمیشہ کے لئے یہ قانونِ الٰہی قرار پایا کہ ایک کی برائی کا بوجھ دوسرے پر لادا نہ جائے،

أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ

(نجم ۳)

کیا انھیں بتایا نہیں گیا، جو موسیٰ کے اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں ہے، جس نے پورا حق ادا کیا، کہ کوئی شخص دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھائیگا اور یہ کہ انسان کے لئے نہیں ہے بلکہ

سورۂ انعام کے آخر میں حضرت ابراہیمؑ کے تعلق سے یہ آیت پھر آتی ہے، آنحضرت صلعم کو ارشاد ہوتا ہے، کہ کہدے کہ ہم تو ابراہیم کے دین کے پیرو ہیں، جس کا مسلک یہ تھا،

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ

کہدے کہ مجھے میرے رب نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، سیدھا دین ابراہیم

اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ	کا دین جو موحد تھا، اور مشرکوں میں سے
الْمُشْرِكِيْنَ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ	نہ تھا، کہدے کہ میری نماز میری قربانی
وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ	میرا جینا، میرا مرنا، عالم کے پروردگار
الْعٰلَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ	اللہ کے لئے ہے، اس کا کوئی شریک
اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ قُلْ	نہیں، اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے
اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ	اور میں مسلمانوں کا پہلا ہوں، کہدے
كُلِّ شَيْءٍ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ	کہ کیا خدا کے سوا کسی اور کو پروردگار
اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ	چاہوں، حالانکہ وہی تو ہر شے کا رب
وِّزْرَ اُخْرٰى،	ہے، اور ہر جان کی کمائی اسی پر ہے
(انعام - ۲۰)	کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا بوجھ

یہ سب وہی باتیں ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے میں تھیں، اور ان کا اعادہ پھر صحیفۂ محمدی میں کیا جارہا ہے،

میرا خیال ہے کہ توراۃ کا صحیفۂ پیدائش ہی حضرت ابراہیمؑ کے اس عرض و معروض کی پوری تفصیل ہے، جو انھوں نے حضرت لوطؑ کی قوم کے بارہ میں بارگاہ الٰہی میں پیش کی۔

"ابراہام ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا، تب ابراہام نزدیک جاکے بولا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا، شاید پچاس صادق اس شہر میں ہوں، کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس صادقوں کی خاطر جو اس کے درمیان ہیں اس مقام کو نہ چھوڑے گا، ایسا کرنا تجھے بعید ہے، کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا، اور خداوند نے کہا کہ اگر میں سدوم (قوم لوط کا شہر) میں شہر کے درمیان پچاس صادق پاؤں تو میں ان کے واسطے تمام مکان کو

چھوڑ دوں گا، تب ابراہام نے جواب دیا اور کہا، اب دیکھ میں نے خداوند سے بولنے میں جرأت کی، اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں، شاید پچاس صادق سے پانچ کم ہوں، کیا ان پانچ کے واسطے تو تمام شہر کو نیست کرے گا۔ اور اس نے کہا اگر میں وہاں پینتالیس پاؤں تو نیست نہ کروں گا، پھر اوس نے اوس سے کہا کہ شاید وہاں چالیس پائے جائیں، تب اوس نے کہا کہ میں اُن چالیس کے واسطے نہ کروں گا، پھر اوس نے کہا میں منت کرتا ہوں، کہ اگر خداوند خفا نہ ہوں تو میں پھر کہوں، شاید وہاں تیس پائے جائیں، وہ بولا اگر میں وہاں تیس پاؤں تو میں یہ نہ کروں گا، دیکھ میں نے خداوند سے بات کرنے میں جرأت کی، شاید وہاں بیس پائے جائیں، وہ بولا میں بیس کے واسطے بھی اُسے نیست نہ کرونگا، تب اوس نے کہا میں منت کرتا ہون کہ خداوند خفا نہ ہون، تب میں فقط اب کی بار پھر کہوں، شاید وہاں دس پائے جائیں، وہ بولا میں دس کے واسطے بھی اُسے نیست نہ کرونگا، جب خداوند ابراہام سے باتیں کر چکا، تو چلا گیا، اور ابراہام اپنے مقام کو پھرا "

(باب ۸ - ۲۳ سے ۳۳ تک)

توراۃ کے اس بیان سے اس جدال کی پوری تفصیل معلوم ہوتی ہے، جو وہ بار بار سدوم کے گنہگاروں کو بچانے کے لئے بارگاہ الٰہی میں پیش کرتے تھے، اور اس نرم دلی، بردباری، اور رجوع حق کی تصدیق ہوتی ہے، جس سے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کو متصف کیا ہے، اور ان آیات الٰہی کی تصدیق ہوتی ہے، جن کو قرآن نے صحیفۂ ابراہیمی کے حوالہ سے پیش کیا ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کی اس شان بشریت کا اظہار ہوتا ہے، جو جلال الٰہی کا پر تو تھی،

حضرت ابراہیمؑ جب کعبہ کی تعمیر سے فراغت پاتے ہیں، اور اپنی اولاد کو اس کی پاسبانی کے لئے بارگاہ الٰہی میں پیش کرتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں، کہ اس بے آب و دانہ بنجر زمین میں خداوندا اسکو تیرے گھر کی پاسبانی اور تیرے دین کی حفاظت کی خاطر بساتا ہوں، خداوندا ان کو روزی دینا، ان میں

اپنا رسول بھیجا، ان کو بتوں کی پوجا سے بچانا،

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ	اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے
هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ	میرے پروردگار اس شہر کو امن والا
اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ رَبِّ اِنَّهُنَّ	بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو تو اس
اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ	سے بچا، کہ وہ بتوں کو پوجیں، خداوندا
تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ	ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ
فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	کیا، تو جو میری پیروی کرے وہی
(ابراہیم۔ ۶)	مجھ سے ہے، اور جس نے میری نافرمانی
	کی، تو بے شک تو بخشنے والا رحمت والا

یہ خدا کی بخشش و رحمت کی تحریک کن کے لئے ہو رہی ہے، ان کے لئے جو بُت پرست ہو کر ان کی نافرمانی کریں،

یہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی بشری شان،

صحابہ میں ان کے جلوے، اوپر کی سطروں میں انبیاء علیہم السلام کی ذریت اور بشریت کی جو تشریح کی گئی ہے، وہ میری نہیں بلکہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان حق ترجمان سے ادا ہوئی ہے، غزوۂ بدر میں جب کفار قریش گرفتار ہو کر آئے، تو آنحضرت صلعم نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ نے کہا کہ ان کو آگ میں جلا دیا جائے، اور حضرت عمرؓ نے کہا ان کو قتل کر دیا جائے، لیکن حضرت ابو بکرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ یہ آپ کے خاندان اور قوم کے ہیں، ان پر رحم فرمائیے، آپ نے ان دونوں فریق کے مشورہ کو سنکر فرمایا، کہ ایک فریق اپنے پہلے بھائیوں نوحؑ اور موسیٰؑ کی طرح ہے، نوحؑ نے کہا تھا پروردگار زمین پر کافروں

میں سے کسی گھر بسانے والے کو مت چھوڑ" اور موسیٰ نے کہا ہمارے پروردگار ان کی دولت میٹ دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے" اور دوسرا فریق ابراہیمؑ کی طرح ہے، ابراہیمؑ نے کہا، جس نے میری پیروی کی، وہ مجھ سے ہے، اور جس نے میری نافرمانی کی، تو تو بخشنے والا اور رحم والا ہے" اور عیسیٰ کی طرح ہے، کہ عیسیٰ نے کہا کہ اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو قدرت والا اور حکمت والا ہے، (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۱ و ۲۲)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے عبد اللہ بن رواحہ اور حضرت عمرؓ کو حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰ کی نذیری شان، اور حضرت ابوبکرؓ کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی بشیری شان کی مثال ظاہر فرمایا اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ بشیریت و نذیریت کے کمال سے کیا منشا ہے،

عام طور سے ہر نبی نذیر اور بشیر ہے، | اس بیان سے کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ اس مضمون کا منشا نعوذ باللہ یہ ہے کہ کوئی نبی صرف مبشر یا کوئی نذیر صرف اس معنی میں ہوتا ہے، کہ ایک صرف بشارت سناتا ہے، اور دوسرا صرف انذار کرتا ہے، بلکہ یہ منشا ہے کہ کسی نبی میں عام وصف انذار کے ساتھ مبشریت کا کمال ہوتا ہے، اور کسی میں مبشریت کے عام وصف کے ساتھ نذیریت کا کمال ہوتا ہے، ورنہ خود اللہ تعالیٰ نے بلا استثناء تمام پیغمبروں کو مبشر و نذیر ایک ساتھ فرمایا ہے، لیکن اس بشیریت و نذیریت کے معنی واضح بھی فرما دیئے ہیں جو عام وصف بشیر و نذیر کی حقیقت ہیں، فرمایا،

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا	اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو لیکن
مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ. (انعام)	بشارت سنانے والے اور ڈر سنانے والے

یہ بشارت کیا ہوتی ہے، اور یہ ڈر سنانا (انذار) کیسے ہوتا ہے، آیت بالا کے ساتھ ہی اس بشارت اور انذار کی یہ تشریح ہے،

فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ	تو جو ایمان لایا اور اچھے کام کئے

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ	تو ان کو نہ ڈر ہوگا، اور نہ غم، اور
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ	جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا،
بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝	ان کو ان کی نافرمانی کے سبب سے
(انعام - ۵)	عذاب چھوئے گا،

لیکن بشیریت یا نذیریت کے اوصافِ غالبہ جن پیغمبروں کو ملتے ہیں، ان کی بشیریت اور نذیریت کی شان اس سے بہت بلند ہوتی ہے، جس کی مثالیں ایک طرف حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ میں، دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ میں نظر آتی ہیں، اور دونوں کا مجموعہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک میں، صلوٰت اللہ علیہم اجمعین،

یہ جمال وجلال کے پرتو ہیں، کسی نبی میں شانِ نذیری کا غلبہ، اور کسی نبی میں شانِ بشیری کا کمال باہم ایک دوسرے پر ترجیح کا سبب نہیں، انبیاء علیہم السلام کے یہ دونوں اوصاف اللہ تبارک وتعالیٰ کی شانِ جلال وجمال کے مظہر ہیں، کسی میں جلالی شان کی چمک زیادہ ہوتی ہے، اور کسی میں جمالی شان کی، جب اور جس زمانہ میں حکمتِ الٰہی کا اقتضاء جلال یا جمال میں جس شانِ کمال کا اظہار ہوتا ہے، وہ اسوقت کے پیغمبروں میں ظاہر فرماتا ہے، دونوں اسکی شانیں ہیں، اور دونوں اس کے اسمائے حسنیٰ،

اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

عالمگیر کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب رفیق دارالمصنفین

"جسمانی ہمت اور بر ودت کے علاوہ اس نے اوائلِ زندگی ہی سے بادشاہت کی مشقتوں اور خطروں کو اپنا شیوہ بنالیا تھا، اور اس عظیم الشان عہدہ کے لئے احترامِ ذات، معرفتِ ذات، اور ضبط نفس سے اپنے کو تیار کیا، بادشاہوں کے لڑکوں سے بالکل مختلف، اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور صحیح الطبع عالم تھا، اور زندگی کی آخری سانس تک کتابوں سے محبت کرتا رہا، اگر ہم قرآن شریف کے ان متعدد نسخوں کو نظر انداز بھی کر دیں جکو اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک عابد کی سرگرم ریاضت کیساتھ لکھا، تو بھی ہم اسکو فراموش نہیں کر سکتے، کہ وہ ایک مشغول حکمراں ہونیکے باوجود اپنی قلیل فرصت کو عربی کی فقہ اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں شوق سے گذارتا، اور پرانے اور نادر مخطوطات مثلاً نہایہ، احیاء العلوم اور دیوانِ صائب کو کتابوں کے ایک کامل عاشق کی ہوس سے ڈھونڈتا، اس کے کثیر رقعات اس کی فارسی شاعری اور عربی ادب پر قدرت کی دلیل ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے ہر ایک خط کو مناسب اشعار و اقتباسات سے مزین کرتا ہے، عربی اور فارسی کے علاوہ وہ ترکی اور ہندی بھی آزادی کے ساتھ بول سکتا تھا، یہ اسی کی جودتِ طبع اور سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ فتاوی عالمگیری ہے جو نہایت مناسب طور پر اسی کے نام کیا تھا،

منسوب ہے، اور جس نے ما بعد کے عہد میں ہندوستان میں اسلامی انصاف کو واضح طور پر صاف کرکے آسان کر دیا ہے[۱]؛

یہ الفاظ اورنگ زیب کے اس سیرت نگار کے ہیں، جس نے اس کے خلاف تعصب اور عداوت کا اظہار کرنا اپنی زندگی کا واحد اور معنی خیز مقصد سمجھا ہے، ایک مخالف مورخ کی مذکورۂ بالا رائے عالمگیر کے علم کے حسن ذوق کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے، مگر اس مختصر بیان کی تشریح کے لئے ہم تفصیلات کی دلچسپی میں ضرور پڑیں گے، گو اس موضوع پر اہل قلم مختلف پیرایوں میں اظہار خیال کر چکے ہیں[۲]، ڈر ہے کہ کہیں تکرار نہ پیدا ہو جائے،

اورنگزیب کے فطری علمی ذوق کی جلا لائق اور قابل اساتذہ کی تعلیم و تربیت سے ہوئی جن استادوں سے اورنگزیب نے فیض حاصل کیا وہ یہ تھے،

مولینا عبد اللطیف سلطانپوری[۳]، ہاشم گیلانی[۴]، ملا موہن بہاری[۵]، علامی سعد اللہ[۶]، مولینا سید محمد قنوجی[۷]، ملا شیخ احمد معروف بہ ملا جیون، شیخ عبد القوی[۸]، دانشمند خان[۹]،

مولینا عبد اللطیف معقولات اور منقولات میں مہارت تامہ رکھتے تھے، ہاشم گیلانی کا ذکر شاہجہاں کے دربار کے فضلاء کے سلسلے میں آچکا ہے، وہ علم معقولات اور منقولات کے علاوہ طب اور ریاضی کا متاز عالم تھا، ملا موہن بہاری حافظ تھے، علامی سعد اللہ کا بھی ذکر آچکا ہے، مولینا سید محمد قنوجی ریاضی اور ادب کے ماہر تھے، ملا جیون تفسیر اور فقہ کے جید عالم تھے، اپنی تفسیر احمدی اور نور الانوار کی وجہ سے اب تک ہندوستان میں مشہور ہیں،

---

[۱] اورنگ زیب جلد پنجم از جادو ناتھ سرکار ص ۴۶۳، [۲] اورنگ زیب کی تعلیم و تربیت اور انشاء و ادب پر جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے سابق رفیق دار المصنفین (حال پروفیسر اسماعیلیہ کالج بمبئی) نے مقدمۂ رقعات عالمگیر میں نہایت فاضلانہ ابواب لکھے ہیں، موجودہ مضمون کی ترتیب میں ان سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، [۳] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۳۲، [۴] عبد الحمید لاہوری جلد اول حصہ دوم ص ۹۵، [۵] مآثر الکرام ص ۲۲۲، [۶] احکام عالمگیری ص ۴، [۷] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۳، [۸] مآثر الکرام ص ۱۷۱، [۹] مآثر الامراء جلد اول ص ۲۲۵،

دانشمند خان کو تصوف و اخلاق پر عبور تھا، اورنگ زیب نے امام غزالی کی احیاء العلوم اسی سے پڑھی، اورنگ زیب امام غزالی کی کتابوں سے خاص ذوق رکھتا تھا، ایک رقعہ میں شہزادہ اعظم شاہ سے ان کی ایک تصنیف تبر المسبوک کی فرمایش تاکید کے ساتھ کرتا ہے[۲]، عالمگیر نے چار زبانیں سیکھیں، عربی فارسی، ترکی اور ہندی، عالمگیر نامہ میں ہے :-

"آن زبان سروش بخت و اقبال اگرچہ اکثر اوقات بزبان سلیس بلیغ فارسی تکلم می نماید، لیکن ترکی چغتائی را بنہایت خوب می دانند و با ترکان بدان زبان سخن می کنند و با جمعی از اہل ہند کہ فارسی نمی دانند یا نیکو نمی توانند گفت بضرورت زبان بلغت ہندی می کشایند"[۳]

اس تعلیم و تربیت کا جو لازمی نتیجہ ہونا چاہئے تھا، وہ ہوا، تبحر علمی، کثرت مطالعہ اور وسیع النظری میں اورنگ زیب تمام تیموری حکمرانوں پر فوقیت اور افضلیت رکھتا تھا، عالمگیر نامہ میں اس کے علم و فضل کا اعتراف ان لفظوں میں ہے :-

"از کمالات کسبیہ آنحضرت کہ زینت بخش حالات قدسیہ وجیہہ گشتہ، تتبع علوم دینیہ از حدیث و تفسیر عربیہ و فقہ شریف حنفیہ است، از بس بممارست مراتب شرعیہ و استکشاف عقائد اصلیہ و مسائل شرعیہ اشتغال ورزیدہ اند، قوت حافظہ اشرف مخزن این حقائق شدہ و بسیاری از کتب طریقت و سلوک و اخلاق چون احیاء العلوم و کیمیائے سعادت و دیگر تصانیف عرفا و اکابر و رسائل و مؤلفات علمائے باطن و ظاہری بمطالعہ ہمایون رسیدہ ... عضلات و کشف اسرار آن فرمودہ اند و بالفعل نیز بعد فراغ از نظم مہام سلطنت و سروری تمہید مراسم دین پروری و عدالت گستری باین شرائف اشتغال بیونگی وارند"[۴]

---

[۱] التبر المسبوک فی اخلاق الملوک چھپ گئی ہے، اسمیں امام نے سلاطین کے ضروری اخلاق و عادات اور طرز سیاست پر گفتگو کی ہے، [۲] احکام عالمگیری، [۳] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۵، [۴] ایضاً ص ۱۰۹۱

اسی چیز کو ماثر عالمگیری کا مصنف ان مختصر الفاظ میں پیش کرتا ہے :۔

" از کمالات کسبیۂ آنحضرت کہ زینت بخش حالات وہبیہ گشتہ تتبع علوم دینیہ از تفسیر و حدیث وفقہ است و تصانیف امام حجۃ الاسلام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ و انتخاب مکتوبات شرف الدین یحیٰی منیری و شیخ زین الدین قدس سرہما و قطب محی شیرازی رحمہ اللہ و ازین قبیل کتب دیگر مدام ز تعدی مطالعہ شد"[1]

اورنگزیب حافظ قرآن بھی تھا، اور یہ سعادت تیموری بادشاہوں میں صرف اسی کو حاصل تھی، اور سب سے بڑھکر تعجب کی یہ بات ہے کہ اورنگزیب نے کلام پاک اس وقت حفظ کیا، جب وہ اپنی عمر کے تینالیسویں سال میں تھا، اور یہ دولت صرف ایک سال کے اندر جمع کی ۱۰۷۰ھ میں حفظ کرنا شروع کیا اور ۱۰۷۱ھ میں ختم کیا، سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ سے ابتدا کی اور لوح محفوظ سے اختتام کی تاریخ نکلتی ہے، اورنگ زیب کے ایک درباری شاعر نے اس موقع پر یہ شعر کہا،

توحامی شرع وحامی تو شارع
توحافظ قرآن وخدا حافظ تو[2]

عالمگیر نامہ میں ہے :۔

" واز جلائل فضائل آن خدیو یزدان پرست توفیق حفظ تمام کلام مجید ربانیت درمین اوان سلطنت وجہانبانی وزمان اشتغال بامور ملک رانی وکشورستانی کہ ہیچ یک از سلاطین اسلام ودین پرور دنیا پاستانی را این خصیصۂ سعادت چہرہ آرای دولت نگشتہ وعزیمت این مقصد بلند وداعیہ ہمت پسند درخاطر نگذشتہ بلکہ کمتری از ارباب فضل وکمال واصحاب علم و معرفت را این کرامت وشرف دست نداده اگرچہ ہم از مبادی حال دولت واقبال بر...

[1] ماثر عالمگیری ص ۵۳۲، اس بیان کی تائید انہی الفاظ کے ساتھ مراۃ العالم مصنفہ بختاور خان سے ہوتی ہے (قلمی نسخہ دارالمصنفین) ص ۵۲، [2] ص ۵۳۳ و عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۱ و مراۃ العالم قلمی نسخہ،

از سور کریمهٔ قرآنی و بسیاری از آیات بینات فرقانی محفوظ خاطر اقدس بود لیکن حفظ مجموع کلام اللہ
از آن بادشاہ خدا آگاہ بعد جلوس بر اورنگ حشمت و جاہ اتفاق افتاد و چون بہ نیروی تائید ربانی این
خطرهٔ الٰہی و داعیهٔ آسمانی بر باطن تقدس موطن پرتو افگند بمیامن ہمت بادشاہانه و عزیمت خسروانه
و یاوری توفیق کردگار و مساعدت بخت سعادت آثار در عرض اندک وقتی مختصر فرصتی مجموع کلام مجید
و فرقان حمید با رعایت مراتب قرات و شرائط تجوید و ادراک شان و نزول آیات بینات و تفسیر معانی
و فہم اسرار و نکات آن بر لوحهٔ حافظهٔ اشرف کہ لوح محفوظ اسرار غیبی است مرتسم گشت، چنانچه
تاریخ شروع آن حفظ شریف را حروف کریمه سنقرئک فلا تنسی بحساب جمل پرده از رخ می کشاید
و تاریخ اتمامش از اعداد لوح محفوظ جلوهٔ ظهور می نماید[۵۱]

اورنگ زیب فن خطاطی میں ید طولیٰ رکھتا تھا، یہ فن اوس نے سید علی خان الحسینی جواہر رقم[۵۲] اور عبدالباقی حداد[۵۳] (عبداللہ) سے سیکھا، چنانچہ اسکو خط نسخ اور خط نستعلیق لکھنے میں کامل مہارت تھی، منشی کاظم مصنف عالمگیر نامہ لکھتا ہے:

"از رتبهٔ خط و حسن تحریر آن شہنشاه فلاطون فطنت سکندر نظیر که صفحات روزگار و اوراق
دفاتر لیل ازان زینت پذیر است خامهٔ نکته پرداز چه دو فن را چه یارای دم زدن بقدرت
کلک بدائع آثار معنی استادی و سحر نگاری را چنان بر کرسی نشانیده اند که دست استادان
اقالیم سبعه خط بدان نتواند رسید و برشحهٔ فیض انامل دُرربار نهال موزون قلم را در خوشنویسی
شاخ و برگی بخشیده که یکتایان صنعت خط از تتبع آن شیوه جز خجلت ثمری نتوانند چید، اخط
نسخ آن حضرت که رقم نسخ خط یاقوت و صیرفی تواند بود، در غایت پختگی و مزه و متانت و اسلوب
است، کمال قدرت در نوشتن آن دارند، اکثر اوقات توفیق ثواب اندوزی کتابت کلام اللہ

[۵۱] عالمگیر نامه ص ۱۰۹۲۔ [۵۲] تاریخ خوشنویسان ہند ص ۵۲ [۵۳] ایضاً ص ۱۲۵

از ضمائم عبادات و کرائم عادات آن شہنشاہ دین پناہ است،........خط نستعلیق آنحضرت بے تنا
اطرای مدح طرازی و اغراق نکتہ پردازی دراں رتبہ است کہ قطعہائے کہ در عین ایام ذوق
و سرگرمی مشق رقم پذیر خامہ اشرف گشتہ بقطعہائے خوب استادان کہ عمر گرامنا یہ صرف تحصیل
آن سرمایہ ساختہ تکمیل امرے دیگر سے نپرداختہ اند در نظر خط شناسان مبقر مشتبہ می شود،
و شکستہ نستعلیق در غایت مغزداری و صفا متانت و پختگی می نویسند"[1]

مآثر عالمگیری میں ہے،

" خط نسخ آنحضرت در غایت متانت و اسلوب بود و کمال قدرت در نوشتن آں داشتند
و خط نستعلیق و شکستہ نیز بغایت خوب نوشتند"[2]

بختاور خان مراۃ العالم میں لکھتا ہے،

" در نوشتن اقسام خطوط مہارت اندوختہ" (موجودہ دار المصنفین قلمی)

اورنگ زیب نے خطاطی کا فن محض ذاتی زیب و زینت کے لئے نہیں سیکھا تھا، بلکہ اس کے ذریعہ سے
کسب سعادت دین اور معاش دنیا کیا کرتا تھا، وہ فرصت کے اوقات میں عموماً صبح کو پانچ بجے سے سات
بجے تک اور سہ پہر کو ۲ بجے سے ۵ تک کلام مجید کے نسخے اپنے ہاتھوں سے لکھا کرتا تھا جس کا سلسلہ
سن ایام شہزادگی سے لیکر آخر عمر تک جاری رہا، عالمگیر نامہ میں ہے،

" در ایام میمنت انجام بادشاہزادگی مصحفی مجید بخط مبارک صورت اتمام دادہ[3] تزا باد گیر
شرائف تحف و رغائب و مسلی خطیر برسم نذر و آئین نیاز بہ مکہ معظمہ و کعبہ مشرفہ زاد ہا اللہ

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۳، [2] مآثر عالمگیری ص ۵۳۳ [3] مراۃ العالم میں تذکرہ ہے اور کا بیان ہے کہ اس میں آٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے
" در قرآن مجید بخط اقدس صورت ترتیب پذیرفتہ، دو مبلغ ہفت ہزار روپیہ بر لوح وجدول آں صرف شدہ بمکہ
شریفہ ترسیل یافتہ"

قدر اوجلالہ فرستا دند کہ دران حرم محترم و بقعۂ مکرم برکات تلاوتش بروزگار خجستہ آثار عائد گردد

وبعد از جلوس بر سریر سلطنت و اقبال با وجود کثرت مشاغل صوری ومعنوی ونظم وپرداخت امور

دینی و دنیوی وفرط توجہ اشتغال بحراست وپاسبانی جہانیان وتاسیس قواعد عدل واحسان

عزیمت نگارش مصحفی دیگر از خاطر انور سر برزدہ شروع دران مقصد والا فرمودند و ہر روز

بعد فراغ از اشغال ضروریۂ دین و دولت وتنظیم مہام ملک وملت واداے وظائف طاعت و

عبادت شطری از اوقات میمنت قرین بتحریر سطری چند از کتاب مبین مصروف ساختہ در عرض اندک

وقتے بدستیاری تائید و مددگاری بخت سعید جدی، دیگر از مصحف مجید باتمام رسانیدہ سوادت

جاوید اندوختند، وسواے این دو مصحف کریم مکرر بتحریر پنجسورہ و دیگر سور قرآنی موفق گشتہ اند"[1]

اورنگزیب کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے کلام پاک کے نسخے آج بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں

پائے جاتے ہیں، ایک نسخہ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن کی ملکیت ہے، دوسرا جناب مولوی سید خورشید علی صاحب

ناظم دیوانی حیدرآباد کے پاس ہے، تیسرا نواب صاحب ناگردل کے پاس ہے، جس کا عکس جناب خواجہ حسن

نظامی صاحب نے شائع بھی کر دیا ہے، مگر یہ نسخہ مشکوک ہے، ایک پنج سورہ وکٹوریہ میموریل کلکتہ میں ہے[2]

اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے ملک اور سب سے بڑی مملکت کے شہنشاہ نے کلام

پاک کے انہی نسخوں کے ہدیہ کی رقموں کو اپنی آخرت کی نجات کا ذریعہ سمجھا، چنانچہ اپنے وصیت نامہ میں لکھتا ہے:

چہار روپیہ و دو آنہ از وجہ کلاہ دوزی نزد آیہ بیگہ محلدار است بگیرند، وصرف کفن این

بیچارہ نمایند، و سہ صد و پنج روپیہ از وجہ کتابت قرآن در حرف خاص است، روز وفات

بفقرا بدہند"[3]

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۲ [2] تفصیلات کیلئے دیکھو مقدمہ رقعات عالمگیری از سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے،

[3] سرکار، احکام عالمگیری ص ۱۳۰ طبع ثانی، بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی،

عالمگیر کی بہترین علمی یادگار اسکے رقعات ہیں، جس کے ادب و انشار کی داد ہر زمانہ میں اہل علم و کمال نے دل کھول کر دی ہے، آیات قرآن مجید، احادیث نبوی، اور سعدی، حافظ، نظیری، اور نظامی کے اشعار کو اس برجستگی اور خوبی سے اپنے رقعات میں نقل کرتا ہے، کہ وہ سب کے سب ادبی شہ پارے بن گئے ہیں، جنکے پڑھنے میں بڑی گھلاوٹ اور لطافت محسوس ہوتی ہے،

معاصر مورخوں نے اس کے ادب و انشار کی تعریف اس طرح کی ہے،

"نکتہ دانی و معنی شناسی در بعد و مناسبت وکیبی آن حضرت، بمراتب نثر و انشائے انواع کلام در مرتبہ ایست کہ سخن سنجان معنی طراز و فصاحت پیشگان نکتہ پرداز از فیض تعلیم و ارشاد آن مظہر کمالات قدسی عمرہا استفادہ دقایق و رموز سخن میتوانند کرد، ہرگاہ باداے منشور فشان بلاغت گستر، انشا نامہ میفرمایند، بحسن تقریر دلپذیر بنوعے تمہید مطلب و تلقین مدعی مینمایند کہ اگر نگارندہ قوت حافظہ را درج آن دُر شاہوار ولالی آبدار ساختہ بنگارش ہمان الفاظ گہر نثار بنظم و تالیفی کہ از زبان حق بیان استماع نمودہ اکتفا نماید، از تجشم فکر و تکلف انشار مستغنی است وچون مسودہ آن درست می شود، بمطالعۂ اشرف رسیدہ از قلم بدائع رقم آن شہنشاہ نکتہ رس ہوشمند، چنداں بتصرفات مرغوب و اصلاحہائے دلپسند زینت می یابد کہ ادیب اریب از ملاحظہ آن بعجز و قصور معترف گشتہ، سرمایہ بصیرت در اسلوب و قواعد سخن و پیرایۂ خبرت و مہارت دراں حق می اندوزد، ہمچنین مناشیر جلالت نشانی کہ منشیان بلاغت آثار بنام شاہزادہائے کامگار بخت بیدار و عمدہائے ایں دولت پائدار می نویسند نخست مسودۂ آن بنظر انور درآمدہ بزیور اصلاح بادشاہانہ مزین میشود"[1]

مآثر عالمگیری کا مصنف اختصار کیساتھ اسی چیز کو اسطرح لکھتا ہے:-

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۵

"آنحضرت را در مراتب نثر و انشاء دستے تمام بود و در عبارت نظم و نثر بہرۂ تمام"[ا۵]

یہ تو درباری مورخین کے بیانات ہیں، لیکن بیسویں صدی کے ممتاز انشاء پرداز اور نکتہ سنج بھی آپ کے ادب کی تعریف اسی لسانی کے ساتھ کرتے ہیں، مولینا شبلی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں کہ

"عالمگیر تیغ و قلم دونوں کا مالک تھا، اسکی انشاء پردازی کی داد مخالفوں تک نے دی ہے، اس کے رقعے باوجود اس کے کہ واقعات کا ذخیرۂ قصہ طلب حوالوں کا مجموعہ اور جغرافیۂ اطلاعوں کی یادداشت ہیں، تاہم اداے مطلب کی قدرت، عبارت کی سادگی، فقروں کی ہمواری، مطالب کا اختصار، پہلو بہ پہلو جملے، دلنشیں ترکیبیں نہایت حیرت انگیز ہیں"[۵۲]

مولینا آزاد "بادلِ ناخواستہ" لکھتے ہیں، کہ

"عالمگیر نے دل معتدل اور زبان قادر البیان پائی تھی، اسلئے اپنے فرمان اور خطوط آپ لکھتا تھا، یا سامنے لکھواتا تھا، کاغذات پر خود حکم چڑھاتا تھا، وہ پچاس برس سلطنت کرکے ۱۱۱۸ھ میں فوت ہوا، اس کی تحریریں دیکھ کر تعجب آتا ہے، کہ جس طرح اورنگ سلطنت زیر قدم رکھتا تھا، اسی طرح کشور سخن بھی زیر قلم، دیکھو اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے بھی ملک رانی کے پیچوں میں الجھے ہوے ہیں، مگر عبارت صاف ہے، اور لفظ لفظ میں محاورے کا نمک دیا ہوا ہے۔ تمام انتظامی ہدایتیں، اور اکثر اخلاقی نصیحتیں ہیں، کہ تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں، اس کی تحریر کو گلستاں سے تشبیہ دوں تو مضائقہ نہیں، اتنا فرق ہوگا کہ گلستان کے خیالی مضامین اور اس کے حالی عبارت اسکی جتنی پڑھنے میں سہل ہے، اتنے ہی لکھنے میں دشوار ہے"[۵۳]

عالمگیر کے خطوط کی ہمہ گیری کے متعلق مرتب "رقعاتِ عالمگیر" کی راے ہے، کہ

ا۵ مآثر عالمگیری ص۵۳۲، ۵۲ مضامین عالمگیر ص۱۳۲، معارف پریس، ۵۳ نیرنگ خیال،

"اورنگ زیب کے خطوط...... گلہائے رنگا رنگ کے بہترین مجموعہ ہیں، کہیں ذاتی حالات کے متعلق اظہار خیال ہے، تو کہیں سیاسی و معاشرتی واقعات پر تنقید، کہیں شوق وصال بے چین کئے ہوئے ہے، تو کبھی درد فراق نے مضطر کر رکھا ہے، کسی جگہ کسی کی شادی یا ولادت کی خوشی ہے، تو کہیں کسی کی موت کا ماتم، کسی جگہ کسی افسر کی سفارش ہے، تو کہیں تنبیہ، اگر ایک خط عمارتوں اور قلعوں کے مفصل حالات سے مملو ہے، تو دوسرا باغوں اور چمنوں کی رنگین بیانی سے پُر، کہیں عتاب ہے، تو کہیں عنایت، کبھی گرمجوشی ہے، تو کبھی سرد مہری کہیں الزامات کی صفائی ہے، تو کہیں دوسرے کے خلاف شکایت، غرضکہ وہ کونسی چیز ہے، جو اس مجموعہ میں نہیں ہے، پھر وہ کونسی شے ہے، جس میں حقیقت نگاری کیساتھ کمال ادب کو جگہ نہیں دی گئی ہو"[1]

عالمگیر کی دوسری علمی یادگار، **فتاوی عالمگیری** ہے، اس نے محسوس کیا کہ حنفی مذہب کے فقہی مسائل مخلوط طور پر تمام پھیلے ہوئے ہیں، کہیں ایک جگہ مرقوم نہیں، اسلئے کوئی ایک خاص کتاب جو تمام مسائل پر حاوی ہو، موجود نہیں، چنانچہ جب کوئی فقہی مسئلہ درپیش ہوتا تھا، تو اس پر فتوی دینے کے لئے تمام کتابوں کی چھان بین کرنی پڑتی تھی، جو صبر آزما اور دشوار کام ثابت ہوتا تھا، انہی مشکلوں کا لحاظ کرکے عالمگیر نے ہندوستان کے ممتاز علماء کے ایک گروہ کو حکم دیا، کہ فقہ کی تمام کتابوں سے "مفتی بہا مسائل" کا انتخاب کرکے ایک کتاب تیار کریں، اس گروہ کے صدر شیخ نظام مقرر ہوئے، علماء کے لئے وظائف کی منظوری ہوئی، آٹھ سال کی مدت میں یہ کتاب تیار ہوئی، اور اس میں دو لاکھ روپے صرف ہوئے،

---

[1] مقدمۂ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی ص ۵۵-۵۶ ہم نمونے کیلئے اورنگزیب کے رقعات کو یہاں پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتے، کیونکہ مولف ہذا نے اورنگزیب کے خطوط پر ادبی حیثیت سے نہایت ہی مبسوط ناقدانہ اور فاضلانہ بحث کی ہے، ملاحظہ ہو مقدمۂ رقعات عالمگیر ص ۵۵ تا ۹۱،

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے علماء و طلبہ کو فقہ کی تمام کتابوں سے بے نیاز کردیا ہے، اس کتاب کی تیاری کا حال عالمگیر نامہ کا مصنف اس طرح لکھتا ہے:۔

"چون ہمگی ہمت والانہمت شریعت پیرائے آن خدیو دین پرور حق پژوہ مصروف است، بآنکہ کافۂ مسلمین در احکام دین متین بمسائلے کہ اکابر علماء و ائمۂ مذہب شریف حنفی بدان فتوی دادہ معمول بہا و معمول علیہا دانستہ عمل نمایند، و مسائل مذکورہ در کتب فقہ و نسخ فتاوی بنابر اختلاف فقہاء و علماء بار وایات ضعیفہ و اقوال مختلفہ آنہا مخلوط است و معہذا مجموع آنرا یک کتاب حاوی نیست، و تا کتب مبسوطۂ بسیار فراہم نیاید و کسی را دستگاہی وسیع بضاعتی کامل وقدرت و استحضاری وافی، در علم احکام فقہ نباشد انکشاف حق صریح و استنباط مسئلۂ مفتیٰ بہا و حکم صحیح نمی تواند نمود، لاجرم بر ضمیر مہر انوار کہ در امور دین و دولت بفتوی الہام کار گذار است پرتو این عزیمت تافت کہ جمعے از علمائے پایۂ سریر اعلیٰ کتب معتبرہ و نسخ مبسوطۂ آن فن را کہ در کتاب خانہ خاصۂ شریفہ بروزگاران از اطراف و اکناف عالم فراہم آمدہ جلوہ گاہ انظار منیع ساختہ از روی تحقیق و تدقیق و خوض و غور انیق بجمع و تالیف آن مسائل پردازند، و از مجموع آن نسخۂ جامعہ مرتب سازند تا ہمگنان را انکشاف مسئلۂ مفتی بہا در ہر باب بمراجعت آن کتاب بسہولت و آسانی دست دہد، و قضاۃ و مفتیان اسلام از جمیع کتب و دفاتر شتی و تتبع و تصفح جمیع نسخ فتاوی مستغنی باشند و سرکردگی و اہتمام این مہم صواب انجام بفضیلت مآب شیخ نظام کہ جامع فضائل معقول و منقول است تفویض یافت کہ کمر سعی و اجتہاد و تمشیت این امر بہ باتفاق سایر اہل فضل و دانش و جمع تالیف ان مسائل نماید و گروہے از فضلاء و علماء کہ در پایۂ اورنگ خلافت بودند، بدان شغل شریف مامور شدند و در اطراف و اکناف کشور فضل پرور ہندوستان ہر جا کسی بصیت اشتہار و مہارت در علوم موسوم بود، بموجب یرلیغ ہمایوں بجناب والائے سلطنت

حاضر آمده بموافقت آن صحیح تعیین یافت و همگی آن فریق بوظائف شایسته و مواهب ارجمند کامیاب گشته بتقدیم آن امر مشغول شدند و از کتبی که تمشیت آن امر را در کار شود نسخ بیمو از کتاب خانه خاصه شریفه بفضلا حواله رفت و هر سال مبلغے خطیر در وجوه وظایف و انعامات عمده و ممارسان این شغل جلیل و خطب نبیل، از خزانه احسان بادشاہے صرف می شود، وچوں آن کتاب مستطاب صورت اتمام گیرد، و پیرایهٔ اختتام پذیرد جهانیاں را از سایر کتب نقهی مغنی خواہد بود برکات اجر و ثواب ایش ابد الآباد در نسخه حسنات شهنشاه مؤید قدسی ملکات ثبت و مرقوم گشت[1]

عالمگیری دربار کے شعراء، عالمگیر کے دربار میں کوئی ملک الشعرا نہیں تھا، اس سے عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ عالمگیر کو شعر و شاعری سے نفرت تھی، اس لئے اس عہدہ کو اپنے دربار سے برطرف کر دیا، مگر اہل نظر یہ کیونکر یقین کر سکتے ہیں، جب کہ اس کے اکثر خطوط اشعار اور لمبی لمبی نظموں سے مزین نظر آتے ہیں[2] یہی نہیں بلکہ سعدی، حافظ، نظامی، نظیری، صائب، ملاشاہ اور فانی کشمیری کے دیوان کو خاص طور سے پڑھتا تھا، اور ان کے اشعار زبانی یاد رکھتا تھا، بخشی الممالک مخلص خاں نے ایک بار دیوان صائب پیش کیا، جس میں ایک لاکھ اشعار تھے، عالمگیر صائب کے اشعار کو پڑھکر جو معرفت و معنویت میں ڈوبے تھے بہت ہی محظوظ ہوا، اور اس دیوان کو محبوب رکھنے لگا، اس میں سے مندرجۂ ذیل غزل ایک مدت تک اپنی مجلس میں بار بار پڑھا کر سنتا تھا،

خم چو گردید قدا فراختہ می باید رفت / پل بریں آب چو شد ساختہ می باید رفت

ہر چہ در کار بر و ساختنش خود ساز نیست / گو مشو کار جہان ساختہ می باید رفت

این سفر ہیچو سفر ہائے دگر صائب نیست / رخت ہستی ز خرد انداختہ می باید رفت

(ملاحظہ ہو مآثر عالمگیری انتالیسواں سال جلوس)

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۶ و مآثر عالمگیری ص ۵۲۲ [2] مثال کے طور پر بعض نمونے ملاحظہ ہوں، ایک خط میں لکھتا ہے،

جو اشعار اسکو پسند آتے تھے، وہ خود اپنی بیاض میں لکھ لیتا تھا، اور اکثر اوقات اپنے لڑکوں کی بیاض میں بھی بالالتزام لکھواتا تھا، ایک رقعہ میں لکھتا ہے،

"ہدایت اللہ زرین رقم بگوئید، کہ این رباعی در بیاضے کہ بیاد دست شہزادہ کام بخش مرحمت می شود، بخط خود بنویسید، ؎

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش | من خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش | اے واے من و دست من و دامن خویش

(رقائع عالمگیر ص۵۲)

علالت اور حتی کہ بستر مرگ پر بھی عالمگیر کی زبان پر اشعار ہوتے تھے، سنہ ۱۱۱۶ھ میں ایک بار بیمار پڑا، تو ضعف کی حالت میں یہ اشعار ترنم کے ساتھ پڑھ رہا تھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۵)

"خان جہان بہادر درگذشت، انا للہ وانا الیہ راجعون، سبحان اللہ آدمی چہ قدر غافلست؟ ونفس تا کجا بر دعالب؟ درین ایام صوبہ داری دکن می خواست وبجہ دلگرمی آرزوے آن می کرد؟ آرے کارنفس بدتر ازین است، ؎

کشتن ایں کار عقل و ہوش نیست، | شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست،
عالمے را لقمہ کرد و درکشید، | معدہ اش نعرہ زنان ہل من مزید
دوزخ است این نفس و دوزخ اژدہاست | کو بدریاہا نگردد کم و کاست،
ہفت دریا را درآشامد ہنوز، | کم نگردد سوزش ایں خلق سوز،
سنگہا و کافران سنگ دل، | اندر آیند اندران خوار و خجل،
ہم نگردد ساکن ایں چندیں غذا، | تا ز حق آید مراو را ایں ندا،
سیر گشتی سیر گوید نے ہنوز، | این است آتش این است تابش این است سوز

بہشتاد و نود چوں در رسیدی — بسا سختی کہ از دوراں کشیدی

دراں جا چوں بصد منزل رسانی، — بود مرگے بصورت زندگانی

امیر خاں نے جو اسوقت مقرب خاص تھا، عالمگیر کو اشعار پڑھتے سنا تو عرض کیا کہ نظامی گنجوی نے ان ابیات کی تمہید میں یہ بیت کہی ہے،

پس آں بہتر کہ خود را شاد داری — دراں شادی خدا را یاد داری،

عالمگیر نے اس شعر کو کئی بار سنا، پھر اپنی بیاض میں لکھوایا، اور مدت تک پڑھا،[۱] بستر مرگ پر یہ شعر اکثر اسکے ورد زبان رہتا تھا،

بیک لحظہ بیک ساعت بیک دم، — دگرگوں می شود احوال عالم،[۲]

سلہ مآثر عالمگیری واقعات ۱۱۱۸ھ۔ ۲ہ ،، واقعات ۱۱۱۸ھ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۶)

حق قدم بر وے نہد از لامکاں — آنگہ او ساکن شود از کن فکاں

چونکہ جزو دوزخ است ایں نفس ما — طبع کل دارد ہمیشہ جزوہا،

ایں قدم حق را بود کو را کشد، — غیر حق خود کے کماں اورا کشد،

تو تے خواہم ز حق دریا شگافت — تا بسوزن بر کنم ایں کوہ قاف،

او تعالیٰ توفیق کرامت کند و ازیں نیزہ روزہ رہائی بخشد۔ بحرمۃ محمد و آل محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام

(وقائع عالمگیر مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی ص ۱۰۹)

۲- ایک بار شہزادہ بیدار بخت (خلف اکبر محمد اعظم) نے اپنی محبوبہ بیگم شمس النساء صبیہ سید ممتاز خان کو غصہ کی حالت میں باجی کی لڑکی کہا، خود دار بیگم نے شہزادہ سے بولنا چھوڑ دیا، عالمگیر کو خبر ہوئی، تو بیدار بخت کو اس دلچسپ انداز میں خط لکھا،

صبحدم مرغ چمن با گل نوخاستہ گفت — ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت

یہ سن کر تعجب ہوگا کہ وہ خود بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتا تھا، ہم کو اس کا صرف ایک شعر مل سکا ہے، اور وہ یہ ہے،

غم عالم فراوان ست و من یک غنچہ دل دارم چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را[1]

ان حقیقتوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک درست ہے، کہ عالمگیر کو شعر و سخن سے دلچسپی نہیں تھی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ عملی اور کارفرما دل و دماغ لیکر آیا تھا، وہ تفریحی مشاغل کا شیدا نہ تھا، اسکی سنجیدہ اور متین طبیعت شعراء کی مبالغہ طرازیوں، خوشامدانہ مداحیوں، اور جھوٹی بنادٹی باتوں کو نہیں پسند کرتی تھی، چنانچہ مرأۃ العالم میں ہے،

"و در مراتب نثر دانشا دستے تمام داشت و در مہارت نظم ہم بہرہ تمام، اما بمودار ای مستشہد صادق کریمہ والشعراء یتبعھم الغاؤن متمسک گشتہ توجہ باستماع شعر ندارند،"

---

[1] بحوالہ بادشاہ نامہ عالمگیری از ذکار اللہ ص۲۷۵،

(بقیہ حاشیہ) ہم گل بخندید کہ از راست نرنجم، لیکن ہیچ عاشق سخن تلخ بمعشوق نگفت،

بآں نور الابصار واضح باد کہ در ایام جوانی کہ اصطلاح پیدا ج مصاحبان شما جوانی دیوانی می گویند مارا ہم دراں ایام این تعلق باشخصیکہ نہایت تبختر داشت بہم رسیدہ بود تا حیات محبت اورا بانجام رسانیدیم و گاہے آزردہ نکردیم دیگر آں کہ با سادات لفظ باجی گفتن محض باجی گریست، کسے اگر سید را باجی بگوید البتہ باجی نخواہد شد، اگر از نوشتۂ محلدار و ناظر رضامندی آں سیدہ نشود بعتاب، بلکہ عقاب گرفتار خواہید شد، جزاء بما کانوا یعملون (ایضاً ص)

۳- شاہزادہ محمد اعظم کو ایک موقع پر تنبیہ کرتا ہے،

عجب ازآں فرزند کہ صحبت باہیچ اثر نہ کردہ؟ از احتیاط و دور بینی ہزار مرحلہ دور افتادہ الحزم سوء الظن بخاطر نیاوردہ واز آیت وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ بہرہ نیافتہ،

مرغے کہ زیرک است درین بوستاں سرا گل را خیال چنگل شہباز می کند،

تا بشنیدن اشعار چہ رسد الاشعر کہ متضمن موعظت باشد"

نہ کردہ بہر رضائے خدائے عزوجل　　نہ چشم سوے غزال و نہ گوش سوے غزل

مآثر عالمگیری کا مصنف بھی یہی لکھتا ہے،

اما بمواے مستشہد صادق کریمہ الشعراء یتبعھم الغاوٗن تمسک گشتہ توجہ باستماع شعر بے فائدہ نداشتند یا بشنیدن اشعار مدح چہ رسد، الاشعرے متضمن موعظت باشد،

نکردہ بہر رضاے خدائے عزوجل　　نہ چشم سوے غزال و نہ گوش سوے غزل[۱]

ایک بار سلطان شادماں نے اس کی مدح میں مندرجۂ ذیل قصیدہ اسکے سامنے پڑھا،

آن کیست کو ز حلقۂ لعت نشاں دہد　　در خواب اگر دہد بطریق گماں دہد،

آب حیات خضر کہ عمریست جاوداں　　تاکے ز حسرت لب لعل تو جاں دہد

[۱] مآثر عالمگیری ص ۳۲-۵۳۲،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۸)

خوں می چکد ز زخم نمایاں زخندہ اش،　　کلکے کہ بے ملاحظہ پرواز می کند،

مردے در تہوری وبے باکی نیست بلکہ در خورشکنی ست

کمال مردی و مردانگی ست خورشکنی ست　　بوس دست کسے راکہ این کمان شکند،

۴- ایک دوسرے رقعہ میں لکھتا ہے:-

بفرزند عالیجاہ عرضداشت کند کہ ایشان استشفاع تقصیر اعتبار خان کردہ اند، احتمال قوی کہ سید سعد اللہ درویش نوشتہ باشد بنویسید کہ عبد القادر بیدل دریں مقام دو مصراع دلچسپ گفتہ،

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن

اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

(وقائع عالمگیر ص ۱۲۲)

فکرِ سخن طراز کہ خضریست فی المثل، خود در عدم رود چو نشان زان میان دہد

ابرِ قلم کہ آبِ سیہ می چکد ازو، رنگِ سخن ز وصفِ لبِ گل رخاں دہد

قدِ تو در خرام بگلگشت بوستان صد پیچ و خم ز شرم بسروِ چماں دہد

آنجا کہ اوست نالۂ عاشق کجا رسد، گر بال جبرئیل بمرغِ فغاں دہد

از چشمِ جانستانش چو خواہم حیاتِ نو مژگان جوابِ من بزبانِ سناں دہد

گر دل ستاند از نگہِ عشوہ آفریں صد دل عوض ز طرۂ عنبر فشاں دہد

چوں شیشۂ شراب کہ با محتسب دہند کس دل چرا بدستِ تو نامہرباں دہد

نازم بچہرہ اش کہ بہنگامِ مے ز عکس رنگینیِ بہار بفصلِ خزاں دہد

ہر چیز را بجا صفتے آفریدہ اند، کے سرمہ در گلو اثرِ زعفراں دہد

من خود بدردِ یار خوشم ورنہ روزگار کے ایں قدر الم بدلِ شادماں دہد

چشمش با بروان و مژہ گشت عالمی کس ترکِ مست را ز چہ تیر و کماں دہد

زلفش مزوریست مکن اعتبار او، از عشوہ گر دلی بتو شب درمیاں دہد

مضمونِ دلنشیں کہ رسد از جہانِ غیب یاد از حلاوتِ سخنِ راستاں دہد

مرد آں بود کہ گر ہمہ عالم بدو دہند دل کم دہد بشادی و غم تا کہ جاں دہد

ما جاں بنقدِ مہر و وفا دادہ ایم و بس دیوانہ نیستیم کہ جانی بناں دہد

شاید مرادِ من کہ نہ خواہم ز آسماں اورنگ زیبِ عادلِ گیتی ستاں دہد

شاہی کہ از برائے سرِ دشمنانِ دیں بہرِ نثار گوہرِ تیغِ یماں دہد

بہرام صولتے کہ ز بیمش بپے گریز، گردوں عنانِ خود بره کہکشاں دہد

تا ارض بر سکون و سما در تحرک است تا چترِ آفتاب ز مشرق نشاں دہد

زیبندہ باد بر سر اورنگ سلطنت

تا ابر و مہر راتب دریا و کان دہد

باوجودیکہ اورنگزیب اپنی مدح سرائی کو مطلق پسند نہ کرتا تھا، اور شاعروں کی قصیدہ خوانیوں کو فعل عبث سمجھتا تھا، چنانچہ شادماں کو آئندہ مدح سرائی کرنے سے منع کیا، لیکن ان میں سے بعض اشعار کو شاعرانہ نقطۂ نظر سے بہت پسند کیا، اور بار بار پڑھوا کر سنا، چنانچہ مراۃ الخیال میں ہے،

سلطان شادماں قصیدۂ مشتمل بر مدح گفتہ بسمع مبارک رسانید و بعض ابیاتش پسند خاطر فیض افتاد، و بتکرار استماع فرمودند۔[1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ باوجود اس ذوقِ شعری کے ملک الشعرار کے عہدۂ جلیلہ کو دربار سے کیوں تخفیف کر دیا، یہ سوال ذرا غور طلب ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اس عہد کے ممتاز ترین شعرار کون تھے موسوی خان، شیخ ناصر علی سرہندی، نعمت خاں عالی، عاقل خاں رازی، ملا اشرف ماژندرانی وغیرہ وغیرہ ان میں کوئی ایسا نہ تھا، جو فیضی، طالب آملی، قدسی اور ابو طالب کلیم کا مد مقابل ہو سکتا تھا، پھر ان میں کسی کو ملک الشعرار کے خطابِ فائقہ سے سرفراز کرکے ان نادرۂ روزگار شعرار کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا، تو کیا عالمگیر کے علم و ادب کے بلند اور اعلیٰ ذوق پر حرف گیری نہیں ہوتی،؟ (ربانی)

[1] مراۃ الخیال ص ۲۵۲، ۲۵۳،

رقعات عالمگیر

اورنگ زیب اور عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں، اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور ان سے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ضخامت ۷۰۰ صفحات، چھپائی، لکھائی، کاغذ، بالخصوص ٹائٹل نہایت دلفریب قیمت: ہے ہے ر

"منیجر"

آزادی کا اخلاقی مفہوم

از

جناب پروفیسر معتقد ولی الرحمٰن صاحب ایم اے

(۳)

۵۔ آزادی اور جبریت میں عدم تناقض

آزادی کے اہم معنی بلاشبہہ تعریف و توجیہ طلب رہ جاتے ہیں، ان میں سے پہلے معنی تو گویا آزادی کا سلبی پہلو ہے یعنی ارادے پر خارجی موانع کا فقدان، دوسرے معنی اخلاقی آزادی یا زندگی کی حقیقی آزادی ہے، پہلے معنوں میں ایک فعل اسوقت آزاد کہلاتا ہے، جب یہ ہماری مرضی اور خواہش کے مطابق ہو، جب اس کے ذریعے سے ہم شعوراً اپنے مقصد کا اظہار کریں، اور خارجی رکاوٹیں، یا کسی اور کا ارادہ ہمارے ارادے میں مزاحم نہ ہو، ان ہی معنوں میں ہم تیز رو ندی کو عبور کرنے میں آزاد ہوں، بہ شرطیکہ بارش سے اس کا پل بہ نہ گیا ہو، اسی میں ایک شکار کا پہاڑ کی چوٹی تک تعاقب کرنے میں آزاد ہون، بہ شرطیکہ ہماری طاقت جواب نہ دے چکی ہو، ہم ایک جائداد خریدنے میں آزاد ہون، بشرطیکہ ہم اس کے مالک کو اسکے بیچنے پر آمادہ کرسکیں، ان معنون میں بدکار اپنے افعال میں اتنا ہی آزاد ہے، جتنا کہ نیکوکار، بہ شرطیکہ سوسائٹی یا خارجی قوتیں اس کی مزاحم نہ ہون آزادی کے ان معنوں میں بدکار اور نیکوکار جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں، جبریت کا دعوی ہی کہ ان دونوں میں کوئی جو کچھ کرتا ہی، اس کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے،

اگر مذکورۂ بالا آزادی کو ہم موانع کی آزادی کہیں، تو اخلاقی آزادی یا زندگی کی آزادی کا اہم ترین عمل قابل غور رہ جاتا ہے، اگر بدکار موانع سے اتنا ہی آزاد ہو جتنا کہ نیکوکار، تب بھی وہ اخلاقی آزاد نہیں، کیونکہ اس میں اور خود اس کی فطرت اور اس کے اخلاقی نظام میں تنازع ہے، اخلاقی آزادی حسب خواہش عمل کرنے کو اتنی ہی متضمن ہے جتنی کہ شہری آزادی، جس طرح سلطنت میں صرف وہ اشخاص حقیقۃً آزاد ہوتے ہیں، جو معقول قوانین کے پابند ہوں: اسی طرح وہ اخلاقاً آزاد صرف اسوقت ہوتے ہیں جب انکا عمل ایک حقیقی اخلاقی معیار کے اقتضار سے معیّن ہو، جس حد تک کوئی خطا اور ثواب کے متعلق متذبذب رہتا ہے، یا بدی کیساتھ آنکھ مچولی کھیلتا ہے، اسی حد تک وہ اخلاقاً آزاد نہیں ہوتا، کیونکہ اس حالت میں بدی اسکو کھینچتی ہے، اور اس پر اثر کرتی ہے، اور کوئی شخص حقیقۃً زیادہ کشش بدی کی محسوس کرتا ہے، اسی قدر زیادہ وہ اس کا محکوم ہوتا ہے، اخلاقی آزادی اصلی معنوں میں اخلاقی غلامی کی ضد ہے، نیک زندگی کا تجربہ آزادی ہے، اور بدزندگی کا تجربہ غلامی، مختصر یہ کہ سلبی معنوں میں آزادی اُن ادنیٰ ہیجانات اور خواہشات کی قوت سے آزادی کے ہم معنی ہے جو ذات کی ترقی اور اس کے توازن کو تباہ کرتے ہیں، اخلاقی آزادی ایک داخلی توازن پیدا کرتی ہے، اس میں ذات کے تمام ملکات کا منصفانہ اظہار ہوتا ہے، یہ گویا اس فساد اور بے ترتیبی کی ضد ہے، جو متقابل اشتہاآت منظم اور زیر تصرف نہ ہونے کی صورت میں ہماری فطرت میں پیدا کرتے ہیں، یہ آزادی عقل کے قاعدے سے حاصل ہوتی ہے، جس کے مطابق ہمارے جزئی اور متنازع مقاصد و خواہشات ہماری زندگی کے مرکزی مقصد کے محکوم ہو جاتے ہیں، اخلاقاً آزاد صرف وہ زندگی ہوتی ہے، جس نے اپنی وحدت کو اور اس طرح توازن اور تسکین کو حاصل کر لیا ہے، لیکن اس اخلاقی آزادی کو زندگی کی آزادی کہنا بہتر ہوگا، نہ ارادے کی آزادی، کیونکہ اس میں ایک ایسا ارادہ شامل ہے، جو زندگی کے مقصد کی خاطر تیقت کے قوانین سے معیّن ہوتا ہے، عام مذہبی نقطۂ

میں اس واقعہ کو ضمناً تسلیم کیا گیا ہے، خدا کی فطرت کا جو عام تخیل ہے، اس کے مطابق وہ کلیتہً مجبور بھی ہے، اور کلیتہً آزاد بھی، اپنے انتخاب میں وہ نیکی پر مجبور ہے، وہ بدی کا ارادہ، اور دو متبادل طریقوں میں سے بُرے طریق کا انتخاب نہیں کر سکتا، ایسا کرنا خود اس کی فطرت کے منافی ہے یعنی ایسا کرنے سے وہ خدا ہی نہیں رہتا، اس کے ساتھ ہی اس نصب العین خیر کے معین ہونے سے حیات خداوندی کی کامل آزادی، توازن اور تسلی پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی آزادی کا نصب العین بھی آزاد یعنی غیر مجبور و غیر معین ارادہ نہیں، بلکہ زندگی کی ایسی آزادی ہے، جو صادق بصیرت سے معین کئے ہوئے ارادے سے حاصل ہو، ہماری اخلاقی آزادی، قانون کی حکومت سے آزادی کے ہم معنی نہیں آزاد ہونے کے باوجود ہم اسی ملک کے باشندے رہتے ہیں، اور ایک مکمل منتظم نظام حکومت کے تمام اقتضاآت کے تابع ہوتے ہیں، لیکن اخلاقاً آزاد شخص نے اپنی فرمانبرداری کو غیر منظم ہیجان و خواہش سے عقل و صداقت کے قانون کی طرف منتقل کیا ہے، اب ہم غلام عورت کی اولاد نہیں، بلکہ آزاد عورت کی اولاد ہیں"

ظاہر ہے کہ اس اخلاقی آزادی کا درجہ ہر شخص میں مساوی نہیں ہوتا، بلکہ اس کی انفرادی زندگیوں کی تکمیل کے مطابق بے شمار درجے ہوتے ہیں، اس عقیدے سے غلط تر عقیدہ اور کوئی نہیں ہو سکتا، کہ ہر شخص پیدایش کے وقت آزادی کی پوری مقدار کا حامل ہوتا ہے، جو تمام عمر اس سے چھینی نہیں جا سکتی، ہماری آزادی مکمل نہیں ہوتی، یہ معرض تکوین میں ہوتی ہے، جو شخص حیوانات کی طرح ہر دم بدلنے والے ہیجانات و اشتہاآت کا محکوم ہے، اور خود اپنی مجموعی زندگی سے ان کے تعلق اور ان کے معنون کا لحاظ نہیں کرتا، وہ اخلاقی آزادی میں بہت کم حصہ رکھتا ہے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وہ غلام ہے لیکن تمام نمو پذیر ذواتین جنہیں عمر یا عادت نے عمل کے راستے کو آخری طور پر معین نہیں کیا ہے، آزادی ایک ترقی کرنے والا عمل ہوتا ہے، اور بڑھنے والی قوت ہوتی ہے، آہستہ آہستہ تجربے کے سکھائے ہوئے

سبق عقل بن جاتے ہیں، متنازع خواہشات پر رفتہ رفتہ غلبہ حاصل ہوتا ہے، اور زندگی کے تمام حصے اسکے مرکزی مقصد کے مطابق ہو جاتے ہیں،

اب ہم علم اور اخلاقی آزادی کے اہم تعلق کو معلوم کر سکتے ہیں، جس عمل سے آزادی حاصل کیجاتی ہے، وہ روشنی طبع کا عمل ہے، صداقت، اخلاقی تعلقات، اور اخلاقی قوانین کا واضح ادراک، فطرتِ انسانی اور اسکی حقیقت کا فہم یہ وہ چیزیں ہیں، جو انسان کو آزاد کرتی ہیں، ان کے علاوہ التباس وخطا سے بچنے کو بھی اخلاقی آزادی کہا جا سکتا ہے، انسانی آزادی کو حیوانی زندگی کی خود روی سے متمیز کرنے کی وجہ یہ ہے، کہ انسان میں سیکھنے اور اپنے علم کو رہنمائی اور خود تعیینی کا باطنی اصول بنانے کی قابلیت بہ درجۂ اولی ہوتی ہے، بقول نصف کرہ (hemisphere) کی مچھلی کے مقابلے میں ہم زیادہ حقیقی معنوں میں خود اپنی تعیین کرنے والے فاعل ہیں، کیونکہ مچھلی کی خلقت تو ایسی ہوئی ہے، کہ وہ تو چارے کو دیکھ کر اس کو کھانے پر مجبور ہے، خواہ وہ تھوڑی ہی دیر پہلے اس کانٹے سے آزاد ہوئی ہو جو اس چارے کے اندر چھپا ہوا ہے، اس کے برعکس ہم اس گلاس کو جو ہونٹ تک جا چکا ہے، واپس میز پر رکھ سکتے ہیں، اور اپنے کام اور اپنی شہرت پر اس کے اثر کو غور کر سکتے ہیں، وسیع تر اور بہتر زندگی کے تخیلات اتفاقی واقعات سے نہیں، بلکہ اپنے منتظم اعمال سے تعمیر کئے جاتے ہیں، جو ذہنی زندگی میں واقع ہوتے ہیں، یہی اعلیٰ ذات ہمارے تفکر میں مستحضر ہو کر ایک کھینچنے اور مجبور کرنے کی قابلیت بنجاتی ہے، دوسرے الفاظ میں یہی اخلاقی زندگی میں تعیین کرنے والی قوت کہلاتی ہے، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، اسی طرح غایت علتِ فاعلی کی شکل اختیار کر لیتی ہے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے اخلاقی انتخابات ہمارے خیالات کے دائرے کے اندر محدود رہتے ہیں، کوئی شخص وہ نیکی منتخب نہیں کر سکتا جس سے وہ ناواقف ہے، غلامانہ اور اخلاقی غیر آزاد روح کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ صاف طور پر ایک ایسی بہتر زندگی کو معلوم کرلے، جو موجودہ زندگی پر فوقیت رکھے، عمل میں تغیر کرنے کے لئے ذہن کا تغیر پہلی شرط

ہے، یہ ایک اہم بات ہے، کہ جن مذاہب اور فلسفوں نے اخلاقی زندگی کے مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ
بحث کی ہے، اُن سب نے بدی سے نجات حاصل کرنے کو روشنی طبع پر مشروط کیا ہے" جب صداقت
تم کو آزادی دلائے تب تم حقیقۃً آزاد ہو" لہذا صرف متعلم کی حیثیت سے انسان آزاد ہوسکتا ہے، صرف
علم کے ذریعہ سے وہ اپنے ماضی سے تجاوز کر سکتا ہے، کسی محدود اور اصطلاحی معنوں میں نہیں، بلکہ
وسیع ترین معنوں میں، علم فطرتِ انسانی کا تجاوز کرنے کا اصول ہے، لیکن یہ تجاوز ذہنی زندگی کے
معین طور پر مربوط اعمال سے بچنے کے ہم معنی نہیں، یہ در اصل ان اعمال میں اور ان کی مدد سے
ترقی کے مساوی ہے،

۱۰- جبریت پر بعض اعتراضات کا جواب

ابھی بعض ان مشکلات اور اعتراضات کا جواب دینا باقی ہے، جو اختیاریت پیش کرتی ہو، سب سے
پہلا اعتراض یہ ہے، کہ ہمیں تسلیم ہے کہ جبریت میں اخلاقی ترقی کی گنجایش ہے، لیکن کیا یہ عقیدہ آزادی کے
اس شعور کے متناقض نہیں، جو ہر عمل کے انتخاب کے وقت ہم میں سے ہر ایک کے تجربے میں آتا ہے،؟
جواباً کہا جا سکتا ہے کہ اگر مذکورہ احساس شعور کا عام واقعہ ہو بھی، تب بھی اس غیر ناقدانہ احساس
کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی، اب اگر یہ صحیح ہے کہ ہم میں ان معنوں میں آزاد ہونے کا شعور ہے
جن میں کہ لفظ آزادی کو یہاں استعمال کیا گیا ہے، تو بھی بہ حیثیت علمی ثبوت کے اس احساس کی اتنی ہی قیمت
ہے جتنی اس احساس کی کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے، فلکیات کے لئے ہے"، دوسری بات یہ ہے
کہ ایسے شعور کی عمومیت مشکوک ہے، ممکن ہے یہ ان لوگوں میں عام ہو، جن کی تعلیم ایسے خاص نظریوں
کے زیر اثر ہوئی ہے، جن کی وجہ سے ان کے ذہن اس عقیدے کی طرف مائل ہوجاتے ہیں، لیکن جن لوگوں کی
تعلیم مختلف نظریوں کے زیر اثر ہوئی ہے، ان میں یہ نا پید ہے، آخری بات یہ ہے، کہ شعور کا یہ فتوی جہاں
کہیں، اور جس درجے میں بھی پایا جاتا ہو، ہر صورت میں اس کی ایسی نفسیاتی توجیہہ ممکن ہے، جو جبریت کے

عین مطابق ہوتی ہے مستقبل کی طرف سے لاعلم رہنے کی صورت میں فیصلے کے وقت تک ہم اپنے انتخاب کو طبعاً غیر معین سمجھتے ہیں، جہاں تک ہمارا موجودہ علم ہماری مدد کرتا ہے، یہ فیصلہ امکانات میں سے کسی ایک کے مطابق ہو سکتا ہے، جب ہستیاں عالم الکل نہیں، ان کے لئے اس قسم کا ابہام ناگزیر ہے، بہت سے متبادل طرق عمل میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ صادر کرنے میں ہمیں کسی قدر وقت کیوں نہ پیش آئی ہو، لیکن اتنا ظاہر ہے کہ اس فیصلہ کرنے کے وقت ہماری ذات ایسی تھی، کہ کوئی اور فیصلہ صادر نہ کر سکتی تھی، ہم کو یہ سمجھنا چاہئے، کہ اعمال کے سلسلے میں ایک عمل دوسرے کو معین کرتا ہے، بلکہ درحقیقت ذات اپنے اعمال کو یکے بعد دیگرے معین کرتی ہے،

جبریت پر ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اس کے مطابق ہمارے گذشتہ اعمال عام اس سے کہ وہ اچھے تھے، یا برے، اس سے مختلف نہ ہو سکتے تھے، جیسے کہ وہ تھے، کل کے بُرے کام پر آج ہم پچھتاتے ہیں، لیکن وہ لازمی اور ناگزیر تھا، گذشتہ اعمال کے وجوب و ضرورت کے خلاف اختیاریت بغاوت کرتی ہے، اور پھر احساس آزادی کی طرف مرافعہ کرتی ہے، جو اس کے نزدیک صدور فعل سے پہلے بھی ہوتا ہے، اور بعد میں بھی، اس کا دعویٰ ہے کہ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہمارا فعل اس سے مختلف ہو سکتا تھا،

لیکن اگر ہم اپنے گذشتہ عمل پر غور کریں، تو کیا اس وقت کے داخلی و خارجی حالات کو پیش نظر رکھنے کے بعد بھی ہمیں کبھی ایسا معلوم ہوا ہے، کہ ہمارا عمل مختلف ہو سکتا تھا؟ ہرگز نہیں، جب ہم اس معاملے پر بعد میں غور کرتے ہیں، تو ہمارا احساس یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم ویسے ہی خارجی حالات میں دوبارہ عمل کریں تو ہمارا فعل مختلف ہو سکتا ہے، اور کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ ہم باطناً بدل چکے ہیں، اگر کوئی شخص اُن ہی حالات میں دوبارہ عمل کرے، جن میں کہ کل کا ماسوف علیہ عمل ہوا تھا، تو نتیجہ بلا شبہہ مختلف ہوگا، اسکی وجہ یہ ہے کہ آج کے وسیع تر تجربے اور نئے خیالات و احساسات کے مطابق اس عمل پر پچھتایا جاتا ہے، یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس انتخاب کے پانچ منٹ بعد ہی پھر وہی صورت حالات پیدا ہوتی، تو بھی

ہمارا عمل مختلف ہوتا، اس کی وجہ بھی وہی ہوتی، میرا عقیدہ ہے کہ اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ آیا ہمارا فعل بالکل اسی صورتِ حالات میں اسی احساس وعلم ونقطۂ نظر کیساتھ، اور بعد کے تجربے کی روشنی کے بغیر اس سے مختلف ہوسکتا تھا، جیسا کہ وہ زمانہ گذشتہ میں تھا، تو ہم بلا تامل جواب دیں گے، کہ ایسا نہیں ہوسکتا، اور یہ کہ ہمارا انتخاب بالکل وہی ہوگا،

اب رہ گیا یہ واقعہ کہ اشخاص گذشتہ افعال کے متعلق کہا کرتے ہیں، کہ "وہ مختلف ہوسکتے تھے" تو اس کا معاملہ اس طرح ہے کہ کسی فعل کے متعلق فیصلہ کرنے سے قبل ہم ایک یا دو متنازع راستوں کو واقعۃً ممکن سمجھتے ہیں، اس طرح کے دُہرے امکان کا خیال تمام شک، بحث اور تذبذب کی لازمی شرط ہے، ان میں سے کسی ایک متبادل راستے کو پہلے ہی سے ممکن سمجھ لو، تو تمام بحث فوراً ختم ہوجاتی ہے، اور یقین عدم یقین کی جگہ لے لیتا ہے اور فیصلہ تذبذب کی اب صرف ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے، اور ہم اپنے آپ کو اس کی سمت میں مجبور پاتے ہیں، لیکن ہماری حالت یہ ہوتی ہے، کہ صدورِ فعل سے قبل ہم یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ دو متبادل راستوں میں سے ہم کس کا انتخاب کریں، یہ تذبذب شعور میں دو طریق عمل کے حقیقی امکان کی صورت میں باقی رہتا ہے، پھر جب ہم اس معاملے پر نگاہ دوبارہ ڈالتے ہیں، تو ہم اس سے پہلے کی ذہنی حالت کو اس عام قول میں ظاہر کرتے ہیں، کہ "یہ مختلف ہوسکتا تھا" یہ عجیب بات ہے، کہ ہم یہی فقرہ ان واقعات کے متعلق بھی استعمال کرتے ہیں، جن کو سب عقلمند آدمی متفقاً لابدی کہتے ہیں، مثلاً کسی بچے یا کھلاڑی کے خطرناک کرتب کے بعد ہم کہا کرتے ہیں کہ "تمہاری ٹانگ ٹوٹ جاتی" ظاہر ہے کہ اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہوتا، کہ ان تمام حالات میں، جو اس خاص وقت تھے، یہ نتیجہ حقیقۃً ممکن تھا، اگر نظامِ فطرت میں یہ ممکن ہوتا، تو یقیناً ظاہر ہوجاتا، بلکہ ہمارا مطلب صرف یہ ہوتا ہے، کہ اس واقعہ سے قبل ایسے حالات موجود تھے، جن کی وجہ سے ہمیں تشویش ہوگئی تھی، اس سبب سے کہ ہم نتیجے سے لاعلم تھے، اس کے علاوہ ہمارا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر یہ افعال جاری رکھے گئے، تو ان کا

انجام اچھا نہ ہوگا، کیونکہ عوارض، حالات اور خود اپنے عضلات پر ہمارا تصرف ایک ہی سا نہیں رہتا، بہرحال یہ فقرہ کہ "یہ مختلف ہو سکتا تھا" دونوں صورتوں میں مساوی معنی رکھتا ہے،

۱۱۔ قسمت اور جبریت

جن لوگوں نے جبریت کے پورے معنوں کو اخذ نہیں کیا ہے، وہ معترض ہیں کہ یہ قسمت کے لئے ایک نرم اصطلاح ہے، اور یہ کہ یہ دونوں عقائد اخلاقی جد وجہد کے لئے مساوی طور پر مہلک ہیں، لیکن دو اہم نکتے ایسے ہیں، جن کی وجہ سے جبریت اور قسمت میں فرق ہو جاتا ہے، اوّل قسمت عام طور پر غلط یا کے ایک امید سوز عقیدے کی طرف اشارہ کرتی ہے، یہ اس واقعے کو نظر انداز کرتی ہے، کہ انسان کے آیندہ فعل لازمی نہیں کہ اسکے گذشتہ افعال کے مشابہ ہوں، اور یہ کہ ان کی تبدیلی کا امکان ہر وقت رہتا ہے، یہ صحیح ہے کہ کوئی گذشتہ فعل ان حالات میں جو اسوقت تھے، مختلف نہ ہو سکتا تھا، لیکن مستقبل کا معاملہ اس سے الگ ہے، اگر ہم اس قول کی کہ "یہ مختلف ہو سکتا تھا" اہمیت کو بہت کم کرنے اور اسکو اس واقعہ سے قبل کے واقعات کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار سمجھنے پر مجبور ہیں، تو ہمارا یہ عزم کہ "ہم مختلف بنیں گے"، ایک بالکل مختلف معنی رکھتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ فاعل میں ایک نیا ذہنی رویہ پیدا ہو چکا ہے، اس طرح اگر بعینہٖ وہی خارجی حالات دوبارہ پیدا ہوں تو داخلی حالات مختلف ہوں گے، اور اس طرح نئے انجام کی گنجایش نکل آوے گی، لہذا مستقبل میں بدی کے بجائے نیکی کا انتخاب ہو سکتا ہے، ہم کسی نا قابلِ تغیر نظامِ عمل کے پابند نہیں، جس وسیع کل میں تمام واقعات ہمارے نزدیک نہ ٹوٹنے والے رشتے میں منسلک ہیں، وہ سکونی دنیا نہیں، اس میں حرکت ہوتی ہے، تغیر ہوتا ہے، اور زندگی ہے، ذہنی دنیا کو معین طور پر متعلق و مربوط کہنے سے نئے تجربات اس دنیا میں سے اسی حد تک خارج ہوتے ہیں، جس حد تک کہ ایک ایسا ہی تخیل جس کا ذی فکر انسان فطرت پر اطلاق کرتے ہیں، اس فطرت میں سے نئے واقعات کو خارج کرتا ہے،

دوم. قسمت ذات کی کارفرائی کو بھی نظر انداز کرتی ہے، اور انسانی زندگی کو خارجی قوتوں کا کھیل سمجھتی ہے، اس کے نزدیک کائناتی عمل ذاتی تقدیر کو معین کرتا ہے، اس تعیین میں وہ شعور کی باطنی دنیا کو ملحوظ نہیں رکھتی، قسمت فرض کرتی ہے، کہ انسانی تقدیر انسانی فعل کے بغیر معین ہوتی ہے، جبریت اس کو انتخاب کا نتیجہ سمجھتی ہے، کسی شخص کی تقدیر اس کی فطرت اور اسکے افعال کے بغیر معین نہیں ہوتی، اگر کل جزو کو معین کرتا ہے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے، کہ یہ تعیین جزو کی شرکت کے بغیر نہیں ہوسکتی، یہ خیال رکھنا چاہئے کہ دنیا اور ذات کا کمیتی مقابلہ یعنی ایک کو بہت بڑا، اور دوسری کو بہت چھوٹا کہنا گمراہ کن ہے، ہر عقیدے کے مطابق فرد تمام اشخاص و اشیا کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہوتا ہے، لیکن جہانتک کسی خاص ذات کی تقدیر کا تعلق ہے، یہ ذات جیسی کچھ ہے، اور جو کچھ وہ کرتی ہے یہی سب سے بڑا عنصر ہے، اس میں کلام نہیں کہ ہم ایک کائناتی قوت کے تابع ہیں، لیکن قسمت اس واقعہ کو ملحوظ نہیں رکھتی، کہ یہ قوت بعض غایات کو صرف ہمارے تفکر اور ارادے کے ذریعہ سے حاصل کرتی ہے، یہ بھی اکثر بھلا دیا جاتا ہے، کہ نفس اختیاریت ایک دوسری قسم کی قسمت میں تحویل ہو جاتی ہے، اگر بلا محرک انتخاب اور اندھا دھند ارادے کی قوت فی الواقع موجود ہوتی، تو ہم بجا طور پر شکایت کر سکتے تھے، کہ اسی حد تک ہماری زندگی بدترین قسم کی قسمت یعنی بخت و اتفاق کے حوالے ہو جاتی ہے،

قسمت کے مطابق ہماری تقدیر کو ایسی قوتیں معین کرتی ہیں، جو ذات سے باہر ہیں، اگر یہ عقیدہ اخلاقی جد و جہد کے لئے مہلک ہے، اور جمود و خمود یا عوارض حالات کی غلامی کو پیدا کرتا ہے، تو جبریت اس سے بالکل مختلف ہے، یہ ذات کو انسانی زندگی کی تعیین کے لئے ایک کارکن اور اہم عنصر سمجھتی ہے، [illegible] سعی و عمل صرف اس وقت مفقود ہو سکتی ہے، جب ہم اپنے مستقبل کے متعلق کامل و مکمل علم رکھتے ہوں، اس صورت میں زندگی اپنی دلچسپیوں کو یقیناً کھو دے گی، کیونکہ ہم اپنے تجربات کو مستقبل کے ہاتھوں سے چھین قبل از وقت اس کے مالک بن جائیں گے، لیکن جبری عقیدے کے مطابق ہماری جیسی محدود ہستیوں کے لئے

زندگی ہمیشہ ایسی چیزوں کی رازکشائی کو باقی رکھے گی، جو تا حال نامعلوم ہیں، ان میں ان غایات کے حصول کا شوق باقی رہے گا، جو ابھی حاصل نہیں ہوئیں، اور تجربہ میں نہیں آئیں، جب ہم کسی شکار کا تعاقب کرتے ہیں، تو ہماری دلچسپی اس وجہ سے کم نہیں ہو جاتی، کہ ہمارا راستہ پہلے ہی سے معین و مقرر ہے، یا یہ کہ ہم سے قبل اور بہت سے لوگ اس کو طے کر چکے ہیں، جب ہم خود اس کو پہلی مرتبہ طے کرتے ہیں، تو اس میں ندرت کی تمام دلکشیاں موجود ہوتی ہیں، یہی حال زندگی کا ہے، مستقبل میں جو کچھ ہے، وہ ہر قدم پر ایک نیا تجربہ ہوتا ہے، ہم کو خود اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا کسی درجۂ کمال تک علم نہیں، یہی وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کو ہمیں دریافت کرنا پڑتا ہے، ہم کیا کچھ حاصل کر سکتے ہیں، اور جو کچھ ہم حاصل کرتے ہیں، اس کی قیمت کیا ہوتی ہے، ان تمام باتوں کا علم ہمیں اس وقت تک نہیں ہوتا، جب تک کہ ہم کوشش نہیں کرتے، یہ خیال رکھنا چاہئے، کہ خواہش اور کوشش ہماری فطرت کے عنصری اور ضروری حصے ہیں، ان کی تشفی صرف زندگی کے ختم ہونے سے ہوتی ہے

(باقی)

تذکرۂ طاہر

یعنے

سوانح خود نوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خان طاہر مرحوم

(۵)

جدید علم کلام کی سرسید مرحوم نے بنیاد ڈالی

بہرحال مجھ کو متعدد مرتبہ سرسید مرحوم سے جلوت و خلوت میں ملنے کا اور اُن کے حکیمانہ و فلسفیانہ اقوال اور مذہبی خیالات سے مستفید ہونے کا، اور ان کے تالیفات و مضامین پر غور و خوض کرنے کا موقع ملا، اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ یورپ کے علوم جدیدہ کے مقابل میں سرسید مرحوم نے ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی، اور انگریزی خواں تعلیم یافتہ گروہ کو ہاویۂ کفر و ارتداد میں گرنے سے بچا لیا، اور دین الفطرۃ اسلام کے وقار قائم رکھنے کی جو سعی ان کے دست و قلم و زبان سے وقوع میں آئی، اسکی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کو ان کے مقاصد صحیحہ میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی دنیائے علم اور عالم اسلامی میں ہمیشہ ان کو ممتاز درجہ حاصل رہے گا، اور آیندہ نسلیں ہمیشہ انکے مساعی جمیلہ کی فخر کیساتھ شکر گذار رہیں گی،

سرسید مرحوم کی تالیفات و مذہبی خیالات پر رائے

مگر میں صاف دلی کیساتھ اپنے علم و فہم کے مطابق بلا اندیشہ لومۃ لائم کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کی لاجواب تالیفات اور مضامین نافعہ سے مسلمانوں کو دینی اور دنیاوی فوائد تو بے شمار حاصل ہوئے، مگر سچ یہ ہے کہ جیسی چاہئے تھی، اُن سے حقیقی مقاصد اسلام

کی تکمیل نہیں ہو سکی، اور نہ یہ اسوقت ممکن تھا، ؎

از حکمت و منطق نہ کشاید در عرفان این با ہمہ آرایش افسانۂ عشق است

جو لوگ علوم مذہبی سے واقف ہیں، اور جن کے دل و دماغ میں غور و تحقیق اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کا مادہ قدرت نے ودیعت کر رکھا ہے، وہ سرسید مرحوم کے حکیمانہ اقوال اور فلسفیانہ خیالات سے بلاشک و شبہہ عظیم فوائد اور بہترین نتائج اخذ کر سکتے ہیں، اور حق و صداقت کی صراط مستقیم سے بھٹک نہیں سکتے، مگر جو لوگ علوم مذہبی میں دستگاہ نہیں رکھتے، اور سطحی خیالات والے ہیں، اور جن کا زیادہ وقت صرف مغربی علوم جدیدہ اور فلسفۂ مغرب کے مطالعہ میں گذرا کرتا ہے، وہ سرسید مرحوم کے تالیفات و خیالات سے استعدر تو ضرور فائدہ حاصل کر سکتے ہیں، کہ نام کے مسلمان رہیں، اور دائرۂ اسلام سے خارج نہ ہوں مگر اسلام جیسے دین الفطرت اور مجموعۂ حق و صداقت سے کامل فائدہ نہیں اٹھا سکتے،

سرسید مرحوم اور قدماے متکلمین کے طرز استدلال و بحث کا فرق

اس لیے قدماے متکلمین نے جب فلسفہ یونانی کے مقابلہ کے لئے علم کلام کی بنیاد ڈالی، اور اس کے ذریعہ سے مسائل فلسفہ کو مسائل مذہبی سے تطبیق دینے کی کوشش کی تو انھوں نے دین الفطرۃ اسلام کی برتری کو مد نظر رکھکر اسکے اصول و احکام کو مقدم رکھا اور ان کے ضمن و تحت و اثر میں مسائل فلسفہ بیان کر کے ان کی تطبیق یا تردید یا مشکوک ٹھہرانے میں مساعی جمیلہ سے کام لیا، اس طرز بیان و استدلال و بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصول و احکام مذہبی کا تفوق و احترام دلوں میں قائم رہا، اور کوئی شخص راہ راست اسلام سے گمراہ نہیں ہوا، برخلاف اس کے سرسید مرحوم نے مسائل فلسفہ کو بلند رکھکر ان کے ضمن و تحت و اثر میں اسلامی اصول و احکام بیان کر کے ان کی تطبیق و تردید وغیرہ میں سعی موفور کی اس طرز بیان و استدلال و بحث کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ جلد بھٹک جانے والی طبیعتیں اور موجودہ شاندار مغربی تمدن و سائنس کی ترقی سے مرعوب ہو جانے والے قلوب راہ راست اسلام کو چھوڑنے اور کفر و ارتداد کی غار میں گرنے سے رک گئے، مگر با این ہمہ وہ اصول و احکام صادقۂ ایمانی کے لذت آشنا ہونے

سے کوسوں دور پڑے رہے۔ سہ

کسے کز لذت طاعت بود محروم من ضامن
کہ بگذارند در جنت وے باداغ حرمانش

جہاں تک میں نے غور کیا سرسید مرحوم کی تالیفات و مضامین کا میں نے یہی اثر اپنے دل پر پایا، مگر خدا ے عز وجل کا بڑا فضل میرے حال پر یہ تھا، کہ حضرت والد محترم کے فیض صحبت و تربیت سے مطالعۂ کتاب وسنت کا ذوق میرے دل میں سرایت کرچکا تھا، گو وہ عارضی طور پر فلسفیانہ خیالات سے متاثر ہو کر کچھ دنوں کے لئے دب گیا تھا، مگر مٹا نہیں تھا،

دیوان سرنوشتم چوں نسخہ ہاے اصلی
ہرچند بد نوشت است اما غلط ندارد

چنانچہ اس زمانہ میں بھی جسکو میں ایک قسم کے فسق و الحاد کے زمانہ کے نام سے تعبیر کیا کرتا ہوں، حضرت والد مرحوم کی تالیفات اور ائمۂ ہدیٰ یعنی علامہ ابن تیمیہؒ امام غزالی، امام فخر الدین رازی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ کی تصنیفات اور علماء عصریہ میں حکیم الامۃ جمال الدین اسد آبادی مفتی محمد عبدہٗ علامہ جسر طرابلسی خیر الدین پاشا وزیر تونس کی تالیفات اور حضرت علامہ شبلیؒ کے فیض صحبت نے مجھ کو خضر راہ کا کام دیا، اور خدا ے ارحم الراحمین نے مجھ کو ورطۂ ہلاکت وضلالت سے نکلنے کی توفیق عطا فرمائی، اور بہت جلد مغربی فلسفہ کی ملحدانہ دلفریبی تمدن جدید کی ملمع سازی، مورخین یورپ کے طرز خیالات کی بے اعتدالی اور مورخانہ رنگ آمیزی اور اشاعت تہذیب کے پیرایہ میں مذاہب کی بیخ کنی اور قلیل التعداد اقوام کی حمایت کے پردہ میں توسیع حکومت کی ہوس رانی، امن و امان قائم رکھنے کے نام سے مغربی مدبرانہ چالاکی، اور مختلف اقوام میں تفرقہ اندازی کا راز مجھ پر کھُل گیا،

خود را نہ پرستیدہ عرفاں چہ شناسی
کافر نشدی لذت ایماں چہ شناسی

الحمد للہ کہ اب میں تحقیقی طور پر نہ تقلیدی طور پر مغربی فلسفیانہ خیالات و مغربی طرز و روش سے کنارہ کش ہو کر دنیا میں صرف مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب کو مجموعۂ حق و صداقت اور ترقی یافتہ

مکمل تہذیب سمجھتا ہون، اور اس کے دین الفطرۃ ہونے پر دل سے یقین کرتا ہوں اور اتباع کتاب و سنت ہی کو صراط مستقیم اور میزان قسط جانتا ہوں، اور اسی پر قائم ہوں۔ واللہ ولی التوفیق و الیہ المرجع والمآب۔

زترتیب نظام آفرینش چون نہ آگہ، حوادث را ز تاثیر نجوم آسمان بینی
زگر در غبت خاطر فروشو دیدۂ فطرت اگر خواہی کہ حسن خار و گل یک عیان بینی
برآ از پردۂ صورت قدم در راہ معنی زن کہ در ہر منزلے سرّے ز اسرار نہان بینی

خیالات گذشتہ پر افسوس، گذشتہ خیالات و حالات کی ندامت اب تک میں اپنے قلب میں محسوس کیا کرتا ہون، اور غایت عجز و الحاح کے ساتھ اپنے خالق فاطر السموٰت والارض وحدہٗ لاشریک لہ کے سامنے سربسجود اور دست بدعا ہون، کہ وہ مجھکو اور میری اولاد و احفاد کو کتاب و سنت کی صراط مستقیم پر قائم رکھے، اور استقامت بخشے اور میرے سیئات کو حسنات سے بدل دے' انّ الحسنات یذھبن السیئات ذلک ذکری للذاکرین،

سرسید مرحوم کی کامیابی، بہرتقدیر سرسید مرحوم کو جو صدق عقیدت اسلام کے ساتھ تھی، اور جس نیک نیتی کے ساتھ انھوں نے علماے عصر کو حمایت اسلام کے اہم دینی فرض سے غافل پاکر اپنے علم و دانش و خیال کے مطابق اسلام کی تائید و حمایت اور قوم کی دنیاوی ترقی میں اپنی عمر عزیز صرف کی، یہ اسی کی برکت تھی کہ کالج کو ایک قلیل مدت میں وہ عظمت و مرکزیت حاصل ہوئی، جس کی امید عام مخالفت کو دیکھتے ہوئے بمشکل ہوسکتی تھی، مسلمانوں میں رفتہ رفتہ اشتراک عمل کی روح اور اپنے قومی تنزل کا احساس پیدا ہونے لگا، علماے اسلام کو بھی علوم مشرقیہ کی حفاظت و احیاء کا خیال پیدا ہوا، اور اسلام کی حمایت، اور مسلمانوں میں روشن ضمیری پھیلانے کی طرف ان کو خاص طور پر توجہ ہوئی، اور اس طرح ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی، دین الفطرت اسلام کا ایک بڑا رکن یعنی دنیاوی ترقی جس پر اسلام اور

ایک بڑا رکن یعنی دنیاوی ترقی جس پر اسلام اور مسلمانوں کی عظمت و وقار کا مدار تھا، اور جس کو مدت دراز سے علماے ملت نے اپنے دائرۂ سعی و عمل سے متروک و خارج سمجھ رکھا تھا، سرسید مرحوم نے اسکی ضرورت کو قوم کے ذہن نشین کیا، غرض سرسید مرحوم نے اپنے مساعی جمیلہ کا نیک ثمرہ بہت کچھ اپنی زندگی ہی میں پا لیا، اور جو باغ انھوں نے قوم کے ہونہار بچوں کو جمع کرکے لگایا تھا، اس کو پھولتے پھلتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا،

نواب محسن الملک بہادر مرحوم کا خط راقم الحروف کے نام

سرسید مرحوم کی وفات کے بعد بست و ششم جنوری ۱۸۹۹ء میں نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی مہدی علی خان بہادر مرحوم آنریری سکریٹری محمڈن کالج نے مجھ کو خط میں لکھا کہ آپ کا نام نامی ٹرسٹیوں کی فہرست میں نہیں ہے، اگر آئندہ کوئی جگہ خالی ہوئی، تو مجھے یقین ہے، کہ سید محمود صاحب اور دیگر ٹرسٹی آپ کے غالبًا خواہش کریں اور میں اسکی تحریک کرونگا، اور جب تک وقت آئے میں آپ کی خدمت میں مطبوعہ کاغذات کالج کے اور ضروری اطلاعیں متعلق ترقی کالج کے عرض کرتا رہوں گا، مگر واقعہ یہ ہے، کہ بعض اتفاقی موانع کی بنا پر باوجود غایت دلچسپی کے میں ٹرسٹی شپ قبول کرنے سے پہلوتہی کرتا رہا، یہانتک کہ کالج کا ایک نیا مذہبی دور شروع ہوا، اور نواب وقار الملک بہادر مولوی مشتاق حسین صاحب مرحوم نے آنریری سکریٹری شپ کا عہدہ قوم کی متفقہ آواز سے متاثر ہو کر قبول فرمایا، نواب صاحب مرحوم کی ذات اقدس روشن خیالی آزاد طبعی، مذہبی پابندی اور تقوی کے لحاظ سے بہت اعلیٰ اور ارفع درجہ رکھتی تھی، ان کے آنریری سکریٹری کالج ہونے سے بہت سی بدگمانیاں اور شبہات جو سرسید مرحوم کی پارٹی اور کالج کی طرف سے علما و قوم اور نیز دیگر لوگوں کے دلوں میں تھیں، دور ہو گئیں، نواب صاحب بہادر مرحوم کے مبارک عہد میں مجکو کالج کے ٹرسٹی ہونے کی عزت حاصل ہوئی، چونکہ اب وہ پہلی سی مجبوریاں بھی باقی نہیں رہی تھیں، اسلئے بزرگان قوم کی بخشی ہوئی عزت اور خصوصًا نواب صاحب بہادر مرحوم کی تعمیل ارشاد سے روگردانی کرنا ایک

قسم کا کفران نعمت تھا، اور میرے بس کی بات نہ تھی میں نے دلی شکر گذاری اور احسان مندی کیساتھ اس عزت کو قبول کیا، بعد ازاں دوازدہم مارچ ۱۹۰۵ء میں مجھ کو سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر ہونیکی عزت بخشی گئی،

۱۹۰۴ء میں جب ایجوکیشنل کانفرنس کا مشہور اجلاس لکھنؤ میں زیر صدارت مسٹر بیک منعقد ہوا تو اس میں نواب صاحب اور تمام رؤسا و ارکین نے نواب محسن الملک کی تحریک سے خاکسار کو صدارت استقبالیہ کمیٹی کی عزت بخشی، اسی اجلاس میں میں نے اپنی دو متوفی لڑکیوں کی یادگار میں تین ہزار روپیہ کے صرف سے دو پختہ بورڈنگ ہاؤس تعمیر کرائے، جب اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک کا آغاز ہوا، اور ہز ہائینس سر آغا خان بالقابہ کا ڈپوٹیشن لکھنؤ میں آیا، تو ہز ہائنس غریب خانہ پر تشریف لائے، اور یونیورسٹی کمیٹی میں میں نے پندرہ ہزار روپیہ یکمشت پیش کیا،

رکنیت ندوۃ العلماء، ترک وطن کرکے لکھنؤ چلے آنے کے بعد حضرت علامہ شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ میں میرے رکن بنائے جانے کی تحریک کی، اور مجلس انتظامیہ نے مجکو منتخب کرکے رکن ہونے کی عزت بخشی چنانچہ چند سال تک میں نے دلی جوش و توجہ کے ساتھ ندوہ کے مذہبی و تعلیمی خدمات میں حصہ لیتا رہا،

ندوہ کے نظام عمل میں نقائص کا ظہور۔ کچھ مدت گذرنے کے بعد عملی تجربہ نے مجھ پر یہ امر واضح اور منکشف کر دیا، کہ ندوہ کے نظام کار (کانسٹی ٹیوشن) میں چند ایسے نقائص عظیمہ پیدا ہوگئے ہیں، جو اس کے مقاصد مہمہ کی بنیاد ہی کو متزلزل کئے دیتے ہیں، یہ صورت حال محسوس کرکے میں نے بعض مشاہیر ارکان و اعضائے مجلس ندوہ سے اس معاملہ میں بالمشافہ اور بذریعہ خط و کتابت مشورہ کیا، اور اپنے محترم دوست جناب مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم سابق سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ و رکن انتظامی ندوۃ العلماء کے قلم سے خطوط لکھوا کر بیرونی ارکان کو اصل حالات سے مطلع کیا،

انجمن اصلاح ندوہ کی تاسیس و آغاز دعوت: جب تقریبًا دوتہائی ارکان انتظامیہ ضرورتِ اصلاح پر متفق ہوگئے، تو بعض اجزائے صالحہ کے ذریعہ سے انجمن اصلاحِ ندوہ کی بنیاد ڈالی، انجمن کے اولین اجلاس نے فیصلہ کردیا، کہ اس انجمن کے صدر جناب مولوی نظام الدین حسن صاحب مرحوم وکیل لکھنؤ وسابق وزیر بھوپال ہون[1]، اور راقم الحروف سکریٹری ہو،

جب عام طور پر لوگون کو ندوہ کے نظام کار کے نقائص کا علم ہوا، تو ہندوستان کے مختلف صوبون شہرون بلکہ قصبات و دیہات تک میں تقریبًا پچاس جلسے مسلسل مطالبۂ اصلاح کی تائید میں منعقد ہوئے انجمن اصلاحِ ندوہ نے اپنے کامون کا جو پروگرام طے کیا تھا، اس میں یہ تجویز بھی تھی، کہ معاملاتِ ندوہ کے متعلق ایک عام کانفرنس منعقد کیجائے، اور تمام ملک سے نامبین ملت کا مجمع فراہم کرکے ان کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کیا جائے، چونکہ دہلی کو قدیم سے علوم اسلامیہ کا مرکز اور دارالسلطنت ہند ہونے کا شرف رہا ہے اسلئے قدرتی طور پر ادھر توجہ ہوئی، اللہ تعالیٰ نے بزرگانِ کرام دہلی کے دلون کو اس مقصدِ عظیم کی طرف متوجہ فرمادیا، عالیجناب مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب دہلوی مرحوم نے بمعیتِ بزرگانِ دہلی، اوائل اپریل ۱۹۱۴ء میں ایک جلسۂ عام کرکے اس مشکل کو خود بخود حل فرمادیا چنانچہ دہم مئی ۱۹۱۳ء کو ایک عظیم الشان کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی، اور آل انڈیا مسلم لیگ علیگڈھ کانفرنس مسلم یونیورسٹی کمیٹی حمایتِ اسلام اور خود ندوۃ العلماء کے اجلاس جن ملکی جماعتون سے مرکب ہوا کرتے ہیں، اُن سے زیادہ جامع اور اوسع اجتماع کے ساتھ اس کانفرنس میں بزرگانِ قوم وملت نے شرکت فرمائی، اور نو اصحاب کی ایک کمیٹی کو منتخب کیا کمیٹی نے ندوہ کے تنزل کے اسباب وعلل دریافت کرکے ایک دستور العمل مرتب کیا، اور تمام وہ طریق عمل بھی قرار دیئے، جن پر کاربند ہوکر ندوہ ندوہ بن سکتا ہے، مگر افسوس اس وقت بدقسمتی سے کچھ ایسے اسباب غلط فہمی اور سوءظن کے

[1] جناب مولوی نظام الدین حسن صاحب مرحوم نے بست وسوم ستمبر ۱۹۲۱ء مطابق بست محرم شب جمعہ ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی، اللھم اغفرہ وارحمہ،

جمع ہوگئے، کہ بزرگانِ ندوہ نے کمیٹی کی برادرانہ گذارشوں پر مطلق توجہ نہ فرمائی، اور پورا ایک سال کا زمانہ اسی جد و جہد میں بسر ہوگیا، ہمارے ہر سوال کے جواب میں اغماض اور ہمارے ہر عجز کے سامنے بے نیازی تھی، با ایں ہمہ کمیٹی کا رویہ برابر آشتی اور صلح پر مبنی رہا، دہم مئی کے اجلاس کے بعد سے علانیہ مخالفت اور انعقادِ مجلس عام کی کوششیں بند کردی گئیں، یہانتک کہ رسالہ الہلال میں جو مسئلۂ اصلاح کے خاص محرکین میں تھا کمیٹی کے قیام کے بعد کوئی مضمون اس میں شائع نہیں ہوا، پھر بھی اربابِ کار نے نظر توجہ سے دریغ فرمایا:- ع

ادھر سے عجز اُدھر سے رکھائیاں ہی رہیں،

ندوہ کے جانب سے جلسۂ عام کا اعلان

اسی اثنا میں ارکانِ ندوہ نے جلسۂ عام کے انعقاد کا اعلان کیا، خواہ اس اعلان کا مقصد کچھ ہی رہا ہو، مگر ہم اس ارادہ کے منت گذار ہیں کہ آخر کار یہی اعلان ہمارے مقصد یک سالہ کے ظہور کا وسیلہ بنا، اس اعلان نے ارکانِ انجمن اصلاح کو یکایک اس نئے سوال کی طرف متوجہ کردیا، کہ اس موقع پر ان کو کونسا طریقۂ عمل اختیار کرنا چاہیئے، اس پر غور و مشورہ کے بعد حضرت محترم جناب مولانا ابو الکلام صاحب آزاد کلکتہ سے لکھنؤ تشریف لائے، تاکہ اس مسئلہ کا آخری قطعی فیصلہ کیا جائے، بالآخر یہ رائے قرار پائی، کہ جس طرح ان کی بے نیازی کی انتہا نہیں، اس طرح ہمارے عجز و سوال کی بھی کوئی حد نہیں ہونی چاہیئے، اور اگر اس میں بھی ناکامی ہو، تو پھر مجبوراً جلسۂ عام میں شریک ہوکر پبلک طور پر مطالبۂ اصلاح کو پیش کیا جائے، اور اجتماعی قوت کے ذریعہ سے موانع تبویتِ اصلاح کو ایک آخری اور قطعی شکست دیجائے، چنانچہ ایک مراسلہ جناب ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی خدمت میں بھیجا گیا، اور ان کو توجہ دلائی گئی، کہ اگر جلسۂ سالانہ سے پہلے امور مختلفہ کے متعلق ہم متحد ہوسکیں، اور جلسۂ عام میں اختلافات کے اختتام اور حصول مقصد اصلاح کا اعلان کرسکیں تو ندوہ کے لئے یہ ایک مژدۂ حیات ہوگا ورنہ جلسہ کے اندر شدید معرکۂ اختلاف گرم ہوگا، ندوہ کی بقیہ زندگی کا خاتمہ ہوجائیگا اور ہمارا مشترکہ مقصد نیک ناکام ہوگا

انجمن اصلاح ندوہ کی کامیابی خدا کا شکر ہے کہ ہماری یہ استدعا پایۂ اجابت کو پہنچی، ہماری صدائیں بے اثر نہ رہیں، ہمارا عجز و نیاز رائگاں نہیں گیا، ہمارا سوال محرومِ جواب نہ رہا، ہماری نیتوں کی صداقت و عدمِ صداقت کا جو فیصلہ نتیجۂ کار اور عاقبتِ امر کے ہاتھ میں تھا، بالآخر مشتبہ نہیں رہا، تلک الدار الآخرۃ نجعلها للذین لا یریدون فی الارض علوا و لا فسادا و العاقبۃ للمتقین، اور انجمن اصلاح اور ندوۃ العلماء کے ہواداروں کی ایک ایسی مشترک صحبت تمام متنازع فیہ مسائل پر غور کرنے، اور کسی ایک متفقہ نقطہ تک پہنچنے کیلئے قرار پائی جس میں نصف تعداد ارکانِ ندوہ کی، اور نصف تعداد ارکان انجمن اصلاح ندوہ کی ہو، اس میں حسب ذیل ارکان انجمن اصلاح کے جانب سے شریک ہوئی، مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب دہلوی، مرحوم مولینا مولوی ابوالکلام صاحب آزاد، بابو نظام الدین صاحب امرتسری، ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب راقم الحروف سکریٹری انجمن، کچھ شک نہیں کہ اگر نیتیں صاف اور قلوب حق پرست ہوں، تو جن مناقشوں میں عمریں صرف ہوجایا کرتی ہیں، وہ ایک لمحۂ تفکر میں رفع ہو سکتے ہیں، یہ صحبت مغرب کے بعد سے گیارہ بجے شب تک رہی، مبادلۂ خیالات و مباحث کے بعد تقریبًا تمام مسائلِ اصلاح حل ہوگئے اور اصلاحِ ندوہ کے متعلق جس قدر اہم مطالبات تھے، اُن سب کو بزرگانِ ندوہ نے منظور فرمالیا، ؎

بعد از ہزار سعی ثواب و مجاہدت زنار زاہد و بتِ ترسا بما رسید،

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ،

اس موقع پر میں خصوصیت کے ساتھ ان احباب ذوی الاحترام کا شکرانہ ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا، جن کی مساعی جمیلہ سے انجمن اصلاح کے مقاصد کی تکمیل اور جن کی مدد و توجہ سے راقم الحروف کو کامیابی نصیب ہوئی، سچ یہ ہے کہ اگر جناب مولانا مولوی مسعود علی صاحب ندوی اور جناب حکیم عبد الولی صاحب مرحوم لکھنوی کی عملی سعی و ہمدردی، اور جناب مولینا مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کی معنوی اعانت، جناب مولینا ابوالکلام صاحب آزاد کی مخلصانہ اور حق پرستانہ کوشش، اور جناب مسیح الملک

حکیم اجمل خانصاحب دہلوی کی غایت دلسوزی کے ساتھ چارہ سازی، اور جناب رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب کی دلی جوش کے ساتھ مدبرانہ ایثار نفسی اور بیش بہا امداد شریکِ کار نہ ہوتی، تو کامیابی دشوار بلکہ قریبًا محال تھی، اسی طرح اگر جناب مولینا مولوی حکیم سید عبدالحیٰ صاحب مرحوم ناظم سابق ندوۃ العلماء عہدۂ نظامت کو قبول فرماکر رفع نزاع میں کوشش نہ فرماتے، تو تمام سعی وجہد رائگاں جاتی، اب میں اس تذکرہ کو اس مصلح حکیم اور مرشد خبیر کے ذکر و دعا پر ختم کرتا ہوں، جسکو ندوہ کے ساتھ روح وجسد کا سا تعلق رہا ہے، جس نے اپنی زندگی کی بہترین فرصتوں اور قوتوں کو ندوہ کی راہ میں وقف کر رکھا تھا، جسکی فکرِ حکیم اور رائے مستقیم نے قیام دارالعلوم اور اصلاحِ نصاب کو اصلاح دینی کا اصل اساس سمجھ کر سب سے پہلے اس عملِ جلیل کی بنیاد ڈالی، اور احیائے امت مرحومہ کی جس حقیقتِ کبری کو باوجود محسوس کرنے کے حکیم الامۃ جمال الدین اسدآبادی مرحوم اور مفتی محمد عبدہ مرحوم عمل میں نہ لا سکے، اسکو حضرت علامہ شبلی مرحوم نے عملًا نمایاں کرکے دکھا دیا،

مگر افسوس ہے کہ با این ہمہ بدبختانہ طور پر ندوۃ العلماء اس کے فیض بخشی حیات سے محروم رہا، اور اس قتیلِ ندوہ اور فدائے اصلاح دینی کے خدماتِ عظیمہ سے مستفید نہ ہوسکا،

اولاد، زوجۂ اولی کے بطن سے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں، اور ان تینوں نے میرے سامنے وفات پائی،

زوجۂ ثانیہ سے آٹھ لڑکیاں اور تین فرزند پیدا ہوئے، سب سے بڑا ابوالفضل عزیزی سید امیر حسن خان سلمہ اللہ تعالیٰ ۱۳۱۰ھ میں ولادت ہوئی، دوسرا عزیزی ابوالفتح سید شمس الحسن خان سلمہ اللہ تعالیٰ ۱۳۲۲ھ میں پیدا ہوئے، اور بی اے ال ال بی تک تعلیم پائی، شعر وسخن کا سلیقہ رکھتے ہیں اور تیسرا عزیزی ابوالفیض سید انور حسن سلمہ اللہ تعالیٰ ۱۳۲۶ھ میں پیدا ہوا،

تصانیف، راقم الحروف کے حسب ذیل تالیفات ہیں،

حظیرۃ التقدیس، موارد المصادر للصادر والوارد، فطرت الاسلام، المدنیۃ فی الاسلام، شریعت الاسلام

سیرۃ الاسلام، رسالۂ دیندار و دنیا دار، اسلام اور اس کے طریقۂ عبادت، تعلیم و تربیت، تذکرۂ بزم حق، خرمن گل، نالۂ دل، اغراض و مقاصد کا نفرنس، خطبۂ صدارت متعلق تعلیم نسوان، انتظام خانہ داری، خطبۂ تعلیم، مسائل الاسلام قلمی، گلگشت گلستان باب اول قلمی، مضامین و تراجم قلمی، خطبۃ البیان متعلق اسلامیہ کلب بمبئی، خطبۃ البیان نمبر ۲ متعلق ندوۃ العلماء، مآثر صدیقی ۴ جلد غیر مطبوعہ فارسی اور اردو کلام، بعض مضامین جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے،

(باقی)

الفاروق

یعنی حضرت فاروق اعظمؓ کی لائف اور طرز حکومت، صحابہ کے فتوحات، طریقۂ حکومت، عراق و شام مصر اور ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق و زہد، عدل، اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر،

مولینا شبلی کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گرانمایہ کتاب کے بیسیوں اڈیشن فروخت ہو رہے ہیں، مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ اڈیشن کی تلاش تھی، مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جو حرف بحرف نامی پریس کا نمونہ کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت، اعلیٰ چھپائی، عمدہ کاغذ، دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلاً تا مُطَرّ ضخامت ۲۱۲ صفحے، قیمت سے

سیرۃ النعمان

امام ابوحنیفہ کی سوانحمری اور ان کے اجتہادات اور مسائل، فقہ حنفی کی تاریخ اور اس کی تدوین کے حالات، فقہ حنفی کی خصوصیات، علم حدیث، علم فقہ کی تاریخ اور اسلامی قانون پر تبصرہ، حجم ۲۲۱ صفحے، قیمت :۔ عہ

"منیجر"

حیدرآباد دکن کے
اردو اخبارات اور رسائل

از جناب سید تمکین صاحب کاظمی منشی فاضل، ایف آر اے ایس، ایم آر اے ایس

(۳)

سنہ ۱۹۲۶ء میں جامعہ عثمانیہ کی طرف سے اساتذہ کی امداد سے سینیر طلبائے جامعہ نے مجلہ عثمانیہ سہ ماہی جاری کیا، جو آدھا اردو آدھا انگریزی تھا، یہ رسالہ ابتک نہایت عمدگی سے جاری ہے،

سنہ ۱۹۲۶ء میں کتب خانہ مسجد چوک کے منتظمین نے رسالہ تجلی سہ ماہی جاری کیا، اور اسکی ادارت محمد سردار علی صاحب کے تفویض کی گئی، باوجود مولوی غلام محمد صاحب کی مالی اعانت کے مرتب کی ناتجربہ کاری اور عدم قابلیت کی وجہ سے رسالہ بند ہوگیا، یہ رسالہ بھی نہایت مفید اور جب تک بعض خاص محسن لوگوں کے مشورے سے نکلتا رہا، بڑی اچھی طرح نکلا،

سنہ ۱۹۲۶ء ہی میں مسٹر پی انبا داس راؤ وکیل نے آئین دکن جاری کیا، یہ قانونی ماہوار رسالہ سنہ ۱۳۰۲ف سے مولوی فدا حسین کی ادارت میں جاری تھا، مولوی صاحب کے انتقال کے بعد سے بند ہوگیا تھا، جسے انبا داس صاحب نے لے کر پھر جاری کیا،

سنہ ۱۹۲۷ء سے نرسنگھ راؤ دبیر نے ایک ہفتہ وار اخبار رعیت جاری کیا، جو سنہ ۱۹۲۹ء تک باضابطہ نکلتا رہا، مگر سنہ ۲۹ء میں بعض خاص وجوہ سے حکماً بند کر دیا گیا، مگر پھر سنہ ۱۹۳۴ء میں دوبارہ اس کا اجرا ہوا، جو ابتک جاری ہے۔

سنہ ۱۹۲۷ء ہی میں مولوی سید وقار احمد ایم اے اور مولوی حبیب اللہ رشدی ایم اے نے نظام گزٹ ہفتہ وار جاری کیا، یہ فرزندان جامعہ عثمانیہ کا پہلا اخبار ہے، جو ابتک جاری ہے،

اور عمدگی سے نکل رہا ہے،

۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب نے ایک روزنامہ دکن گزٹ کے نام سے جاری کیا جو دو ایک ماہ تک نکلتا رہا،

۱۹۲۸ء میں منیر الدین صاحب نے ایک ہفتہ وار اخبار الحکایت کے نام سے جاری کیا جو بہت جلد بند ہوگیا،

۱۹۲۹ء میں اخبار مشیر دکن کے ایک مترجم نے ایک دو ورقہ اخبار روزنامہ سرسری کے نام سے دو روز کے لئے جاری کیا،

۱۹۲۹ء ہی میں حکیم گنگا تھ پرشاد صاحب نے دکن پنچ کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا،

۱۹۲۹ء ہی میں محمد صالح نے ورزش جسمانی کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا،

۱۹۲۹ء ہی میں مولوی حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے ایک سہ ماہی رسالہ تاریخ کے نام سے جاری کیا، جو اپنی نوعیت کا بہترین رسالہ تھا، مگر دو تین سال کے بعد افسوس ہے کہ بند کر دیا گیا،

۱۹۲۹ء ہی میں مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی نے مجلہ مکتبہ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جس کے مدیر عبد القادر صاحب سروری تھے، افسوس ہے کہ دو تین سال کے بعد یہ رسالہ بھی بند ہوگیا،

۱۹۲۹ء ہی میں انجمن ترقی اردو نے ایک رسالہ سائنس جاری کیا، جو اب تک نکل رہا ہے،

۱۹۲۹ء ہی میں حیدرآباد تیجر کے نام سے ایک رسالہ جاری ہوا جو بہت جلد بند ہوگیا،

۱۹۲۹ء ہی میں نور اللہ نوری نے مشاعرہ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ صرف دو اشاعتوں کی حد تک نکالا،

۱۹۲۹ء ہی میں رسالہ ارشاد ایک ماہوار مذہبی رسالہ مولوی یوسف الدین صاحب نے جاری کیا جو اب تک نکلتا ہے،

۱۹۲۹ء ہی میں، انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد سے مولوی عبدالحق بی اے کی سرپرستی میں رسالہ نورس جاری ہوا،

۱۹۲۹ء ہی میں مولوی احمد عارف نے روزنامہ صبح دکن جاری کیا،

۱۹۲۹ء ہی میں ایک ماہوار رسالہ کشافہ (بوائز اسکاوٹ) جاری ہوا،

۱۹۲۹ء میں بیگم ابوبکر خان صاحب خویشگی نے ہجولی ماہوار جاری کیا جو ایک سال کے بعد بند ہوگیا،

۱۹۲۹ء ہی میں صادقہ قریشی صاحبہ نے سفینۂ نسواں ماہوار جاری کیا، جو اب اختر قریشی صاحب کی ادارت میں کامیابی سے نکل رہا ہے،

۱۹۲۹ء میں مولوی عبدالرحمن صاحب نے روزنامہ "منشور" جاری کیا، جو اب تک موجود ہے،

۱۹۲۹ء ہی میں امام بیگ صاحب رونق نے ایک نیم مذہبی رسالہ خلیق جاری کیا، جو اب تک نکلتا ہے،

۱۹۳۰ء سے متقر ضلع ناندیڑ سے حکیم غفران احمد صاحب نے الاعظم ہفتہ وار جاری کیا، جو ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد منتقل ہوگیا، مگر بعض وجوہ سے ۱۹۴۵ء میں حکماً بند کر دیا گیا،

۱۹۳۰ء میں ایک انجمن اشاعت القرآن قائم ہوئی، اور ایک ماہوار رسالہ ترجمان القرآن کے نام سے نکالا گیا، جو مولوی ابوالاعلیٰ مودودی کی ادارت میں اب تک نہایت عمدگی سے نکل رہا ہے،

۱۹۳۲ء میں عبدالرزاق صاحب بسمل نے ایک ماہوار رسالہ کاشتکار جاری کیا، جس کا آدھا حصہ اردو اور آدھا تلنگی اور مرہٹی ہوتا تھا، یہ زرعی رسالہ تھا،

۱۹۳۲ء ہی میں اکبر وفا قانی بی اے نے حسن کار کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار جاری کیا، جو نہایت کامیابی کیساتھ ۱۹۳۶ء تک جاری رہکر بند ہوگیا،

۱۹۳۳ء میں عبدالرزاق صاحب بسمل نے شہاب نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا، جو

اب تک جاری ہے،

۱۹۲۳ء ہی میں طلبائے سٹی انٹرمیڈیٹ کالج حیدرآباد نے ایک رسالہ الموسیٰ جاری کیا،

۱۹۲۵ء میں انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل کے طلبہ نے ورنگل کالج میگزین کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا،

۱۹۲۶ء میں روزنامہ پیام قاضی عبد الغفار صاحب نے جاری کیا،

۱۹۳۶ء میں داستان گو کے نام سے ایک ماہوار سلسلہ افسانوں کا علی احمد بی اے نے شروع کیا، چونکہ اسکی باضابطہ اجازت نہیں لی گئی تھی، اسلئے یہ پرچہ بند کرادیا گیا،

۱۹۳۶ء ہی میں مئی سے نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کے فرزند ارجمند مونس احمد صاحب نے ایک ماہوار رسالہ آئینۂ ادب کے نام سے جاری کیا جو ابھی تک جاری ہے،

اس طرح حیدرآباد دکن سے ۱۸۵۰ء سے ۱۹۳۶ء تک (۴۶) اخبار اور (۹۵) رسائل جاری ہوئے جنمیں سے ذیل کے اخبار اور رسالے اب تک موجود ہیں،

روزنامہ رہبر دکن، روزنامہ صبح دکن، روزنامہ صحیفہ، روزنامہ مشیر دکن، روزنامہ منشور، روزنامہ پیام، اخبار رعیت ہفتہ وار، اخبار نظام گزٹ ہفتہ وار، تاریخ ماہوار، ارشاد ماہوار، واعظ ماہوار، سفینۂ نسوان ماہوار، تحقیق ماہوار، شہاب ماہوار، آئینۂ ادب ماہوار،

حیدرآباد سے بعض گمنام اشخاص نے بعض عجیب و غریب رسائل اور اخبارات بھی جاری کئے جو دو دو تین تین اشاعتوں سے آگے نہ بڑھ سکے، چونکہ ان میں سے بعض کے سنین اجرا مل نہ سکے اسلئے ان کے نام بھی چھوڑ دیئے گئے ہیں، اور بعض ایسے اخبارات جو محض ذاتی منفعت اور اڈیٹری کے "نام" کی خاطر ایک آدھ پرچہ نکال کر بند کر دیئے گئے، ہمارے پاس بھی موجود ہیں، مگر ہم نے عمداً ان کو نظر انداز کر دیا ہے، مثلاً القمر، ندیم وغیرہ،

اردو کے اخبارات اور رسائل کے علاوہ انگریزی، تلنگی، مرہٹی بھی حیدرآباد سے نکلتے رہے اور اب بھی دو ایک حیدرآباد فارمر (انگریزی) نظام دیکھئے (تلنگی) جاری ہیں، مگر یہ ہمارے موضوع سے علحدہ تھے، اسلئے ہم نے انھیں نظرانداز کر دیا ہے،

ان اخبارات اور رسائل کے علاوہ بعض سالنامے بھی مستقل نکلا کرتے ہیں، مثلاً رہبر دکن اور صبح دکن، منشور، اور نظام گزٹ کے سالگرہ نمبر، رہبر دکن کا سالنامہ مجلہ تحقیقات علمیہ عثمانیہ یونیورسٹی کا سالنامہ، سٹی کالج کا سالنامہ وغیرہ،

حیدرآباد کے صحافتی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے لئے (۱۴۱) اخبارات اور رسائل کی تعداد کچھ زیادہ خوش آیند نہیں ہے، مگر اس سے زیادہ تکلیف دہ یہ اعداد ہیں کہ آج کل حیدرآباد سے صرف (۶) روزنامے (۲) ہفتہ وار اخبار، اور (۷) ماہوار رسائل جاری ہیں، اس تعداد میں بعض سرکاری جرائد، مثلاً جریدۂ اعلامیہ، پولیس گزٹ وغیرہ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ پرچے صحافتی شان کے نہیں، بلکہ اشتہارات، اعداد اور احکامات کی حد تک محدود ہیں، حیدرآباد جیسے مدینۃ العلم کے لئے (۷) ماہوار اور سہ ماہی رسائل کی تعداد کچھ بھی نہیں، ان میں سے دو تین کالج کے آرگن ہیں، دو ایک مذہبی ہیں، اور ایک آدھ تعلیمی رسالہ ہے، صرف دو رسائل شہاب اور آئینۂ ادب علمی ادبی رسائل کہلائے جا سکتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ اس معیار پر یہ دونوں بھی پورے نہیں اترتے، پابندی اشاعت کے علاوہ اور کوئی خوبی ان میں نہیں، مضامین، ترتیب، تنقیدات، شذرات، کوئی چیز بھی ان میں نظر نہیں آتی، اول الذکر رسالہ میں نثری حصہ زیادہ رہتا ہے، مگر بے کار، اور آخرالذکر رسالہ تقریباً گلدستہ بن رہا ہے، کاش ان دونوں رسائل کے مدیران رسائل کو حقیقی معنی میں علمی ادبی بناتے،

حیدرآباد کے مشہور ادیب اور پرانے انشاپرداز مولانا سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر

دیوانی و مال حیدرآباد کی علمی و ادبی خدمت میں سرگرم رہنے کے علاوہ اپنی جیب سے ماہوار کافی رقم اس سلسلہ میں صرف کرتے ہیں، کاش مولینا موصوف ایک ایسے علمی ادبی معیاری رسالہ کے اجرا کی طرف توجہ فرمائیں، جو حیدرآباد کے شایانِ شان ہو، اور معیاری کہلا سکے[1]،

---

[1] اس مضمون کی ترتیب میں تاریخ بستان آصفیہ مؤلفہ مانک راؤجی، اور دکن میں اردو مولفہ مولوی نصیر الدین اور عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی مؤلفہ ڈاکٹر زور سے بھی مدد لی گئی ہے مگر افسوس ہے کہ آخر الذکر دونوں کتابوں میں سنین کی غلطیاں ہیں، انھیں میں نے حتی الامکان درست کیا ہے، مگر پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میرے لکھے ہوئے سنین صحیح ہیں، کیونکہ اکثر اخبارات اور رسائل مجھے میسر نہیں ہوئے، صرف بعض کتابوں اور رسالوں وغیرہ سے نام اور سنہ اجرا وغیرہ لیا گیا ہے، اس طرح یہ (۱۴۱) اخبارات اور رسائل کی فہرست پیش کی جا رہی ہے چونکہ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے صرف (۶۸) اخبارات اور رسائل کا ذکر کیا ہے، اور ڈاکٹر زور نے بھی فقط (۹۸) اخبار اور رسائل گنائے ہیں، اسلئے یہ فہرست ان دونوں فہرستوں سے بہت زیادہ ہے،

استاد احمد معمار کے خاندان کی ایک اور یادگار

زیب النساء بیگم کے دربار کی ایک اور تصنیف

شاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی شہزادی زیب النساء بیگم کے علمی دربار کی جو یادگاریں اب تک معلوم تھیں ان میں ایک اور تصنیف کا اضافہ ہوا ہے، یہ استاد احمد معمار کے پوتے، اور ہیئت کی مشہور درسی تصنیف تصریح شرح تشریح الافلاک کے مصنف ملا امام الدین ریاضی بن ملا لطف اللہ مہندس لاہوری کا معانی و بیان میں ایک رسالہ ہے جس کا نام بیانیہ ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ نواب سید علی حسن خان مرحوم (بھوپال ہوس لکھنو) کے کتبخانہ میں نظر سے گذرا،

رسالہ کی زبان فارسی ہے، اور اس میں اکثر عربی اور بعض فارسی اشعار سے مثالیں دی گئی ہیں، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ اس نے اپنی طالب علمی میں یہ رسالہ لکھا تھا، اور یونہی پڑا تھا، جب اس کی خبر شہزادی کو معلوم ہوئی، تو اس نے اس کو دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا، اس حکم کی تعمیل میں سنہ ۱۱۰۲ھ میں یہ رسالہ صاف کیا گیا

دیباچہ کی عبارت یہ ہے،

"حمد منزہے را سزد کہ ذات و صفاتش از مؤنت تشبیہ و تمثیل بے نیاز است، ....

اما بعد چنیں گوید افقر عباد اللہ الغنی امام الدین الریاضی بن لطف اللہ المہندس اللاہوری ثم الدہلوی کہ در خلال از منۂ تحصیل و آونہ اکمال و تکمیل قواعد چند کہ اساس علم بیان رفیع البنیان است تحریر نمود و لیکن بسبب اشتغال بعض امور ماموره نقل آں از مسوده ببیضہ بمقتضائے وقت نمی نمود"

ثانی بحال، چون سنہ الف ومائۃ سبع ہجری مطابق سنہ سی وچہار امیر کبیر بسیار بخش، کم پذیر، اورنگ زیب بہادر عالمگیر، این معنی بعرض جناب عالیان مآب بادشاہزادۂ ذو القدر الرفیع ثریا جاہ جہانیان ملکۂ دوران حافظۂ قرآن قرۃ العین خلیفۃ الرحمٰن نواب قدسیہ القاب زیب النساء بیگم سلمہا اللہ تعالیٰ وابقی اظلال رافتہا علی العالمین خصوصاً بیدہ، حکم جہان مطاع عالم مطیع شرف صدور عز ورود بخشید کہ آن را مرتب ومہذب سازد تا بشرف مطالعہ لامعۂ طبع مشرق باشراقات انوار الٰہی مفتخر شود. فانّ وقع فی حیز القبول فہو منتہی المقصود واقصی المامول، لہذا سمعاً وطاعۃً بانیان این امر وامتثال این حکم پرداختہ مہذب ومدون ساختہ بہ بیانیہ موسوم نمود

اس نسخہ کی کتابت ۱۲۴۵ھ میں ہوئی ہے،

مصنف کے الفاظ "بسبب اشتغال بعض امور ماموره" سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اس کو کوئی بادشاہی عہدہ بھی ملا ہوا تھا،

"س"

تلخیص تبصرہ

نائجیریا کے مسلمان

شمالی نائجیریا میں مسلمانوں رئیسوں کی حکومت ہے لیکن "زیر سایہ حکومت برطانیہ" مشہور مشنری رسالہ "مسلم ورلڈ" (اپریل ۱۹۳۲ء) کے ایک مقالہ نگار نے اس قانون پر غصہ کا اظہار کیا ہے جسکی رو سے نائجیریا کے شمالی صوبوں میں مسیحی تبلیغ ممنوع قرار دی گئی ہے، نیز اس نے وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا سبب بھی اسی قانون کو قرار دیا ہے تاہم اس مضمون میں جو معلومات مسلمانوں کے متعلق فراہم کی گئی ہیں، وہ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں :-

نائجیریا مغربی افریقہ کا ایک وسیع صوبہ ہے جس کا رقبہ برطانیہ عظمیٰ کے رقبہ کا چوگنا ہے، معدنیات میں ٹن اور لوہا زمانہ قدیم سے آمدنی کے بڑے ذرائع ہیں، افریقہ کے اکثر حصوں کی طرح نائجیریا میں آمدنی کے قدرتی وسائل بہت زیادہ ہیں، لیکن ابھی تک اُن سے بہت کم فائدہ حاصل کیا گیا ہے۔ وہاں کے باشندوں کی تمدنی حالت نہایت پست ہے، اگر اہل یورپ نے بیشتر ان قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے، وہاں غلامی کا انسداد قانونی طور پر ۱۹۱۷ء میں ہوا، کانوں کی وجہ سے جنوبی صوبوں میں ریلوے لائنیں زیادہ ہیں، تجارت کی جو چیزیں باہر بھیجی جاتی ہیں، ان میں سے خاص خاص یہ ہیں، :- تاڑ کا گودا، تاڑ کا تیل، سپاری، روئی کی پنیاں، تھوہ، کھال اور چمڑے، مہوگنی کے لٹھے، اور ٹن، نائجیریا کی آبادی ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق (۱۹۱۳۰۰۸۵۹) ہے، اس میں سے (۱۴ ۳۱۴ ۸ ۵ ۹ ۹ ۹) باشندے شمالی صوبوں میں رہتے ہیں، تقریباً پوری آبادی نائجیریا کے ملکی باشندوں کی ہے، غیر ملکی باشندے جو وہاں آباد ہو گئے ہیں صرف (۲۶۲۱) ہیں، اور ایسے

غیر ملکیوں کی تعداد جنھوں نے بود و باش اختیار نہیں کی ہے (۱۱۷۰) ہے، شمالی نائجیریا میں سب سے زیادہ آبادی کانو، سوکوٹو، باوچی، اور بورنو کے صوبوں میں ہے، اور انہی صوبوں میں مسیحی تبلیغ مسدود ہے،

شمالی نائجیریا میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں، بقیہ بت پرست ہیں، عیسائی بہت کم ہیں، یعنی پوری آبادی میں ایک فی صدی کا پانچواں حصہ، اگرچہ بہت سے مسلمانوں میں مذہب کی صحیح روح پائی جاتی ہے، تاہم عوام کے اندر یہ روح موجود نہیں، جس طرح بت پرست پتھر اور درخت وغیرہ کو پوجتے ہیں، اسی طرح ان مسلمانوں نے قرآن کو بھی ایک بت بنا لیا ہے، چنانچہ ان کا عقیدہ ہے، کہ اگر کوئی شخص قرآن پر جھوٹی قسم کھائے گا تو ضرور مر جائے گا، نیز جس روشنائی سے قرآن کی آیتیں لکھی جائیں اسے اگر کوئی پی لے، تو ہر بیماری سے شفا پائے گا، عورتیں بے نقاب نکلتی ہیں، اور نماز کی بھی کچھ زیادہ پابندی نہیں ہے، مسلمانوں کی یہ ڈھیل مسیحی تبلیغ کے لئے بہت اہم ہے، کہا جاتا ہے کہ ہر مسلمان اپنے مذہب کا مبلغ ہوتا ہے، لیکن نائجیریا میں یہ مقولہ ایک بہت محدود معنی میں صحیح ہے، برخلاف اس کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حیثیت سے نائجیریا میں اسلام کے کارنامے بہت نمایاں ہیں، اسلام ہی نے وہاں کے وحشی قبائل کو متمدن بنایا، اس نے لوگوں کے مطمحِ نظر کو وسیع بنایا، ٹولیوں کو متحد کر کے ایک قوم بنائی، اور کسی حد تک لکھنے پڑھنے کو رواج دیا، علاوہ بریں مردم خوری، شراب نوشی اور دوسرے برے رسوم کو ممنوع قرار دے کر اوس نے بعض علاقوں میں حبشیوں کی تمدنی حیثیت حقیقۃً بلند کر دی ہے،

اسلام کی ترقی مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا نتیجہ نہیں ہے، ابتداء میں لوگ بجبر مسلمان بنائے گئے، لیکن آج اسلام غیر شعوری طور پر محض معاشرتی تعلقات کی وجہ سے پھیل رہا ہے، بت پرست جب مسلمانوں سے ملتا ہے، تو دیکھتا ہے، کہ وہ دماغی قوت اور قابلیت میں اس سے بڑھے ہوئے ہیں، وہ اکثر لکھ پڑھ سکتے ہیں، دنیا کے حالات سے زیادہ واقف ہیں، اور ان کے مکانات اسکے مکانات سے بہتر ہیں، وہ یہ بھی دیکھتا ہے، کہ اُن کا مذہب کسقدر عالمگیر ہے، ان تمام باتوں کے اثر سے وہ مسلمان ہو جاتا ہے، مسلمان اکثر بت پرست عورتوں

سے شادیاں بھی کرتے ہیں، اس ذریعہ سے بھی مذہب کی اشاعت ہوتی ہے،

مسلمانوں کے ہر شہر میں ایک مدرسہ ہے، بچے اس میں بہت ابتدائی عمر میں جاتے ہیں، اور انھیں قرآن شریف پڑھنا سکھایا جاتا ہے، اسکے بعد انھیں وضو وغیرہ کے طریقے بتائے جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ طریقۂ تعلیم ناقابلِ اطمینان اور ناکافی ہے تاہم اسکی وجہ سے تقریباً تین فی صدی مسلمان لکھ پڑھ سکتے ہیں، جو بت پرستوں کی تعلیمی حالت کے مقابلہ میں بہت غنیمت ہے،

سب سے بڑھکر یہ کہ نائجیریا میں اسلام کی وجہ سے اتحاد قائم ہوگیا ہے، اور اس اعتبار سے جنوب جہاں بت پرستوں کی آبادی ہے، اور شمالی اسلامی ریاستوں میں بہت نمایاں فرق ہے،

زبانوں کی کثرت کے لحاظ سے شمالی نائجیریا گویا بابل کا مینار ہے، تنہا اس ایک علاقہ میں دو سو سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں،

تعلیمی حالت بہت پست ہے، تقریباً اٹھانوے فی صدی آبادی بالکل جاہل ہے، برخلاف اس کے جنوبی نائجیریا میں جہاں زیادہ تر بت پرست آباد ہیں، تعلیم زیادہ پھیلی ہوئی ہے، اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ شمالی صوبوں میں عیسائی مشن کو تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں ہے، علاوہ اُن حلقوں کے جہاں بت پرستوں کی آبادی ہے، اور جنوبی صوبوں میں ان کی تبلیغی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ شمالی نائجیریا میں حکومت صرف (۴۴۰۰۰) پونڈ سالانہ تعلیم پر صرف کرتی ہے، حالانکہ جنوبی نائجیریا میں (۱۴۴۰۰۰) پونڈ سالانہ صرف کئے جاتے ہیں، لیکن شمالی نائجیریا کے سرکاری مدرسوں میں طلبہ کی تعداد بہت کم ہے، یعنی صرف (۱۵۰۰) مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری مدرسوں میں جہاں پرنسپل یورپین ہوتے ہیں، بہت کم بھیجتے ہیں، کیونکہ حبشی فطرتاً قدامت پرست ہوتے ہیں، نیز وہ یہ دیکھتے ہیں، کہ سرکاری مدرسوں میں بچوں کا وقت زیادہ صرف ہوتا ہے، اور کھیتی باڑی کے لئے انھیں وقت کم بچتا ہے، اسی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو اسلامی مدارس میں داخل کرتے ہیں، جہاں صرف صبح اور شام ایک ایک گھنٹہ پڑھائی ہوتی ہے، ۱۹۲۵ء میں اس وسیع علاقہ میں صرف

تیس سرکاری مدارس تھے، اور ایک سو تین مشنری مدارس تھے، اسکے مقابلہ میں اس سال اسلامی مدارس کی تعداد (۲۰۲۸۱) تھی جن میں (۳۴۹۰۲) اساتذہ تعلیم دیتے تھے، اسوقت اسلامی مدارس کا شمار (۳۰۴۱۱) طلبہ کی تعداد (۱۶۳۳۲۷۰) اور اساتذہ کی (۳۵۰۹۳) ہے، شمالی نائجیریا میں جتنے بچے تعلیم پارہے ہیں، ان میں اٹھانوے فی صدی سے زیادہ اسلامی مدارس کے طلبہ ہیں، "ع ز"

تاتار کی اسلامی صحافت

ایشیا کے ان مسلمانوں میں جنھوں نے اپنی داخلی اصلاح و ترقی اور اپنے حالات سے دنیا کو عموماً اور عالم اسلام کو خصوصاً باخبر رکھنے کے لئے اپنی مستقل صحافت کی ضرورت محسوس کی تاتاری سب آگے ہیں،

تاتار کی جدید تاریخ میں اخبار ترجمان کو بڑی اہمیت حاصل ہے، تاتاری زبان کا یہ سب سے پہلا اخبار تھا، اس نے تاتاری مسلمانوں کی بڑی مفید خدمات انجام دیں، اس کا بانی اور اڈیٹر تاتار کا مشہور مدبر و مصلح اسمٰعیل بک غصپری نسکی تھا، یہ پہلا شخص ہے جس نے پہلی مرتبہ عام موتمر اسلامی کے انعقاد کی دعوت دی، یہ اخبار آج سے نصف صدی پیشتر نکلا تھا، ابتدا میں ہفتہ وار تھا، پھر ترقی کرکے روزانہ ہوگیا، اس کا ایک صفحہ روسی زبان میں ہوتا تھا، اس سے روس اور قرب وجوار کی دوسری قوموں کو تاتاری مسلمانوں کی حالت سے پوری واقفیت ہوگئی، ترجمان نے سب سے بڑی خدمت اصلاح تعلیم کی انجام دی، اس نے تاتاریوں کو پرانی اور فرسودہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو بدل کر جدید تعلیم کو جو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت سے قریب تر ہو اختیار کرنے پر آمادہ کیا، اور ایک نئے طرز کی بڑی درسگاہ قائم کی، جس سے صدہا تاتاری نوجوان مستفید ہوئے، تاتاری حروف اور رسم الخط میں مفید اصلاحیں کیں اور ان پرانے حروف تہجی کی جگہ جن کی تحریر میں بڑی پیچیدگیاں تھیں نئے اور آسان حروف کو داخل کرکے ترجمان کے ذریعہ سے ان کی اشاعت کی، تاتاریوں کا یہ مصلح اور محسن اعظم برسوں اپنی قوم کی خدمت انجام دیکر ۱۹۱۳ء میں انتقال کرگیا، اس کے انتقال کے بعد دو سال تک اخبار ترجمان نکلتا رہا، پھر بعض

ایسے واقعات پیش آگئے کہ بند کر دینا پڑا،

ترجمان کے بعد مختلف مقامات سے تاتاریوں کے متعدد اخبارات ورسائل نکلے، دو بھائیوں محمد شاکر اور محمود ذاکر نے "اورنبرگ" سے ایک بڑا اخبار "وقت" کے نام سے نکالا، ایک اور مشہور تاتاری عالم مفتی ضیاء الدین[1] نے "شوری" نام اخبار نکالا، یہ دونوں اخبار تاتاری صحافت کا بہترین نمونہ تھے،

"قازان" سے دو اخبار "یولدوز" (ستارہ) اور "کویاش" (آفتاب) نکلے، ایک ممتاز تاتاری لیڈر عیاض اسحاقی[2] نے ماسکو سے "وطن" نکالا، جنگ عظیم کے بعد مشرق اقصی اور یورپ سے تاتاری زبان کے بہت سے اخبارات و رسائل نکلے،

امام احمدی اور ڈاکٹر احمد زمی نے ۱۹۲۷ء میں "خربین" سے "ازاک شرق" (مشرق اقصی) ایک رسالہ نکالا، جو ترقی کرکے ۱۹۳۲ء میں روزانہ اخبار بن گیا "ازاک شرق" کے علاوہ خربین سے اور متعدد اخبارات و رسائل نکلے

سنہ ۱۹۳۰ء میں تاتار کے قائد اعظم اور ان کے مذہبی اور سیاسی رہنما شیخ عبد الحئی قربان علی نے جاپان سے صینی زبان میں ایک ماہانہ رسالہ "نینی یاپون مجری" نکالا، یہ نہایت بلند پایہ رسالہ ہے، اس میں زیادہ تر تاتار کے مہمات مسائل پر مضامین ہوتے ہیں، اس کے بعد علی الترتیب جاپان، مشرق اقصی کی تاتاری قوموں اور عالم اسلام کی خبریں ہوتی ہیں، اس رسالہ کی اشاعت ہزاروں کی تعداد میں ہوتی ہے، اسوقت یورپ سے دو تاتاری اخبار نکلتے ہیں "ینی ملی یول" اور "یاشس ترکستان" (ترکستان جدید) پہلا عیاض اسحاقی کی ادارت میں نکلتا ہے، اور دوسرا ختنقانی اوغلی کی،

ان اخبارات ورسائل کے علاوہ پولینڈ کے تاتاری النسل مسلمانوں کے ادیبوں کی ایک جماعت پولینڈ کے پایہ تخت وارسا سے سالانہ تاتاری جنتری نکالتی ہے، "م"

---

[1] یہ وہی ہیں جن کا پچھلے سال انتقال ہوا [2] یہ آجکل جاپان میں خدمت اسلام کر رہے ہیں،

مصر اور حبشہ

مندرجۂ بالا عنوان سے ہیبرٹ جرنل میں ڈاکٹر رینڈل ہیرس نے مصر اور حبشہ کے درمیان ان روابط و تعلقات پر روشنی ڈالی ہے، جو زمانۂ تاریخ سے پہلے اون دونوں میں قائم تھے، اوس کی تلخیص ذیل میں درج کیجاتی ہے،

ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ جب کہ حبشہ میں مصریوں کی نوآبادی تھی، یہاں وہ مصری بحری سیاح آباد تھے، جو سونا، ہاتھی دانت، تیل اور نادر پودوں کی تلاش میں آئے، چنانچہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے، کہ نیل ازرق اپنے منبع سے لیکر بحر قلزم تک مصریوں کے زیر نگیں تھا، نیل ازرق ہی دریائے نیل تھا جو اس زمانہ میں بھی مصر کی زرخیزی اور شادابی کا مخزن تھا،

بحر ہند میں جو جزیرہ سقوطرہ کے نام سے آباد ہے، اور جس کو یونانی ڈی اوس کورو ڈیس (Dioscorides.) کہتے تھے، اس کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ مصری نوآبادی تھی، جہاں اس کے باشندے مصری مذہب کے پیرو تھے، سقوطرہ کے معنی رع کا میدان ہے، رع آفتاب کے خدا کو کہتے ہیں (سقوطرہ اصل میں سقوطارع ہے)

ممفس کا ایک حصہ بھی اسی نام سے منسوب تھا، جس کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اس کی بنیاد بھی مذہبی حیثیت سے ڈالی گئی،

یہ امر واقعہ ہے کہ مصری بحری سیاح بحر احمر سے ہو کر بحر ہند میں سینکڑوں میل زمین کی طرف نکل جایا کرتے تھے، تو پھر یہ بھی یقینی ہے، کہ جنوبی عرب کے ساحل اور افریقہ کے اس ساحل سے بھی ہو کر گذرتے تھے، جسکو آج ہم سومالی لینڈ کہتے ہیں،

سومالی لینڈ مصریوں کی زبان میں پنٹ (Punt) کے نام سے موسوم تھا، اور یہ بھی روایتی

کے ساتھ کہا جاسکتا ہے، کہ پنٹ (Punt) مصری نوآبادی تھی، حبشہ کے نقشہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ایک علاقہ سوکورا (Socora) کے نام سے منسوب ہے، جو یا توسوکوترا (Socotra) ہے، یا سوکرا (Socra) ہے، سوک (Soc) مصری زبان میں سوکھٹ (Sokhet) کا صیغہ تذکیر ہے، جس کے معنی میدان کے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ مصری حبشہ میں ضرور آباد ہوئے،

اشانتی لینڈ (Ashanti-land) میں چند دریا ایسے ہیں جن سے موجودہ زمانہ میں بھی برطانوی باشندوں نے سونا نکالنے کی کوشش کی ہے، ان میں جو اہم دریا ہے اس کا نام انکوبرا (Ankobra) ہے، یہ مصری نام ہے، جس کے معنی زاغ کے دل کی زندگی ہے، یہ بعض متاخر فراعنہ کا لقب بھی ہوگیا تھا، انکوبر (Ankober) حبشہ کے قدیم پایۂ تخت یا اس کے کسی ایک بہت ہی مشہور شہر کا بھی نام تھا، حبشہ کی تاریخوں اور سیاحوں کے سیاحت ناموں کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انکوبر (Ankober) کے معنی بھی سنہرا شہر تھا، اگر یہ امر واقعہ ہے، تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا، کہ مصری یہاں ضرور آباد ہوئے۔

ایک تحقیق اور ہے، اہل حبشہ کے ایک کھانے کا نام ثف (Teff.) ہے، یہ روٹی پر سیاہ مرچ چھڑکا ہوا ہوتا ہے، اصل میں یہ مصری لفظ (Tehefa) ہے، جو غذا کی عام اصطلاح ہے، اگر مصریوں نے حبشہ میں اناج کو رواج دیا، تو وہ اصلی معنوں میں حبشہ کو متمدن بنانے والے تھے، کیونکہ تمدن کی ابتدا ہر جگہ اناج کے کھانے ہی سے ہوتی ہے، اس سے ایک بات اور پیدا ہوتی ہے، اس کھانے کے نام کے ابتدائی حروف (Teh) ہیں، جس کا تلفظ کرنا آسان نہیں، لیکن یہ خالص حبشہ کی زبان کا حرف ہے، اور حبشہ کی اس جھیل کے نام کا پہلا لفظ ہے، جس سے دریائے نیل ازرق نکلتا ہے، والڈمیر جس نے حبشہ میں دس سال تک تبلیغی کاموں میں زندگی بسر کی ہے، اس حرف کا نام (Tzana) لکھتا ہے، دوسرے لوگ اسکو (Tana) بھی لکھتے ہیں، بحر قلزم کی طرف دریائے نیل کے بازو پر یونانیوں نے

(Zoan) کے نام سے ایک نوآبادی قائم کی، اس کا متصل علاقہ عبرانی میں (Zoan) اور عربی میں ساان کہلاتا ہے، ان دونوں شہر کا نام (Tchan) تھا، اس کے ابتدائی حروف یونانی اور عبرانی حروف میں بدلتے رہے،

ایک بات اور، ایک زمانہ میں پورا بحر خزر (Caspian Sea) مصریوں کے زیر اقتدار تھا، اس علاقہ میں تیل کی کانیں جو ایک حصول دولت کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں، مصری نام سے منسوب تھیں، اس علاقہ یا اس کے پایہ سلطنت کا نام باکو ہے، جو تیل کے معنی میں مصری لفظ ہے، حبشہ میں بھی ایک علاقہ کا نام باکو (Bako) ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ بھی تیل کا ایک مرکز ہوگا، جہاں اگر مصری تیل نکالا کرتے ہوں گے، یہاں اب بھی تیل پایا جاتا ہے، اور اگر حکومت تیل نکالنے کے لئے کوئی باضابطہ کام شروع کرے، تو زمین کی سطح سے قریب ہی تیل برآمد ہو سکتا ہے، اگر مذکورہ بالا نام کی توجیہ صحیح ہے، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب سے بہت ہی پہلے مصریوں نے حبشہ میں کان کنی کا کام اسی طرح شروع کیا تھا جس طرح انھوں نے بحر خزر کے علاقہ میں کیا،

سطور بالا سے حبشہ پر مصریوں کے اثرات عیاں ہیں، ان روایات کی موجودگی میں موجودہ مصری حکومت کو حبشہ سے متعلق کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے، اس کا بتانا ہمارا کام نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ ایک زمانہ میں مصر حبشہ کے مستقبل سے متعلق گہری دلچسپی لیا کرتا تھا، "ص ع"

انقلاب الامم

ڈاکٹر لیبان کی مشہور کتاب قوموں کی ترقی و تنزل کے قوانین نفسی کا خلاصہ جسکو پڑھکر یہ معلوم ہو سکتا ہے، کہ دنیا میں قومیں کیونکر بنتی اور بگڑتی ہیں، طبع دوم قیمت ۸؍ ضخامت ۱۶۲ صفحے،

"منیجر"

سلطنت عثمانیہ کی بعض دستاویزات

ٹرکش ہسٹوریکل کمیشن نے حال میں سلطنت عثمانیہ کی قدیم سرکاری دستاویزات دو جلدوں میں شائع کی ہیں، ایک جلد میں وہ دستاویزات ہیں، جو گیارھویں صدی ہجری کے استنبول کے حالات اور معاشرت سے متعلق ہیں، اور دوسری جلد میں وہ جنکا تعلق تیرھویں صدی ہجری سے ہے، پہلی جلد میں ۱۵۹۲ء سے ۱۶۸۹ء تک کی دستاویزات ہیں، اور دوسری میں ۱۷۸۶ء سے ۱۸۲۹ء تک کی، ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان عہدوں میں استنبول کی معاشرتی، اقتصادی اور صنعتی زندگی کا کیا حال تھا، مثلاً پہلی جلد کی دستاویز نمبر ۲۹ سے معلوم ہوتا ہے، کہ غلطہ کے مسلمانوں نے ایک عرضداشت باب عالی میں اس مضمون کی بھیجی تھی، کہ وہاں کے عیسائی اپنے گھروں میں علانیہ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے ہاتھ شراب فروخت کرتے ہیں، لوگ اُن کے گھروں پر مجمع ہوکر شراب پیتے ہیں، اور بہت شور و غل مچاتے ہیں، جس سے مسجد کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہے، اس بنا پر استدعا کی گئی تھی، کہ شراب کا علانیہ فروخت کرنا ممنوع قرار دیا جائے، چنانچہ یہ درخواست منظور کر لی گئی،

دستاویزات نمبر ۵۲ و ۵۳ میں غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کا ذکر ہے، اور دکھایا گیا ہے، کہ اس معاملہ میں کسقدر بے عنوانی پھیلی ہوئی ہے، لہذا عیسائیوں اور یہودیوں، اور قزلباشوں کو استنبول میں اس کاروبار کی قطعی طور پر ممانعت کردی گئی،

دوسری جلد کی دستاویز نمبر ۴ میں استنبول کی عورتوں کے لباس کا ذکر ہے، اُس زمانہ میں عورتیں

دستے باریک کپڑے کا فراجہ استعمال کرتی تھیں، کہ اندر کا لباس نظر آتا تھا، فراجہ ایک قسم کی بالائی پوشش تھی جو اور سب کپڑوں کے اوپر پہنی جاتی تھی، اس دستاویز میں یہ حکم درج ہے کہ اگر اب سے کوئی درزی یا لباس فروش ایسے باریک کپڑے کا فراجہ بنانے کی جرأت کرے گا، جس سے عورتوں کا اندرونی لباس نظر آئے، تو اُسے اوسکی دوکان کے سامنے پھانسی دیدی جائے گی"

دستاویز نمبر ۹ میں سونے اور چاندی کی چیزوں کے متعلق احکام ہیں، جو محل سلطانی اور دوسرے عہدہ داروں کے محلوں میں استعمال ہوتی تھیں، لکھا ہے کہ "باوجودیکہ ازروے شریعت سونے چاندی کا استعمال صرف صرف تلواروں، اور عورتوں کے زیورات میں جائز ہے، اور باقی ہر طرح حرام ہے، تاہم مختلف قسم کے برتن سونے چاندی کے بنائے جاتے ہیں، اور اس سے ٹکسال میں سکوں کے لئے سونے چاندی کی بہت کمی واقع ہورہی ہے خصوصًا جنگ کے اوقات میں جب کہ سونے چاندی کے سکوں کی فراوانی بہت اہم ہوتی ہے، لہذا حکم دیا جاتا ہے کہ (ایک قلیل مقدار کے علاوہ) محل سلطانی کے تمام طلائی اور نقرئی ظروف شاہی ٹکسال کے حوالہ کردئیے جائیں، اور تیس روز کے اندر وزیروں اور دوسرے عہدہ داروں کے محل کے بھی سونے چاندی کے تمام برتن ٹکسال میں بھیج دے جائیں، جو کوئی بھی اس حکم کی خلاف ورزی کرے، اس پر اللہ اور اس کے رسول کی لعنت ہو"

ایران میں تعلیمی ترقی

ایران کی وزارت تعلیم نے جو سالانہ رپوٹ بابت ۳۷-۱۹۳۶ء شائع کی ہے، اس سے وہاں کی تعلیمی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے، اعداد و شمار حسب ذیل ہیں،

۱- جدید اسکیم کے مطابق دارالسلطنت میں ابتدائی مدارس میں (۴۰) درجوں کا اضافہ کیا گیا (۱) نئے ابتدائی مدارس (۹) جدید ثانوی مدارس کے درجے، (۱) بہت چھوٹے بچوں کا مدرسہ، اور (۵) مخصوص موسیقی کے درجے کھولے گئے،

۲۔ صوبوں میں ابتدائی مدارس میں (۲۷۰) درجوں کا اضافہ کیا گیا، (۸۱۱) مدرسے چھوٹے بچوں کیلئے جدید طرز تعلیم کے کھولے گئے، ثانوی مدرسوں میں (۴۳) جدید اور اونچے درجوں کا اضافہ کیا گیا، (۵) ابتدائی نارمل اسکول، (۲) چھوٹے بچوں کے مخصوص مدرسے، (۸) محل، اور (۲) کتب خانے قائم کئے گئے،

۳۔ بالغوں کی تعلیم کے لئے طہران میں (۹۱) اور صوبوں میں (۶۵۹) درجے کھولے گئے،

۴۔ ۳۵-۱۹۳۴ء میں تمام ملک میں اتنے مدرسے قائم ہوئے:۔ لڑکوں کے لئے ابتدائی مدارس (۶۹۰) لڑکیوں کے لئے (۱۴۳) لڑکوں کے لئے ثانوی مدارس (۴۶)، لڑکیوں کے لئے (۱۸)

۵۔ ۳۵-۱۹۳۴ء میں داخلہ کی تعداد:۔ ابتدائی مدارس میں (۸۵۲۱۵) لڑکے اور (۴۳۳۲۴) لڑکیاں ثانوی مدارس میں (۶۷۷۰) لڑکے، اور (۱۰۰۱) لڑکیاں،

بلند پروازی کا اثر دماغ پر

فضائے آسمانی میں جسقدر بلندی پر جائے، آکسیجن کی مقدار کم ہوتی جائے گی، حال میں یہ تجربہ کیا گیا ہے، کہ اس کمی کا اثر دماغ پر کیا پڑتا ہے، معمولوں کو ریاضی کے چند سوالات دیدیئے گئے تھے، سولہ ہزار فٹ سے اوپر جانے کے بعد ان کا دماغ سست ہونے لگا، اور وہ اُن سوالات کو پوری طرح حل نہ کرسکے، پھر جب ٹیوب کے ذریعہ سے آکسیجن کی کافی مقدار ان کو بہم پہونچائی گئی تو انکی دماغی قوت از سرنو عود کرآئی اور وہ سوالات انھوں نے آسانی سے حل کرلئے،

جامعہ ازہر میں انگریزی تعلیم

ازہر میں ایک نیا قانون نافذ ہونے والا ہے، جس کی رو سے کلیہ اصول الدین واقع شبرا میں غیر ملکی زبانوں کی تعلیم داخلِ نصاب کردی جائے گی، کیونکہ اس کالج کے فارغ التحصیل طلبہ تبلیغ کا کام کرتے

ہیں، اور اُن کو مختلف زبانوں سے واقفیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ شیخ الازہر نے یہ فیصلہ کر لیا ہے، کہ چونکہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں تمام اسلامی ممالک میں استعمال ہوتی ہیں، اسلئے اس کالج میں ان دونوں زبانوں کی تعلیم جاری کر دی جائے،

ایک عجیب گھڑی

کارخانوں اور دفتروں کے بعض ملازمین جب کبھی اپنے کام پر دیر کرکے پہونچتے ہیں، تو وہ کبھی کبھی اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دفتر کی گھڑی کی سوئی پیچھے ہٹا کر اپنا آنا صحیح وقت پر درج کرلیں، ایسے لوگوں کی گرفت کے لئے ایک عجیب وغریب گھڑی ایجاد کی گئی ہے، جو امریکہ میں رائج بھی ہوگئی ہے، یہ گھڑی ایک چھوٹے سے بکس کے اندر بند رہتی ہے، بٹن دبانے سے فوراً دن، تاریخ، گھنٹہ، اور منٹ کاغذ کی ایک چٹ پر جو مشین کے اندر لگی ہوئی ہے، درج ہوجاتا ہے، اور یہ چٹ خود بخود سامنے سے ہٹ کر اندر کی طرف چلی جاتی ہے، اس کے بعد اس چٹ کا ایک سادہ حصّہ بکس کے سوراخ کے سامنے آجاتا ہے، اسی حصّہ پر ملازم یا مزدور اپنے دستخط کر دیتا ہے،

تقریر کی اصلاح

امریکہ کی نارتھ وسٹرن یونیورسٹی میں ایک شعبہ تقریر کی اصلاح کا کھولا گیا ہے، طلبہ اپنی تقریر اور گفتگو کو فونوگراف کی پلیٹوں میں بھر کر اس کے نقائص کا تجزیہ اور اصلاح کرتے ہیں، یہ طریق اصلاح کامیاب ثابت ہورہا ہے،

"ع ن"

ادبیات

جذبِ اثر

از جناب نواب جعفر علی خانصاحب اثر لکھنوی

پی کے آپے میں رہے کوئی یہ مقدور نہین
مئے منصور ہے، افشردۂ انگور نہین

گلۂ دوست! نہیں اے دلِ رنجور نہین
دردمندانِ محبت میں یہ دستور نہین

جرم ٹھہرا ہے ترے عہد میں اقرارِ وفا
نام مٹ جائے محبت کا تو کچھ دور نہین

ہائے وہ آنکھ ٹپکنے لگی حسرت جس سے
ہائے وہ دل کہ جسے ضبط کا مقدور نہین

آشنائے غمِ الفت نہ کسی کو پایا،
نرگستاں ہے یہاں دیدۂ پرنور نہین

بدگماں سے کوئی اتنا نہیں کہنے والا
عشق خوددار ہے خودسر نہیں مغرور نہین

لٹ رہا ہے چمن اور آہ نہیں کر سکتے
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی مجبور نہین

جس طرح شب سے عیاں نورِ سحر ہوتا ہے،
بختِ خوابیدہ بھی جاگ اٹھے تو کچھ دور نہین

ذرے ذرے سے یہ آہنگِ حقیقت ہے بلند
خود فروشوں کے لئے رایتِ منصور نہین

آہ کے ساتھ گئی لذتِ دردِ جگری،
حسرت اے دل کہ تمنا کوئی مشکور نہین

دعوی ظرف جنھیں ہے کوئی ان سے کہدے
ہمکو اندازۂ سرمستیٔ منصور نہین

یہ سمجھ لے کہ ہوا درخورِ بزمِ ساقی
شب کا میخوار اگر صبح کو مخمور نہین

دل میں آراستہ کر انجمنِ شوق اثر
پئے آغوشِ نظر جلوۂ مستور نہین

بیانِ حقیقت

از حکیم الشعراء جناب امجد حیدر آبادی

باغباں کی منت سے آپ کو رہا پایا — جس نے غنچۂ دل کو باغ دلکشا پایا،

تیرے وصل کی خواہش اک غلط نمائش ہو — اپنے آپ کو میں نے تجھ سے کب جدا پایا،

آنکھ بند ہونے پر دید کی تمنا ہے، — آنکھ رکھ کے کیا دیکھا زندگی میں کیا پایا

ناامیدی و امید ساتھ ساتھ چلتی ہیں — بارہا اُسے کھویا اور بارہا پایا،

سانس جسکو کہتے ہیں ایک پھانس ہر دم ہے — زندگی کے دھوکے میں موت کا مزا پایا،

علم ایک نقطہ ہے، اور کچھ نہیں لیکن — نقطۂ نظر اک کا، ایک سے جدا پایا،

ہم تو صاف کہدیں گے مل گیا خدا اسکو — جس نے اس خدائی میں بندۂ خدا پایا،

حیلہ ہاتھ آتا ہے، خوب پائے بوسی کا — رکھدیا قدم پر سر، جب انھیں خفا پایا،

جستجو ہی اے امجد رازِ کامیابی ہے،

جس نے جا بجا ڈھونڈا، اُسنے جا بجا پایا،

فغانِ روشن

از

جناب روشن صدیقی

پردۂ رازِ غم عشق اوٹھایا نہ گیا، — بے کسی سے بھی مرا حال سنایا نہ گیا،

کر دیا دفترِ ہستی تو پریشاں دل نے — مگر اک خوابِ پریشاں کو بھلایا نہ گیا،

کبھی اے جنبشِ دامانِ تصور ! مجھسے — شمعِ احساسِ جدائی کو بجھایا نہ گیا،

سرحدِ عشق سے آگے نہ بڑھی وحشتِ عشق
حُسن آزاد کو دیوانہ بنایا نہ گیا،

کھو گیا ایک ہی سجدے میں مرا ذوقِ نیاز
جھک گیا سر ترے در پر تو اٹھایا نہ گیا

عشق اک داغ سہی دامنِ ہستی پہ، مگر
دونوں عالم سے بھی یہ داغ مٹایا نہ گیا

کر دیا دل کو تو مدہوشِ محبت لیکن
اُن نگاہوں سے بھی پھر ہوش میں آیا نہ گیا

کس کس عنواں سے بھلانا انھیں چاہا تھا روشؔن
کسی عنواں سے مگر اُن کو بھلایا نہ گیا،

رنگِ تغزل

از

جناب سید عبد العلی صاحب بحرؔ الہ آبادی

جب تجھ سے حسیں کو پائیں گے ہم
پھولے پھر کیوں سمائیں گے ہم،

رنجش میں بھی لطف پائیں گے ہم
روٹھے گا کوئی منائیں گے ہم،

آجا تیری دلبری کے صدقے
سب ناز ترے اٹھائیں گے ہم،

پیارے ہو حسین و خوبرو ہو
دنیا سے تمھیں چھپائیں گے ہم،

تیری ہی تلاش میں کسی دن
اپنے کو بھی ڈھونڈ لائیں گے ہم،

آوارہ مزاج رنگ و بو ہیں
پھولوں کی ہنسی اڑائیں گے ہم،

تو یاد رکھ اے ستانے والے
اک روز تجھے ستائیں گے ہم،

اس عہدِ شباب میں بھی اے بحرؔ
کیا عیش و سکوں نہ پائیں گے ہم،

مطبوعات جدیدہ

الازہار المربوعہ فی ردّ الآثار المتبوعہ | مؤلفہ مولینا ابو المآثر حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی صدر مدرس مفتاح العلوم، مئو ضلع اعظم گڈھ، ص ۱۵۲، پتہ:- حافظ محمد صادق محلہ بہادر شہید متصل پیلی کوٹھی، بنارس،

بعض اہل حدیث اور فقہائے مذاہب میں ایک مدت سے یہ بحث چلی آرہی ہے، کہ تین طلاقیں جو ایک ساتھ دی جائیں، وہ ایک کے حکم میں ہیں، اور اسلئے رجعی ہیں، یا تین ہیں، اور ان سے طلاق بائنہ پڑتی ہے جس میں رجوع نہیں، پہلا مسلک اہلحدیث کا ہے، اور دوسرا عام فقہائے مذاہب کا، اہل حدیث کے مسلک کے سب سے پرجوش حامی امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم ہیں، ہندوستان میں بھی حضرات اہل حدیث یہی مذہب رکھتے ہیں، اور ہندوستان اور مصر میں اس پر سرگرم بحثیں ہوئی ہیں، آج کل مئو اور بنارس کے بعض علماء نے ہر دو طرف سے اس پر پرزور تحریریں لکھی ہیں، حنفی مصنف نے پہلے اس مسئلہ پر ایک مختصر رسالہ الاعلام المرفوعہ کے نام سے لکھا تھا، اسکے جواب میں ایک اہلحدیث عالم نے الآثار المتبوعہ لکھا، اب پھر حنفی فاضل مولینا حبیب الرحمٰن صاحب نے الازہار المربوعہ لکھکر جواب الجواب دیا ہے، اور فریق کے ایک ایک دعوی اور دلیل پر بہ تفصیل ردّ و قدح کی ہے، اور اس ضمن میں احادیث و آثار کی بڑی چھان بین کی ہے، مسئلہ کا فیصلہ تو فریقین جانیں، لیکن جو بات یہاں کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ اس بحث میں ہمارے ہندی دوست مصر کے مشہور حنفی مصری عالم شیخ نجیب سابق شیخ ازہر سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جنھوں نے اسی بحث پر ایک رسالہ الابحاث فی التطلیقات الثلاث لکھا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ عقلیات کے علاوہ نقلیات میں بھی ہندوستان

کا علم بحمد اللہ مصر سے زیادہ ہے، احناف میں جو لوگ اس ضروری مسئلہ سے آگاہ ہونا چاہیں، ان کے لئے اس رسالہ کا پڑھنا نہایت ضروری ہے، ابھی اس رسالہ کا یہ پہلا حصہ شائع ہوا ہے، دوسرا حصہ ابھی قدردانوں کی توجہ کا منتظر ہے، حضرات اہل حدیث کو بھی اس رسالہ کو پڑھنا چاہئے، تاکہ فریق مخالف کے پورے دلائل پڑھ کر مطلع ہوسکیں۔ "س"

تفسیر سورۂ کوثر، مولفہ مولینا حمید الدین فراہیؒ مترجمہ مولینا امین احسن اصلاحی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت نہایت نفیس، قیمت: ۸ ر پتہ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ،

مولینا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے کلام اللہ کی تفسیر و تاویل میں جو ملکۂ راسخہ اور حقائق و معارف قرآنی کے فہم و تدبر میں جو شرح صدر عطا فرمایا تھا، ان کے دوسرے تفسیری رسائل کی طرح یہ رسالہ بھی ان کی ان تمام تفسیری خصوصیات کا حامل ہے، سورۂ کوثر کی تفسیر میں عموماً مفسرین "کوثر" سے مراد جنت کی نہر یا خیر کثیر "شَانِئَكَ" سے مراد متعین شخص اور "اَبْتَر" سے مراد مقطوع النسل لیتے ہیں لیکن مولینا کے نزدیک یہ سورہ فتح مکہ کی بشارت عظمیٰ اور خانہ کعبہ کے جلال و عظمت کی تصویر ہے، اس روشنی میں ان کے نزدیک "کوثر" سے مراد خانہ کعبہ "شَانِئَكَ" سے مراد قریش، اور "اَبْتَر" سے مراد مخذول و مقہور ہے، اسکی تائید میں انھوں نے کلام عرب، حدیث و آثار، محل نزول، اور ماقبل و مابعد کی سورتوں کے ربط سے مذہبی اور عقلی دلائل پیش کئے ہیں جن کی دلنشینی کا اندازہ صرف ان کے دیکھنے سے ہو سکتا ہے، پھر اس تفسیر کے سلسلہ میں انھوں نے نماز اور قربانی کی حقیقت، دونوں کی باہمی مناسبت، ماقبل و مابعد کی سورتوں سے اس کے تعلق، تمام امتوں پر امت مسلمہ کی فضیلت سورہ کے محل نزول، فتح مکہ کی بشارت، امت مسلمہ کے لئے رضوان الٰہی کی بشارت، نبوت محمدی کی دائمی دلیل، حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ، اور اوسکی تصدیق وغیرہ بڑے عالمانہ اور دقیق مباحث پیدا کئے ہیں، اور ان میں جو جو نکتہ آفرینیاں، اور دقیقہ سنجیاں کی ہیں، ان کا اندازہ پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے، کہ بے اختیار ذوق سلیم وجد کرنے لگتا ہے، یہ تفسیر کلام الٰہی کے شائقین کے لئے عموماً اور مولینا کے بادۂ حقیقت کے ذوق شناسوں

کے لئے خصوصاً ایک نعمت ہے، لائق مترجم کے انشاپرداز قلم نے لطف بیان کو پوری طرح قائم رکھا ہے، اور مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے، کہ لوگ عام طور سے ان بلند مباحث کو سمجھ سکیں،

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

خالدہ ادیب خانم، مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب،

تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۸۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت:- عار، پتہ، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

۱۹۳۵ء میں مشہور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم نے جامعہ ملیہ میں "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" کے موضوع پر آٹھ خطبے دیئے تھے، یہ کتاب انہی خطبات کا ترجمہ ہے، ان میں عثمانی سلطنت کے دور تاسیس سے لیکر قیام جمہوریہ تک ترکون کی تاریخ کے تمام پہلوؤں پر نہایت عالمانہ تبصرہ ہے، پوری کتاب فاضل خطیبہ کی دقت نظر اور سیاسی بصیرت کا آئینہ ہے، ان خطبات کی ایک حیثیت ترکی قوم اور عثمانی سلطنت کی تاریخ ہے جس میں اس کے سیاسی انقلابات و حوادث، تمدنی اور ادبی ارتقاء، مذہبی تغیرات اور اس کے اثرات و نتائج کے حالات ہیں، دوسری حیثیت مشرق و مغرب کی کشمکش ان کے سیاسی اور تمدنی تعلقات اور اسکے ذہنی اور مادی نتائج پر تبصرہ کی ہے، جس سے ہندوستان کے موجودہ دور انقلاب میں بہت کچھ سبق مل سکتا ہے، کہ یہ اس قوم کی داستان ہے جو ابھی تھوڑے ہی دنون پہلے ان مراحل سے گذر چکی ہے، جو ہندوستان کو درپیش ہیں، اگرچہ غلام اور آزاد قوم کی حیثیت سے دونوں کے حالات میں بہت فرق ہے، پھر بھی بہت کچھ اشتراک پایا جاتا ہے، ضمناً ان خطبات میں سیاست، مذہب اور تہذیب و معاشرت وغیرہ کے بہت سے ایسے مسائل آگئے ہیں، جو ہندوستانیوں کے سامنے بھی ہیں، ممکن ہے یہ تمام خیالات بجنسہ قابل قبول نہ ہون، لیکن ان سے فائدہ ضرور اٹھایا جاسکتا ہے، سبب یہ ہے کہ خانم موصوفہ نے مغربی تعلیم پائی ہے، اور مغربی تمدن کے ماحول میں زندگی بسر کی ہے، اسلئے وہ اسی نقطۂ نظر سے ہر چیز کو دیکھتی ہیں، اسلامی مسائل کی جو تشریح انھون نے کی ہے، اس سے ان مسائل سے انکا بیگانہ پن بالکل نمایاں ہے، ترجمہ کی خوبی کے لئے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا نام کافی ہے،

کتابچہ نمبر ا، از آقا سید محمد علی سابق پروفیسر نظام کالج، تقطیع اوسط، ضخامت ۴۲ صفحات،
کاغذ بہتر، کتابت و طباعت اوسط، قیمت عدر، پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن،

یہ کتابچہ آقا سید محمد علی مؤلف فرہنگ نظام کے چھ ریڈیو لکچروں کا مجموعہ ہے، پہلے چار لکچروں میں فارسی شاعری کے آغاز سے عہد سامانی تک کی چارسو سالہ تاریخ پر تبصرہ ہے، کہ قبل از اسلام کی پہلوی شاعری کیسی تھی، پھر اسلامی دور میں اس نے عربی شاعری کے اثر سے کیا قالب اختیار کیا، کن کن شعراء نے اسے سنوارا، کن کن درباروں نے اسکی سرپرستی کی، اور رفتہ رفتہ اسنے کتنی وسعت حاصل کی، اس تبصرہ میں متعدد فارسی شعراء اور قدرداں فرمانرواؤں وغیرہ کا تذکرہ آگیا ہے، شاہنامہ پر فاضل خطیب نے جو بحث کی ہے، اس کے بعض مقدمات اگرچہ قیاسی ہیں لیکن لائق غور ہیں، اگر ان لکچروں کو ایران کے قاچاری اور ہندوستان کے مغلی عہد تک وسعت دیدیجاتی، تو فارسی شاعری کی اجمالی تاریخ پر مختصر کتاب ہوجاتی، چھٹے لکچر میں ہندوستانی زبان کے رشتے یعنی اجزا بیان کئے گئے ہیں، اگرچہ اردو ہندی اتحاد کی یہ کوشش مبارک ہے، لیکن اس کیلئے عربی اور آریائی الفاظ میں لفظی او معنوی اشتراک دکھانیکی سعی علماً صحیح ہےاور نہ عملاً مفید، چھٹا لکچر غالب کی فارسی شاعری پر ہے،

سید البشر مرتبہ جناب ابوسعید عبدالرحمن صاحب فریدکوٹی، تقطیع اوسط ضخامت ۸۰ صفحات،
کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت ۲ر کے ٹکٹ، پتہ، ابوسعید عبدالرحمن صاحب فریدکوٹ اسٹیٹ پنجاب

اس رسالہ میں فاضل مؤلف نے بائبل سے نبی آخر الزمان صلعم کے ظہور کی پچاس پیشینگوئیاں جمع کی ہیں، ان میں سے کچھ نہایت صاف و صریح ہیں، اور کچھ مجمل، جن میں آنے والے نبی کے محض علامات اور نشانیان اور کچھ حالات بتائے گئے ہیں، لائق مؤلف نے دلائل اور شواہد سے ثابت کیا ہے، کہ ان کا مصداق ذات پاک مصطفوی کے علاوہ اور کوئی نبی ہو ہی نہیں سکتا،

مرثیہ اندلس (جلد اول) از جناب عبد الحفیظ صاحب نعیمی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۵۶ صفحات کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت باختلاف جلد عہ، صہ اور طلبہ کے لئے بھی رعایت،

پتہ:- عبد الغفار خاں محلہ قردلان چوپلہ روڈ بریلی،

یہ مرثیہ درحقیقت اندلس کے اسلامی فتوحات اور یہاں کی اسلامی حکومت کے عروج وزوال کی تاریخ ہے، چنانچہ اس حصہ میں اندلس کی فتح اور عبد الرحمٰن اول کے عہد کے حالات ہیں، لیکن اس کے نام سے شبہ ہوتا ہے، کہ اندلس کی اسلامی حکومت کے خاتمہ کے حالات ہیں اسلئے آخری جلد کا نام مرثیہ اندلس رکھنا چاہئے تھا، اس کتاب کا ماخذ زیادہ تر اخبار الاندلس ہے، شاعری کی حیثیت سے اوسط درجہ کی کتاب ہے، بعض بعض حصے نہایت پرجوش اور شاعری کے معیار کے مطابق ہیں، لیکن ہر جگہ یکسانی نہیں ہے، بعض بعض حصے محض منظوم واقعہ بن گئے ہیں، کہیں کہیں اشخاص اور مقامات کے نام غلط یا مسخ ہوگئے ہیں، مجموعی حیثیت سے کتاب لائق قدر ہے، کہ اس سے ہندوستانی میں اندلس کی ایک منظوم تاریخ ہو جائیگی، اور اس سے غزل کے علاوہ دوسرے مفید منظومات کا شوق شاعروں میں پیدا ہوگا،

جامع النحو، مولفہ مولوی حکیم محمد احمد صاحب معلم مدرستہ الاصلاح سرائے میر تقطیع اوسط ضخامت .. صفحات کاغذ کتابت وطباعت اوسط، قیمت ۸ر پتہ حکیم محمد احمد صاحب مدرستہ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ،

عربی صرف ونحو کی درسی مشکلات کو حل کرنے کیلئے ہندوستان میں عربی صرف ونحو پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، انہی میں یہ رسالہ بھی ہے، اسمیں مولوی محمد احمد صاحب معلم نے نحو کے قاعدوں کو آسان اور عام فہم انداز میں مرتب کردیا ہے، اس سے طلبہ کم سے کم مدت میں نحو سیکھ سکتے ہیں،

مصری افسانے، مترجمہ جناب مولوی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۲ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت اوسط، قیمت ۸ر پتہ مجتبائی پریس قاضی منزل میرٹھ،

مصر کے مشہور اہل قلم مصطفےٰ لطفی منفلوطی دور جدید کے ان لوگوں میں ہیں، جو اپنی قومی روایات کے تحفظ کیساتھ ترقی چاہتے ہیں، اس لئے ان کے بیشتر افسانے اصلاحی ہوتے ہیں، مصری افسانے ان کے پانچ سبق آموز افسانوں کا ترجمہ ہے، "دفرزر کا عاشق" "شہیدان محبت" "نقاب اٹھ جانے کے بعد" "عذاب" "شہزادہ اندلس" بعض بعض میں حسن وعشق کی بھی چاشنی ہے، ترجمہ نہایت شستہ ہے، بعض ترجموں میں دوسرے مترجمین سے توارد ہوگیا ہے، "م"

سوانح عمریاں

الفاروق: یعنی حضرت فاروق اعظمؓ کی ولادت اسلام، حکومت، مہمات کے فتوحات، طرز حکومت، عراق، شام، مصر، ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق اور مفصل حالات اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر نامہ، کتابت اعلیٰ چھپائی عمدہ، کاغذ دبیز، اسلامی تاریخ کی بہترین تصنیف مجلد، ضخامت ۱۲ مصفحے قیمت [illegible]

المامون: یعنی خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہد سلطنت کے حالات، کاغذ اور لکھائی چھپائی بہترین، ضخامت ۲۴۴ صفحے قیمت باختلاف کاغذ، عا، عیر

الغزالی: امام غزالی کی سوانح عمری، اور ان کا فلسفہ اور علم کلام، اخلاق اور تصوف میں ان کے مجددانہ کارنامے ضخامت ۱۲۰ صفحے، قیمت: عہ

سیرۃ النعمان: امام ابو حنیفہ کی سوانحعمری اور ان کے اجتہادات اور مسائل، فقہ حنفی کی تاریخ اور اسکی تدوین کے حالات، فقہ حنفی کی خصوصیات، علم حدیث، علم فقہ کی تاریخ اور اسلامی قانون پر تبصرہ، حجم ۴۴۱ صفحے قیمت: عہ

سوانح مولانا روم: اسلام کے مشہور صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانحعمری، فضائل و مناقب ان کے تصوف کے اسرار، علم کلام کے رموز اور مثنوی شریف پر سیر حاصل تبصرہ اور اس کے منتخب مضامین پر تبصرہ قیمت عہ حجم ۲۴۴ صفحے،

ابن رشد: مشہور اندلسی حکیم جو مسلمانوں میں اسطو کے فلسفہ کا بہترین شارح کہا جاتا ہے اور جس کی تصنیفات مدتوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں) کی سوانح اور اس کے فلسفہ پر تبصرہ، ضخامت [illegible] صفحے قیمت [illegible]

سیرت عائشہؓ: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات زندگی، اور ان کے مناقب و فضائل، اخلاق اور ان کے علمی کارنامے، اور ان کے اجتہادات، اور صنف نسوانی پر ان کے احسانات، اسلام کے متعلق نکتہ سنجیاں اور معترضین کے جوابات، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ ضخامت ۳۵۰ صفحے، قیمت: [illegible]

حیات امام مالکؒ: امام مالکؒ کی سوانح عمری، علم حدیث کی مختصر تاریخ، فقہ مدنی کی خصوصیت اور علم حدیث کی پہلی کتاب موطا امام مالک پر تبصرہ طبع دوم ضخامت ۱۰۶ صفحے، قیمت: عہ

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ: حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ اموی کے سوانح حیات اور ان کے مجددانہ کارنامے طبع دوم، قیمت: عہ، ضخامت ۱۹۰ صفحے،

خیام: خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ اور فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیات خیام پر مفصل مباحث اور آخر میں خیام کے چند عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ اور اس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام کے مباحث پر بہت ہی مفصل مکمل اور محققانہ یہ سب سے پہلی کتاب لکھی گئی ہے ضخامت ۴۲۰ صفحے، کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ، قیمت: غیر مجلد [illegible] مجلد [illegible]

نطشے: مشہور جرمن فلاسفر نطشے کی سوانحعمری اور اس کے افکار و خیالات اور تصنیف پر مبسوط تبصرہ ہے، حجم [illegible] صفحے

قیمت [illegible]

منیجر: دار المصنفین، اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۷ جون سنہ ۱۹۳۷ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڑھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان مجموعہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتداء میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے،

تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں لکھی گئی ہیں، پھر اُن معجزات کی تفصیل ہے جو بروایت صحیحہ ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ انہیں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے صحیح عقائد لکھے جائیں،

پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کی عبادات سے اُن کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باعتبار کاغذ حصہ اول [illegible] حصہ دوم [illegible] حصہ سوم [illegible]

[illegible]

[illegible] منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ

جلد ۳۹	ماہ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ جون ۱۹۳۷ء	عدد ۶

مضامین

۲۰ ۔ اپریل ۱۹۳۷ء کو کلکتہ سے ایسوشی ایٹڈ پریس نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتبخانہ مین ایک عجیب وغریب عربی کتاب کے واحد نسخہ کے وجود کی خبر دی ہے جس کا پتہ شمس العلماء ہدایت حسین صاحب نے لگایا ہے، اس کتاب کی صنعت یہ ہے کہ چند جدولون میں الفاظ لکھے ہوئے ہین، اگر ایک جدول کے الفاظ دائنے سے بائین پڑھیے تو ایک خاص علم کی کتاب ہوجائے گی اگر اوپر سے نیچے پڑھیے تو دوسرے فن کی کتاب ہوگی اگر ایک جدول کے الفاظ چھوڑ کر پڑھئے تو تیسرے فن کی کتاب ہوجائیگی، یہ بھی خبر ہے کہ فاضل موصوف کتاب کے اس یگانہ نسخہ پر کوئی تحقیقی مضمون کلکتہ مین پڑھین گے،

اس سلسلہ میں یہ جاننا دلچسپ ہوگا کہ اس کتاب کے قلمی نسخے جا بجا ملتے ہیں، ابھی اس کا ایک قلمی نسخہ اسلامیہ اسکول اٹاوہ مین دیکھا ہے، اس سے بھی بڑھکر یہ ہے کہ یہ پرانے زمانہ میں ہندوستان مین عنوان الشرف کے نام سے چھپ بھی چکی ہے، اور اس کا مطبوعہ نسخہ دیسنہ لائبریری (ضلع پٹنہ) مین موجود ہے،

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو میں "ہماری زبان کا نام" کے عنوان سے جو تقریر کی گئی تھی وہ اخباروں میں شائع ہوچکی ہے، اس تقریر میں دلائل کے ساتھ یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہندوستان کی اس عام اور مشترک زبان کا موزوں نام "ہندوستانی" ہے، جو اس زبان کے مختلف پرانے ناموں میں سے ایک مشہور نام ہے، جہاں تک اخباروں کی تحریروں اور اشخاص کی اطلاعون اور گفتگوون کا تعلق ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

اس تجویز کے ہمدردوں اور معاونوں کی خاصی کثرت ہے، یہ تقریر مستقل رسالہ کی صورت میں الگ بھی چھپ چکی ہے، جن صاحب کو ضرورت ہو وہ ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجکر دفتر دارالمصنفین سے منگوا سکتے ہیں،

ہندوستان میں بہار پہلا صوبہ ہے، جہاں ایک انگریز حاکم کی بد دماغی اور جہالت سے ہندوستانی رسم الخط عدالتوں سے برطرف ہو کر ہندی رسم الخط حکماً جاری کیا گیا تھا، اور تقریباً باون برس تک یک تخت ہندوستانی رسم الخط یہاں قانوناً ممنوع رہا، ہندوستانی زبان جاننے والے جنمیں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس سے سخت تکلیف مین مبتلا رہے، ان کو عدالت کے ہر حکم اور نوشتہ سے واقفیت کے لئے ایک ہندی داں کی تلاش ناگزیر ہوتی تھی، یہی حاکم جب بدل کر صوبہائے متحدہ میں گئے تو وہاں بھی انھوں نے اردو ہندی کے جھگڑے کا بیج بویا،

بہار کے ہندوستانی جاننے والے اور خاص طور سے مسلمان ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہے کہ یہ ممانعت کسی طرح دور ہو اور ان کو بھی اپنے رسم خط میں لکھنے کی اجازت مل جائے، آخر نصف صدی کے بعد چند سال ہوئے کہ بڑی کوششوں کے بعد صرف پٹنہ کمشنری کے لئے یہ اجازت حاصل ہو سکی، اب نئے آئین کے تحت مین اس صوبہ میں جو وزارت قائم ہوئی ہے اس نے پورے صوبہ میں نہ صرف ہندوستانی رسم خط کی اجازت دیدی ہے، بلکہ یہ لازمی کر دیا ہے کہ ہر عدالتی کاغذ مین ایک ہی عبارت دونوں رسم خط میں لکھی جایا کرے کہ تاکہ دونوں میں ایک جاننے والے بھی سرکاری حکم سے آسانی کے ساتھ باخبر ہو سکین، امید ہے کہ اس تجویز کو دوسرے صوبوں میں بھی قبول کیا جائے گا، تاکہ ہر خط کے جاننے والوں کو یکساں آرام پہنچے،

ہم لوگ ابھی تک اردو اور ہندی کے جھگڑوں میں پھنسے ہیں، اس سلسلہ میں پٹنہ ہائیکورٹ کا ایک فیصلہ ذکر کے قابل ہے، تاکہ دوسرے صوبوں میں بھی وہ نظیر کا کام دے، پٹنہ ہائیکورٹ نے چند سال ہوئے یہ فیصلہ

صادر کیا ہے کہ پٹنہ ہائیکورٹ کی زبان ہندوستانی ہے، اور ہندوستانی کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ وہ زبان جو عام طور سے یہاں بولی جاتی ہے، اور جو یہاں کی عدالتوں میں اب تک مروج ہے، یہ فیصلہ بالکل بجا اور درست ہے،

ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ہندوستانی زبان و ادب کے ایم اے کے درجے جب سے کھلے ہیں، انگریزی تعلیم یافتوں کو اپنی زبان سے جو بیگانگی تھی وہ نسبۃً کم ہو رہی ہے، اور اس زبان کے طالب علموں کی تعداد سال بسال بڑھ رہی ہے، ہم کو ایک یونیورسٹی کا حال معلوم ہے، جہاں پچھلے سال گیارہ طالب علم تھے، اور امسال چھبیس تھے، اور ان کی واقفیت کا معیار بھی ہر سال بڑھ رہا ہے،

لیکن یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ وہی شہر آگرہ، لکھنؤ، دہلی جو ہندوستانی زبان کے مرکز ہیں اس زبان کی اعلیٰ تعلیم و سند سے محروم ہیں، شیراز کے پیر دانا کا یہ شکوہ شاید ہمیں کے حسب حال ہو،

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

مقالات

خطبۂ صدارت

شعبۂ علوم وفنونِ اسلامی،

جو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر ۲۷ر مارچ ۳۶ء کو بمقام اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی میں پڑھا گیا،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قدرشناسانِ علم وفن!

ممنون ہوں کہ علماء اور اہلِ علم کی اس مجلس میں اس کرسی پر بٹھا کر آپ نے علم وفن کے ایک خدمت گذار کی عزت اور آبرو بڑھائی،

اسلامی علوم وفنون کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگا کر علم وہنر کے چند قیمتی موتیوں کو نکال کر قدر دانوں کے سامنے پیش کرنا میرے جیسے سست بازو کا کام نہیں، بہرحال مجھے آپ کے سامنے نذرانہ کیلئے کچھ پیش کرنا ہے، وہ درِ شہوار ہوں یا خزف ریزہ،

سب سے پہلے تو ہم کو اس خوشی کا اظہار کرنا ہے، کہ مدت کے بعد ہمکو اپنی بھولی ہوئی دولت یاد آئی ہے، ورنہ زمانہ کے انقلاب سے یورپ کے نئے علوم وفنون نے ہماری آنکھوں میں وہ خیرگی پیدا کر دی تھی، کہ ہمارا اپنا مطلعِ انوار ہماری نگاہوں سے چھپ گیا تھا، علم وفن کسی قوم کی ایسی وراثت نہیں، جو کبھی چھن نہ سکے، مختلف قوموں نے باری باری سے علم وفن کی خدمت کی ہے، اور جب ایک کی ہمت ہار گئی، تو دوسری باہمت قوم نے آگے بڑھکر اس فرض کو ادا کیا، اسی طرح دنیا کے آغاز سے آجتک یہ دولت بڑھتی ہی رہی ہے، گھٹی نہیں، اس نے خزانوں کے گھر بدلے ہیں، انکی ہوئی مقدار کبھی ہاتھ سے نہیں گنوائی ہے،

سب جانتے ہیں کہ مذہبی علوم کے علاوہ دوسرے ادبی اور عقلی علوم مسلمانوں نے دوسری قوموں سے حاصل کئے، اور اپنے عروج کے دور میں ان کو بڑھا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا، پھر زمانہ نے پلٹا کھایا، اور اندلس اور سسلی کی راہ سے علم و فن کے مسافر نے یورپ کے ظلمتکدہ میں قدم رکھا، اور اپنی تیز مشعل سے ہر جگہ کو درخشاں کر گیا،

مسلمانوں کو یہ فخر ہے، کہ انھوں نے اپنے دینی علوم کی جس طرح ترتیب و تدوین کی، کلیات بنائے اصول وضع کئے، جزئیات اور فروع کی تفصیل کی اور انہیں سے ہر صنف پر تصنیفات کا ڈھیر جس طرح لگا دیا وہ مذہبی قوموں کی تاریخ میں بے نظیر کارنامہ ہے، اسلام کے معلم اور ہادی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پیرووں کے ہاتھوں میں قرآن نام ایک کتاب دی تھی، اور یہی اسلام کے کتبخانے کی سب سے پہلی کتاب ہے، یہ کتاب تبیاناً لکل شیئ تھی، اس تبیان کی تفصیل ہمارے وہ سارے دینی علوم ہیں، جو اب ہمارے کتبخانوں کی زینت اور ہمارے مذہبی مدرسوں کے نصاب درس ہیں،

غور کرنے والوں کو یہ نظر آئے گا کہ ہر قوم کے سامنے ایک مرکزی تخیل رہتا ہے، جو اس کے ہر علم و فن اور شعر و ادب کا مرکز ہوتا ہے، مسلمان قوموں کا یہ تخیل ان کا قرآن ہے، انھوں نے جس علم و فن کی خدمت کی اس کی تحریک کا جذبۂ شوق دراصل قرآن پاک ہی کے کسی جز کی خدمت کا ذوق اور جوش تھا، قرآن پاک کی آیتوں کی تشریح کی گئی تو علم تفسیر بن گیا، حامل قرآن کی قولی اور عملی تشریحوں کو جمع کیا گیا، تو علم حدیث پیدا ہوگیا، قرآن کے اعتقادی تعلیمات کی علمی تشریح کی گئی، اور اس پر عقلی دلائل، اور رد و قدح یکجا کئے گئے، تو علم کلام نے جنم لیا، قرآن کے قانونی مسائل پر جو بحثیں کی گئیں، انھوں نے علم فقہ کا جامہ پہن لیا، قرآن پاک کے لفظوں سے کسی مسئلہ کے سمجھنے کے جو اصول بنائے گئے، ان کا نام اصول فقہ ہوگیا، رسول کی تشریحات پر روایتوں اور سندوں کی حیثیت سے جو گفتگو شروع ہوئی، وہ اصول حدیث کا ماخذ قرار پائی، اور ان کے راویوں کی تاریخی اور اخلاقی گفت و شنید نے اسماء الرجال کا دفتر تیار کر دیا، قرآن پاک کے لفظوں کے صحیح مخرج، طرز ادا، وقف و سکون نے تجوید و قرأت کا فن پیدا کیا، ان لفظوں کی صحیح

شکلوں کے جاننے پہچاننے اور ان کے صحیح اعرابوں کو معلوم کرنے سے صرف و نحو وجود میں آئی، قرآن کے لفظوں
لغتوں اور محاوروں کی دریافت کیلئے علم ادب اور علم لغت کی ترتیب ہوئی، غرض اسلامی علوم و فنون کا ہر خط
دراصل اسی نقطہ سے شروع ہوا، اور کبھی کبھی آگے بڑھکر ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنے مرکز سے دور نکل گیا، یا مرکز
سے ہٹ گیا ہے،

دخیل علوم، یعنی علم و فن کا وہ سرمایہ جو دوسری قوموں سے منتقل ہو کر مسلمانوں کو سپرد ہوا، اگلے مسلمانوں
نے ان کو بھی اپنے اسی مرکز سے ملا کر دنیا کو دکھایا، مسلمانوں میں دخیل علوم میں سے سب سے پہلے طب کا فن آیا،
طب سے کیمیا کی طرف توجہ ہوئی، چنانچہ عقلی علوم میں سے بنی امیہ کے دور میں یہی دو فن مسلمانوں میں داخل
ہوئے، امیر معاویہ کے زمانہ میں ابن اثال نے یونانی سے طب کی بعض کتابوں کے ترجمے کئے، مروان کے
زمانہ میں ماسرجویہ یہودی نے سریانی سے ایک طبی سفینہ (کناش) کا ترجمہ عربی میں کیا، اور حضرت عمر بن
عبد العزیز نے اسکو اپنے زمانہ میں شائع کیا، اور خالد بن ولید بن معاویہ نے کیمیا اور طب کو عربی میں فروغ
دیا، اور ہشام کے کاتب ابو جبلہ سالم نے ارسطو کی کتابوں کو عربی قالب میں ڈھالا،

عباسیوں کے زمانہ میں سب سے پہلے ایرانیوں کے اثر سے نجوم کے فن نے منصور عباسی کے دربار میں
جگہ پائی، نجوم نے ریاضیات اور فلکیات کی طرف رُخ پھیرا، اور مامون کے عہد میں جہمیہ کی تحریک نے فلسفہ
کی داغ بیل ڈالی، اور سلطنت کے دور دراز حصوں میں کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ قطع مسافت کے
خیال نے اسی زمانے میں مختصر اور اچھے راستوں کی دریافت کا شوق پیدا کیا، جس نے بعد کو جغرافیہ کا ہیولیٰ تیار
کرلیا، غرض اسلام میں عقلی علوم و فنون نے اسی طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں میں اشاعت پائی، اور تیسری صدی کے
وسط سے مسلمانوں میں ان فنون کے اہل کمال پیدا ہونے لگے، عام اندازہ یہ ہے، کہ مسلمانوں میں اہل تحقیق
تیسری صدی ہجری سے لیکر ساتویں صدی تک گذرے ہیں، یعنی اسوقت تک رہے، جبتک چنگیزیوں کی سفاکی
نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ نہ بجادی، اور ایران و خراسان و عراق میں اہل علم کے قتل عام کا بازار نہ گرم ہوا

محقق طوسی المتوفی ۶۷۲ھ اور علامہ ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ موسم بہار کا دور اختتام ہیں، اس کے بعد شاذ ونادر ہی اہل تحقیق پیدا ہوئے، اور اگر ہوئے تو وہ نوادر اور مستثنیات کے حکم میں ہیں، اور اس کے بعد سے جو دور شروع ہوا، وہ اہل تقلید کا ہے، یعنی ان لوگوں کا جن کا کام اگلوں کی تحقیقات کی نقل اور تکرار رہے، اور ان میں سے جو لوگ ممتاز ہوئے، انھوں نے اگلوں کی تصانیف کی شرحیں کیں، یا حاشیے اور تعلیقات لکھے یا ان کی اچھی اچھی کتابوں کی تلخیص اور اختصار کیا،

میں ایک مثال دیدوں، شیخ عبد القادر جرجانی المتوفی ۴۷۱ھ نے معانی و بیان میں دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ دو کتابیں لکھیں، جو حقیقت میں اس فن کے مباحث کا جوہر اور مغز ہیں، اور جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ سے لیکر ثعالبی المتوفی ۴۲۹ھ تک اس فن کے جو مسائل پیدا ہوئے تھے، ان کو محیط ہے، امام رازی المتوفی ۶۰۶ھ نے الایجاز فی دلائل الاعجاز میں شیخ کی دونوں کتابوں کو جن میں حد درجہ تفصیل و تطویل تھی، نچوڑ لیا، سکاکی المتوفی ۶۲۶ھ نے مفتاح العلوم کی تیسری قسم میں اس کا خلاصہ کرکے شامل کر لیا، خطیب قزوینی المتوفی ۷۳۹ھ نے تلخیص المفتاح میں مفتاح کا خلاصہ کیا، سعد الدین تفتازانی المتوفی ۷۹۳ھ نے اس کی مطول اور مختصر دو شرحیں لکھیں، اور معانی و بیان کو منطق کے قریب کر دیا، اور عصام الدین اسفرائینی المتوفی ۹۴۱ھ نے اطول کے نام سے معانی و بیان کو بالکل منطق یعنی ذوقی چیز کو عقلی بنانے کی ناکام کوشش کی، اس کے بعد ان پر حواشی لکھے جانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ اسوقت سے لیکر آج تک ہمارے ہاں کے عربی درسیات میں مختصر المعانی، مطول اور اطول کے سوا معانی اور بیان کے فن میں قدما کی ہر چیز آنکھوں سے اوجھل ہو گئی اور اسوقت تک سامنے نہیں آئی جبتک مفتی عبدہ مرحوم کی کوشش سے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ مصر میں نہ چھپیں، اور دار العلوم ندوۃ العلماء نے انکو اپنے نصاب درس میں داخل کرکے انکو ہندوستان کے مدرسوں میں روشناس کیا، اسی طرح دوسرے فنون کا حال ہے،

ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کا رواج متاخرین کے دور میں ہوا، لودھیوں کے زمانے

تک ہندوستان میں اہل ترکستان کے اثر سے صرف فقہ، اصول فقہ، اور علم کلام کا رواج تھا، اور اسی کا نام علم و دانائی تھا جدال و مناظرہ انہی فنون میں ہوتا تھا، انہی کو پڑھکر علما، قاضی اور مفتی اور محتسب کے شاہی عہدے پاتے تھے، دینیات میں تفسیر بیضاوی و مدارک کے کچھ اجزا، اور حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح یا مشارق الانوار کا درس ہوتا تھا، سب سے پہلے شیخ عبد الحق محدث دہلوی حرمین محترمین سے کتب احادیث کا تحفہ ہندوستان لائے اور شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خانوادہ نے صحاح ستہ کے فیض سے ہندوستان کو معمور کیا، ان کتابوں کا شاہ عبد العزیزؒ کے زمانہ تک یہ حال تھا کہ مولینا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی زبانی مولوی حکیم سید عبد الحئی صاحب مرحوم (سابق ناظم ندوۃ العلماء) اپنی طالب علمی کے زمانہ (۱۳۱۲ھ) کا یہ قصہ سناتے ہیں کہ اس زمانہ میں تفسیر کبیر رازی کا ایک نسخہ صرف شاہی کتب خانہ میں تھا، شاہ صاحب کو جب ضرورت ہوتی تھی، تو بڑے اہتمام سے اسکو شاہی کتب خانے سے منگواتے تھے، بخاری شریف کا یہ حال تھا، کہ درس کے پورے حلقہ میں ایک یا دو نسخے ہوتے تھے، ان کے اجزار توڑ توڑ کر طالب علموں میں تقسیم ہوتے تھے، اور ہر ایک سبق الگ الگ جزو سے باری باری سے ہوتا تھا،

ہندوستان کے پورے دور میں عربی کا ایک بھی کامل شاعر یا ادیب جو عربوں کے نہج و طرز پر شعر یا نثر لکھتا ہو، پیدا نہیں ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ نثر میں مقامات حریری جیسی بے مزہ کتاب اور نظم میں دیوان متنبی جیسے عجمیانہ شاعری کا دیوان عربی طالب علموں کے سامنے رہتا تھا، اس پورے دور میں قاضی عبد المقتدر دہوی المتوفی ۷۹۱ھ نظم میں، اور شاہ ولی اللہ دہلوی نثر میں ایسے ہوئے ہیں، جن کے نام دوسرے اسلامی ملکوں کے ارباب فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ بے تکلف لئے جا سکتے ہیں

حماسہ ابوتمام جو عربی شاعری کا صحیفہ ہے، ہندوستان میں مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری المتوفی ۱۳۰۴ھ سے پہلے نامعلوم تھا، ان کے زمانے سے یہ کتاب درس میں داخل ہوئی، اور مدرسوں میں عام ہوئی، اسی کا نتیجہ ہے، کہ مولینا فیض الحسن صاحب اور ان کے شاگردوں میں مولینا شبلی اور مولینا حمید الدین فراہی وغیرہ نے

عرب کے ذوق کو ہندوستان میں زندہ کیا، فلسفہ و منطق کا آغاز گو ہندوستان میں پہلے سے تھا، لیکن سکندر لودھی کے عہد میں شیخ عبد اللہ تلنبی، اور مولینا عزیز اللہ سنبھلی کے دم سے ان کا رواج ہوا، یہ دونوں بزرگ ملتان سے ادھر آئے تھے، ان سے پہلے منطق میں شرح شمسیہ اور علم کلام میں شرح صحائف کے سوا کچھ اور نہ پڑھا جاتا تھا، اس کے بعد اکبر کے زمانے میں حکیم فتح اللہ شیرازی نے یہاں معقولات کو فروغ دیا، شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، اور میر زاہد ہروی نے منطق و فلسفہ کا درس عام کیا، اورانہی کے تلامذہ سے شاہ ولی اللہ، فرنگی محل اور خیرآباد کی درسگاہوں میں متاخرین کے معقولات اور شروح وحواشی کی بہار آئی، حکیم فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ کے شاگرد ملا عبد السلام لاہوری، اور ان کے شاگرد ملا عبد السلام دیوی، ان سے ملا قطب الدین سہالوی، اور ملا قطب الدین سہالوی سے ملا قطب الدین شمس آبادی، ملا امان اللہ بنارسی، اور قاضی محب اللہ بہاری نے اور ملا قطب الدین سہالوی کے صاحبزادہ ملا نظام الدین نے ملا امان اللہ بنارسی سے پڑھا، مگر ملا نظام الدین کے وارث ملا بحر العلوم ہوئے، بحر العلوم سے خیر آباد کا علمی خاندان چلا، میر زاہد کا فیض شاہ عبد الرحیم صاحب دہلوی کو، اور ان سے شاہ ولی اللہ صاحب کو، ان سے شاہ عبد العزیز صاحب کو پہنچا، اور ان سے ملک میں عام ہوا،

متاخرین کے ان شروح وحواشی نے اصل فن کا خون کر دیا، چنانچہ اس عہد کی دماغی پیداوار زیادہ تر لفظی مباحث، اعتراضات، شکوک اور رد و بدل ہیں، اس دور میں اسلامی علوم و فنون میں سوائے نقل و تقلید اور بحث و مناظرہ کے ایک ذرہ اضافہ نہیں ہوا، اس دور کے مستثنیات میں حافظ ابن حجر عسقلانی امیر اسمعیل یمانی، صالح بن مہدی مقبلی یمانی، ابن خلدون مغربی، مقریزی مصری، شاہ ولی اللہ دہلوی اور بحر العلوم فرنگی محلی ہیں، کچھ اور بھی نام ہوں گے، مقصود استقصا نہیں،

اسلامی علوم و فنون کا اصلی سرمایہ وہی ہے، جو قدما نے ہمارے لئے ترکہ چھوڑا، اور جسکو ہمارے بزرگوں نے سینوں سے لگا کر رکھا، اس کا زمانے کو فخراً بیان کیا جا سکتا ہے، کہ مسلمانوں نے علوم و فنون

جتنا تحریری سرمایہ دنیا کو دیا، اور جس طرح کتبخانوں میں ان کو محفوظ رکھا، اس میں کوئی دوسری قوم انکی برابری نہیں کرسکتی، جس کثرت سے اسلامی ملکوں میں کتابیں لکھی گئیں، اور کتب خانے قائم ہوئے، وہ اس خزان کے دور میں بھی بہار کے موسم کا پتہ دیتے ہیں، مسلمانوں کے زمانہ میں نہ تو چھاپے خانے تھے، اور نہ ریل اور ڈاک کی آسانیاں تھیں، پھر بھی اہل شوق کی کوششوں سے "وراقین و وراقۃ" کے ذریعہ سے ہر کتاب کے اس کثرت سے نسخے فراہم ہوتے تھے، کہ آج بھی اس پر حیرت ہوتی ہے، کتاب مشرق کے ایک گوشہ میں لکھی جاتی تھی، اور چند روز میں مغرب کے دوسرے گوشہ میں پہنچ جاتی تھی، کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے، کہ ابوالفرج اصفہانی المتوفی ۳۵۶ھ کی کتاب الاغانی لکھی تو مشرق میں گئی، اور سیف الدولہ ہمدانی کو ہدیہ دی گئی، مگر اس کا سب سے پہلا نسخہ اسپین کے خلیفہ حکم المتوفی ۳۶۶ھ کی خدمت میں پیش ہوا، اور خلیفہ اس اولیت پر فخر کرتا تھا،

ہندوستان کا یہ کارنامہ فخر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ شاہجہانی عصر کے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے علم کلام اور معقولات پر جو شرح و حواشی لکھے، وہ لکھے تو ہندوستان میں مگر ان کی نقلیں عثمانی سلاطین کے پاس تحفۂ شاہی کے طور پر قسطنطنیہ جاتی تھیں، یہی سبب ہے کہ ان کی تصانیف قسطنطنیہ سے شائع ہوئیں،

اسلامی علوم و فنون کی کتابوں پر تین سب سے بڑے سخت وقت گذرے ہیں، جن میں بزرگوں کا بڑا اندوختہ تلف ہوگیا، یا اخلاف کے ہاتھوں سے نکل گیا، سب سے پہلا وقت تو وہ ہے، جب ساتویں صدی میں چنگیز خاں و ہلاکو کے ہاتھوں سے خراسان اور بغداد کے کتب خانے تباہ ہوئے، دوسرا وقت وہ تھا جب نویں صدی میں اسپین میں اسلامی حکومتوں کا خاتمہ ہوا، اور تیسرا وقت وہ ہے، جب موجودہ یورپ کی تعدی نے اسلامی علوم و فنون کے ذخیروں پر پہلے فوجی قبضہ کرکے پھر خرید خرید کر یورپ کے کتبخانوں میں منتقل کر دیا، جو کچھ اسوقت ہمارے پاس ہے، وہ یا مصر کے سرکاری کتب خانے میں یا دمشق یا حلب کے بعض مکتب خانوں میں یا قسطنطنیہ کے ہو تو فہ کتبخانوں میں ہے،

حرمین میں جو کتابیں تھیں، وہ گذشتہ فتنہ میں تباہ ہوئیں، مدینہ منورہ میں گو کئی کتب خانے ہیں، مگر متولیوں کی غفلت سے تباہ و برباد ہیں، صرف دو کتبخانے ذکر کے قابل رہ گئے ہیں، ایک شیخ الاسلام کا کتبخانہ جس کی نادر کتابیں ترکوں نے مدینہ چھوڑتے وقت شام میں منتقل کر دیں، اور شام کے تخلیہ کے وقت صندوقوں میں بھری ہوئی تلف ہو رہی تھیں، کہ کتب خانہ کے ترک متولیوں اور امیر فیصل کی کوششوں سے جو بچیں وہ واپس آسکیں، دوسرا وہاں کا کتب خانہ مدرسہ محمودیہ کا کتب خانہ ہے، جو سلطان محمود عثمانی کی یادگار ہے، اس کے کتب خانہ کو ۱۹۲۶ء میں جب میں نے دیکھا، تو یہ حال تھا، کہ بڑی مشکل سے متولیوں نے اس کے بند دروازوں کے قفل کھولے، لیکن فہرست میں دیکھ کر جس نادر کتاب کو مانگا، معلوم ہوا، کہ ترک اسکو اپنے ساتھ لیگئے،

ابھی اس بڑی جنگ کے بعد جب عراق انگریزوں کے ہاتھ آیا تو دجلہ فرات کی روانی انگلش چینل کی موجوں میں مل گئی، اور کتابیں یورپ کے کتب فروشوں کی دوکانوں میں بہ بہ کر آنے لگیں، کہتے ہیں کہ اسپین کا بچا کچا سرمایہ اسکوریال لائبریری میں ہے، اور ایشیاے وسطی کا ذخیرہ روس کے کتب خانوں میں منتقل ہو گیا ہے،

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں لکھنؤ اور دلی کے شاہی کتب خانوں پر جو آفتیں آئیں، وہ مورخوں کی نگاہوں سے ابتک پوشیدہ ہیں، اور شاید ہمیشہ کے لئے رہیں، کچھ حصہ تو انگلستان کو منتقل ہو گیا، کچھ فوجی افسروں اور سپاہیوں میں بٹ گیا، پھر انھوں نے قدردانی سے انگلستان کے قومی کتب خانوں کے سپرد کر دیا یا نیچ کے طور پر بیچ ڈالا اور کتابیں کہیں سے کہیں پہونچ گئیں، اور اب بھی اس قسم کے مال غنیمت کا پتہ یورپ کے کتب خانوں میں ملتا ہے،

جرمن ڈاکٹر اسپرنگر نے جو اس زمانہ میں بعض سرکاری عربی مدرسوں کے انچارج تھے، اور جنھوں نے اودھ کے شاہی کتبخانوں کی فہرست تیار کی تھی، اس قسم کے سرمایہ کو بڑی حفاظت سے اپنے ملک میں پہنچا دیا، اودھ کے سرکاری کتب خانہ کی کتابیں آج بھی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں،

اودھ کے شاہی کتب خانوں کی بربادی کی کہانی مولینا شبلی مرحوم نے ایک چشمدید گواہ مشہور فارسی شاعر خواجہ عزیز الدین لکھنوی کی زبانی مجھ سے بیان فرمائی تھی، خواجہ صاحب کہتے تھے، کہ فرنگی محل کے پل سے لیکر نخاس تک کتابوں کا انبار ڈھیر بکھرا ہوا تھا، کہ آنے جانے والے کتابوں کو روندکر آتے جاتے تھے، اور سنا ہے کہ گورنمنٹ نے ان کو نیلام کر دیا، اور کتابیں ردی کے بھاؤ بکیں، بہرحال اتنا شکر ہے کہ بریلی سے حافظ الملک رحمت خاں اور لکھنو سے شاہان اودھ کی کچھ کتابیں رام پور چلی گئیں، جو آجتک وہاں سرمایۂ افتخار ہیں، لکھنو میں مولوی ناصر حسین صاحب کے خاندانی کتب خانے کی بنیاد بھی لکھنو کے شاہی کتب خانوں کی غارت شدہ کتابوں سے پڑی، اس زمانہ میں خان بہادر مولوی مفتی محمد قلی خاں موسوی نیشاپوری کنتوری المتوفی ۱۲۶۰ھ صدر الصدور تھے، انھوں نے غدر کے زمانے میں گورنمنٹ کی نیلام کی ہوئی کتابیں خریدلیں، ٹونک کا سرمایہ بھی غنیمت ہے، جو وہاں کے ایک عالم رئیس کی محنت کا نتیجہ ہے،

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ شکریہ کی مستحق ہے، کہ اس نے اس افراتفری کے زمانہ کے بعد کتابوں کو خریدنا شروع کر دیا، اور اس طرح اچھا خاصہ ذخیرہ ہندوستان کے اندر رہ گیا، تاہم اس کے رجسٹر مولویوں کو یہ واقعہ ہے کہ نادر کتابوں کو کوڑیوں کے مول خریدنے اور یورپ اور امریکہ کے شائقوں کے ہاتھوں بیچنے کا چسکا پڑا، اور یہ کاروبار اب تک جاری ہے،

نواب عماد الملک مرحوم کا یہ کارنامہ بھلانے کے لائق نہیں کہ انھوں نے سرکار آصفیہ کو ان پراگندہ موتیوں کو اپنے خزانۂ عامرہ میں بحفاظت جمع کرنے کی توجہ دلائی، اور کتب خانۂ آصفیہ کا وجود ہوا جس کی بدولت دکن کا بڑا سرمایہ محفوظ رہا، دوسری طرف پٹنہ کے مولوی خدا بخش خاں مرحوم نے اپنی ساری کمائی کو انھی جواہرات کے خریدنے اور جمع کرنے میں خرچ کر ڈالا اور آج پٹنہ کا مشرقی کتبخانہ ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کی یادگاروں کا نادر مرقع ہے، علیگڈہ بھی ایک ایسے ہی شائق رئیس بن رئیس کا مسکن ہے جنکے حبیب گنج میں لکھنو، لاہور، دلی اور دکن کے انمول موتی ہیں،

کتابیں کہاں سے کہاں اور کیونکر پہونچیں ان کی دو دلچسپ کہانیاں آپ کو سناتا ہوں،

دار المصنفین کے کتب خانہ میں شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید کا ایک عمدہ قلمی نسخہ ہے، اسکے پہلے صفحہ پر جو اس کی سرگذشت مختلف مالکوں کے قلم سے ثبت ہے، وہ یہ ہے، کہ یہ نسخہ کوئی ایرانی فاضل میر صفی الدین ۱۰۰۰ھ میں کسی بادشاہ کے لئے ہدیہ لائے، پھر ۱۰۲۱ھ میں محمد قلی قطب شاہ والی دکن کے کتب خانہ کی ملکیت ہوا، پھر کوئی امیر الدولہ عماد الملک اس کے مالک بنے، اس کے بعد ۱۱۹۳ھ میں کسی طرح شمس الدولہ منیر الملک مسٹر ہنری ونسٹرٹ بہادر تہور جنگ کے قبضہ میں آیا، اس سے یکم مئی ۱۲۰۰ھ کو وہ کسی انگریز بودم کے قبضہ میں کلکتہ آیا، وہاں سے محمد آباد ضلع اعظم گڈھ کے علم دوست رئیس ڈپٹی مولوی عبد الغفور صاحب مرحوم کی ملکیت بنا، اور اب وہاں سے وقف ہو کر دار المصنفین کے کتب خانہ میں آیا ہے،

زیب النساء بنت عالمگیر کے دربار کے عالم معین بن دلی قزوینی جنھوں نے شہزادی کے حکم سے امام رازی کی تفسیر کبیر کا ترجمہ فارسی میں زیب التفاسیر کے نام سے کیا تھا، ۱۱۰۰ھ میں شہزادی کی اجازت سے حج و زیارت کو حرمین گئے تھے، اس مقدس سفر کی یادگار میں انیس الحاج نام ایک مختصر کتاب لکھی تھی، جس میں بڑا حصہ سفر کے حالات کا اور کچھ مناسک حج کا ہے، اس میں بندر سورت، مخا، جدہ، اور امیر مکہ شریف برکات، اور ترکی والی، اور محل وغیرہ کے جلوسوں کی قلمی تصویریں ہیں، اس کا ایک ناقص حصہ برٹش میوزیم لائبریری میں ہے، اسپرنگر نے اودھ کے شاہی کتب خانہ میں اس کے ایک ایسے نسخہ کا ذکر کیا ہے جو کسی دوسری کتاب کے ساتھ ایک جلد میں شامل تھا، اور اس کے اوراق کچھ غیر مرتب تھے، اور جس میں تصویریں تھیں، ابھی حال میں ۱۵ جمادی الثانی ۱۳۵۵ھ کو اس کا ایک نسخہ مونگیر کے ایک دیہات سے دار المصنفین کے کتب خانے میں خریدا گیا، جس پر گو مہریں نہیں، تاہم اسپرنگر کے بیان کا حرف حرف صادق آتا ہے، اور تعجب ہے کہ کہاں اودھ کا شاہی کتب خانہ اور کہاں مونگیر کا ایک دیہات، شاہی کتب خانوں کی اکثر کتابوں کی یہ انقلابی تاریخ ہر بڑے کتب خانے کے نسخوں کی لوح پر ثبت نظر آتی ہے،

بہر حال ہر شر میں خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے، ع خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما در و باشد، (باقی)

عالمگیر کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

(۲)

پھر بھی عالمگیر کا دربار شعراء سے خالی نہ تھا، وہ ان کے اشعار سنتا، اور موقع بموقع اپنے جود و سخا سے فیضیاب کرتا تھا، اور ان کی استعداد و لیاقت کے مطابق عہدے دیتا تھا، وہ مفت خوری کا قائل نہ تھا اور نفس شاعری کو ذریعۂ معاش ٹھہرانا پسند نہ کرتا تھا، یہی سبب ہے کہ اوسنے اپنے دربار کے شعراء کو بھی ملکی منصب دیکر روزی کمانے کا ذریعہ عطا کیا، نفس شاعری کا منصب اس نے جاری نہیں کیا،

اس عہد کے قابلِ ذکر شعراء کے حالات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں،

۱۔ موسوی خان میرزا معزالدین محمد فطرت،

میر محمد زمان مشہدی کا نواسہ تھا، عین شباب کے زمانہ میں اپنے باپ مرزا فخر سے خفا ہو کر اصفہان چلا آیا، جہاں آقا حسین خوانساری سے علوم و فنون کا استفادہ کیا، بہت ہی ذہین و فہیم تھا، اسلئے علوم عقلیہ میں یکتائے روزگار ہوا، ۱۰۸۱ھ میں ہندوستان آیا، تو اورنگ زیب نے اس میں ذاتی اور نسبی جوہر دیکھ کر اپنے لطف و کرم سے مالا مال کیا، شاہ نواز خاں کی لڑکی یعنی شاہزادہ محمد اعظم کی خالہ سے اسکی شادی انجام پائی اور وہ عظیم آباد کا دیوان مقرر ہوا، لیکن وہاں کے ناظم سے اس کا اتفاق نہ رہا، اسلئے واپس بلا لیا گیا، ۱۰۹۹ھ میں موسوی خان کے خطاب سے سرفراز ہوا، اور دیوان تن مقرر ہوا، ایک سال بعد تمام دکن کا دیوان ہوا،

سنہ ۱۰۱۱ھ میں فوت ہوا[51]

میرزا معزالدین بہت ہی خوددار اور نازک مزاج تھا، ایک موقع پر عالمگیر کو اس سے رنجش پیدا ہوگئی، تو وہ تھوڑے دنوں تک شاہی التفات سے محروم رہا، مگر وہ بھی اپنی خودداری کے باعث بے نیاز رہا، جب لوگوں نے سمجھایا کہ بادشاہ سے اپنی تقصیر کی معافی مانگو، تو اس نے ایک معروضہ لکھا جس میں یہ شعر تھے،

درطلب ما بے زبانان آتشِ پروانہ ایم | سوختن از عرضِ مطلب پیشِ من آسان ترا ست

شد از غرورِ غلامی زبانِ عرضِ خموش | مرا براہِ خطا، ایں صوابہا انداخت،

از موجِ فیضِ بحرِ کرم را قرار نیست | اہلِ سوال بیہودہ ابرام می کنند،

عالمگیر نے اس درخواست کو پڑھا تو یہ لکھا،

بے زبانی می کشاید بندہائے سخت را | درقفس طوطی زمنقار سخنگوے خود است

لیکن:-

ہیچ مردے در پئے اصلاحِ خوے خویش نیست | ہر کرا دیدم در آرائشِ خوے خود است

"بموجب حدیث السلطان ظل اللہ، ہرگاہ سلطان عصر با نوکران خود التجا مطلب او کند و جواب باین خوبی می دہد، از اخلاق بعید است کہ التفات بحالِ او نشود"[52]

موسوی خاں شعر گوئی میں یکتائے زمانہ تھا، مآثر الامراء میں اس کا ذکر اس طرح ہے،

"بدستیاری طبع رسا و ذہن عالی در علوم عقلیہ یگانۂ روزگار گردید، ..... چو طالعش مانند استعداد بلند بود مشمول عواطف عالمگیری گردیدہ بمناصب سر عزت برافراخت ...... در خوش خیالی و نازک تلاشی بے انباز و بہ انشاپردازی و وخت آفرینی ممتاز بود، در اوائل مشق شعر فطرت تخلص میکرد"

[51] مآثر الامراء جلد ۳ ص ۶۲۳ نیز مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۱۲۶ [52] وقائع عالمگیر ص ۳۰ [53] مآثر عالمگیری واقعات سنہ ۱۱۰۱ھ۔

آخر موسوی دل نشین او افتاد [۱]

شیخ ناصر علی سرہندی، صاحب مآثر الکرام اس شاعر شیریں مقال کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں

"شیر نیستان سخوری است و مرد میدان معنی گستری، ذو الفقار کلکش بہ تسخیر قلمرو بیان پرداختہ و نصرت طبعش آفتاب سخن را از افق عربی راجع ساختہ سر خوش گوید،

در ملک سخن بود جہانگیر علی ، در مشرب دل دلی علی، پیر علی،

باشعر علی نمی رسد شعر کسے ، زانساں کہ خط کس بخط میر علی،

عالمگیر نے ناصر علی کو ۱۰۹۰ھ میں کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا، لیکن تھوڑے دنوں کے بعد بعض اسباب کی بنا پر وہ گوشہ نشین ہو گیا، ۱۱۰۶ھ میں عالمگیر نے اسکو اپنے عنایات و اکرام سے پھر مالا مال کیا، منصب خطاب خلعت خاصہ اور شمشیر عطا کر کے الہ آباد کا ناظم مقرر کیا، [۲]

نعمت خان عالی، عالی تخلص تھا، اور میرزا محمد علی نام حکیم فتح الدین شیرازی کا لڑکا تھا، میرزا محمد ہندوستان ہی میں پیدا ہوا، لیکن صغرسنی میں باپ کیساتھ شیراز چلا گیا، اور وہیں کسب کمال علم کیا، ہندوستان آیا تو ملا شفیعائی یزدی کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا، یہاں آکر طب کا آبائی پیشہ اختیار کیا، پھر اورنگ زیب نے اپنے ملازمان خاص میں داخل کر لیا، اورنگ زیب نے جب حیدر آباد فتح کیا، تو اس نے یہ تاریخ لکھی،

از نصرت پادشاہ غازی ، گردید دل جہانیان شاد،

آمد بقلم حساب تاریخ ، شد فتح بجنگ حیدر آباد،

اورنگ زیب نے خوش ہو کر اسکو خلعت و انعام عطا کیا، [۳]

---

۱ مآثر الامرا جلد ۳ صفحہ ۹۳۳، کلام کے نمونے مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۱۲۱ پر ملاحظہ ہوں، ۲ دفتر ثانی صفحہ ۱۳۲ پر کلام کے نمونے دئے ہوئے ہیں، ۳ مآثر عالمگیری واقعات ۱۰۹۸ھ،

۱۱۰۱ھ میں اسکو نعمت خاں کا خطاب ملا، اور باورچی خانہ کا داروغہ مقرر ہوا، آخر عہد میں اورنگزیب نے اسے مقرب خاں کے خطاب سے سرفراز کیا، اور جواہر خانہ نگین دولت کا داروغہ بنایا، شاہ عالم کے زمانہ میں دانشمند خاں ہوا، اور شاہنامہ لکھ رہا تھا کہ زندگی کو خیرآباد کہا، وقائع نعمت خاں عالی، مثنوی عشق، خوان نعمت، سخن عالی اسکی منظوم تصنیفات ہیں، وقائع نعمت خاں میں عالمگیر کی ہجو ملیح لکھی ہے، احمد علی سندیلوی اپنے مخزن الغرائب میں لکھتے ہیں،

"نہایت شوخ و بے باک و حاضر جواب و لطیفہ گوے بودہ بملازمت محی الدین اورنگزیب عالمگیر بادشاہ سرفرازی داشت چوں آن بادشاہ نیکو قابل دوست و جوہر شناس بود آنرا منصب بحالی امتیاز بخشید و نعمت خاں کرد، ادحق نمک و لی نعمت خود نگاہ نداشتہ ہجو ملیح کرد"[1]

اورنگزیب نعمت خاں عالی کی دریدہ دہنی سے واقف تھا لیکن اس سے وہ قصداً اغماض کرتا تھا، ایک بار کامگار خاں نامی ایک امیر کی شادی کے موقع پر نعمت خاں عالی نے ایک ہجو لکھی تو اول الذکر نے اورنگزیب سے اسکو تنبیہ کرنے کی درخواست کی لیکن اورنگزیب نے لکھا،

"خانہ زاد سادہ لوح (کامگار خاں) می خواہد کہ ما راہم دریں رسوائی شریک ساز د کہ ادہر چہ خواہد درباب ما گوید، وخوبسید، وشہرۂ عالم ساز د، وبیشتر ہم درباب ما مقرر نہ بود[2] آملانی باضافہ

---

[1] مخزن الغرائب قلمی نسخہ مملوکہ دار المصنفین اعظم گڈھ، [2] یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جب کہ فتح دکن کے موقع پر تاخیر ہوئی تو بعض امرا نے اورنگزیب سے واپس جانے کی درخواست کی، اورنگزیب واپس جانے کے خلاف تھا اس موقع پر نعمت خاں عالی نے چڑھ کر کہا،

بنشستہ چناں تو ی کہ بر داشتنش کارے دگرے نیست خدا بر دارد

عالمگیر ہنس پڑا،

انعام شدہ کہ دیگر ارتکاب نکند، با وجود این خود کمی نکردہ، زبان بریدن وگردن زدن مقدر نیست، باید سوخت، و باید ساخت، رفیق لا یرافقک وکا یفارقک[1]:

میر غلام علی آزاد اس کے بارے میں لکھتے ہیں، کہ

"حاوی فنون وافر بود وجامع علوم متکاثرہ، میرزا محمد در نظم ونثر قدرت عالی دارد وخصوص در وادی نثر طلسم حیرت می بندد"

مآثر الامراء کا مصنف اسکو ہمیشہ حاجی کے نام سے یاد کرتا ہے اور لکھتا ہے،

"ہیچ یکے از زبانش نرستہ"[2]

عاقل خان رازی، میر عسکری نام تھا، خوات کا رہنے والا تھا، شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا، اور شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ دکن میں ضلع دار مقرر ہوا، ایام شاہزادگی میں اورنگ زیب کی ایک کنیز (یکے از پرستاران خاص) کا انتقال ہوگیا، جس سے اورنگ زیب روز "تازہ بتازہ و نو بنو" گانے سنکر محظوظ ہوا کرتا تھا، اس کے انتقال پر ملال پر اورنگ زیب بہت ہی غمگین ہوا، غم غلط کرنے کے لئے دوسرے روز شکار میں چلا گیا، میر عسکری بھی ساتھ تھا، تنہائی میں میر عسکری نے پوچھا کہ اندوہ وملال کی شدت میں شکار کھیلنے کے کیا معنی ہیں، اورنگ زیب نے جواب میں یہ شعر پڑھا،

نالہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست
در بیابان می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

میر عسکری نے یہ شعر سنکر عرض کیا کہ

عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت

---

[1] وقائع عالمگیر از نبی احمد سندیلوی صفحہ ۶۲، [2] مآثر الامراء جلد سوم صفحہ ۴۹۵، اس کے ایاجی کے نمونے مخزن الغرائب میں ملاحظہ ہوں، کلیات نعمت خان عالی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں بڑ کچھ کلام کے نمونے مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۱۳۶ پر بھی درج ہیں،

اورنگ زیب نے شعر سنا تو اس پر رقت طاری ہوگئی، اور اسکو بار بار پڑھتا تھا[1]

میر عسکری اپنے شعر و شاعری کے لحاظ سے اپنے زمانہ میں بہت مشہور ہوا، حضرت برہان الدین رازی کا معتقد تھا، اس لئے رازی تخلص کرتا تھا، جب اورنگ زیب دکن سے دارا سے لڑنے چلا، تو قلعۂ دولت آباد میں اپنے اہل و عیال کو چھوڑا، میر عسکری اس شہر کا نگہبان ہوا، اورنگ زیب جب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اسکو عاقل خاں کا خطاب دیا، اور دوآبہ کا فوجدار مقرر کیا، لیکن چند مہینے کے بعد صحت کی خرابی سے خانہ نشین ہوگیا، اس مدت میں اسکو ۵۰۰ روپئے ماہوار ملتے رہے، ۱۰۷۴ھ میں پھر ملازمت شاہی میں منسلک ہوا، اور داروغۂ حرم خاص مقرر ہوا، جس پر بہت ہی معتمد امیر مامور ہوتا تھا، اس زمانہ میں اورنگزیب کے عنایات و اکرام سے برابر فیضیاب ہوتا رہا، ۱۰۸۰ھ میں اسکو ایک شاہی خلعت عطا کیا گیا اور ڈاک چوکی کا داروغہ مقرر ہوا، لیکن اس عہدہ سے مستعفی ہوا، ۱۰۸۰ھ میں اس کا ایک ہزار روپیہ وظیفہ مقرر ہوا، ۱۰۹۰ھ میں بخشی دوم کے عہدہ پر مامور ہوا، ۱۰۹۸ھ میں اس کو دہلی کی صوبہ داری سپرد کی گئی، جس عہدۂ جلیلہ پر اپنی وفات تک فائز رہا، مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے، کہ عاقل خاں کی خدمات، دیانت داری، اور اخلاص کیوجہ سے عالمگیر اسکی خودرائی و خود آرائی سے چشم پوشی اور عمدہ و اہم خدمات اسکے حوالے کرتا تھا[2]

ظفرنامۂ عالمگیری، ایک دیوان، مرقع تصنیف رازی، اور چند مثنویاں، نغمات العشق ثمرات الحیواۃ شمع و پروانہ، اور مہر و ماہ، اسکی یادگاریں ہیں، ظفرنامہ عالمگیری میں عالمگیری عہد کے واقعات جنگ بیجاپور سے میر جملہ کی وفات تک درج ہیں، مرقع تصنیف رازی میں مولانا جلال الدین رومی کی طرز پر ایک مثنوی لکھی، ثمرات الحیواۃ اسکے مرشد، شیخ برہان الدین رازی کی تصنیف ہے، اس نے اسکو ترتیب دیا، شمع و پروانہ میں رتن سین اور پدماوت کا قصہ ہے، مہر و ماہ میں ایک ہندوستانی قصہ منظوم ہے، مصنف[3] مآثر عالمگیری کا

---

[1] مرأۃ الخیال ص۲۶۱ [2] اوپر کے تمام واقعات مآثر عالمگیری سے لئے گئے ہیں، [3] ہمیشہ بہار از کشن چند اخلاص بحوالہ فہرست مخطوطات کتب خانہ شاہ اودھ مرتبہ اسپرنگر ص ۱۴۲-۱۴۳۔

بیان ہے، کہ مثنوی مولینا روم کے دقائق کو حل کرنے میں وہ اپنے کو یکتا خیال کرتا تھا[۱]

مراۃ الخیال کا مصنف اسکی شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے :-

"وصاف رنگینی کلامش را خامہ از قلم نرگس و سیاہی از دوات لالہ باید شنگرف از رنگ گل وحرف از آواز بلبل شاید از رشک نسخہ مہر و ماہش ماہ آفتاب در رو ساختن و از مشاہدہ رنگینی و نزاکت سخنش گل و بلبل در رنگ باختن دیوانش عالمے است پر از یوسف طلعتان معانی دلنشین و سواد اعظمی از سینما ان حروف منشئیں و در رشتہ بازار سطورش متاع در دانہا و انبار و بر تختہ دوکان صفحہ اش گلہائے مضامین رنگین گلزار، گلزار، ہر سطرش زلف معشوقی سراپا ناز و ہر نقطہ اش داغ دل عاشقی خانہ برانداز۔"[۲]

ملا محمد سعید اشرف مازندرانی، ملا محمد صالح مازندرانی کے لڑکے اور ملا محمد تقی مجلسی کے نواسے تھے، عالمگیر کے اوائل حکومت میں ہندوستان آئے، ان کی استعداد و قابلیت کو دیکھکر عالمگیر نے ان کو زیب النسا کا اتالیق مقرر کیا، ۱۰۸۳ھ میں زیب النسا سے اجازت لیکر اصفہان واپس گئے، پھر واپس آئے تو شہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم کے ساتھ عظیم آباد میں رہے، شہزادہ انہیں بہت ہی محبوب رکھتا تھا، باوجود کبر سنی کے انھیں اپنے پاس برابر بٹھائے رہتا تھا، آخر عمر میں بیت اللہ کی زیارت کو جا رہے تھے مگر مونگیر پہنچکر انتقال کر گئے، یہیں ان کی قبر بھی ہے، ان کی نسبت صاحب مآثر الکرام رقمطراز ہیں،

" صاحب جودت بود، و شاعر والا قدرت طبع چالاکش معانی تازہ بہم می رساند، و عجائب گلہا در جیب و دامن سامعہ می افشاند..... دیوان ملا سعید اشرف بمطالعہ درآمد انواع شعر و قصیدہ و غزل و مثنوی و قطعہ وغیرہا دارد، و ہمہ جا حرف بقدرت می زند،"[۳]

روشن ضمیر، ایران کا مشہور شاعر تھا، عالمگیر کے زمانہ میں ہندوستان آیا، اور شاہی

---

[۱] مآثر عالمگیری واقعات ۱۱۰۰ ہجری [۲] مراۃ الخیال ص ۲۶۱ [۳] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۱۲

منصب داروں میں مقرر ہوا،[1] خافی خان لکھتا ہے:-

"روشن ضمیر کہ از روشن ضمیران صاحب کمال و مستعدان آن زمانہ گفتہ می شد، و در نظم فارسی و اشعار ہندی مشق او بجائے رسیدہ بود کہ امیر خسرو ثانیش تواں گفت"[2]

تذکرۂ مراۃ الخیال کا مصنف، روشن ضمیر کا ذکر بہت ہی عزت و احترام کیساتھ کرتا ہے:-

آسمان فضل و کمال را بدر منیر عالی قدر بلند مکان میرزا روشن ضمیر از اعاظم مستعدان و اکابر عالی فطرتان روزگار بودہ، چنانکہ در عربی و فارسی لطائف خسروی بظہور آوردہ، و در علم ہندی از نغمات آن فن گذرانید، علمائے ہند اکثرے پشت دست و روئے امید در پیشش می نہادند و در علم لااصل موسیقی بجائے رسید کہ استادان ماہر نسبا گردیش مباہات می نمودند. گویند بچہار دہ ہزار نواہائے قبایین سامعہ نواز اہل صحبت گردیدہ بود، در اکثرے ازان مقامات تصنیفات عربی و فارسی ہندی ساخت و باہزاراں تر زبانی علم بلند آوازگی برافراخت"[3]

اورنگزیب عالمگیر نے جب کلام پاک حفظ کیا، تو اس موقع پر روشن ضمیر نے یہ تاریخ لکھکر گذرانی،

محی الدینی و مصطفےٰ حافظ تو، صاحب سیفی و مرتضی حافظِ تو،

تو حامی شرع و حامی تو شارع تو حافظ قرآن و خدا حافظِ تو،

عالمگیر نے خوش ہوکر اسکو انعام میں سات ہزار روپئے عطا کئے،[4]

جب اورنگ زیب شہزادہ شجاع سے لڑ رہا تھا، تو اس نے مندرجۂ ذیل تاریخ لکھکر پیش کی،

اے حرز تو سورۂ تبارک بادا، پیوستہ ترا تارج و تبارک بادا،

---

[1] ید بیضا قلمی نسخہ دار المصنفین، [2] خافی خاں جلد دوم ص ۵۰۰، [3] تذکرۂ مراۃ الخیال ص ۲۲۸،
[4] مراۃ الخیال ص ۲۲۹،

جستم ز پی شگون فتحت تاریخ دل گفت شود فتح مبارک بادا
۱۰۶۹

اورنگزیب کو یہ تاریخ بہت پسند آئی، اس نے انعام میں پانچ ہزار روپے مرحمت کئے،[1]

ہندی میں اس کا تخلص تھی تھا، بھاشا و سنسکرت کے الفاظ کا وہ صحیح تلفظ نہیں کر سکتا تھا، لیکن ہندی کے اشعار کہنے میں اعلیٰ مہارت رکھتا تھا، پارجاتک جو موسیقی میں ہندی زبان کی مشہور کتاب ہے اس کا ترجمہ اس نے فارسی زبان میں کیا،[2]

باذل رفیع خان مشہدی خواجہ شمس الدین حافظ سے نسبی تعلق رکھتا تھا، اس کا خاندان مشہد سے ہندوستان شاہجہاں کے زمانہ میں آیا، اس کا چچا میرزا محمد طاہر، وزیر خان عالمگیر کے زمانہ میں برہان پور اکبر آباد اور مالوہ کا صوبہ دار رہا، رفیع خاں باذل شاہجہان آباد میں پیدا ہوا، جوان ہوا تو دامن دولت عالمگیری سے وابستہ ہو کر سرکار بانس بریلی کا حاکم مقرر ہوا، مآثر الکرام میں اس کے شعر و شاعری کا بیان اس طرح لکھا ہوا ہے،

"طبعے قوت بیانے دارد، و بہ اقتضائے تخلص خود فراوان جواہر ز ابر بذل و ایثار می نماید حملۂ حیدری و قریب نود ہزار بیت مشہور عالم است"[3]

التفات خاں نقد صفاہانی طاہر نام میرزا محمد طاہر تھا، اصفہان کا رہنے والا تھا، عالمگیر کے عہد میں ہندوستان آیا، مخلص خاں کے ذریعہ سے شاہی ملازمت اور منصب حاصل کیا، اور التفات خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا، بیڑ کا جو مضافات اورنگ آباد میں واقع ہے، فوجدار مقرر ہوا، صاحب مآثر الکرام لکھتے ہیں،

"ذکی الطبع بود و نثر مستعدانہ می نوشت، و بشایہ قدرت داشت کہ سہ کاتب در حضور او

---

[1] خافی خاں جلد دوم ص ۔ [2] مقالات شبلی ادبی جلد دوم ص ۔ نیز ید بیضا از غلام علی آزاد بلگرامی، رفیع خان کے مفصل حالات تذکرہ مراۃ الخیال ص ۲۰۳-۲۲۰ پر ملاحظہ ہوں [3] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۲۴،

باسباب کتابت می نشستند، ہر سہ را عبارت خود می فرمود، وفقرۂ لاحق برائے ہر کدام بے تامل می گفت ودر ربط کلام از دست نمی داد، وباوصف آں خود ہم دراں حالت مشغول کتابت می بود[1]"

فضلاء

فتاوی عالمگیری کی جامعیت و معنویت اس بات کا ثبوت ہے، کہ عالمگیر کا عہد باکمال علماء و فضلاء کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھا، مگر افسوس ہے کہ ان علماء کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملے، جن علماء و فضلاء کے حالات دستیاب ہو سکے، ان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

ملا جیون: شیخ احمد نام تھا، امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے، اصول فقہ میں عالمانہ نظر رکھتے تھے، نور الانوار اصول میں اور تفسیر احمدی قرآن پاک کی احکامی آیتوں کی تفسیر میں ہے، عالمگیر کے استاد تھے، اور وہ ان کے ساتھ بہت ہی تعظیم و توقیر کے ساتھ پیش آتا تھا، تذکرۂ علمائے ہند میں انکا ذکر ان الفاظ میں ہے،

"قوت حافظہ بغایتے داشت کہ قصیدہ بشنیدن یکبار بادلی گرفت، وعبارت کتب درسیہ بلا معاینہ کتاب بزبانی می خواند، اولاً قرآن مجید حفظ کردہ کتب درسیہ از علمائے عصر خود تحصیل نمودہ، فاتحہ فراغ بخدمت ملا لطف اللہ ساکن کوڑہ جہان آباد خواند، پس ازان بحضور محی الدین اورنگ زیب بادشاہ باریاب شدہ، بادشاہ موصوف بتعظیم و توقیر تمام پیش آمدہ بحلقہ تلامذہ وے درآمد و تا زندگی پا از جادہ ادبش بیرون نہ نہاد، ہمچنین اولاد بادشاہ موصوف مراعی آدابش بودند، ملا ممدوح الذکر عمر عزیزش را با فادہ درس و تصنیف صرف نمودہ[2]"

۱۱۳۰ھ میں انتقال ہوا،

قاضی محب اللہ بہاری، موضع کڑا، علاقہ بہار شریف (پٹنہ) کے رہنے والے تھے، اور قطب الملک

---

[1] مآثر الکرام دفتر ثانی ص۱۴۲، [2] تذکرہ علمائے ہند ص۲۵،

سے تھے، ملا قطب الدین شمس آبادی اور دوسرے علماے روزگار سے تعلیم پاکر دکن گئے جہاں عالمگیر نے شاہی ملازمت میں منسلک کر لیا، لکھنؤ اور حیدر آباد میں قاضی رہے، پھر عالمگیر نے اپنے پوتے رفیع القدر بن شاہ عالم کی تعلیم کے لئے مامور کیا، شاہ عالم کے زمانہ میں قاضی القضاۃ کا عہدہ تفویض ہوا، اور فاضل خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے ۱۱۱۹ھ میں انتقال ہوا، اور محلہ چاند پورہ بہار شریف میں مدفون ہوئے،

منطق میں سلم العلوم و افادات اصول فقہ میں مسلم الثبوت، جزء لایتجزی کے بیان میں الجوہر الفرد اور رسالہ مغالطۃ العامۃ الورود، ان کی تصانیف ہیں، ان کی استعداد و قابلیت مصنف تذکرہ علماے ہند کے صرف ایک جملہ سے ظاہر ہوگی،

"بحرے بود از بحار علوم و بدرے بود بین النجوم"[۱]

مولوی عبد اللہ سیالکوٹی، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے صاحبزادے تھے، علاوہ علم و فضل کے صاحب عرفان بھی تھے، اور اپنے اخلاق و افعال میں اسلام کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے تھے، عالمگیر کو ان سے ملنے کا بہت اشتیاق رہتا تھا، ۱۰۸۰ھ میں حسن ابدال سے پیام شوق ملاقات لکھ بھیجا، دونوں کی ملاقات لاہور میں ہوئی، عالمگیر ملکر بہت ہی محظوظ ہوا، رخصت کرتے وقت خلعت خاص، دو سو اشرفیاں اور ایک ہاتھی عطا کیا،[۲]

ملا عبد اللہ اور ان کے شاگردوں کو عالمگیر نے فتاوی عالمگیری کے فارسی ترجمہ کے لئے حکم بھی دیا،[۳]

ملا محمد عوض وجیہ، شاہی لشکر کے محتسب اور احکام شرع کے سخت پابند تھے، مصنف مآثر عالمگیری کا خیال ہے کہ ان کا ایسا محتسب کوئی دوسرا نہیں ہوا، خدمت احتساب سے علحدہ ہونے کے بعد بقیہ عمر درس و تدریس میں بسر کی، ان کے فضل و کمال کا ہر صاحب علم کو اعتراف تھا،[۴]

بختاور خان، عالمگیر کا بہت ہی محبوب ملازم تھا، داروغہ خواصاں تھا، لیکن فن انشاء و تاریخ دانی

---

[۱] تذکرۂ علماے ہند ص ۱۶۷ [۲] مآثر عالمگیری واقعات ۱۰۸۰ھ [۳] مراۃ العالم، ایلیٹ جلد ۷ ص ۱۶۰ [۴] مآثر عالمگیری واقعات ۱۱۰۸ھ

میں بہت اچھی عبارت رکھتا تھا، مرآۃ العالم اسکی بہت ہی مشہور تصنیف ہے، لیکن اسکے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسکی متعدد تصنیفات و تالیفات تھیں، مثلاً جہار آئینہ جس میں جنگ جانشینی، اور اورنگزیب کی فتح و کامرانی کے احوال لکھے ہیں، سنائی کے حدیقہ کی تلخیص فریدالدین عطار کی منطق الطیر اور مولینا رومی کی مثنوی کا انتخاب بھی کیا تھا، پھر روضۃ الاحباب اور تاریخ الفی کا ایک مختصر ملخص بھی لکھا تھا، سواد اعظم کے عنوان سے ایک مجموعۂ نظم بھی تیار کیا، ایک بیاض کلام نظم و نثر اساتذہ سے ترتیب دی جس کا نام دلکشا، اور تاریخی نام مجموعہ شعرہائے رنگیں رکھا، ریاضۃ الاولیا، میں اولیا، کے احوال لکھے، "آئینہ بخت" اسکی ایک تاریخی تصنیف ہے جس میں بابر کے وقت سے شاہجہان کے عہد تک مختصر حالات اور عالمگیر کی دہ سالہ حکومت کے واقعات بتفصیل درج ہیں[1]،

اپنے علمی ذوق کی بنا پر علما و شعرا کو بے حد عزیز رکھتا تھا، اور اہل کمال و ہنر کا ہمیشہ معاون و مددگار رہا، شعرا نے اس کی مدح میں قصائد لکھے ہیں، اس کا جب انتقال ہوا تو اورنگ زیب کو بے حد افسوس ہوا، اس کا جنازہ عدالت گاہ میں منگوا کر خود نماز پڑھائی، اور کچھ دور جنازہ کے ساتھ پا پیادہ گیا، پھر اس کے نام پر فاتحہ پڑھنے اور خیرات و مبرات جاری کرنے کیلئے احکام صادر کئے[2]،

[1] برٹش میوزیم کیٹلاگ ص ۱۲۶ و معارف نمبر ۴ جلد ۲۹ ص ۲ اس کتاب پر ایک مضمون معارف نمبر ۴ جلد ۲۹ میں نکل چکا ہے، منشی احمد علی شوق مرحوم سابق مہتمم کتب خانہ رامپور کا خیال ہے کہ بختاور خان نے ابتداءً صرف بابر سے عالمگیر کے حالات لکھے، اور اوس کا نام آئینہ بخت رکھا، پھر اسی کو وسعت دیا، اور اوس کو مرآۃ العالم سے موسوم کیا، اور اس کا تاریخی نام آئینہ بخت باقی رکھا، لیکن برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات کے مرتب نے اس تالیف مرآۃ العالم کو شیخ محمد بقا (۱۰۹۴-۱۰۲۶ھ) کی تالیف قرار دیا ہے، ایلیٹ اسکو بختاور خاں ہی کی طرف منسوب کرتا ہے، مآثر الامرا کا مصنف بھی اس کتاب کو بختاور خاں ہی کی تصنیف سمجھتا ہے،

[2] مآثر عالمگیری واقعات ۱۰۹۵ھ،

ہمت خاں میر عیسیٰ، اسلام خان بدخشی کا لڑکا تھا، عالمگیر نے ایام طفلی میں اوس کی تعلیم و تربیت اپنی زیر نگرانی کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جوان ہو کر مجمع فضل و کمال ہوا، مآثر الکرام میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے،

"از سر آغاز نشو و نما بل در سن صبا بعنایت و الطاف خلد مکان سرفراز بود، و بنوازش تربیت آن شاہ ستودہ شیم ممتاز مجموعہ بود در قابلیت و کمال، نسخہ بود از فضائل خصائل پیوستہ ملاذ علما، دقیقہ طراز و مرجع سخن نہان نکتہ پرداز، سلیم النفس نیک ذات کریم الاخلاق خیر خواہ کائنات، ارباب علم و ہنر از سر اب در محفلش باریاب و کامیاب، طبع موزوں داشت[1]"

ہندی میں بھی شاعری کرتا تھا، میرن تخلص تھا[2]

ملا شفیعا یزدی، ایران سے فضل و کمال حاصل کر کے شاہجہاں کے وقت میں ہندوستان آئے، شاہجہان نے ان کی استعداد و لیاقت دیکھکر مورد لطف و کرم بنایا، اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لئے مامور کیا، ہزاری منصب سے سرفراز ہوئے، پھر بخشی گیری دوم کا عہدہ اور دانشمند خان کا خطاب عطا ہوا، ترقی کر کے میر بخشی گری اور سہ ہزاری ہشت صد سوار کے منصب پر فایز ہوئے، عالمگیر نے انھیں اپنے عہد میں پنجہزاری کا منصب عطا کیا، اور قلعۂ شاہجہان آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے، ۱۰۸۱ھ میں فوت ہوئے،

مآثر الامراء کا مصنف ان کی سوانح کے سلسلہ میں لکھتا ہے، :-

"آن امیر ستودہ شیم از کبار فضلاے زمانہ بود، بنیک نفسی و نیک اندیشی مشہور، بس از دو تا حال از نوئیسان بلند مقدار کسے کہ فضیلت را با مارت جمع کردہ باشد، در عرصۂ روزگار نشانہ[3]"

سید سعد اللہ، شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے بتیس سال تک اپنے نانا سے درس لیتے رہے، علوم عقلی و نقلی، ریاضی و سلوک حاصل کر کے بیت اللہ کی زیارت کو گئے، جہاں بارہ سال تک تعلیم و تعلم کا سلسلہ

---

[1] مآثر الامراء جلد ۳ صفحہ ۹۴۲، [2] ایضاً، [3] ر جلد ۲ صفحہ ۳۲،

جاری رکھا، شریف مکہ اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آتا تھا، بعض ناخوشگوار واقعات کی بنا پر ہندوستان آئے، اور بندر سورت میں قیام پذیر ہوئے، عالمگیر کو جب ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا، تو ان کی مدد معاش کے لئے دو گاؤں اور ایک مکان خانقاہ کے لئے دیئے، اورنگزیب کو ان کی ذات سے بہت عقیدت تھی، دست خاص سے ان کو خط لکھا کرتا تھا،[۱]

خافی خان نے منتخب اللباب جلد دوم میں عالمگیر کے عہد کے بعض اولیا و بزرگان دین کے حالات لکھے ہیں، جو صوری و معنوی حیثیت سے مجمع فضل و کمال تھے، اور جنسے عالمگیر روحانی حیثیت سے بہت زیادہ وابستہ تھا، اکثر ان کی زیارت کے لئے بنفس نفیس حاضر ہوتا تھا، ان کا ذکر یہاں پر مناسب نہیں معلوم ہوتا،

ہندو فضلا و شعرا، عالمگیر کی سرپرستی نہ صرف مسلمان فضلا، و شعرا تک محدود رہی، بلکہ اوس نے ہندو اہل علم کمال کو بھی اپنی فیاضیوں کا رہین بنایا، ہندی کا مشہور رزمیہ شاعر یعنی بیر رس کا بادشاہ بھوشن کوی کا بھائی چنتامنی کوی اورنگ زیب ہی کے سایہ عاطفت میں بڑھا، اسی کے توسل سے بھوشن کوی مغل دربار میں دہلی پہنچا، اور وہاں عرصہ تک رہا، کی اپنی ہسٹری آف ہندی لٹریچر میں لکھتا ہے، کہ "سخت گیر اورنگ زیب ہندوؤں کے فن اور علوم کا دلدادہ نہ تھا، لیکن (ہندی کے ہندو) شعرا، دربار کی اعانت اور سرپرستی سے قطعاً محروم نہیں رہے، اور بہت سے شاعر اورنگ زیب اور اس کے بیٹے بہادر شاہ کے دربار سے وابستہ رہے،" اسی حقیقت کو مولانا شبلی اس طرح واضح کرتے ہیں "عام خیال یہ ہے، کہ ہندوؤں کے علوم اور زبان سے نہایت نفرت رکھتا تھا، لیکن مسلمانوں نے بھاشا زبان پر جسقدر اس کے زمانہ میں توجہ کی، پہلے نہیں کی"[۲]

عالمگیر کے مسلمان درباریوں میں علاوہ روشن ضمیر کے[۳] اور عبد الجلیل بلگرامی بھاشا کے بہت ہی ممتاز شعرا تھے، اسی طرح ہندو درباریوں میں فارسی کے بہت ہی قابل قدر ادبا، شعرا، اور مورخین تھے جو شاہی

---

[۱] خافی خان جلد ۲ ص۶۰۸، [۲] مقالات شبلی حصہ دوم ص۳۰، [۳] اسکی نسبت غلام علی آزاد بلگرامی ید بیضا میں لکھتے ہیں، کہ نظم ہندی بسیار خوب گفتہ

ابر لطف و کرم سے برابر سیراب ہوتے رہے، ان میں سے چند کے احوال ملاحظہ ہوں[1]،

واحق کھتری، امرائے عالمگیری میں سے ایک کا وکیل تھا، اس کے نظم و نثر اور ادب فارسی کی یہ دھوم تھی، کہ ان کو سن کر شہنشاہ عالمگیر جو خود ایک بلند پایہ ادیب تھا، احسنت و آفریں کہتا تھا،

رائے بندرابن، رائے بہارامل کا بیٹا تھا، بہارامل نے ۱۰۶۹ھ جلوس شاہجہانی میں حسن خدمات کے صلہ میں رائے کا خطاب پایا تھا، دارا شکوہ نے اسکو اپنا دیوان مقرر کیا، اس کے بیٹے بندرابن کو عالمگیر نے تربیت دیا، اور رائے کا خطاب بخشا، لب التواریخ کے نام سے اپنی ایک بہترین یادگار چھوڑی ہے،

ایسر داس، قوم کا ناگر اور پٹن کا باشندہ تھا، ۳۰ سال کی عمر تک قاضی شیخ الاسلام ابن عبد الوہاب کی خدمت میں تحصیل علم کرتا رہا، شاہی ملازمین میں منسلک ہو کر جودھپور کا امین مقرر ہوا، اس نے میدان جنگ میں کارنمایاں انجام دیا، تو دوبست و پنج صدی افسر مقرر ہوا، فتوحات عالمگیری اوس کی ایک علمی یادگار ہے،

بھیم سین کایستھ، شاہی ملازمت میں بندیلہ کے حاکم کے ساتھ منسلک تھا، دکن کی لڑائیوں میں بہت ہی کارآمد ثابت ہوا، تو عالمگیر نے راؤ کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر بنایا، پھر قلعہ نالدرک کا قلعہ دار ہوا، دلکشا نام سے عہد عالمگیری کی ایک تاریخ لکھی،

سوجان رائے کھتری، پٹیالہ کا رہنے والا تھا، خلاصۃ التواریخ کے نام سے ایک نہایت صحیح اور مفصل تاریخ ابتدائے عالم سے لیکر شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد تک لکھی، اور عالمگیر کے نام سے معنون کی،

خوشحال چند، عالمگیر کے شاہی دربار کا دیوان تھا، تاریخ نادر الزمانی خوشحال کی بہترین تصنیف ہے،

---

[1] یہ تمام حالات علامہ سید سلیمان ندوی کے مختصر مضمون "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی" سے ماخوذ ہیں،

اس عہد میں ہندوؤں کے علوم و فنون کو فارسی زبان میں منتقل کرنے کی جو کوشش کی گئی، وہ عالمگیر کو بدنام کرنے والے اصحاب و مورخین کے لئے بصیرت افروز ہے، امیر زا خان بن فخرالدین محمد نے شاہزادہ اعظم شاہ کے لئے تحفۃ الہند تصنیف کی جس کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت اور عروض و قافیہ وغیرہ ہے[۱] ابو سعید الحسینی الرضوی الشیرازی نے ۴۲ سنہ جلوس عالمگیری مطابق ۱۱۱۴ھ میں ہند و علوم ہیئت و نجوم پر نظام النجم کے نام سے ایک کتاب لکھی،[۲] شیخ فقیر اللہ نے ہندی موسیقی پر ۱۰۷۳ھ میں راگ درپن کے نام سے ایک رسالہ لکھا، شیخ فقیر اللہ عالمگیری علما و امرا میں تھا، سیف خاں لقب تھا، موسیقی کا بڑا ماہر تھا، رسالہ ہذا فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک سوہل کا ترجمہ ہے، جس میں بہت سے فوائد اضافہ کئے ہوئے ہیں[۳] اس عہد کی دو اور عجیب کتابیں ہیں، مت اچھرا، اور رد الکفر، دونوں ہندوؤں کے رسوم و عقائد پر ہیں، پہلی کتاب ایک ہندو کی لکھی ہے، جس کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو ان کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اس کا لکھنے والا لعل بہاری ولد کاہید سنگھ ہے، جو بھوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا، اور اورنگ زیب کے درباری امیر اللہ وردی کا متوسل تھا، لعل بہاری نے اس کتاب کے دیباچہ میں عالمگیر کو جن الفاظ اور خلوص و عقیدت سے یاد کیا ہے، وہ ہندوؤں کے پڑھنے کے لائق ہے[۴]، دوسری کتاب رد الکفر ایک نومسلم کی لکھی ہوئی ہے، جس میں ہندوؤں کے عقائد پر تبصرہ کیا ہے،[۵]

مورخین اورنگ زیب کے درباری مورخین کی تعداد زیادہ نہیں، وقائع و اخبار نویسوں کے علاوہ صرف ایک درباری مورخ منشی محمد کاظم تھا جس نے عالمگیر کی حکومت کے دس سالہ واقعات عالمگیر نامہ میں لکھے منشی

۱؎ اس کتاب پر مولینا شبلی کا مضمون مقالات شبلی ادبی جلد دوم میں ملاحظہ ہو، ۲؎ اس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں موجود ہے، ۳؎ ماثر الامرا جلد دوم ص ۲۴۳، ۴؎ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ جامعہ ملیہ لائبریری دہلی میں موجود ہے، اس پر علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مضمون معارف نمبر ۶ جلد ۲۳ میں ملاحظہ ہو،

۵؎ ایضاً

محمد کاظم مرزا محمد امین منشی[1] مصنف پادشاہ نامہ کا لڑکا تھا، اس کے ادب و انشاء کے چند نمونوں کو دیکھ کر عالمگیر نے اسے اپنے عہد کے حالات لکھنے کے لئے مامور کیا، لیکن دس سال کے واقعات وہ لکھنے پایا تھا، کہ عالمگیر نے دربار کے محکمۂ تاریخ نویسی کو تخفیف کر دیا، اس کی خاکسار طبیعت پسند نہیں کرتی تھی، کہ اس کے مفاخر و مکارم کی داستان گوئی کے لئے ایک سرکاری بزم قائم کرے، عالمگیر نامہ کے مقدمہ میں ہے،:-

"وچون بندگان حضرت اعلیٰ خاقانی بمقتضائے دانش خداداد و فطرت بلند و علو ہمت و وسعت حوصلہ ابقاء آثار ظاہر را درجنب محو ان وقعتے ننہادہ تبا سیس مآثر باطن بیشتر توجہ داشتند بعد از تدوین واقعات دہ سالہ حکم حقیقت شیم صادر شد کہ گذارندۂ داستان مفاخر و مکارم محمد کاظم مصنف کتاب مستطاب عالمگیر نامہ من بعد وقائع را بقید کتاب درنیاورد و لہذا او ہم بدان قدر اکتفا نمودہ[2]"

مآثر عالمگیری کا مصنف بھی اپنے دیباچہ میں اسی بات کو ظاہر کرتا ہے،

"واضح باد کتاب بلاغت نصاب والاخطاب عالمگیر نامہ متضمن وقائع دہ سالہ دولت ابد طراز.... ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی نگاشتہ خامہ بدائع نگار مرزا محمد کاظم سرآمد سخن سنجان نادر کار است و چون خدیو عالم صورت و معنی و واقف اسرار بلندی و پستی را تاسیس بنائے باطن مقدم بر اظہار آثار ظاہر بود راقم از تسوید ممنوع شد،"

مگر آزاد اہل قلم جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں، اس عہد کی تاریخ برابر لکھتے رہے، ان میں سے بعض ہندو مورخوں نے اپنی تاریخیں عالمگیر کے نام سے معنون کیں، اور ان کو بہ تقریب ہدیہ دربار میں لیکر حاضر ہوئے،[3]

---

[1] مرزا محمد امین کا ذکر گذشتہ مضمون میں آچکا ہے، [2] مقدمہ عالمگیر نامہ ص، [3] عہد عالمگیر میں تاریخ نویسی" کے عنوان کو جناب سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین کا ایک مدلل مضمون معارف نمبر ۶ جلد ۴۳ میں ملاحظہ ہو،

مدارس برنیر نے شہزادوں کی ابتدائی تعلیم کے متعلق اورنگ زیب کی زبانی ایک دلچسپ اور پر مغز تقریر نقل کی ہے[1] جس سے اورنگ زیب کا تعلیمی نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے، لیکن برنیر کا بیان عموماً سنجیدہ اور وقیع نہیں ہوتا اسلئے ہم اسکو نظر انداز کرتے ہیں خصوصاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ اورنگزیب نے یہ تقریر اپنے ایک استاد ملا محمد صالح سے کی تھی، جسکا نام ہمعصر موقر تاریخوں میں کہیں نہیں آتا،

عالمگیر کو جو علم و ہنر سے شغف تھا، اس کا اقتضا، یہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت میں اسکی ترویج ہر ممکن صورت سے کرے چنانچہ اسنے تمام شہروں اور قصبوں میں مدارس و مکاتب قائم کئے، لائق اساتذہ مقرر کئے، اور طلبہ کو وظائف دیئے، عالمگیر نامہ کے مصنف کا بیان ہے؛

> "و از آنجا کہ توجہ خاطر دانش آثار بترویج مراتب فضل و تاسیس معالم علم درجۂ قصوی دارد و در جمیع بلاد وقصبات ایں کشور وسیع فضلا و مدرسان را بوظائف لائقہ از روزیانہ و املاک موظف ساختہ بشغل تدریس و تعلیم محصلان علوم گماشتہ اند، و برائے طلبۂ علم در ہر مولی و ناحیۂ وجوہ معیشت درخور رتبہ و حالات و استعداد مقرر داشتہ و ہر سالہ بدیں وجہ نیز از خزائن احسان پادشاہانہ مبلغہائے معتد صرف می شود، و از فیض کرمت و افضال شہنشاہ ابر کف دریا نوال طالبان علم و کمال سمت افزونی پذیرفتہ فشرح البال و مرفہ الحال بکسب و تحصیل علوم اشتغال می ورزند، و برکات دعائے اجابت اثر آن گروہ سرمایۂ بقاے این دولت آسمانی شکوہ می گردد[2]،"

گجرات میں جو مدارس قائم ہوئے، اور وہاں کے طلبہ کو جو سہولتیں پہنچائی گئیں، اس کا حال مراۃ احمدی میں اس طرح درج ہے،

---

[1] دیکھو وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر مترجمہ سید محمد حسین ص ۲۹۵ ۔ [2] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۶ - ۱۰۸۵ انگریز مورخوں نے بھی اس کی شہادت دی ہے کہ اورنگزیب نے زراعت کو ترقی دیا، باضابطہ سڑکیں بنوائیں، اور بے شمار مکاتب و مدارس قائم کئے، (کین ۔ موغل امپائر)

"بنام کرمت خان دیوان صوبہ صادر شد، چوں حکم مقدس معلی در جمیع صوبجات ممالک محروسہ شرف نفاذ یافت کہ در ہر صوبہ مدرس تعیین نمایند و طلبہ علم از میزان تا کشاف خوان باستصواب صدر صوبہ موافق تصدیق بطریق رسان وجہ علوفہ از تحویل خزانچی خزانہ آن صوبہ می دادہ باشند، دیں والا سہ نفر مدرس در احمد آباد و پٹن و سورت و چہل و پنج نفر طلبہ علم اضافہ در صوبہ احمد آباد مقرر شد"[۱]

اسی عہد میں شیخ محمد اکرام الدین نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپئے کے خرچ سے ایک مدرسہ کی عمارت بنوائی، عالمگیر نے اس مدرسہ کے اخراجات کے لئے موضع سوندرہ پرگنہ سانولی و موضع سبھیلہ عملہ پرگنہ کرای وقف کیا، اور ساتھ ہی ساتھ دو روپیہ یومیہ محتاج طلبہ کے لئے بھی مقرر کیا،[۲]

---

[۱] مراۃ احمدی ص ۳۰۹ تاریخ فرح بخش مصنفہ محمد فیض بخش و مترجمہ ولیم ہوئی سے نریندر ناتھ لا نے نقل کیا ہے کہ اورنگزیب میزان کے پڑھنے والے طلبہ کو ار نصف پڑھنے والے کو ۲ر شرح وقایہ اور فقہ پڑھنے والوں کو ۸ر روزینہ دیا کرتا تھا۔

[۲] مراۃ احمدی جلد اول ص ۲۷۲، اورنگزیب نے گجرات کے بوہروں کی تعلیم کے لئے بھی اساتذہ مقرر کئے، تاکہ اون کی صحیح تعلیم ہو، اون کے ماہانہ امتحان کے نتائج براہ راست اس کے پاس بھیجے جاتے تھے، (مراۃ احمدی جلد اص ۲۷۸-۲۷۷) برنیر کے بیان کے مطابق اورنگزیب نے فرنگی محل لکھنؤ میں بھی ایک مدرسہ قائم کیا،

مقدمہ رقعات عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشاء، اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ ہندوستان کے صیغہ انشار کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، حجم ۱۰۴ صفحے، قیمت للعہ

"منیجر"

آزادی کا اخلاقی مفہوم

از

جناب پروفیسر مقصود ولی الرحمٰن صاحب ام اے

(۴)

۱۲- مزید اعتراضات کا جواب،

پچھتاوے اور ملامتِ ذات کے احساسات کو جبری عقیدے کے مطابق ناقابلِ توجیہ سمجھا جاتا ہے، بعض فلاسفہ کے نزدیک تو یہ احساسات جبریت کے خلاف برہانِ قاطع ہیں لیکن اگر یہ احساسات اخلاقیات کے لئے لازمی ہیں، تو کیا جبریت میں یہ جون کے توں باقی نہیں رہتے؟ جس طریقے سے زندگی کی ایک خاص صورت خواہ وہ ذہنی ہو یا جسمانی، ترقی پذیر ہوئی ہے، اور اس کی توجیہ سے اس زندگی کی اصلی ذاتی قیمت و وقعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا جسم انسانی کے شست ارتقاء کے نظریے کی وجہ سے اس جسم کے حسن میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوئی، اسی طرح جبریت کے عقیدے کے مطابق بدکار اتنا ہی بدکار رہتا ہے، اور نیکوکار اتنا ہی نیکوکار، قیمت کے متعلق ہماری تصدیقات میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، بدکار اپنے عمل کو اچھا نہیں کہہ سکتا، وہ مجبور ہے کہ اپنی سیرت پر نفریں کرے، اگر وہ اخلاقاً روشن طبع ہے، تو وہ اپنے برے ماضی کو ناپسند کریگا، اور گذشتہ اور موجودہ ذات کی طرف سے بے اطمینانی تغیر کی ایک شرط ہے، جب تک کہ وہ موجود رہتی ہے، اسوقت تک گویا دوسری پیدائش کا ایک اصول برابر کارگر رہتا ہے، جس کی وجہ سے ایک حقیقی توبہ، بدی سے اجتناب اور نیکی کا انتخاب ممکن ہوتا ہے، لیکن یہ احساس صرف ہماری

زندگی کے تسلسل حال کے ماضی پر، اور مستقبل کے حال و ماضی پر انحصار رہیں اور ان کی وجہ سے کام کرتا ہے، اگر یہ انحصار نہ ہو، اگر میں آج کل گذشتہ سے، اور کل آیندہ آج سے مختلف ہوں، تو ماضی کے جن تاسفات کا میں آج پھل پاتا ہوں، ان کے مہیا کئے ہوئے محرکات اصلاح ذات، کوشش کی روزافزوں کامیابی جو عادت کا نتیجہ ہوتی ہے، اور ایک بہتر مستقبل کا یقین جو اس کوشش میں جان ڈالتا ہے، یہ سب ناممکن ہوجاتے ہیں؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جبری نظریہ کے مطابق بدی کا مسئلہ جاسۂ اخلاقی کے لئے مکروہ ہوجاتا ہے کیونکہ اس عقیدے کو تسلیم کر لینے سے ہم مجبور ہوجاتے ہیں، کہ بدترین جرائم کو عالمی نظام کا لازمی عنصر سمجھیں، لہذا کہا جاتا ہے کہ خدا کو اخلاقی اور جسمانی بدی کا بار برداشت کرنا چاہئے، لیکن کیا یہ صورت انسانی ارادے کے کسی عقیدے کو بھی تسلیم کرنے سے پیدا نہیں ہوتی؟ یہ صحیح ہے کہ کوئی شخص بھی خود اپنے اعمال کی براہ راست اور فوری ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ خالق عالم بھی اس عالم کا جسکو اس نے پیدا کیا ہے، ذمہ دار ہے، استدلال کی خاطر ہم مطاع الکل کے اس تخیل کو تسلیم کئے لیتے ہیں، جو زمانۂ ماضی کی دینیاتی دنیا میں بہت مقبول رہا ہے، اور جواب بھی عوام کے تفکر میں عام طور پر مسلم ہے، اس تخیل کے باوجود یہ نتیجہ لابدی ہے کہ اگر ایسی ہستی انسانوں کو آزاد پیدا کرنے کا فیصلہ کرے، تو وہ اپنے اس فیصلے کے تمام عواقب و نتائج کی ذمہ داری سے اگر بچ سکتی ہے، تو صرف اس صورت میں کہ وہ عین اُن صفات سے دست بردار ہوجائے، جن کو مذہبی تفکر اس کی ماہیت میں داخل کرتا ہے، غیر محدود طاقت وعلم اور محدود ذمہ داری کے تخیلات میں سخت تضاد ہے، کوئی نظریہ بھی اس تضاد کو تشفی بخش طریقے سے حل نہیں کرسکتا، پھر ایک ایسی ہستی کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو ان تمام صفات سے متصف ہوکر بھی ایک ایسی دنیا پیدا کرتی ہے، جس میں بخت و اتفاق کا عنصر موجود ہے، اور جس میں اس اتفاق کے حسن اتفاق بننے کا اتنا ہی امکان ہے، جتنا کہ سوئے اتفاق بننے کا[1]، پھر انسانی تجربے کے گھنے جال میں سے طبعی اور اخلاقی بدی کے محدود

---

[1] مترجم کا مصنف کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں،

کو الگ الگ کرنا بھی ناممکن ہے، دنیا کو اخلاقی بدی کے بار سے ہلکا کرنا، مسئلہ بدی کے حل، یا اس کو آسان کرنے کے ہم معنی نہیں، جن بدترین جرائم کو اختیاریت آزاد ارادے کی طرف منسوب کرتی ہے، وہ ان تکلیفوں اور ذلتوں کی وسعت و مدت کے سامنے جو اور وجوہ سے پیدا ہوتی ہیں، ہیچ ہو جاتے ہیں چنانچہ کوئی شخص بھی اتنا خبیث نہیں ہو سکتا، دنیا میں دردناک ادر کریہ امراض پھیلا کر اسکو عمداً اور بالتواتر بدی میں مبتلا کرے۔ انسانی انتخاب میں جو بدی نظر آتی ہے، وہ دراصل ایک بڑے مسئلہ کا جزو ہے،

لیکن اسکو نہ بھولنا چاہیئے کہ اختیاریت کے عقیدے کا اطلاق دونوں سمتوں میں ہونا چاہیئے، اگر دینی بنا پر خدا کو انسانوں کے برے انتخابات کے بار سے ہلکا کرنے کے لئے اختیاریت میں پناہ ملتی ہے، تو انسان کے اچھے انتخابات بھی اس کی طرف منسوب نہیں کئے جانے چاہئیں، اگر انسانی فعل کے سب کچھ ہونے یا کچھ نہ ہونے کو خدا کی طرف منسوب کرنے میں کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے، تو نیکی کے بدی پر غالب ہونے کو تسلیم کر لینے کے بعد ہم مذہبی بنا پر مقدم الذکر ہی کا انتخاب کریں گے، یہ بات کہ ہم میں جتنی نیکی ہے، اس کا سرچشمہ بالآخر وہ طاقت ہے، جو ہم نہیں، ایک ایسا واقعہ ہے، جس کو ہر زمانے کے اچھے اور بڑے آدمیوں نے کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کیا ہے، جب ہم ان بدبخت ہستیوں کی شومئی قسمت پر غور کرتے ہیں، جن کے لئے بدی وراثتہً مقدر ہو چکی ہے، اور جن کے لئے ایک افسوسناک ماحول نے اس پیشے اور انتخاب کو یقینی بنا دیا ہے، "تو ہم روشنی اور مدد کے لئے اس سرچشمہ کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں، جس نے ہم کو ایسے ہی انجام سے بچایا ہے، ہمارا عمیق ترین شعور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتا ہے "ہمارے لئے نہیں، ہمارے لئے نہیں" اب رہ گیا وہ مذہبی سوال، جو یہاں اس بحث میں پیدا ہوتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کو خدا اور دنیا کے ساتھ اس کے تعلق پر ہر طریقے سے فکر کرنا سیکھنا چاہیئے، ہم کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ خدا اپنے تمام انتخابات متقابل محرکات کی موجودگی میں کرتا ہے، یا یہ کہ وہ مجوزہ دنیا کے سامنے اسی طرح کھڑا ہوتا ہے، جس طرح ایک کاریگر اپنی بنائی ہوئی چیز کے سامنے،

جیسا کہ پہلے دکھایا جا چکا ہے، جبریت اس کا عقیدہ نہیں، یہ ہر اس شخص کو بدی سے نجات پانے کی امید

والی ہے جو سیکھنے کے قابل ہے، اور زندگی کے تجربوں سے عقل حاصل کر سکتا ہے، ہمت صرف اسوقت ٹوٹتی ہے اور اخلاقی قوت صرف اسوقت غائب ہوتی ہے، جب ذات پر قسمت کے نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے، اس کے برعکس جبریت اخلاقی زندگی کے بعض اہم عملی پہلوؤں پر زور دے کر محرک عمل مہیا کر سکتی ہے، عمل پر لازمی تعلق کے اصول کے اطلاق کا ایک نتیجہ یہ ہے، کہ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر بعد کا فعل ماقبل کے افعال سے اس طرح ملا ہوا ہے، جس سے عادت کی اہمیت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے، ہر بعد کے انتخاب میں اس شخص کی تمام گذشتہ زندگی بروئے کار آتی ہے، لہذا موجودہ اخلاقی عمل کا مفہوم اور گہرا ہو جاتا ہے، میں جو کچھ آج کرتا اور سوچتا ہوں، وہ میرے کل کے کرنے اور سوچنے کے لئے بہت گہرے اثرات رکھتا ہے، اگر یہ صحیح ہے، کہ کوئی معلول بغیر علت کے نہیں ہو سکتا، تو یہ بھی صحیح ہے، کہ کوئی علت بغیر معلول کے نہیں ہو سکتی، لہذا کسی جادو کے زور سے نہیں، بلکہ بالکل طبعی اور لازمی طریقے سے یہ خیال ترازو کے اس پلڑے کو جھکا سکتا ہے جس میں موجودہ انتخابات تولے جا رہے ہیں، یہی یقین کہ ہم اس طرح معین ہوتے ہیں، بہ ذات خود ہم کو بدی سے روک کر نیکی اختیار کرنے میں مدد دیکتا ہے، اس تعلیم کے عمرانی نتائج بھی کچھ کم وقیع نہیں، اس طرح ہر عمرانی فعل ایک نئے معنی کسب کر لیتا ہے، عمرانی تعلقات کی ذمہ داری سے کون بچ سکتا ہے، ؟ ہمارے افعال خالی خولی ہماری طرف عود نہیں کرتے، بلکہ انسانی تاریخ کے اس بڑے جال میں یہ تمام افعال ایک ایسی طاقت سے کام کرتے ہیں، جس کی صحیح وسعت کو ہم جانچ نہیں سکتے، لیکن ان کو ناگزیر سمجھنا ہی پڑتا ہے،

۱۳۔ ذمہ داری سزا،

مندرجۂ بالا تمام بحث میں ہم نے آزادی کی ایک نئی تاویل کی ہے، جس کے نہ صرف نظری، بلکہ عملی مقاصد بھی مقتضی تھے، یہ صحیح ہے کہ تعلیم، سزا، حکومت، عمرانی جد وجہد، وغیرہ تمام معاملات میں عوام کا تفکر جبریت کے مطابق ہوتا ہے، لیکن بہ لحاظ صورت یہ اختیاریت کے قریب ہوا کرتا ہے، یہ صورت حال کچھ شعور کے فتوؤں کی غیر ناقدانہ تخمین کا نتیجہ ہے، اور کچھ بعض ان نظریات کا جو قانون اور دینیات میں عرصے

سے جاری ہیں، لہذا معلوم یہ ہوتا ہے کہ عوام کا تفکر خود اپنے سے متناقض ہے، اب اخلاقی نظریہ یا تو نا قابلِ بحث نزاع کو تسلیم کرے، یا ان کو دوبارہ شکل دینے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرے، اخلاقی تفکر کا یہ کام نہیں کہ تجربے کی ٹھوس زمین کو چھوڑ کر ہوا میں معلق ہو جائے، عملی معاملات میں فہم عامہ کی تصدیقات کی تردید بھی اس کا مقصد نہیں اعمال کی نئی صورتوں کی تخلیق بھی اس کا اولیں وظیفہ نہیں، بلکہ اس کا اصلی کام پہلے سے موجودہ صورتوں کی توجیہ ہے، اخلاقی نظریہ کسی چیز کو مٹاتا نہیں، بلکہ اس کی تاویل کرتا ہے؛ زیر بحث سوال میں یہ فہم عامہ کی اختیاریت کے مرکزی معنوں کی تردید نہیں کرتا، اور آزادی اور ذمہ داری کے لئے حقیقی اخلاقی مفہوم کے تحفظ کے یہی معنی ہیں، ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جبری نظریے کے مطابق اخلاقی آزادی ایک بے معنی نصب العین نہیں، بلکہ ایک حقیقی واقعہ ہے، جس کے ساتھ واضح معنی شریک ہو سکتے ہیں؛ آزادی ایک غیر معین ارادے کے ہم معنی نہیں، یہ ایسے ارادے کے مساوی ہے، جسکو فہم و بصیرت نے معین کیا ہے، اب ذمہ داری کے مسئلے پر مختصر بحث باقی ہے،

صفائی کی خاطر ہم اس بحث کو اخلاقی مسئولیت، یا ذمہ داری کے بجائے طبعی مسئولیت کے تخیل سے شروع کر سکتے ہیں، ان معنوں میں مسئولیت عمیم الاطلاق ہے، چنانچہ ان ہی معنوں میں ہم ایک شہر میں گندے پانی کے استعمال کو وبا پھیلنے، اور کسی ملک کی آب و ہوا، وہاں کے باشندوں کی خصوصیات کا ذمہ دار کہتے ہیں، اسی طرح فصل کی خرابی کسی خاص قسم کی گھاس کے نکلنے کی طرف منسوب کیجاتی ہے، مجنوں اپنے شدائد کا جواب دہ ہوتا ہے، اور احمق اپنی بدتہذیبی کا، اس استعمال میں اس اصطلاح کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ زیر بحث شخص یا چیز بعض حالات یا واقعات کا بلا واسطہ سرچشمہ ہے، یہ ظاہر ہے کہ اخلاقی ہستیاں بھی ان ہی معنوں میں اپنے افعال کے جواب دہ ہوتی ہیں، یعنی ان کو ان افعال کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے، اس کے علاوہ یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ باہم لازمًا مربوط واقعات کی دنیا میں کوئی چیز بھی اپنی فطرت و ماہیت کے نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتی، گندا پانی صاف نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح بیماری پیدا کرنے والی ہوا بحث بخش

نہیں کہلاتی، جو گھاس قصل کو خراب کرتی ہے، اسکو نکال کر پھینک دیا جاتا ہے، مجنون پاگل خانے میں بند کردیا جاتا ہے، اور احمق کو اس کی حماقت کی سزا ملتی ہے، جن لوگون کو اندیشہ ہو کہ ذمہ داری کی نئی تاویل اخلاقی نظام کی بیخ کنی کرے گی، ان کو طبعی مسئولیت کے نقطۂ نظر سے بھی مطمئن رہنا چاہیئے، سوسائٹی اپنے افراد کو ان کے افعال کے مطابق جانچتی ہی رہے گی، جو شخص عمرانی بدی پھیلائے گا، اسکو بدی کا سرچشمہ ہی کہا جائیگا اور وہ اپنے افعال کا جواب دہ رہے گا،

لیکن اس بات سے سب اتفاق کرین گے، کہ اخلاقی ذمہ داری میں اُس جواب دہی یا مسئولیت کے علاوہ اور بہت کچھ شامل ہے جس پر اب تک غور ہو چکا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو انسان اور درخت یا حیوان کی ذمہ داری میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا، وہ کونسا عنصر ہے، جس سے اخلاقی ذمہ داری مرکب ہوتی ہے، ہم یہاں فہم عامّہ کے جواب کو تسلیم کر سکتے ہین، لیکن یہ خیال رکھنا چاہیئے، کہ فہم عامّہ کو مجبور کرنا چاہیئے، کہ وہ ان معنوں کو محض بیان کرنے کے علاوہ ان کی توضیح بھی کرے، فہم عامہ کا جواب بلاشبہہ یہ ہوگا، کہ انسان صرف اس وجہ سے اخلاقاً ذمہ دار ہے، کہ وہ آزاد ہے، اور یہ صحیح بھی ہے، بہ شرطے کہ ان اصطلاحات کے صحیح معنی لئے جائیں، لیکن اس موقع پر پھر ہم کو ایک آزاد شخص کے تمیزی نشان کی تلاش کرنی پڑتی ہے، ہم کو ایک ایسی خصوصیت درکار ہے، جو آزاد انسان، اور غیر آزاد اشیا یا اشخاص، مثلاً درخت حیوان، مجنون، احمق اور بچے میں مابہ الامتیاز ہو، یہاں فہم عامّہ بلا تامل انسان کی عقل، اور اس کی تدبر کرنے والی اور ذی عقل فطرت کی طرف اشارہ کرے گی، جن کی وجہ سے وہ تصوّرات کو وصول کر سکتا ہے، اور تربیت سے متاثر ہو سکتا ہے، اور جن کی وجہ سے وہ خود اپنی رہنمائی کرنے والا فاعل بن سکتا ہے، لیکن اس کا مطلب ہے، کہ انسان کے افعال غایت کے تصوّر کے مطابق یعنی محرکات کا نتیجہ ہوتے ہین، اور یہی اسکے افعال کو معین کرتے ہیں، ہم سے کہا جاتا ہے کہ مجنون اور احمق ذمہ دار اس وجہ سے نہیں ہوتے، کہ وہ تربیت پذیر نہین وہ تصورات کو وصول نہیں کر سکتے، اور محرکات ان کی تعیین نہیں کر سکتے، پھر اس پر بھی اتفاق کیا جائیگا

کہ تربیت پذیری، اور محرکات سے رہنمائی کی یہ قابلیت ہی ذمہ داری کے درجے کو معین کرتی ہے یہی بچپن میں ہ
افراد ذمہ داری کے مختلف درجوں کی نشان دہی کرتی ہے، یہی ذمہ داری کے ان درجوں کی پیمایش کرتی
ہے جو ہم مختلف سقیم یا فاسد اصناف کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور قانونی نقطۂ نظر سے بھی یہی ذمہ داری
کا معیار ہے، اس اصول میں کوئی استثناء نظر نہیں آتا، یا تو جانوروں کے ساتھ جو سلوک ہم کرتے ہیں اس
میں انسانی ذمہ داری کی دلچسپ شبیہہ دکھائی دیتی ہے، ان کو ہم ان کے عقل اور تربیت پذیری کے درجے
کی مناسبت سے ذمہ دار سمجھتے ہیں،

لیکن اس کے بعد بھی کہا جائے گا کہ امتحانی نکتہ تو ابھی جوں کا توں باقی ہے، کیا ہم انسانی افعال
کو لازمی اور جبری کہنے کے باوجود انسان کو ذمہ دار گردانیں گے،؟ اس کا جواب فہم عامہ کی تصدیقات کے
مطابق بھی غیر مشتبہ ہے، اور فہم عامہ کی انہی تصدیقات کی روشنی میں ہم یہاں بحث کر رہے ہیں، اس میں
شبہہ نہیں کہ ہم ایک شخص کو اس کے لازمی اور جبری افعال کا ذمہ دار گردانتے ہیں، بشرطیکہ یہ لزوم جبر خود
اس کی فطرت کی طرف سے ہو، نہ کسی اور خارجی طاقت کی طرف سے، اور یہ کہ یہ فطرت محرکات کے تعینی اثرات
کی وجہ سے قابلِ اصلاح ہو، معمولی انسانوں کے عام افعال میں یہ شرائط بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں، ایک گرم
مزاج اور زود رنج باپ اپنے بچے میں گرم مزاجی اور زود رنجی کو دیکھ کر سمجھتا ہے کہ وہ بچہ خود اس کا آوتار ہے
لہذا وہ اس تمام حالت کو ایک ایسے موروثی میلان کا بالکل طبعی اور لازمی اظہار خیال کرتا ہے جس کے خلاف
خود اس نے تمام عمر جہاد کیا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ بچے کو پوری طرح ذمہ دار گردانتا
ہے، تجربے سے باپ نے اس گرم مزاجی اور زود رنجی کی برائیوں اور حماقتوں کو معلوم کر لیا ہے، اور وہ
بچے کو اس کے کسی اور فعل کے مقابلہ میں اس فعل کا زیادہ ذمہ دار گردانتا ہے، کیونکہ اسکو یقین ہو کہ
تربیت و تادیب بے اثر نہ رہے گی، یہ خیال غلط ہے کہ اگر ہم کسی فعل کو لازماً معین یا معلومہ حالات میں ناقابل
تغیر سمجھتے ہیں، تو اس کی مسئولیت ختم ہو جاتی ہے، واقعہ یہ ہے، کہ ہم اپنے آپ کو حسین اور

افعال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، جو خود ہماری فطرت کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں، اور جن کو ہم خود اپنی سیرت کے کسی تعین کرنے والے عنصر کی طرف منسوب کر سکتے ہیں، بقول گرین "اگر کسی شخص کا فعل اس کی سیرت کو نہیں، بلکہ بلا محرک ارادے کی کسی ناقابل توجیہ قوت کو ظاہر کرتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ اسکو اس پر شرم آئے، یا وہ خود اپنے آپ کو ملامت کرے" جن مثالوں میں اخلاقی ذمہ داری کا درجہ، فہم عامہ یا قانونی عدالتوں کے نزدیک بہت کم ہوتا ہے، وہ وہ ہوتی ہیں، جن کو فاعل کی اپنی سیرت معین نہیں کرتی، یا جن میں کسی خرابی کی وجہ سے اس سیرت پر محرکات کا اثر نہیں ہو سکتا، آزادی کا جو عقیدہ آزادی کو خود تعینی کے ساتھ متحد قرار دیتا ہے، اس کی تائید میں قوی ترین دلائل میں سے ایک یہ واقعہ بھی ہے، کہ اس کے ذریعے سے ہم اخلاقی ذمہ داری کے واقعات کی تاویل روزمرہ زندگی کی صحیح اخلاقی تصدیقات کے مطابق کر سکتے ہیں، یہ تصدیقات جس نظریئے کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، گو اُن کے مطابق یہ غلط ہوتی ہیں لیکن عملاً اُنکی صحت غیر مشتبہ ہے،

سزا کے اخلاقی پہلو، زیر بحث مسئلے کے تعلق سے اتنے اہم ہیں، کہ اس موقع پر ان کا ذکر بھی ضروری ہے، اگر سزا کسی شخص کے لئے کوئی اخلاقی قیمت رکھتی ہے، اور وہ محض عمرانی حفاظت کا طریقہ نہیں ہے، تو اُن پیچیدہ ذہنی حالات میں بصورت تعیینی عنصر اس کے داخل ہونے کے امکان ہی سے اسکے حدود مقرر ہو جاتے ہیں جن سے فاعل کے آیندہ افعال صادر ہونے والے ہیں، جزا و سزا کا جواز صرف اسی لئے ہے، کہ اس کی وجہ سے محرکات بروئے کار آتے ہیں، لیکن جیسا کہ ہم اس سے قبل دیکھ چکے ہیں اختیاری عقیدے کے مطابق یہ دونوں اسی حد تک بے اثر ہیں جس حد تک کہ اختیاریت صحیح ہے، مختصر یہ ہے کہ معین و مجبور ارادہ ہی وہ ارادہ ہے، جو اخلاقی تعلقات میں کام آسکتا ہے،

لیکن ظاہر ہے کہ سزا کی ایک صورت مندرجۂ بالا بیان سے مستثنیٰ ہے، اور وہ یہ انتقامی سزا ہے جس سے مظلوم کی تشفی ہوتی ہے، اور جس میں نتائج و عواقب ملحوظ نہیں رہتے، اگر سزا بدکار کی اصلاح

سوسائٹی کی حفاظت میں کارگر نہیں ہوتی، تو اس کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے، اور وہ محض بے کار اور ضبیثانہ لیذا
سانی بن جاتی ہے، سزا سے انتقامی عناصر کو خارج کر دینے کا روز افزوں میلان اخلاقی ترقی میں بہت اہم ہے
س سزا میں یہ انتقامی عنصر داخل ہے، وہ ہر شخص کے لئے انسانیت سے معرا کرنے والی ہے، اسلئے زمانۂ وحشت
کی اور چیزوں کی طرح اسکو بھی مٹ جانا چاہئے، انسانی فعل کی جبری توجیہ کے بہترین اثرات میں سے ایک اثر
یہ بھی ہے، کہ اس سے اپنے ابناے جنس کی ہمدردی پیدا ہوتی ہے، عمل کے گہرے سرچشموں کا سمجھنا ہر حقیقی و صحیح رحم
کے لئے اتنا ہی ضروری ہے، جتنا سر عادلانہ مانعت کے لئے، اگر اس رحم میں انسان کی برائیاں اور حماقتیں بھی
شامل ہوں، تب بھی یہ خطرناک یا مشفقانہ رحم نہیں بنتا کیونکہ یہ نہایت وضاحت کے ساتھ اس بات کو پیش نظر
رکھتا ہے، کہ عمرانی نظام میں ایسے مؤثر محرکات کام کر رہے ہیں، جو بدی کو روکتے ہیں، اس لئے وہ ایک
ہاتھ تو کمزوروں اور خطاکاروں کے ساتھ ہمدردی کی طرف بڑھاتا ہے، اور دوسرا ان کی سخت روک
تھام کی طرف،

۴۱-جبریت کا خیال زندگی کی طرف،

آخر میں آزادی اور ذمہ داری کی اس تاویل کے عملی نتائج پر غور کرنا بہتر ہوگا، جو ہم نے گذشتہ اوراق
میں پیش کئے ہیں، یہ بلاشبہہ صحیح ہے، کہ کوئی محتاط فکر کرنے والا شخص کسی نظریے کے فوری عملی اثر کو اس کی
نہائی صداقت کا معیار نہیں مانتا، ہم کو اس سے انکار کرنے میں بھی تامل نہ ہونا چاہئے، کہ تاریخی حیثیت سے
عقلی غلطی نے بعض اوقات بڑے اچھے نتائج پیدا کئے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خطا صواب کے برابر مفید ہے
اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ انسانی ارتقا کے ایک خاص درجے میں کسی مسئلے میں عقیدے کی غلطی دوسری
مروجہ غلطیوں اور علم کی مجموعی حالت کے ساتھ ایسا اچھا توازن رکھتی تھی، کہ صداقت و صواب نہ رکھ سکتے تھے،
پھر اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ غلطی نفس اپنے نقائص اور کمزوریوں کی وجہ سے نہایت عمدہ عملی محرک بن گئی،
اعلیٰ قسم کی شہادت کے لئے یہ محرکات بالکل غیر موثر ہو جاتے ہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ غلطی کی آخری خوبی کے خلاف

ہمارے اتفاقات داذعانات صد اسے احتجاج بلند کرتے ہیں، ہم میں سے ہر ایک کا ایمان ہے، اور اسکی تائید میں کافی شہادتیں ہیں، کہ صواب کو جاننا اور اس پر عمل کرنا بہتر ہے، لیکن قصہ یہ ہے کہ اختیاریت نے جبریت کو اس کے مفروضہ عملی نتائج کی بنا پر رد کیا ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس مناقشے کا بھی فیصلہ کرلیا جائے، اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے، کہ اخلاقیات میں ہم نظریۂ عمل پر بحث کرتے ہیں، لہذا اگر یہ معلوم ہو جائے، کہ یہ نظریہ ایسا ہے جس کے مطابق انسان زندگی بسر نہیں کرسکتا، یا یہ اعلیٰ اخلاقی جد وجہد کے لئے مہلک ہے، تو پھر یہ نظریہ مہلک طور پر عیب ناک ہو جاتا ہے، اب سوال دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ انسانی عمل کی اس تاویل کے نتائج کیا ہیں؟ ایک عقیل اور فہیم شخص اس کے مطابق کیسے زندگی بسر کریگا؟ بلاشبہ وہ کوئی نامناسب خاطر جمعی، یا فخر محسوس نہ کریگا، اگر وہ اپنے آپ میں کوئی اچھی، یا قیمتی چیز پائے گا، تو وہ یہ بھی معلوم کرلے گا، کہ ان کا سرچشمہ خود اس کا پیدا کردہ نہیں بلکہ وہ عالمی نظام کی کسی گہرائی میں پوشیدہ ہے، بصیرت کی ہر خلقی قوت، سیرت کی ہر اطمینان بخش و مسرت انگیز میزان، عروج پانے کا ہر ہیجان ہر جگہ اس چیز کی شناخت کرے گا، جو اس کے لئے ایک تحفہ ہے، پھر احول کی ان ہزاروں قوتوں کو بھی وہ ایسا ہی سمجھے گا، جن سے اس نے اپنی تقدیر بنائی ہے، اسلئے جب وہ اپنا مقابلہ اپنے اس ہمنشین سے کرے گا، جس کو غلطی نے اندھا بنادیا ہے، اور جو بدی کا غلام ہے، تو اسکو معلوم ہوگا، کہ اس تحفے کی غیر موجودگی میں وہ بھی اتنا ہی مصیبت زدہ ہوتا، اگر وہ اس بدی کو، جو وہ اپنے آپ میں پاتا ہے اسی نگاہ سے دیکھتا ہے، تو اس کا یہ عقیدہ اس بدی کی سنگینی کو کم نہیں کرسکتا، اور نہ حصول کمال کی کوشش میں اس کی وجہ سے کوئی کمی واقع ہوسکتی ہے، وہ اس درد انگیز تربیت و تادیب کو جو خود اس کی اپنی حماقت اور خطاکاری کا نتیجہ ہے، اپنی صلاح و فلاح کی لازمی شرط سمجھے گا، اور اس کو ہر قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہوگا، اپنے ہمنشینوں کے ساتھ اسکو گہری ہمدردی ہوگی، کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ وہ ایسی فطرتوں کے حامل ہیں جن کو خود انھوں نے منتخب نہیں کیا ہے، اور اگر اس ہمدردی کی وجہ سے وہ زندگی کے طربیہ و حزنیہ پر ہنستا اور روتا ہے، تو اس کی ہنسی طنز سے اور اس کا رونا تلخی سے پاک ہوگا، لیکن ایک ہر دم تیار ہمدردی کی وجہ سے وہ

نہ تو منصفانہ مطالبوں کو پورا کرے گا، اور نہ اپنے ہمنشینوں کی ذمہ داریوں کو کم کرے گا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اتیدو نفی بیم کے مناسب محرکات ہی ان کو ان کی بہترین کوششوں پر ثابت قدم رکھ سکتے ہیں، اگر اس سے انصاف کر یا سزا دینے کو کہا جائے گا، تو وہ نہ رحم کھائے گا، اور نہ کمزوری دکھائے گا، وہ ہاتھ باندھکر کسی خارجی قسمت کی طرف سے فیصلہ صادر ہونے کا انتظار نہ کرے گا، کیونکہ اسکو معلوم ہے کہ اسکے دل میں ارادہ فعل کی حرکت بیکار نہیں ہے، اور یہ کہ اپنی طاقت اور اپنے علم کے مطابق اسکو بھی اس دنیا کے ڈرامے میں اپنا پارٹ کرنا ہے، آخری بات یہ ہے کہ ایسا شخص نوع انسان کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہ ہوگا، کیونکہ وہ گذشتہ زمانہ کی ترقی کو دیکھ چکا ہے، وحشیانہ زندگی سے جو بہیمانہ زندگی سے یونہی سی مختلف تھی اس نے آہستہ آہستہ تمام وقعت حاصل کی ہے، اس نے علم حاصل کیا جس سے جہالت اور توہمات کا خاتمہ ہوا، اس نے ہمدردی پیدا کی جو انانیت اور نفرت کی ہلاکت کا باعث ہوئی، اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں غیر متزلزل شجاعت کا اظہار کیا، اس نے اعلیٰ غایات کے حصول کی کوشش میں بلند نظری کا ثبوت دیا، ان تمام اکتسابات و کمالات کے بعد اب وہ یقین کر سکتا ہے، کہ جو طاقت اس طرح انسانی نوع میں کام کر رہی ہے، وہ اور زیادہ بلند نتائج پر ختم ہوگی،

(نئی کتاب)

مقالات شبلی جلد ششم تاریخی

یعنی

یہ حصہ مولانا شبلی مرحوم کے ان تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جسمیں اسلامی حکومتوں کی تمدن و تہذیب علم و فن، شوق علم، اور بے تعصبی کے متعلق نہایت محققانہ واقعات درج کئے گئے ہیں، اور ان کے متعلق یورپین مورخین کے اعتراضات کے جوابات دئیے گئے ہیں، حجم ۲۴۰ صفحے، قیمت عہ

منیجر

کتبخانۂ حبیب گنج کے فنِ تاریخ کے چند نوادر

از

جناب عبد الغفور صاحب بی اے آنرز لندن ایم اے ایم ایس سی علیگ

نواب صدر یار جنگ بہادر کا کتبخانہ نوادر کتب کا انمول ذخیرہ ہے، ان میں سے چند تاریخی نوادر پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ دول الاسلام مع ذیل دول الاسلام للامام ذہبی، یہ نسخہ امام ذہبی کی ضخیم تصنیف تاریخ الاسلام کا اختصار ہے، جو مصنف نے خود تیار کیا تھا، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں کہ یہ کتاب مختصر تالیف ہے، اسکی ترتیب سنہ کے لحاظ سے ہے، اور سنہ ۷۴۰ھ تک کے حالات اس میں درج ہیں، اس کے بعد سخاوی کی ذیل ہے، جو سنہ ۷۴۱ھ سے سنہ ۹۰۱ھ تک ہے، یہ ذیل بھی اصل کتاب کی طرح مختصر ہے، اور اس کا نام ذیل التام بذیل الاسلام رکھا گیا، دول الاسلام دائرۃ المعارف حیدرآباد کی طرف سے سنہ ۱۳۳۷ھ میں شائع ہو چکی ہے، یورپ کے علمی حلقوں میں بھی کچھ عرصے سے امام ذہبی کی تصنیفات بالخصوص تاریخ الاسلام سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے، تاریخ الاسلام کی ۱۲ اور بقول بعض ۲۰ جلدیں تھیں، اور آج کل اس کے ناقص اور غیر مکمل اجزا مغربی اور مشرقی کتب خانوں میں منتشر پڑے ہیں، ڈاکٹر اسپیز استاذ علوم عربیہ علیگڈھ نے جامع ایاصوفیہ کے قابلِ قدر نسخوں کی طرف توجہ دلائی، اور سنہ ۱۹۳۲ء کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں سموگی کے قلم سے ایک مضمون نکلا تھا، جس میں تاریخ الاسلام کے مختلف پریشان اجزاء کو یکجا کرکے شائع کرنے کی تجویز پیش کی تھی،

حبیب گنج کا نسخہ آغاز سے خلافت حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک ناقص ہے، خط عربی عتیق اور کاغذ عربی ہے، سنہ ۷۴۴ھ کے حالات کے بعد چند اوراق الحاقی ہیں، اس کے بعد اختتامِ کتاب تک اصل کاتب کے ہاتھ سے منقول ہے،

اخیر میں کاتب لکھتا ہے، ما وجد بخط الحافظ ابی عبد اللہ محمد بن احمد بن محمد الذہبی رحمۃ اللہ
من ذیل علی کتاب دول الاسلام چونکہ یہ نسخہ مصنف کے ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے سے نقل کیا گیا ہے اسلئے
بہت اہم ہے، کتابت یوم السبت ۱۰ جمادی الآخر ۹۰۷؁ھ کو ختم ہوئی،

مولینا موصوف نے فہرست میں لکھا ہے، کہ یہ کتاب مولینا شبلی مرحوم کی عنایت سے دستیاب ہوئی،

۲- النور السافر من القرن العاشر۔ اس کتاب میں مصنف نے قرن دہم کے علما، صلحا، ادبا فرمانروا اور امرا کا ذکر ہر ایک کے سنہ وفات کے ضمن میں کیا ہے، آغاز ۹۰۱؁ھ سے کیا ہے، اسلامی دنیا کی عالمگیری کا دلچسپ مرقع ہے، اور شامی و حجازی، مصری و یمنی، رومی و ہندی، مشرقی و مغربی سب ممالک کے مشاہیر و اہل کمال کا ذکر درج کیا ہے، ہر ایک کے ضمن میں ان کی حکایات عجیبہ اور دلچسپ چٹکلے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں، مثلاً ۹۷۴؁ھ کے حالات میں سلطان سلیمان آل عثمان کی وفات کا ذکر کیا ہے، اور اس حادثہ پر ایک مرثیہ بھی تحریر کیا ہے، کتاب کے متن میں کہیں کہیں مصنف کے آبا و اجداد کے سنہ وفات اور سوانح حیات کا حال بھی آیا ہے، ہندوستان کی تاریخ کے لحاظ سے چند امور اہم پائے گئے، اولاً صفحہ ۴۵ پر دسویں صدی کے پانچویں سال میں ایک ہالۂ عظیمہ کا ذکر ہے، جو سورج کے گرد نمودار ہوا اور چاشت کے وقت سے ظہر اور عصر کے درمیانی وقت تک رہا، اس کے بعد غائب ہوگیا، شہر احمد آباد پر ایک علٰحدہ باب لکھا ہے اس میں سلطان محمود شاہ ابن مظفر شاہ کا حال ہے جو احمد آباد میں فوت ہوا، اس شہر کے متعدد علما و ادبا کے حالات زندگی زیب قرطاس کئے گئے ہیں، اور چونکہ ان میں سے بیشتر مصنف کی حیات میں ہوگذرے ہیں اس لحاظ سے یہ تذکرہ تاریخی لحاظ سے بہت وقیع ہے، بقول پروفیسر عبد العزیز میمن اس کا ایک نسخہ کتب خانہ فرنگی محل میں بھی موجود ہے، مصنف کا نام شیخ عبد القادر بن شیخ العیدروس الہندی، متوفی ۱۰۳۸؁ھ بخط نسخ مؤلف نے اس کتاب کی تصنیف سے ۱۰۱۲؁ھ ہجری میں فرصت پائی، سنہ کتابت ۱۰۹۳؁ھ ہجری،

۳۔ اقبالنامۂ جہانگیری، یہ معتمد خان امیر عہد جہانگیری کی مشہور تاریخ ہے، اور تینوں جلدوں کا مکمل نسخہ ہے، اسکی پہلی اور دوسری جلدیں بقول ریو اور ایتھے کمیاب ہیں، تیسری جلد تصحیح کے بعد کلکتہ سے شائع ہو چکی ہے، اس کا اردو ترجمہ دار الترجمہ حیدر آباد نے چھاپا ہے، یہ نسخہ خوشخط فارسی جلی قلم سے لکھا گیا ہے، عنوان مطلا و لاجوردی، اوّل سے آخر تک تمام اوراق سنہری جدولوں سے گھرے ہوئے ہیں، ابتداء کے ورق تو بالکل مطلے ہیں، ہر ہر سطر کو سونے سے معمور کیا گیا ہے، اسکی تذہیب و آرایش شاندار اور عظیم القدر ہے، اس نسخہ کی ایک خاص چیز جو دوسرے قلمی نسخوں میں نہیں پائی جاتی شجرہ سلاطین مغلیہ ہے، جو قبل آغاز کتاب لکھا ہوا ہے، ہر ایک نام زرین حلقے میں ہے، حاشیہ کے نام بھی حلقہ زریں میں تحریر کئے گئے ہیں،

۴۔ تذکرۃ الخوانین مؤلفہ شیخ فرید بن شیخ معروف صدر سرکار بھکر، یہ نسخہ بیحد کمیاب اور نادر الوجود ہے، اسے شیخ فرید بھکری نے عہد شاہجہانی میں ترتیب دیا، اور نواب شائستہ خاں کی خدمت میں پیش کیا تھا، ہندوستان یا یورپ کے کسی کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے، پروفیسر عبد اللہ چغتائی نے پچھلے سال رسالہ اسلامک کلچر میں اس کے ایک نسخے کا ذکر کیا تھا، جو مولوی عبد الحق سکریٹری انجمن ترقی اردو کے پاس ہے، نیز اسی ضمن میں یہ بھی لکھا تھا، کہ نسخہ مذکور ناقص الآخر ہے، بفضل خدا حبیب گنج کا نسخہ مکمل ہے، خط شکستہ جلی شیجرفی آمیز، شروع میں امرائے عہد اکبری، جہانگیری اور شاہجہانی کی مکمل فہرست ہے، کتاب کو تین باب میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے میں امرائے اکبری، دوسرے میں جہانگیری اور تیسرے میں شاہجہانی، مؤرخین کرام مآثر الامرا کو امرائے مغلیہ کے حالات کا بہترین ماخذ قرار دیتے ہیں، مگر فرید بھکری اس مصنف مآثر سے بھی ایک صدی پیشتر گذر چکا ہے، اور عہد شاہجہانی کے حالات تو وہ عینی مشاہدے سے لکھتا ہے، تذکرہ میں جابجا خود دیکھے ہوئے حالات اور اپنے اوپر گذرے ہوے واقعات بیان کرتا ہے، اس لحاظ سے تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ تذکرہ مآثر الامرا سے بہت اہم ہے، ابو الفضل کے خاندان کی تاریخ لکھتے ہوئے تحریر کرتا ہے، کہ آج ابو الفضل یا اسکے بھائیوں کی اولاد میں سے ایک فرد بھی موجود

نہیں، ان کی و تلک منازل جو اکبرآباد میں تھیں سلسلۂ عالیہ اعتماد الدولہ کے قبضہ میں آگئی ہیں، ع

بقا بقائے خدا ایست و ملک ملک خدا،

ابوالفضل فیضی اور صدر الصدور کے باہمی مناظروں میں دو دلچسپ حکایات ایسی لکھی ہیں، جو دوسری کسی تاریخ میں نہیں ملتیں، اگرچہ مصنف مآثر شاہنواز خان نے فرید بھکری کی طرز تحریر کو غیر مورخانہ بتایا ہے، مگر دونوں کتابوں کے مطالعے سے یہ اندازہ لگ سکتا ہے کہ صاحب مآثر نے کس قدر حالات حرف بحرف فرید بھکری سے لئے ہیں، کاش کہ جو محنت اور کوشش مآثر کے چھپوانے اور ترجمہ کرنے میں صرف کی گئی ہے اس کا عشر عشیر بھی اس کتاب پر کی جاتی، تو تاریخ ہند کی اچھی خدمت سرانجام دی جا سکتی تھی، اس نسخے کی کتابت سنہ ۱۲۵۹ھ کی اور کاغذ نیم رنگ قدرے کرم خوردہ آب رسیدہ ہے،

۵- تذکرۃ الامرا کیول رام ولد رگھوناتھ داس قوم بانیہ اگروال متوطن قصبہ کاسہ صوبہ شاہجہان آباد کی تفصیل نام احوال امرایان سلاطین و راجہ ہائے نامی از ابتدائے جلوس حضرت اکبر شاہ و جہانگیر و شاہجہان و عالمگیر پہلے مسلمان امرا کا باب، پھر ان ہندو امرا کا جن کو خطاب راجگی عطا ہوا، اسکے بعد ان ہندو اعیان کا جنکو کوئی خطاب نہیں ملا، ہر باب ترتیب حروف تہجی ہے،

اپنے متعلق مصنف لکھتا ہے، کہ میرے آبا و اجداد نے بادشاہان ہندوستان اور اس خاندان خلافت نشان کے امرا کی نمک خواری سے نشو و نما پائی، اپنے ماخذوں میں اکبرنامہ، اقبالنامہ، توزک جہانگیری بادشاہ نامہ، عمل صالح، عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری وغیرہ گناتا ہے، نیز لکھتا ہے کہ اس میں بعض ایسے خواتین کا حال درج ہے، جو کم مرتبت تھے، اور اس لئے اُن کا ذکر مآثر عالمگیری میں نہیں آیا، اپنی علمی کاوش کے متعلق لکھتا ہے کہ ہر ایک امیر کی قوم نسبت وطن منصب خطاب خدمت اور سال وفات کی تحقیقات کے لئے ہر قسم کی کوشش کی گئی، سنہ تالیف ۱۲۰۴ھ اور کتابت سنہ جلوس شاہ عالم غازی، مطابق سنہ ۱۲۱۰ھ کی ہے یعنی تصنیف سے چھ سال بعد، الیٹ نے اس کتاب کا سنہ تصنیف ۱۱۹۴ھ لکھا ہے، جو غلط ہے، درحقیقت

یہ سنہ ماثر الامرا مصنفہ شاہ نواز خان کی تصنیف ثانی کا ہے، اس کتاب کے نسخے عجائب خانہ لندن اور انڈیا آفس میں بھی موجود ہیں،

۴۔ احوال جنگ پانی پت، مابین احمد شاہ درانی و بھاؤ مرہٹہ مولفہ متصدی نواب شجاع الدولہ وزیر الملک

یہ نسخہ خط شکستہ شجر فی آمیز میں لکھا گیا ہے، کاتب سید محمد حسین حیدری مقام جگ ہمراہ اردوے معلی در ۱۱۹۹ھ تمام شد،

اس کا مصنف کاسی راجہ پنڈت تھا، جو میدان جنگ میں شجاع الدولہ کی طرف سے احمد شاہ درانی اور بھاؤ کے پاس سلام و پیام پہنچاتا تھا، کتاب کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، کہ لڑائی کے دوسرے روز بھاؤ کی نعش ملنے کے وقت وہ شجاع الدولہ کے ہمراہ تھا، اور حسب الحکم شجاع الدولہ اس نے بھاؤ کی لاش کو منڈل اور گنگا جل سے غسل دے کر ہندوؤں کی رسم کے مطابق جلایا، اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لفٹنٹ کرنل جیمز براؤن نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں ۱۷۹۱ء میں شائع کیا، اور ۱۹۲۶ء میں اسکو دوبارہ پروفیسر راولنسن نے مع دیباچہ، حواشی، اور ضمیموں کے علمی دنیا سے روشناس کرایا، دیباچے میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں، کہ اصل نسخہ فارسی تباہ و برباد ہوگیا، علمی دنیا کو مولوی صاحب موصوف کی علم دوستی کا متشکر ہونا چاہئے، کہ ایسی نادر روزگار تاریخ غارتگری زمانہ کے ہاتھوں سے بچالی گئی، اصل فارسی اور انگریزی ترجمہ کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ مترجم سے کہیں کہیں فروگذاشت ہوگئی ہے، فارسی نسخہ میں ایک نقشہ احمد شاہ ابدالی کے لشکرگاہ کا دیا ہوا ہے، وہ انگریزی نسخے میں موجود نہیں ہے، فارسی نسخہ کے اخیر میں مصنف لکھتا ہے کہ میں نے یہ تاریخ جنگ پانی پت سے انیس سال بعد لکھی ہے، مگر انگریزی ترجمے میں یہ درج ہے کہ یہ حالات ان واقعات کے مدت مدید کے بعد تحریر میں لائے گئے، سالوں کی تخصیص نہیں کی گئی،

یہ نسخہ جنگ پانی پت کی بیحد دلچسپ، محققانہ اور عینی مشاہدہ پر مبنی تاریخ ہے، مصنف خود مرہٹہ برہمن تھا، لیکن دل سے شجاع الدولہ کا طرفدار تھا، جانبین کے حالات بے تعصبانہ اور غیر جانب دارانہ طریقے پر لکھے ہیں، بھاؤ کے قتل کے حالات کے لئے تو شاید اس سے زیادہ مستند کوئی اور شہادت نہ ہوگی، ابراہیم خاں افسر گاردی

نے جس دلسوزی سے حق نمک خواری اداکیا، اسکو موثر الفاظ میں بیان کیا ہے، مولینا حبیب الرحمن خانصاحب کو خود بھی جنگ پانی پت کی متعدد روایات یاد ہیں، امید ہے کہ اگر ان کو کبھی موقع ملا، تو اپنے اس بیش بہا ذخیرہ سے جو انھوں نے تاریخی حکایات کا فراہم کر رکھا ہے، علمی دنیا کو بہرہ اندوز ہونے کا موقع دینگے،

۹- تغلق نامہ امیر خسرو، یہ کتاب جو فہرست میں جہانگیر نامہ ملا حیاتی کاشی کے نام سے درج ہے تحقیقات جدیدہ کی رو سے تغلق نامہ کا وہ ناقص نسخہ ہے، جو شہنشاہ جہانگیر کے پاس موجود تھا، اگر یہ نظریہ صحیح ہے، تو یہ نسخہ اس قیمتی تالیف کا یکتا نسخہ ہے، کچھ عرصہ ہوا سید ہاشمی صاحب نے تغلق نامہ کو طبع کرا دیا ہی، چونکہ یہ نسخہ مختلف مشاہیر سلم کی طرف سے علمی دنیا کے سامنے کئی بار پیش کیا جا چکا ہے، اس لحاظ سے اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے،

مذکورہ بالا نسخوں کے علاوہ فن تاریخ میں اور بہت سی مفید کتابیں ہیں، ایک تزک بابری جو آگرہ کالج کے مشہور و معروف شاہی نسخے کی نقل ہے، اس کے علاوہ فارسی ترجمہ تاریخ یمینی اور تاریخ نگارستان احمد بن عبد الغفار قزوینی کے اچھے نسخے کتب خانے میں موجود ہیں،

اعلان

۱- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ہر ماہ کی آخری تاریخوں تک دفتر میں آجانی چاہئے تاکہ پرچہ دوبارہ بھیجدیا جائے، دیر میں اطلاع موصول ہونے پر پرچہ بقیمت بھیجا جائے گا،

۲- معارف سے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت اور ارسال زر میں براہ کرم نمبر خریداری (چٹ نمبر) کا حوالہ ضرور دیجئے، ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہو سکے گی،

منیجر

ہندوستان کے دو قدیم گمنام شاعر

میر مسیحی سبزواری؟

اور

میر سید علی سالک سبزواری؟

از جناب محمد عبد الوہاب صاحب مسلم بی اے، حیدرآباد دکن،

ہندوستان میں مغلوں سے پہلے کی اسلامی وادبی وعلمی تاریخ بیحد تاریکی میں ہے، ابھی دو سال ہوئے کہ مطہر کڑہ کا نام معلوم ہوا ہے، اب ہمارے دوست مولوی عبد الوہاب صاحب مسلم کو میر مسیحی سبزواری اور میر سید علی سالک سبزواری دو شاعروں کے فارسی دیوان ہاتھ آئے ہیں، لیکن ان کا حال نہیں ملتا، اگر ناظرین میں سے کوئی صاحب نظر ان پر روشنی ڈالیں تو علم کی خدمت ہوگی،

مسلم صاحب کا خط حسب ذیل ہے:۔

"س"

محترمی ومعظمی، السلام علیکم

میں نے عرصہ ہوا آپکو سالک اور مسیحی سبزواری کے دو نایاب دیوانوں کے متعلق توجہ دلائی تھی، اور آپنے اپنے گرامی نامہ میں ان کے نام اور تفصیلات پوچھی تھیں، علالت اور عدیم الفرصتی کے باعث کچھ نہ لکھ سکا، تذکرے کئی دیکھے لیکن کہیں پتہ نہ چلا، کہ یہ کون ہیں، اور فدن شاہ بادشاہ جسکی مدح میں مسیحی سبزواری نے قصیدے لکھے ہیں، کون تھا، بہرحال حسب ارشاد ان دونوں کے نام فی الحال بھیجتا ہوں،

۱- میر مسیحی سبزواری، ۲- میر سید علی سالک سبزواری،

میر مسیحی، میر مسیحی نے سلطان علاء الدین فدن شاہ کی مدح میں قصائد لکھے ہیں، اور سید علی سالک نے سلطان سکندر کی شان میں، دونوں دیوانوں میں قصائد کے بعد غزلیں ہیں، مسیحی اکثر جگہ سلمان ساوجی اور ظہیر وغیرہ کا ذکر کرتا ہے، مثلاً

این مطلع ار صبا ببرد جانب عراق، لبیک زد ز تربت سلمان برآورد،

اس کے علاوہ بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے، کہ فدن شاہ ہندوستان کا بادشاہ تھا، اور شاعر ہندوستان آیا تھا، بادشاہ جاہل بھی نہ تھا، (اگر ہم علاء الدین خلجی کو تصور کریں)

بعد از ہزار سال کہ دوران سفر کشد، چو من یکے کجا ز خراسان برآورد،

در ہند اگر چہ ہست سخنگوے بے قیاس، کا قبال شاں گرفتہ بدیوان برآورد،

یارب چہ کم شود چو منے گر ز مجلست، سُرخ و سپید تنگہ بداماں برآورد،

من خوش شدم کہ شاہ نصیحت و ظاہر است، کیں نکتہا بطبع سخندان برآورد

اسیر کردہ خوبان ہند شد دل من، صبا حدیث مسیحی بہ سبزوار رساں،

اکثر اشعار میں فدن سلطان اور علاء الدین کے نام اور عرف آئے ہیں، مثلاً

سپہر لطف و جہان کرم فدن سلطان، کہ بر یمین و یسارش روند فتح و ظفر،

شہ ستارہ حشم بادشاہ علاء الدین، مدار مرکز دانش جہان امن و اماں

ایک سفر کے متعلق لکھا ہے،

یعنی کہ رسید از سفر آن شاہ کہ تیغش، ہر لحظہ برآورد دمار از سر کفار

ایک اور شعر ملاحظہ ہو،

میکشد در ہوس زلف درخت خاطر ما، بہ سواد ختن و مملکت بنگالہ،

میر سید علی سالک، دوسرا شاعر میر سید علی سالک سبزواری ہے، جو سلطان سکندر ثانی کی مدح کرتا ہے، مگر یہ سلطان سکندر ثانی علاء الدین قطعًا نہیں، بلکہ سلطان سکندر لودی ابن بہلول لودی ہے، داخلی شہادت ملاحظہ ہو:

شمار بود ز تاریخ نہ صد و یک سال ۔۔۔ کہ فتح و نصرت سلطان کامگار آمد،

بتاریخ بُد نہ صد و چار دہ، ۔۔۔ کہ شد فتح نلور بہ اقبال شہ

آخری شعر ایک جنگ نامہ (مثنوی) سے لیا گیا ہے، جسمیں اجی راج راجہ نلور کی شکست کا حال ہے،

نلور چو دارائے دوران رسید، ۔۔۔ اجی راج ہم مرگ خود را بدید

سالک کے چند شعروں سے ثابت ہوتا ہے کہ اوس کا چچا پہلے سبزوار سے ہندوستان آیا تھا، اور بادشاہ نے اسکو جاگیر دی تھی، اسکے بعد سالک آیا، اور اس نعمت سے سرفراز ہوا، سالک کہتا ہے،

سالک،

چو عم من از گردش روزگار ۔۔۔ بہند آمد از خطۂ سبزوار،

شہنشاہ دہلی مبارک بنام ۔۔۔ بسادات محمود کرد احترام،

چو باشاہ آن میر کرد اختیار ۔۔۔ شدہ جا چہ ملک آن بختیار را

چہل سال افتادآن قریہ طرح ۔۔۔ حکایات آنرا نگفتم بشرح

بہلول،

شہنشاہ ہم کرد اعطا مرا ۔۔۔ برسم پدر داد طغرا مرا

تہا چار چہ ملک نیبو ع نیست ۔۔۔ اگر ملک گوئیند مشروع نیست

دونوں دیوان ایک ہی کاتب نے لکھے ہیں، اور ۹۲۳ھ درج ہے،

میں نے چند نوٹس اس سے قبل لئے تھے، لیکن وہ اسوقت خدا جانے کہاں غائب ہوگئے، اسلئے سرسری مطالعہ کے بعد آپکی خدمت میں یہ چند شعر ارسال ہیں، میرا خیال ہے کہ میر سید علی سالک کا پیشرو احمد سلطان علاء الدین بن محمد شاہ بن مبارک شاہ بن خضر خان کا متوسل تھا جو ۸۴۹ھ سے ۸۵۵ھ تک حکمران رہا، اسی طرح سالک سلطان سکندر لودی کا متوسل تھا، جسکی حکومت ۸۹۴ھ سے ۹۲۳ھ تک رہی، دونوں شاعروں کے ان دونوں شاعروں کے کچھ حالات معلوم ہوسکتے ہیں لیکن ان کی تصانیف کوئی نظر سے نہیں گذری، اگر آپ مدد فرمائیں تو بہت ممنون ہونگا،

تذکرۂ طاہر

یعنے

سوانح خودنوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خان طاہر مرحوم

(۶)

شعر و سخن، اگرچہ میں نہ کوئی اصطلاحی شاعر ہوں، اور نہ سخن طرازی اور سخن سنجی کا مجھکو دعویٰ ہی، لیکن بدو فطرت سے طبع موزوں ضرور ساتھ لایا ہوں، اور ابتدائے تعلیم سے ذوق شعر و سخن کی چاشنی کا لذت آشنا ہوں اسلئے برسوں کوچۂ شعر و سخن کی خاک اُڑانا پڑی، اور جلوت و خلوت میں شب روز اسی سوز و ساز اور ہجوم ناز و عرض میں زندگی کے دن کاٹنا پڑے، اسی عالم جوش و خروش اور مشغلۂ شعر و سخن میں غزلیات و اشعار فارسی و اردو کا ایک بڑا ذخیرہ مرتب ہوگیا تھا، جو شاید دو کلیات ضخیم کے برابر ہوتا، مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، کچھ زمانہ گذرنے کے بعد جب دل ان رنگ رلیوں سے پھیکا پڑا، تو وہ مجموعۂ غزلیات و اشعار بھی تاراج دست تغافل اور نذر آتش کردیا گیا، ع

این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولی

خدا جانے کس طرح ابتدائی عمر کے معدودے چند اشعار اور غزلیں فارسی اور اردو کی بعض اوراق میں لکھی ہوئی پڑی رہ گئی تھیں ان کو بعض اعزہ نے ترتیب دے کر فارسی غزلیات و اشعار کا مجموعہ بنام خرمن گل، اور غزلیات و اشعار اردو کا مجموعہ بنام نالۂ دل طبع کراکے شائع کرادیا، سچ یہ ہے کہ فارسی اور اردو کلام دونوں محتاج نقد و

نظر وانتخاب تھے، مگر افسوس ہے کہ مجھ کو ان پر نظر ثانی کرنیکی نوبت نہیں آئی انکی اشاعت کے بعد جو کلام جمع ہوا وہ حسب ذیل ہے

فارسی کلام،

بشگفت از تجلی تو لاله زار ما، — نور یقیں ستارهٔ صبح بہار ما
ما راز نور مصطفوی سینه روشن است — ایں بس چراغ راه به شبہائے تار ما

الٰہی عشوه ہائے دلربائی ده بیانم را، — حریف نرگس جادو نگاہاں کن زبانم را
ز عشق مصطفیٰ آں بلبل گلزار توحیدم — خس و خار است از بال ملائک آشیانم را
لب خاموش ما را رنگ تاثیر کرامت کن — ز اشک سرمہ آلود بتاں تر کن زبانم را

چو گل در باغ ہستی فرصت یک خنده می باشد — نسیم صبح می گوید که بر بندید محملہا
رسیدن کے توانم منتہائے حسن را یا رب — که در ہر جلوه اش باید نمودن قطع منزلہا

در شیوهٔ تسلیم چه دخل است ریا را، — از گرد ہوس پاک کنم روئے دعا را
گفتم به چمن تا صفت آں کف پا را — گلبرگ به حسرت نگرد برگ حنا را
بر چہره پریشاں مکن ایں زلف دوتا را — زنجیر مجنباں دل دیوانهٔ ما را
تا دل نه کشاید نه دہد جلوه معانی، — بے بادهٔ صافی نتواں جست صفا را

روشن ز نور عالم فطرت بیان ما، — یک اسم اعظم است زبان در دہان ما
رسوائے درد عشق کسے ایں چنیں مباد — باید شنید از لب دشمن فغان ما
بے صرف عمر وصل میسر نمی شود، — ذوق فنا ست زندگی جاودان ما
طاہر زمان ماضی ما خوش ز حال بود — اے کاش رو کند بقفا کاروان ما

ہزار جلوه در آغوش کردهٔ ما را — شہید نازم و گل پوش کردهٔ ما را،

نیست عرق که دیدهٔ بر تن پر گزند ما — چشم تریم و می چکد اشک ز بند بند ما
ہر ستمے که میکنی بر دل درد مند ما — عذر ستم گماں کند طبع وفا پسند ما

آبادیِ حق است بہ ویرانیِ دلہا — جمعیتِ دلہاست پریشانیِ دلہا
لبریزِ دل از کینہ زبان پُر زنیایش — ہمسایۂ کفراست مسلمانیِ دلہا

مرقدِ ابر ارشد بت خانۂ اسلامِ ما — کفر می خندد بہ توحیدِ دلِ ناکامِ ما

بے خلش مقصدِ دل جلوۂ ذوقے ندہد — سنگ وررہ فگن خار بدیوار طلب
جمع ضدین محال است چہ داند — طالبِ حق نبود مردمِ دینار طلب
دیدۂ روزنِ دیوار چہ بیند زاہد — چشم بیدار چہ جوئی دلِ بیدار طلب

زحسنش چشم حیران است امشب — چہ حیرتہا کہ عرفان است امشب
ز داغِ دل بہاران است امشب — در آغوشم گلستان است امشب
چہ بر جانم گذشت از دردِ ہجران — کہ جانم آفتِ جان است امشب

دمِ وداعِ تو تمکینِ عشق را نازم — کہ اشک بر مژہ مائل چکیدن نیست

کو وعدۂ تو وعدۂ فردا شدنی نیست — این عقدۂ لاینحل ما واشدنی نیست
صد پارہ دلم جامع مضمونِ وفا بود — افسوس کہ این نسخہ یکجا شدنی نیست

خوشم بسایۂ اقبالِ بیکسی طاہرا — نہ بندۂ کس و بے کس مرا خداوند است

در جلوہ طرازی نگران گلبد نے ہست — بشگفتہ در آئینہ بہر سو چمنے ہست
شوخی و حیا را بہم آمیخت ز افسوں — این چشم تو مجموعۂ صد علم و فنے ہست

نگاہ شوق بود ترجمان حالتِ دل — سوال از لبِ عاشق کمال بے ادبی است
جفا ز یار و ز من شکوہ جز تفقن نیست — میانِ عاشق و معشوق نسبت و ہمی است

نہفتہ فتنہ در آن چشم فتنہ زا خفت است — دلِ ستم زدہ داند بلا کجا خفت است
ز بختِ خفتہ کہ سرگشتگی بہ طینتِ اوست — بہ حیرتم کہ چسان خفتہ و کجا خفت است

دلم بہ یادِ تو کم از مریضِ بیکس نیست — کہ در امیدِ طبیب و غمِ دوا خفت است

زمان بہ فتنہ و جنگ است و دل بعیش گرای — غنیم بر در و شہ در حرم سرا خفت است

دلم بہ تہمتِ مرحوم سخت می لرزد — کہ رہزنان بہ کمین اند و رہنما خفت است

اشکے نہان بگوشۂ چشمِ سیاہ کیست — شوخی ز شرم عقدۂ تارِ نگاہ کیست

گہ می کشد بہ عشوہ و گہ زندہ می کند — اعجاز آفریدۂ طرزِ نگاہ کیست

دامن کشیدنِ تو سرِ رہ گناہ من — خندیدن و نگاہ نہ کردن گناہ کیست

آن قوم کہ عشقِ تو نویدِ ظفر اوست — فتحِ دو جہان یک ہوسِ مختصر اوست

آنکس کہ جمالِ تو بہشتِ نظر اوست — دل نیست اگر حورِ بہشتی بہ برِ اوست

بے روشنیِ دل نہ کشاید درِ عرفان — چشم و دلِ آگاہ نشینِ رہگذرِ اوست

این شعبدۂ طرفہ دوران گردشِ چشم است — ہر دل بہ تماشا است کہ سویم نظر اوست

از طعنۂ واعظ ز طلب باز نہ گردم — زین گونہ بسے فتنہ بہر رہگذر اوست

ز تیرِ نیم کشِ ناز بسمل افتاد است — ہزار حسرت و یکدل چہ مشکل افتاد است

دلم بہ نرگسِ مستِ تو مائل افتاد است — ہزار میکدہ در گوشۂ دل افتاد است

نمک فروشِ بہ صبحِ چمن تبسمِ کیست — کہ خندہ بر لبِ گل نیم بسمل افتاد است

گداختند و صد شعلہ قطرہ بچکید — کہ نامِ آن لبِ عاشقان دل افتاد است

زمانہ ایست کہ از بخت و چرخ نالہ کنند — مگر ز کجروی خویش غافل افتاد است

نہ میکنی بہ غلط ہم نگہ سوے طاہر — بگو چہ شد چہ شنیدی چہ در دل افتاد است

در غمِ عشقِ او دلم از غمِ ماسوا گذشت — گشت دوائے دردِ دل درد کہ از دوا گذشت

دل بہ ہمین میکدہ سر بسجود پائے خم — از لبِ جام بادہ بین آنچہ بہ پارسا گذشت

من بہ کمالِ عشق خویش چون نہ ز عقل بگذرم
گر بکمالِ عشقِ خویش فلسفی از خدا گذشت

رفت شباب و ما ہنوز مست مئے شبانہ ایم
بخت بہ راہ خفتہ ماند قافلہ بے درنگ گذشت

رمیدہ دل ز تو ابروے یار نزدیک است
کمان کشیدہ بیا کہ این شکار نزدیک است

حیات عاشق دل خستہ گر وفا نہ کند
وصال یار بعد انتظار نزدیک است

بدیر و کعبہ مرو راہِ گوشۂ دل گیر
مقام دوست ازیں رہگذار نزدیک است

قرار عیش بہ فردا منہ چو وقت رسد
بہوش باش غم روزگار نزدیک است

ندیم دوست اگر غیر شد چہ غم طاہر
مرنج گردش لیل و نہار نزدیک است

بہر صرف عمر عاشق یک رخ زیبا بس است
گر بود مقصود قدر حسن یک شیدا بس است

حکمت و نفعِ مے و میخانہ از ساقی بپرس
پیش مستان ناو نوش و شورش و غوغا بس است

روز و شب سرگرم کار خود دلِ دیوانہ ایست
عشق از عقل است خالی این ہمہ افسانہ ایست

فلسفی عارف نہ گردد از طریق بحث و عقل
در رہ پُر پیچ عشقش عقل ہم دیوانہ ایست

عشقش پئے شکستِ دلِ خود پرست ماست
پنہاں ہزار فتح دریں یک شکست ماست

معشوق و شعر و طاعت حق برگزیدہ ایم
این انتخاب طبع حقیقت پرست ماست

بہار عالم ہستی ز قامت یار است
نہال خوش ثمرے آبروے گلزار است

نقیہ در طلب جاہ و محتسب مے نوش
دریں زمان بکسے اعتماد بے کار است

نہ ہر مزاج بہ یک شیوہ و نہ ہر معشوق
ہزار رنگ بہ یک شغل عشق در کار است

ز مژدہاے وصال تو خوش شدم لیکن
بوعدہ تو و بخت خود اعتبارم نیست

کسے نہ کرد چو من جمع عشق و حکمت را
ہزار حیف کہ مجنون بروزگارم نیست

غیر یک شاہد دگر منظور نیست
شرک اندر عاشقی مغفور نیست

سجدۂ پیشِ بتاں در شرعِ عشق — واجبِ عینی است آن محذور نیست
اندکے صبر و تحمل بایدت — یار خود آید بسویت دور نیست
صوفیِ ما کافرِ مومن نماست — ہر انا الحق گوئی ہم منصور نیست

بہشتِ عشق وصال است و ہجر دوزخِ او — میانِ ہجر و وصالش مقامِ اعراف است
زبد مذاقیِ زہاد عقدہ با افتاد — وگرنہ مسئلۂ عشق از ہمہ صاف است

فطرت اللہ اگر جلوۂ ایمانی نیست — کفر را ہیچ تفاوت ز مسلمانی نیست
رخنہ ہائے عجبے در رہِ ملت افتاد — کہ مسلمان ہمہ جمع اند و مسلمانی نیست

باید عمل بحکمِ مغان در سلوکِ عشق — موقوفِ کار و مہر بہ حکم و ہدایتے است
ذکرِ پری و تذکرۂ حور پیشِ تو — افسانہ مخالفِ عقل و درایتے است
عاشق کہ زندہ ماند شبِ ہجر کشتنی است — بیداد دوست در حقِ او ہم رعایتے است

حسنت بہ ناز و عشوہ دلِ یک جہاں گرفت — آورد حسنِ یوسف و حسن از جہاں گرفت
چوں دید چشمِ مستِ تو زاہد دمِ نماز — سجادہ بر فگند و مے ارغواں گرفت
تا بوئے گل گراں نشود بر مشامِ تو — ہر گل ز برگ پیشِ تو کف بر دہاں گرفت

ہر چہ خواہی ہست جز چیزے کہ در کار است نیست — دوستی چیزے است در عالم کہ بسیار است نیست
گہ بر دشوتم بسویش گہ کشد وہمم بہ پس — طرفہ چشمِ نیم بازِ او کہ بیدار است نیست
چشمِ ظاہر بیں کجا و دیدۂ فطرت شناس — نیست یک چیزے دریں عالم کہ اسرار است نیست
از علائق رستہ و وابستۂ زلفِ نگار — طاہرِ وحشت سرشتِ ما گرفتار است نیست

دارند شیخ و رند بوصفت بیاں صریح — لیکن کسے نمی دہد از تو نشاں صریح
دزدید دل خرامِ تو انیسم گماں نبود — میداشتم بہ دزد خیانت گماں صریح

جز من کسے نگشت خریدار جنس عشق، دارد زبسکہ تیغ نہان در زبان صرع

گو ز جلوۂ جوش بہاری می خیزد جنون ز گردش دامان یار می خیزد،

خدنگش بہ نازے کہ در دل نشیند نہ زنہار لیلی بہ محمل نشیند،

خواستم سخت در آغوش کشم در شب وصل مگر افسوس کہ یار است چہ می باید کرد

جنون اے دل باندازِ نگاہ یار می باید برائے شور و مستی ہم دل ہشیار می باید،

شدن با گلرخان ہم بزم و از قید خرد رستن نمی باید و لے در فصل گل یک بار می باید

ندارم امتیاز بوسہ و دشنام سرمستم، ہمی خواہم کہ ہاں می باید و بسیار می باید

نگار من بہ یک نیم نگہ صد لشکر اندازد ز ابرو ہر کجا شوخے است پیشش خنجر اندازد

ز نوایجادہا ہر شب لطافت آفرین طبعش در آداب وصال و بوسہ طرح دیگر اندازد

گر آید در سلوک عشق عاقل اولیں شرط است ہر آن چیزے کہ دارد در سر خود از سر اندازد

زہے رندے کہ از ہشیاری مستی نما طاہر، بگیرد دامن ساقی و از کف ساغر اندازد

عاشق نبود کہ کافر و دیندار نہ باشد در مذہب او سبحہ و زنار نباشد

پابند علائق نبود خاطر آزاد، این مرغ بصد دام گرفتار نباشد

صد نالہ و صد گریہ و صد جذبہ بباید رہ در دل معشوق بہ یکبار نباشد

آنکس کہ چو طاہر نبود بندۂ عشقش زنہار کہ از فرقۂ احرار نباشد

ہر چند گوشہ گیر چو عنقا شدم ز دہر اما اسیر کشمکش شہرتم ہنوز

طاہر کسے ز اہل وطن یاد ما نہ کرد شرمندۂ وطن نبود غربتم ہنوز

چو باد صبح گہ بر برگ گل گہ بر خار افتم جنون مست بہارم تا کجا خیزم کجا افتم،

خواہم کہ رسم کہنہ گیتی بر افگنم ی در مشرب جنون روش دیگر افگنم

ہم عشق را بہ صیقل دانش دہم فروغ ہم عقل را بہ پاے جنون سر در افگنم

در دین ز دو عظا بحز دواں رخنہ ہا فتاد راز درون شرع سر منبر افگنم

زاہد بہ جستجوے در ومن ز قرب عشق در خلد زیر سایۂ گل بستر افگنم

ترا با نامِ حق[1] کار است زاہد کار من با حق تو از اسلام می گوئی و من اسلام می خواہم

از اداے کم نگاہی مدعا فہمیدہ ام اشتعال انگیزی طرز حیا فہمیدہ ام

حسن ہم عشق است لیکن رنگ و نام دیگر است بجدت معنی ناز و ادا فہمیدہ ام

برہمن دارد بتے زاہد دل صد بت نہان ساؤلوحی ہیں کہ او را باخدا فہمیدہ ام

با غناے نفس نسبت نیست مال و جاہ را فقر را من سایۂ بال ہما فہمیدہ ام

در اول قدم سر و ساماں گذاشتیم صد شکر کار عشق بہ پایاں گذاشتیم

غیرت نداشت تاب فریب متاع جاہ جاگیر را بقبضۂ سلطاں گذاشتیم

انصاف از عدالت گیتی طمع مدار ما کار خود بہ صاحب دیواں گذاشتیم

طاہر ز بحث عقل پریشان نیم فزود تحقیق ایں مقالہ بہ نسیاں گذاشتیم

در حضور و غیب دشوار است یکساں زیستن با تو نتواں بودن و ہم بے تو نتواں زیستن

شادی و غم در جہان جز اعتبارے بیش نیست ہمچو گل باید بہ ہر یک فصل خنداں زیستن

جامۂ زہد ریائی چاک زن طاہر خوش است عارف حق بودن و بر وضع رنداں زیستن

خود را نہ پرستیدۂ عرفاں چہ شناسی کافر نشدی لذت ایماں چہ شناسی،

بیروں نہ نہادی قدمے از در خانہ آویزش خار سر داماں چہ شناسی

یک جرعہ ز سر چشمۂ فطرت نہ چشیدی گوہر شدن قطرۂ نیساں چہ شناسی

---

[1] حق نام کتابے ست در فقہ۔

کلام اردو

کامل ہے اور اکمل سارا نظام تیرا، فطرت ہے کام تیرا مصحف کلام تیرا،

اعلیٰ ہے ذات تیری ارفع صفات تیرے فانی ہے سارا عالم باقی ہے نام تیرا،

عارف سے رہے کیونکر انداز چھپا تیرا آئینۂ فطرت ہے خود جلوہ نما تیرا،

پھولوں میں مہک تیری کانٹوں میں کھٹک تیری سب تجھ سے ہیں اور سب ہیں جلوہ جدا تیرا

حقا و دولت ہیں آشفتہ و سرگردان گم گشتہ دلوں میں کچھ لگتا ہے پتا تیرا،

جس دل نے تجھے پایا سب کچھ ہی تو پھر پایا کونین سے مستغنی رہتا ہے گدا تیرا

بتخانہ میں ہندو بھی پڑھتا ہے کتھا تیری مسجد میں اگر مومن ہے حمد سرا تیرا،

اک راز حقیقت ہے دنیا کی مصیبت بھی تسکین دلوں کی تو اور لب پہ گلا تیرا،

طاہر کی دعا یہ ہے ہنگام اجل لب پر

بے ساختہ نام آئے اے یار خدا تیرا

چکی قیمت نہ اپنے جنس دل کی ان حسینوں میں کسی نے کچھ کہا اسکو کسی نے اور کچھ آنکا

یہ دشت عشق اور یہ حضرت دل دیکھئے کیا ہو کہ منزل ہے کڑی اور پڑ گیا ہے ساتھ ناداں کا

تلاش دل نے شرمندہ کیا کیا اہل محفل سے

یہاں ڈھونڈھا وہاں ڈھونڈا ادھر تاکا ادھر جھانکا

عشق میں احساس خودداری بہت دشوار تھا آپ کے جور و تشدد سے وہ آساں ہوگیا

پایا تھا عشق نے دل مرحوم سے فروغ افسوس کیا چراغ محبت کا گل ہوا

تم نے کئے جو ظلم کسی نے خبر نہ لی، میں نے کیا جو نالہ تو اک شور و غل ہوا

اُس شوخ سے بے سمجھے یوں دل لگانا تھا چالوں پہ نظر رکھتے باتوں میں نہ آنا تھا

ہیں آج وہ بیگانہ کل تک میری طالب تھے اک یہ بھی زمانہ ہے اک وہ بھی زمانہ تھا

آئینہ دیکھ کے دل تھام لیا کرتے ہیں   سیکھتے جاتے ہیں اب وہ بھی لگانا دل کا،

عشق کی گرمی محفل دل مرحوم سے تھی   آپ کی جان سے دور آج بہت یاد آیا،

خدا سمجھے دل بے خانماں کو   کسی کا راہبر رہزن کسی کا

تجھے اے سوزش الفت لگے آگ   جلیں ہم نام ہو روشن کسی کا

خرام ناز بھی کیا جانستاں ہے   کہ ہے ہر نقش پا مدفن کسی کا

اس سے کیا بحث کہ ہے جلوہ کسی کا کیسا   دیکھنا یہ ہے کہ ہے دیکھنے والا کیسا،

سیر منظور ہے تو آئینہ لے کر دیکھو   تم تماشا ہے دو عالم ہو تماشا کیسا،

جب نامۂ دلدار کو دیکھا اوسے دیکھا   تحریر دل آزار کو دیکھا اوسے دیکھا

عشاق میں آجاتے ہیں معشوق کے اوصاف   بیتاب دل زار کو دیکھا اوسے دیکھا،

خیال رخ میں تار شمع ہر اک تار بستر تھا   ترا جلوہ فروغ طالع بیدار بستر تھا

زہے بخت مریض غم عیادت کو وہ آئے تھے   یہ سر رنجور بالش تھا یہ تن بیمار بستر تھا

میری چشم شوق ہی خود بن گئی میری رقیب   چھپکے چلمن سے کسی کا جھانکنا جاتا رہا،

نمک افشاں جو ذرا خندۂ قاتل ہوتا،   بوسۂ تیغ لب زخم پہ بسمل ہوتا

جمع کرتا میری ویرانی کے ساماں جو فلک   ایک منجملۂ اسباب میرا دل ہوتا،

تیری رفتار نہ کرتی جو قیامت برپا   دل وہ کافر ہے قیامت کا نہ قائل ہوتا

بے غرض پا کے وہ کرنے لگے خاطر طاہر   آرزو سے یہ کہاں مرتبہ حاصل ہوتا

جی بھر کے مزا دید کا حاصل نہیں ہوتا   افسوس کہ آنکھوں میں کوئی دل نہیں ہوتا

یہ معجزۂ حسن ہے یا زندہ کرامت   محبوب جہاں میں کوئی قاتل نہیں ہوتا

محشر وہ رفتار ترے در سے اٹھیگا   جو فتنہ اٹھے گا وہ اسی گھر سے اٹھیگا

تارے نظر آجائیں گے خورشید کو دن میں پردہ جو ذرا بھی رخِ انور سے اٹھیگا

ترکِ مے اور صحبتِ زہاد پارسائی میں ہیں عذاب بہت

کیا بھیڑ لگی ہے سرِ بازارِ محبت ایک ایک پہ گرتا ہے خریدارِ محبت

مر کر بھی تو جاتا نہیں آزارِ محبت مر مر کے جیا کرتے ہیں بیمارِ محبت

معلوم ہو گر لذتِ آزارِ محبت خود بیچے اپنے کو خریدارِ محبت

معشوق زباں سے تو کبھی ہاں نہیں کرتے ہاں آنکھوں میں ہو جاتے ہیں اقرارِ محبت

چلتا ہے بات بات پہ واں نسخۂ جفا ہے ورنہ ہر مرض کا جہاں میں صد علاج

لازم ہے صبر عشق میں قاہردہ ہی نہیں پرہیز اس مرض میں ہے سب سے بڑا علاج

مانگے جو دلِ فگار تعویذ ہوں داغِ جگر ہزار تعویذ

بازو میں جو موجِ قلزمِ حسن ہیں گوہرِ شاہوار تعویذ

بوٹا سا وہ قد ہے شاخِ گل اور غنچۂ نوبہار تعویذ

ہوا یہ حالِ دل فرقت کے صدمے اب تو سہہ سہہ کر کھٹک ہوتی ہے تھم تھم کر کسک ہوتی ہے رہ رہ کر

کہوں کیا حالِ فرقت آنسوؤں کے بدلے نکلا ہے کلیجہ ٹکڑے ہو ہو کر لہو آنکھوں سے بہہ بہہ کر

ہم اس انداز سے بیتاب ہو کر وصل میں بیٹھے چھپا جاتا تھا خود با دل میں شب کو جاگ جاگ کر

ساقی کے جلوہ کی ہیں یہ سب عشوہ سازیاں نغمہ ہے کوئی نے میں نہ مستی شراب میں

ہستی ہے میری دو عدموں سے گھری ہوئی میں خود ہوں ایک خواب میانِ دو خواب میں

واعظ کے دل کو ذوقِ محبت سے مس نہیں گویا وہ ایک مردہ مگس ہے کتاب میں

آہ کرنا دلِ حزیں نہ کہیں دم پہ بن جائیگی کہیں نہ کہیں

کھولنا رودے آتشیں نہ کہیں آگ بھڑکیگی یہ کہیں نہ کہیں

لے ہی آئے گا جذبۂ الفت ل ہی جاؤ گے تم کہیں نہ کہیں،

آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا سوئے ماہ میلی ہو چاند سی جبیں نہ کہیں

خوف ہو مانع تو پھر تم کیا کرو دل نہ ہو بس میں تو پھر ہم کیا کریں

تجھ میں ہے اے نگہ ہوشربا کیا کیا کچھ غمزہ و شوخی و انداز و ادا کیا کیا کچھ،

عہد میں تیرے وفا پر ہے ہوس کو ترجیح تھی کبھی قابلِ تعریف وفا کیا کیا کچھ،

غصہ و چشم نمائی و حیا لطف و کرم کر گئے نیم نگہ میں وہ ادا کیا کیا کچھ،

بے ریائی سے ہوا اپنے میں رسوا زاہد ورنہ حضرت نے بھی چھپ چھپ کے کیا کیا کیا کچھ،

چلتے پھرتے گالیاں بے ادا اٹھتے بیٹھتے اک نہ اک رہتی ہے وان ایجاد اٹھتے بیٹھتے،

معجزے قدرت کے ہیں یہ گلرخانِ دہر بھی گل ہیں ہنستے بولتے شمشاد اٹھتے بیٹھتے

ہجر میں باعثِ تسکیں تو ہو اے جاں کوئی ظلم بھی ہو تو اسے مان لے احسان کوئی

نظر آتا نہیں دل بچنے کا ساماں کوئی خالی جاتا ہی نہیں ناوکِ مژگاں کوئی

کر دیا روز کی شوخی نے حیا کو بے باک رکھئے اب اپنے نگہباں کا نگہباں کوئی

ہیں جنوں میں بھی تو دلچسپی کے ساماں بہت پابزنجیر کوئی چاک گریباں کوئی

اے اجل ایک نظر دیکھ تو لینے دے مجھے بال کھولے ہوئے آتا ہے پریشاں کوئی

ہے حسینوں ہی سے اس بزمِ جہاں کو رونق گل گلزار کوئی شمعِ شبستاں کوئی

آپ طاہر سے جو واقف نہ ہوں میں بتلا دوں

پچھلی راتوں کو نکلتا ہے غزلخواں کوئی

خزاں کی یاد دلاتی ہے یہ بہار مجھے ہوائے عیش بھی ہے اب تو ناگوار مجھے

اگر یہی ہے تلون تو شامِ وصل میں بھی رہے گی کشمکشِ یاس و انتظار مجھے

ہوئے ہیں ضعف سے اجزائے جسم سب تحلیل — ہر ایک ذرہ ہے اب محشرِ غبار مجھے،

فضائے باغ ہے سب تنگ دامنِ گلچیں، — خزاں سے کم نہیں یہ موسمِ بہار مجھے

جورِ بتاں کی کچھ تو مکافات چاہئے — ان کافروں سے ترکِ موالات چاہئے،

نیرنگیٔ صفات ہے اک جلوۂ سراب — عاشق ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہئے

مانا کہ شیخ آپ ہیں مستجمعِ صفات — للّٰہیت بھی قبلۂ حاجات چاہئے

ہائے کیا چیز چاہ ہوتی ہے — ہر نگہ ایک آہ ہوتی ہے،

شوخیوں سے ہر اضطراب عیاں — دل کو خود دل کی راہ ہوتی ہے

مذہبِ عشق میں ہے ترکِ خودی — آرزو بھی گناہ ہوتی ہے،

پائمالِ نگاہِ ناز ہے دل — کیسی بستی تباہ ہوتی ہے

ہر قدم پر رہِ محبت میں — عقل ہی سنگِ راہ ہوتی ہے

جلوہ افروزیٔ جہانِ وجود — اک فریبِ نگاہ ہوتی ہے

عشق میں بھی کبھی ہوس مگر — سببِ اشتباہ ہوتی ہے

جس سے کھلتے ہیں رازہائے خفی — وہ تو صرف اک نگاہ ہوتی ہے

جلوۂ رخ سے یہ دل ایسا پریخانہ بنے — ہر جگہ رونقِ محفل مرا افسانہ بنے،

بزم افروز اگر جلوۂ جانانہ بنے، — شعلہ اڑ اڑ کے ہر اک شمع سے پروانہ بنے

اثر انداز اگر نرگسِ مستانہ بنے، — ایک گھر بھی نہ ہوا ایسا جو میخانہ بنے،

وہی کامل ہے جو سالک بھی ہو مجذوب بھی ہو — کہیں فرزانہ بنے اور کہیں دیوانہ بنے،

دل بڑا اور قبضہ بتوں کا ہو خدا کی قدرت — اے تری شان کہ یوں کعبہ صنم خانہ بنے

مے پرستی ہے ازل سے دلِ نازک کی سرشت — یہ وہ شیشہ ہے جو ٹوٹے بھی تو پیمانہ بنے،

تلخیص وتبصرہ

جسم انسانی کے اندر خارجی اشیا کی نقل وحرکت

اس موضوع پر ڈاکٹر فریڈریک ڈیمرا (F. Damrau) کا ایک دلچسپ مضمون رسالہ پاپولر سائنس بابت مئی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ہے، جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، کہ انسانی جسم کے اندر انواع واقسام کی خارجی چیزیں کس آسانی کیساتھ نقل وحرکت کرتی رہتی ہیں، نیز جدید فن جراحی کی بھی داد دینی پڑتی ہے، جو ان اشیاء کو برآمد کرنے میں کمال دکھا رہا ہے، مضمون کا ملخص ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:-

چند سال ہوئے ایک مزدور کے انگوٹھے میں لکڑی کی ایک پھانس چبھ گئی، وہ جہاز کے ایک بڑے کارخانہ میں کام کرتا تھا، اور چونکہ اس قسم کے واقعات اُسے اکثر پیش آتے رہتے تھے اسلئے پھانس کو نکالنے کے لئے وہ اپنی واسکٹ کی جیب میں ایک چھوٹی سی سوئی رکھا کرتا تھا، چنانچہ اس مرتبہ بھی انگوٹھے سے پھانس کو نکال لینے کے بعد اسنے سوئی جیب میں رکھ لی، وہ اسوقت جھکا ہوا تھا، اور اسے اپنے سینہ میں کوئی چیز تیزی کیساتھ چبھتی ہوئی محسوس ہوئی، اور دس روز رات کو اس نے دیکھا کہ سوئی اسکی جیب سے غائب ہے، اور جلد پر ایک شوخ سُرخ دھبہ ہے، اکسرے سے معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ سوئی سینہ کے عضلات کے اندر سے ہوتی ہوئی اس شخص کے قلب کی طرف جارہی ہے، قبل اس کے کہ وہ نکالی جاسکے اسکی نوک قلب کے بائیں خانہ میں داخل ہو چکی تھی، ڈاکٹروں نے آپریشن کرکے سوئی کو نکالنے کی کوشش کی، مگر وہ ہاتھ نہ آئی، آپریشن کے بعد مریض کو افاقہ ہوگیا، اگرچہ اکسرے سے دیکھا گیا، کہ سوئی اب قلب کے دوسرے پہلو سے نکل رہی ہے، ہفتہ میں اانچ کے ایک قلیل حصہ کی رفتار سے حرکت

کرتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ پشت کی طرف بڑھی، اور آخر کار، ریڑھ کے قریب آکر رک گئی، وہاں سے آسانی کے ساتھ نکال لی گئی، وہ مزدور آج بھی زندہ ہے، حالانکہ لوہے کی سوئی اس کے سینہ اور قلب کے آرپار گذر گئی تھی،

یہ صرف ایک واقعہ ہے منجملہ بہتیرے اس قسم کے عجیب و غریب واقعات کے جو ڈاکٹروں کے تجربوں میں آچکے ہیں، ابھی چند روز کی بات ہے، کہ اسی طرح کا ایک واقعہ خود میرے مشاہدے میں آیا، بعض حیثیتوں سے یہ تمام دوسرے واقعات سے زیادہ عجیب و غریب ہے، کئی سال ہوئے ایک طبیب کی بچی کے پاس کھلونے کا ایک گھوڑا تھا جس کی ایال اصلی گھوڑوں کے بالوں کی تھی، جیسا بچوں کا قاعدہ ہے، وہ لڑکی کبھی کبھی کوئی بال توڑ کر چبایا کرتی تھی، ایک مرتبہ چباتے چباتے وہ اتفاق سے ایک بال نگل گئی، اس واقعہ پر تقریباً ۱۲ سال گذر گئے، جب وہ سترہ سال کی ہوئی تو ایک روز اسے اپنے پیر کے ایک انگوٹھے میں کچھ خارش محسوس ہوئی، اور جلد کے نیچے پھانس کی سی کوئی چیز نظر آئی، ایک سوئی لیکر اس نے اُسے نکالنا چاہا، اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی، کہ جس چیز کو وہ پھانس سمجھ رہی تھی وہ گھوڑے کی ایال کا ایک لمبا بال تھا، جو بغیر کسی درد یا خون کے آسانی کے ساتھ نکلا ہوا چلا آرہا تھا، تقریباً بارہ سال تک یہ بال اس کے جسم کے اندر ادھر اودھر پھرتا رہا، اور بالآخر پیر کے انگوٹھے میں جاکر ٹھہر گیا تھا،

خارجی اشیاء کا گوشت کے اندر داخل ہوکر یوں ادھر اودھر پھرتے رہنا کیونکر ممکن ہے،؟ وہ کیونکر جسم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حرکت کرتی ہیں، انھیں کیا چیز حرکت میں لاتی ہے،؟ اس قسم کے سینکڑوں سوالات ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں،

عموماً ان چیزوں کی نقل و حرکت قدرتی راستوں سے ہوتی ہے، یعنی معدہ، رگیں اور شرائین، اور وہ راستے جن سے ہوکر ہوا پھیپھڑوں تک جاتی ہے، یہ چیزیں دوران خون کے راستوں میں بہت زیادہ تیزی سے حرکت کرتی ہیں، کیونکہ خون صرف نصف منٹ کی مدت میں پورے جسم کے اندر گردش کر لیتا ہے، جسم کے ٹھوس حصوں کے اندر سے گذرنے میں خارجی اشیا بالعموم عضلات اور اعصاب کی تہوں کے درمیان سے گذر جاتی ہیں، عضلات کا سکوڑ اور پھیلاؤ، قلب کی حرکت اور وہ حرکتیں جو سانس لینے اور ہاضمہ سے پیدا ہوتی ہیں، ان چیزوں کو ادھر اودھر پھراتی
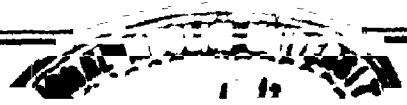
رہتی ہیں، لیکن اکثر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کہ یہ چیزیں اپنی نقل وحرکت میں بعض خاص طریقے کیوں اختیار کرتی ہیں، مثلاً ایک درزن کپڑا سیتے وقت منہ میں متعدد سوئیاں لئے ہوئے تھی، اسی حالت میں اسے چھینک آئی، اور ایک سوئی حلق کے نیچے چلی گئی، دس روز گذرنے کے بعد سینہ کی ہڈی کے تقریباً تین انچ نیچے جلد کے اندر سے سوئی ناف کی طرف سے نمودار ہوئی، اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکا، کہ سوئی ناف کی طرف سے کیوں باہر آئی۔

مجھے ایک دوسرا واقعہ بھی یاد ہے، جس میں ایک سوئی حلق کے نیچے پہونچنے کے بعد ٹوٹ کر تین ٹکڑے ہوگئی تھی، اور ہر ٹکڑا جسم کے مختلف حصوں سے نمودار ہوا، سوئی کے حلق کے اندر جانے کے ایک مہینہ بعد اس کا پہلا ٹکڑا ڈاکٹروں نے آپریشن کرکے پیٹ سے نکالا، پھر چھ ہفتے بعد دوسرا ٹکڑا پیٹ کے بائیں جانب جلد کے اندر سے خود بخود باہر آیا، اور اس کے تین ہفتہ بعد بقیہ ٹکڑا جو سوئی کی نوک کا حصہ تھا، سینہ کی ہڈی کے نیچے ظاہر ہوا، سوال یہ ہے کہ وہ ٹکڑا جو سب سے زیادہ تیز تھا، سب سے زیادہ دیر میں جلد کی سطح تک کیوں پہونچا؟

اسی قدر حیرت انگیز اور واقعات بھی ہیں، کسی دھات کا ایک ٹکڑا ایک شخص کے گھٹنے کے قریب جسم کے اندر داخل ہوگیا، اور سینہ کی جلد سے برآمد ہوا، دوسرا ٹکڑا حلق کے نیچے غائب ہوا، اور بائیں کان کی پشت پر نمودار ہوا، تیسرا منہ کے ذریعہ سے جسم میں داخل ہوا، اور پنڈلی کے پاس سے باہر نکلا،

تھوڑے دن ہوئے ڈاکٹر وارتھن (W. J. Warthen) نے کتوں پر اس قسم کے تجربات کئے تھے، کتوں کی رگوں میں دھات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے داخل کرکے وہ اکسرے کے ذریعہ سے دیکھتے تھے، کہ ان میں سے ہر ٹکڑا کہاں کہاں جاتا ہے، انھوں نے دیکھا کہ تمام ٹکڑے کتوں کے قلب تک پہنچ جاتے تھے،

انسانی جسم میں بندوق کی گولی بھی کبھی کبھی یوں ہی قلب تک پہنچ جاتی ہے، چند سال ہوئے کیلیفورنیا میں اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا، دو لڑکے خرگوش کا شکار کھیل رہے تھے، ان میں سے ایک کی بندوق

بلا ارادہ چھوٹ گئی، اور گولی دوسرے لڑکے کی ران میں جا کر لگی، ہسپتال میں ڈاکٹروں نے اکسرے سے ران کا معائنہ کیا، لیکن گولی کا کوئی نشان معلوم نہ ہوا، اس کے کچھ دنوں بعد لڑکے نے قلب میں درد کی شکایت کی، پھر اکسرے کا معائنہ ہوا، تو معلوم ہوا کہ گولی خون کی نالیوں سے ہو کر قلب میں پہنچ گئی ہے، اسے وہاں سے نکالنے کے لئے ایک نہایت نازک اور خطرناک آپریشن ناگزیر تھا، جو بالآخر کامیابی کیساتھ ختم ہوا،

گذشتہ سال آسٹریلیا کا ایک لڑکا نو ہزار میل کا سفر کر کے ڈاکٹر جیکسن (C. Jackson) کے پاس فلاڈلفیا پہونچا، ڈاکٹر موصوف پھیپڑوں سے خارجی اشیاء کو نکالنے کے لئے خاص شہرت رکھتے ہیں، اس لڑکے کے پھیپڑے میں ایک چھوٹی سی کیل پہونچ گئی تھی، ڈاکٹر جیکسن نے سات منٹ کے اندر اس کیل کو پھیپڑے سے نکال دیا، اور اس آپریشن میں یہ کمال دکھایا کہ ایک قطرہ خون بھی نکلنے نہ پایا،

ڈاکٹر جیکسن کا یہ کمال تیس سال کے متواتر تجربوں کے بعد حاصل ہوا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں ہزاروں آلات ایجاد کر ڈالے، تب کہیں جا کر وہ آلات تیار ہوئے جن کی مدد سے مذکورۂ بالا آپریشن کیا گیا، ان کا ایجاد کردہ برانکوسکوپ (Bronchoscope) جو اب دنیا کے ہر حصہ میں استعمال کیا جاتا ہے، ایک نلکی کی طرح ہے، جس کے سرے پر ایک چھوٹا سا برقی قمقمہ لگا ہوا ہے، یہ نلکی مریض کی حلق کے اندر ڈال دی جاتی ہے، اور پھر اس نلکی کے اندر سے لمبے اور نازک آلات جسم میں داخل کئے جاتے ہیں، جن کی مدد سے باریک سے باریک چیز بھی باہر نکالی جا سکتی ہے، وہ آلات اتنے نازک ہوتے ہیں، کہ سیفٹی پن (Safety pin.) کو بند کر سکتے ہیں، کسی دھات کے ٹکڑے کو کاٹ سکتے ہیں، موچنے کی طرح پکڑ سکتے ہیں، اور چمچہ کی طرح کسی چیز کو اٹھا سکتے ہیں،

ایکمرتبہ ڈاکٹر جیکسن نے ڈھائی منٹ کے اندر ایک پن جو شال میں لگائی جاتی ہے ایک عورت کے پھیپڑے سے نکالی جہاں وہ بائیس سال سے پڑی ہوئی تھی، اسی طرح ایک دوسرے مریض کے پھیپڑے سے تقریباً سات منٹ میں انھوں نے ایک بیجدار کیل نکالی تھی، جو تقریباً چالیس سال سے متقل طور پر پھیپڑے میں رکی ہوئی تھی، فلاڈلفیا کے ایک عجائب خانہ میں وہ تمام عجیب و غریب چیزیں رکھی ہوئی ہیں جنھیں ڈاکٹر جیکسن نے اپنے

مریضون کے جسموں سے نکالا ہے، اس ذخیرہ میں مندرجۂ ذیل چیزیں شامل ہیں، جوتے کے بٹن، زنجیر کی کڑیان، کارتوس کی ٹوپیاں، پنسل کی ٹوپیان، پیسے، تمغے، کیلیں، مچھلی پھنسانے کے کانٹے، بالوں میں لگانے کی پنیں، اور مصنوعی دانت، چند سال ہوے ڈاکٹر موصوف نے ایک پانچ برس کے بچے کی حلق سے پانچ کھلی ہوئی سیفٹی پنیں نکالی تھیں، جو ایک دوسرے سے الجھی ہوئی تھیں، لیکن ہر ایک کی نوک مختلف سمتوں میں تھی، اپنے کام کے سلسلہ میں انھیں سینکڑوں کھلی ہوئی سیفٹی پنیں بچوں کے پھیپھڑون سے نکالنے کا اتفاق ہوا ہے،

چند روز ہوئے کناڈا میں اکسرے کے معائنہ سے ایک ایسا حیرت انگیز انکشاف ہوا جسکی مثال غالباً آج تک نہین پائی گئی، ایک عورت کو مختلف دھاتوں کی چھوٹی چھوٹی چیزین نگلنے کی عادت تھی، ہسپتال میں اکسرے سے اسکے پیٹ کا معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں انواع و اقسام کی (۲۵۳۲) چیزیں جمع ہیں، مثلاً بٹن، پنین، سوئیان، کیلیں، پیسے وغیرہ وغیرہ، تقریبًا ایک سال سے یہ تمام چیزیں جمع ہیں، معدہ میں پڑی ہوئی تھیں، اور حیرت یہ ہے، کہ عورت کو ان سے بظاہر کوئی خاص تکلیف نہ تھی،

اس سلسلہ میں اطبا، یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اس قسم کی بعض چیزیں جو ایک شخص کے جسم میں پہونچ کر مہلک ثابت ہوتی ہیں، دوسرے شخص کے جسم میں کیون بغیر کسی مضرت کے پڑی رہتی ہیں، مثلاً حال میں تیس سال کی عمر کے ایک قیدی کے متعلق یہ اطلاع موصول ہوئی ہے، کہ وہ صبح کا ناشتہ کیلوں سے کرتا ہے، اور دن کے وقت بجائے معمولی غذا کے کارتوس کھاتا ہے، اس نے بیان کیا ہے، کہ میں سات برس کی عمر سے مختلف دھات اور شیشہ کے ٹکڑے نگلنے کا عادی ہوں، اور لوگوں کے سامنے میں نے تولیے اور برقی قمقمے کھا ڈالے ہیں، لیکن مجھے ان کی وجہ سے کبھی کسی درد کی شکایت نہیں ہوئی، ڈاکٹروں نے اسکے بیان کو غلط سمجھ کر اسکے معدہ اور آنتوں کا معائنہ اکسرے سے کیا، تو معلوم ہوا کہ درا صل کیلیں اور کارتوس اندر موجود ہیں، یہ چیزیں دوسرے شخص کے لئے ہلاکت کا باعث ہوتیں لیکن غالبًا اس کے جسم میں کوئی خاص بات تھی، جسکی وجہ سے اس پر کوئی مضر اثر نہیں پڑتا تھا،

اسی طرح بعض آدمی موچی کے سوجے، ڈبہ کھولنے کے اوزار، اور دھاگے کی گولیاں نگل گئے تھے، اور یہ سب چیزیں یا تو آپریشن کرکے نکالی گئیں، یا خود بخود فطری طور پر جسم سے خارج ہوگئیں، ایک مرتبہ ایک بچہ ریشم کے دھاگے کی ایک چھوٹی سی گولی جس میں ایک سوئی بھی تھی، گھونٹ گیا تھا، گولی تو جسم سے فطری طریقہ سے خارج ہوگئی، لیکن سوئی معدہ میں رُک گئی، اور اکسرے سے دیکھنے کے بعد آپریشن کرکے نکالی گئی،

لیکن یہ ضروری نہیں ہے، کہ تمام چیزیں جو جسم کے اندر ادھر ادھر پھرتی رہتی ہیں، اکسرے سے نظر آجائیں، دھات کی چیزوں کے علاوہ بہتیری دوسری چیزیں بھی جسم میں داخل ہوجاتی ہیں، اور ان میں سے بعض مہینوں اور سالوں اندر نقل و حرکت کرتی رہتی ہیں، اور اکسرے سے بھی معلوم نہیں ہوتیں، چنانچہ حال میں اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، چند لڑکے گھاس کی بالوں سے اس طرح کھیل رہے تھے، کہ ان میں سے ایک منہ کھول کر سامنے کھڑا ہو جاتا، اور دوسرے بالوں سے اس کے منہ کے اندر نشانہ لگاتے، اتفاق سے ایک بال ایک چار سال کے بچہ کے منہ میں پڑ گئی اور وہ بے اختیاری میں اُسے نگل گیا، لیکن وہ بال "غلط راستے سے اندر پہونچی"، اور اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوگئی، کچھ دیر کے بعد اُس بچہ کو شدید کھانسی شروع ہوئی، بخار بہت تیز آگیا، اور اس کی حالت تشویشناک ہوگئی، اس کے سینہ پر ایک جانب آماس اور سُرخی نمودار ہوئی اور یہ دونوں چیزیں بڑھنے لگیں، تین ہفتے کے بعد وہ آماس خود بخود پھوٹا، اور اس میں سے گھاس کی ایک بال جو پورے پونے دو انچ لمبی تھی، باہر نکلی، یہ پھیپھڑے کی نلی کے راستہ سے اندر چلی گئی تھی، اور پھیپھڑے کے بیچ سے ہوتی ہوئی سینہ کی سطح تک پہونچی تھی، اس کے نکل جانے کے بعد بچہ کو صحت ہونے لگی، اور چند دنوں میں اصلی قوت پھر آگئی،

مندرجۂ بالا واقعات ایک عامی کی نظر میں الف لیلہ کے قصے معلوم ہوں گے، لیکن ایک طبیب کے لئے یہ واقعات تحقیق کا ایک پُراسرار میدان پیش کرتے ہیں،

"ع ز"

توسیعِ حیات کا امکان

امریکہ کے ایک نہایت مشہور سائنسدان ڈاکٹر شرمین (H. C. Sherman.) نے سالوں کے تجربہ کے بعد یہ دعوی کیا ہے، کہ بعض مخصوص غذاؤں کے استعمال سے انسان زیادہ دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے، یہ تجربہ دراصل خود انسانوں پر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ چوہوں پر کیا گیا ہے، ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ چوہوں اور انسانوں کا نظام تغذیہ بہت کچھ ملتا جلتا ہے، اور اس تجربہ کے جو نتائج چوہوں سے متعلق حاصل ہوئے ہیں وہی انسانوں پر بھی صادق آئیں گے، یہ خیال حقیقۃً کہاں تک صحیح ہے، اس کا فیصلہ مستقبل خود کردے گا، فی الحال مضمون کی دلچسپی کا تقاضا یہ ہے، کہ اسکا خلاصہ ناظرینِ معارف کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کر دیا جائے،

سنہ ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر شرمین نے اپنے معمل میں تجربہ کے طور پر چوہوں کے ایک خاندان کو سفید نمک، دودھ کا سفوف اور سرخ گیہوں کھلانا شروع کیا، اسوقت اس خاندان کی اولاد ترقی کرکے تقریباً (۶۵۰۰۰) کی تعداد تک پہنچ گئی ہے، اور گذشتہ اپریل میں ڈاکٹر شرمین نے امریکہ کی اکاڈمی آف میڈیسن (ACADEMY OF MEDICINE) کے سامنے یہ اعلان کیا ہے، کہ اگر انسان اپنی غذا کے انتخاب میں دانائی برتے تو اس کی مدتِ حیات میں دس فی صدی کی توسیع ہو سکتی ہے، جیسا کہ چوہوں پر تجربہ کرنے سے ثابت ہوا ہے، یعنی انسان بجائے ستر برس زندہ رہنے کے ستتر برس تک پہونچنے کی توقع کر سکتا ہے،

توسیع حیات کے لئے ڈاکٹر موصوف نے جو اصول قائم کیا ہے، وہ بہت آسان ہے، اپنی غذا میں دودھ، ترکاریوں اور پھلوں کا تناسب زیادہ کر دیجئے، ان کے علاوہ غلہ کی چیزیں بھی کسی قدر ہوں، لیکن غذا بالکل پسا ہوا نہ ہو، گوشت اور مٹھائیوں کی بھی ممانعت نہیں ہے، بشرطیکہ دودھ، ترکاریوں اور پھل کی مقدار کافی ہو، چوہوں پر سالوں کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا، کہ انکی غذا میں دودھ کے تناسب کا اضافہ کرنے سے ان کی مدتِ حیات میں بھی اضافہ ہو گیا، چونکہ چوہوں کا نظامِ تغذیہ انسان کے نظام تغذیہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے، اسلئے

یہی توقع انسان کی زندگی سے متعلق بھی کیجا سکتی ہے، اور اہل سائنس کو اس نظریہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے، ایک چوہے پر غذا کا تجربہ تین سالوں میں مکمل ہوتا ہے، اسکی مدتِ حیات اوسطاً انسانی زندگی کا تیسواں حصہ ہوتی ہے، اس اعتبار سے تین سال کی عمر کا چوہا تقریبًا ویسا ہی کمیاب ہے، جیسا نوے سال کی عمر کا انسان ڈاکٹر شرمن نے دو ہزار چوہوں پر ان کی پیدایش سے لیکر موت تک تجربہ کرنے کے بعد یہ راے قائم کی ہے کہ مخصوص غذا کے استعمال سے انسان کی عمر میں بھی سات سال کا اضافہ ہو سکتا ہے، ان کا بیان ہے :-

"عام طور پر غذا میں دودھ کا تناسب بڑھا دینے سے زندگی کی مدت بڑھ جانی چاہئے، اکثر ممالک میں جنمیں ہمارا ملک بھی شامل ہے، غلہ لوگوں کی غذا کا سب سے بڑا جزو ہے، اگر غلہ کی ایک معتدل مقدار کھائی جائے، لیکن اس طرح کہ غلہ باریک پسا ہوا نہ ہو، بلکہ براے نام پسا ہوا ہو، تو اس سے عمومًا فاسفورس، لوہے، تانبے، مینگنیز اور وٹامن بی اور اسی کی ایک بڑی مقدار جسم میں پہونچے گی، لیکن اگر غذا میں دودھ پھل، ترکاریوں، اور انڈوں کا تناسب زیادہ کر دیا جائے، تو جسم میں کالسیم، اور وٹامن، اے، سی، اور جی کی مقدار بڑھے گی، اور یہ اجزا زیادہ اہم ہیں"،

ل ڈ "ع ر"

لغات جدیدہ کا نیا اڈیشن

لغات جدیدہ پہلے پہل ۱۹۱۰ء میں چھپی تھی، اور ملک کے عربی خوان حلقہ میں بہت مقبول ہوئی، یہ اسکا تیسرا اڈیشن ہے، جس میں جنگ عظیم کے بعد سے اب تک جو سینکڑوں، ہزاروں نئے الفاظ، اور اصطلاحات عربی زبان میں پیدا ہو گئے ہیں، وہ سب جمع کر دیے گئے ہیں، اور اس طرح سے یہ موجودہ عہد تک کے تمام جدید عربی الفاظ کی ایک مکمل ڈکشنری بن گئی ہے، شروع میں عربی کے جدید الفاظ و تراکیب کے عنوان سے ایک مقالہ بھی ہے، جسکو مولوی مسعود عالم صاحب ندوی مدیر الضیاء نے مرتب کیا ہے، جدید اڈیشن کی تیاری میں موصوف کی کوششوں کا بڑا دخل ہے، حجم ۳۰۰ صفحے، قیمت عیر

"منیجر"

اخبار علمیہ

آب ثقیل کی خصوصیت

ایڈنبرا یونیورسٹی (اسکاٹ لینڈ) کے ڈاکٹر جمیس کنڈال (G. E. Kendall.) نے اعلان کیا ہے کہ "آب ثقیل" کے استعمال سے انسانی زندگی میں دس سال کا اضافہ ہوسکتا ہے، "آب ثقیل" کی دریافت کو صرف چھ سال گذرے ہیں، کیمیاوی تجزیہ سے معلوم ہوا ہے، کہ معمولی پانی کے چھ ہزار حصوں میں ایک حصہ "آب ثقیل" کا ہوتا ہے، جو دیکھنے میں معمولی ہی پانی کا سا معلوم ہوتا ہے، لیکن اور باتوں میں معمولی پانی سے مختلف ہوتا ہے، آب ثقیل کے دس گلاس معمولی پانی کے گیارہ گلاسوں سے وزن میں زیادہ ہوتے ہیں، معمولی پانی کی بہ نسبت آب ثقیل میں تین درجہ زاید ٹمپریچر پر اُبال آتا ہے، اور سات درجہ زائد ٹمپریچر پر وہ منجمد ہوتا ہے، معمولی پانی میں کوئی ذائقہ نہیں ہوتا، آب ثقیل میں ایک خفیف شیرینی ہوتی ہے،

آب ثقیل کی دریافت کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ آب حیات ثابت ہوگا، یا زہر ہلاہل، یا ویسا ہی جیسا معمولی پانی، بعض تجربہ کرنے والوں نے اسکی قلیل مقدار پی، لیکن انھیں کوئی مضرت نہیں پہونچی، لیکن چوہوں کو جب اسکی مقدار نسبۃً زیادہ دی گئی، تو وہ مرگئے، اسی طرح جب مینڈکوں اور چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو آب ثقیل میں ڈالا گیا، تو وہ مرگئیں، ابھی تک متعین طور پر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ چیزیں "آب ثقیل" سے مرکیوں گئیں، لیکن ماہرین کیمیا کی سمجھ میں ایک اہم اشارہ آگیا ہے، اونھوں نے دوران تجربہ میں دیکھا ہے کہ بہت سے کیمیاوی ردّعمل "آب ثقیل" میں بہ نسبت معمولی پانی کے زیادہ آہستہ آہستہ واقع ہوتے ہیں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ آب ثقیل رفتار حیات

میں سستی پیدا کر دیتا ہے، یہی چیز ڈاکٹر کنڈال کے نظریہ کی بنیاد ہے، ان کا خیال ہے، کہ اگر "آب ثقیل" کی مناسب مقدار احتیاط کیساتھ استعمال کیجائے تو بہت ممکن ہے کہ جسم انسانی کی مشین کی رفتار کم ہوجائے، اور انسان زیادہ دنون تک زندہ رہ سکے، اس مشین کی رفتار کی سستی دماغ پر بھی اثر ڈالے گی، اور جوان عمر لوگ اپنی قوتِ عمل میں کمزوری محسوس کرین گے، لیکن بڈھوں کے لئے جو زندگی کی کشمکش سے علحدہ ہوکر اپنی بقیہ مدتِ حیات سکون کے ساتھ بسر کرنا چاہتے ہیں، آبِ ثقیل کا یہ اثر یقیناً مفید ثابت ہوگا، ڈاکٹر موصوف کو امید ہے کہ دس پندرہ برس میں آبِ ثقیل کا استعمال بوڑھوں میں عام ہوجائے گا، اسوقت سب سے بڑی دقت اسکے استعمال میں یہ ہے، کہ یہ ایک نہایت قیمتی چیز ہے، پہلے ایک چمچہ آبِ ثقیل کی قیمت تین سو ڈالر تھی، اور آج بھی تین سو ڈالر میں صرف دو گلاس پانی خریدا جا سکتا ہے، موجودہ نرخ سے اگر سال بھر کے استعمال کے لئے کوئی شخص اسے خریدنا چاہے، تو ایک کروڑپتی بھی دیوالیہ ہوجائے گا، اسکے اس درجہ گراں قیمت ہونے کی وجہ یہ ہے، کہ مخصوص کیمیاوی طریقہ سے اسکے نکالنے میں مصارف بہت ہوتے ہیں، لیکن ڈاکٹر کنڈال کا خیال ہے کہ چند سالوں میں یہ مشکل بھی حل ہوجائے گی، اور قدیم کیمیاگروں کا "آبِ حیات" سستے داموں بکنے لگے گا،

امریکہ میں پڑھے لکھوں کی تعداد

حال میں ولیم اسمتھ (W. Smith) صدر محکمۂ تعلیم بالغان نیویارک اسٹیٹ کے ایک بیان سے امریکہ کے اکثر باشندوں کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ان کا ملک پڑھے لکھوں کے تناسب کے لحاظ سے دنیا کے ہر ملک سے بڑھا ہوا نہیں ہے، مثلاً فنلینڈ (Finland) کے ہر اس شخص کے مقابلہ میں جو اپنی زبان میں لکھ نہیں سکتا، چھ امریکن ایسے ملیں گے، جو اپنے دستخط بھی نہیں کر سکتے، ایسے لوگوں کی تعداد بھی جو مطبوعہ عبارت سے بمشکل مطلب نکال لیتے ہیں، توقع سے زیادہ نکلی، ماہرین کی ایک جماعت نے ان کی استعداد کا باقاعدہ طور پر امتحان لینے کے بعد جو معلومات حاصل کئے ہیں، وہ حیرت انگیز ہیں، گذشتہ سال امریکن لائبریری ایسوسی ایشن کے جلسہ میں یہ تخمینہ پیش کیا گیا تھا کہ ملک

کی نصف آبادی اتنی استعداد نہیں رکھتی، کہ کسی مطبوعہ مضمون کا مفہوم پوری طرح سمجھ سکے، اور حال میں شکاگو یونیورسٹی کے صدر نے اندازہ لگایا ہے کہ ملک کے نصف نوجوانوں میں جن کی عمریں ۱۴ اور ۲۴ سال کے درمیان ہیں، اتنی قابلیت نہیں ہے، کہ وہ بطور خود کتابوں سے کوئی تعلیم حاصل کر سکیں، ماہرین کے ان تخمینوں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ کے پانچ کروڑ باشندے صرف تھوڑا بہت لکھے پڑھے ہیں، لیکن ولیم اسمتھ نے اپنے محکمہ کے نمایندے کی حیثیت سے یہ پیشینگوئی کی ہے، کہ سنہ ۱۹۵۰ء تک نیویارک اسٹیٹ میں ایک شخص بھی ان پڑھ رہ نہ جائے گا، انھوں نے اس پیشینگوئی کی تائید میں بیان کیا ہے، کہ اس ریاست میں سنہ ۱۹۰۰ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۰ء تک بے پڑھے لکھوں کا تناسب (۵،۱) فی صدی سے گھٹ کر (۳،۷) فی صدی تک آگیا ہے،

یورپ میں مسلمانوں کی تعداد

ذیل کے اعداد و شمار ڈاکٹر ذکی علی کے ایک مضمون سے ماخوذ ہیں جو انگریزی رسالہ اسلام لاہور کی قریبی اشاعت میں نکلا ہے،

مشرقی اور جنوبی مشرقی یورپ،

البانیا میں (۷۰) فی صدی سے زیادہ مسلمان ہیں، جن کی مجموعی تعداد (۷۵۰۰۰۰) ہے،

یوگوسلاویا،	تقریباً	(۱۷۵۰۰۰)
بلغاریا،	"	(۶۸۹۲۹۶)
رومانیا،	سنہ ۱۹۲۴ء میں مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ (۲۳۰۰۰) تھا،	
یونان	سنہ ۱۹۲۸ء میں انکی تعداد تخمیناً (۱۰۰۰۰) تھی،	
پولینڈ اور لتھوانیا،	تقریباً	(۱۲۰۰۰)
فن لینڈ	"	(۳۰۰۰)

ہنگری	تقریباً	(۳۰۰۰)
مغربی یورپ:۔		
فرانس	تقریباً	(۲۰۰۰۰)
برطانیہ عظمی	"	(۳۰۰۰۰)
بلجیم	۱۹۲۹ء کی مردم شماری کے مطابق۔	(۵۰۰۰)
ہالینڈ اور جرمنی،		(۶۰۰۰)
اٹلی		(۱۵۰۰)
اسپین	تقریباً	(۵۰۰۰)
سائپرس	۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق	(۶۴۲۳۸)
روڈس	تقریباً	(۱۲۵۰۰)

پھلوں کی جانچ کا برقی آلہ

امریکہ میں ایک برقی مشین ایجاد کی گئی ہے، جو بتا دیتی ہے کہ پھلوں کی اندرونی حالت کیسی ہے، جن پھلوں کا چھلکا دبیز ہوتا ہے، مثلاً چکوترے انکی اندرونی حالت کا صحیح اندازہ مشکل سے ہوتا ہے، اور اکثر باہر کے تاجروں کو مال کی خرابی کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے، اس مشین کی ایجاد سے یہ شکایت رفع ہو جائے گی، کیونکہ اب باہر بھیجنے سے پہلے تمام پھل جانچ لئے جائیں گے، اگر کسی پھل میں کچھ بھی خرابی ہوئی، تو اس مشین میں ڈالنے کے بعد چھلکے پر فوراً داغ پڑ جائیں گے، اور یہ داغدار پھل اچھے پھلوں سے خود بخود علٰحدہ ہو جائے گا، یہ مشین ایک دن میں ہزاروں پھلوں کی جانچ کر لیتی ہے۔

"ع ز"
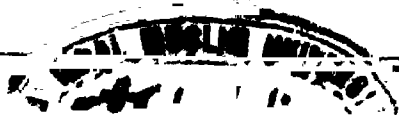
سیر الصحابہؓ

سیرۃ النبی کے بعد مسلمانوں کے لیے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں وہ حضرات صحابہ کرامؓ ہیں۔ دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان کام کو انجام دیا، اور سارے صحابہ کرامؓ کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدیں چار ہزار کے برابر صفحات سے چھپ کر مرتب کیں، اور بہ حسن و خوبی شائع کیں۔ ضرورت ہے کہ حق طلب اور ہدایت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفوں کو پڑھیں، اور اس شمعِ ہدایت کی روشنی میں چلیں جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی۔ ان جلدوں کی علیحدہ علیحدہ قیمتیں حسب ذیل ہیں، جن کا مجموعہ [illegible] ہوتا ہے، لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف [illegible] میں یہ دس جلدیں کامل تذرکیجاتی ہیں۔ پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار۔

جلد اول، خلفائے راشدینؓ	[illegible]	جلد ششم، سیر الصحابہ ششم	[illegible]
جلد دوم، مہاجرین اول	[illegible]	جلد ہفتم، سیر الصحابہ ہفتم	[illegible]
جلد سوم، مہاجرین دوم	[illegible]	جلد ہشتم، سیر الصحابیات	[illegible]
جلد چہارم، سیر انصار اول	[illegible]	جلد نہم، اسوۂ صحابہ اول	[illegible]
جلد پنجم، سیر انصار دوم	[illegible]	جلد دہم، اسوۂ صحابہ دوم	[illegible]

مینجر دار المصنفین اعظم گڑھ